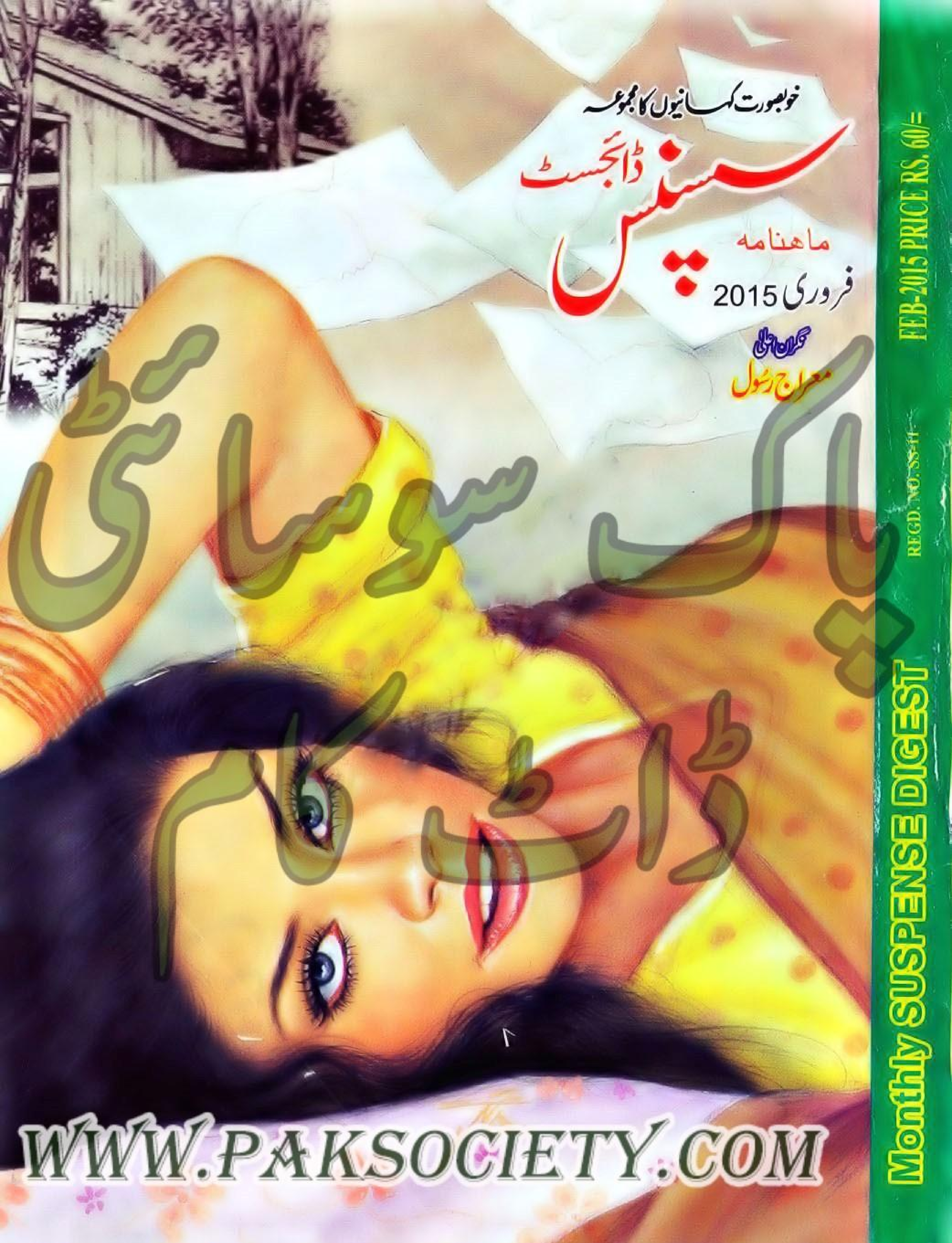

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ
فروری 2015
نگران اعلیٰ
معراج رسول
FEB-2015 PRICE RS. 60/=
Monthly SUSPENSE DIGEST

سسپنس ڈائجسٹ

جلد 45 • شمارہ 02 فروری 2015 • زرسالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •

خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون .35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پرنٹر: ذیشان رسول۔ مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی


Pakistan's ONLY
Baking Soda
Toothpaste
DEEP CLEANING & EXTRA WHITENING FORMULA
SodaWhite
BAKING SODA TOOTHPASTE
TARTAR CONTROL
Quality BRUSH Pack
دانت سفید چکا چک
SW-06-14
facebook.com/snscares

انشائیہ

جون ایلیا

قانون

"تم باہر تو جا رہے ہو مگر تمہیں کسی نے اغوا کرلیا تو......"

"ہوں...... میں باہر تو جا رہا ہوں مگر مجھے کسی نے اغوا کرلیا تو...... مجھے کسی نے اغوا کرلیا تو......"

"مگر تم مجھے خوانخواہ دہلاتے رہتے ہو۔"

"میں خوانخواہ دہلا تا رہتا ہوں...... تمہیں مقدس صحیفوں کی قسم، کیا تم یہ بات دل سے کہہ رہے ہو؟"

"تو پھر تم بھی میرے ساتھ چلو۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں...... مگر ہم دونوں کو اغوا کرلیا گیا تو......؟"

"ہاں یہ تو ہے۔ اگر ہم دونوں کو اغوا کرلیا گیا تو...... تو پھر؟"

"تو پھر یہ کہ باہر تو جانا ہی ہوگا، ہم اندر کب تک رہ سکتے ہیں؟ باہر ہی تو ساری زندگی ہے۔ باہر ہی تو سب کچھ ہے۔ ہمارے نام اور ہماری پہچان بھی تو باہر ہی ہے اور یہ کہ تم بھی تو میرے باہر ہی ہو...... میں بھی تو تمہارے باہر ہی ہوں...... میرے اور تمہارے سانس بھی تو باہر ہی ہیں۔"

"میرے بھائی! آخر ان بستیوں کو ہو کیا گیا ہے؟ وہ کون لوگ ہیں جو نہ جانے کہاں سے یہاں آگئے ہیں؟ بہت سے لوگوں نے اسی بستی میں ہوش سنبھالا ہے، کوئی بتائے کہ یہ لوگ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں......؟"

"یہ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ لوگ باہر سے آئے ہیں؟ کہیں یہ لوگ ہمارے اور تمہارے اندر سے تو نہیں نکل آئے؟"

"ہاں، ایسا ہو تو سکتا ہے کہ یہ لوگ ہم ہی میں سے برآمد ہوئے ہوں...... اور ایک دوسرے کو خود ہی اغوا کرلیتے ہوں مگر پہلے تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ ہوتا تھا مگر کبھی کبھی...... لیکن اب تو یہ روز کا معمول بن گیا ہے۔ ایسا کیوں ہوا ہے؟ یہ گلیاں، یہ نکڑ، یہ راستے، یہ شاہراہیں اور یہ بستیاں اتنی مہلک اور مہیب کیوں ہوگئی ہیں؟ ہم نے تو ان بستیوں کو بڑے چاؤ سے بسایا تھا، ہم نے تو اپنے مسکنوں کو اجاڑ کر ان بستیوں کو اپنا مسکن بنایا تھا...... تو پھر یہ بستیاں ہمارے اور تمہارے حق میں اتنی نامہرباں کیوں ہوگئی ہیں؟ میرا نام زید ہے، میں اردو بولتا ہوں اور میں اس بستی میں غیر محفوظ ہوں۔ میرے ایک دوست کا نام مہتاب منگریو ہے، وہ سندھی بولتا ہے اور وہ بھی اس بستی میں غیر محفوظ ہے۔ میرے ایک اور دوست کا نام عثمان بلوچ ہے، وہ بلوچی زبان بولتا ہے۔ اردو بھی جانتا ہے، وہ بھی اس بستی میں غیر محفوظ ہے۔ میرا اپنا ایک آدمی ہے، اس کا نام نذیر لغاری ہے، وہ بابا فرید کے شہر کا رہنے والا ہے اور وہ بھی اس بستی میں غیر محفوظ ہے۔ اور میرا ایک یار ہے افتخار جالب، جو پنجابی اور اردو میں لکھتا ہے۔ اسی بستی میں رہتا ہے اور وہ بھی اس بستی میں غیر محفوظ ہے۔"

"مگر پہلے تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ اب ایسا کیوں ہوتا ہے؟ پہلے اگر ایسا ہوتا بھی تھا تو بہت کم ہوتا تھا۔"

"سننا چاہتے ہو......؟ یہ قانون کی شکست ہے۔ یہ قانون کی بے حرمتی ہے اور یہ قانون کی معزولی ہے۔"

"ہیں...... قانون کو کس نے معزول کیا؟ قانون کی کس نے بے حرمتی کی؟"

"قانون کو کس نے معزول کیا، قانون کی کس نے بے حرمتی کی...... میرے بھائی! کیا تم یہ بات بھی نہیں جانتے؟ یہ بات تو کریم سبزی فروش بھی جانتا ہے اور یہ بات تو خلیفہ مجید کے اکھاڑے کے پٹھے بھی جانتے ہیں...... اور یہ بات تو جیب تراش بھی جانتا ہے۔ کیا میں اس سے آگے بھی کچھ کہوں؟ یہ بات تو وہ لوگ بھی جانتے ہیں جو حکومت کی گدی پر بیٹھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے قانون بنایا اور اب جو فرق پڑا ہے، وہ یہ ہے کہ عام آدمیوں نے بھی قانون سے کھیلنا شروع کردیا ہے۔ جب تک قانون بنانے والے قانون کا احترام نہیں کریں گے تو بستیوں اور شہروں کے عام لوگ بھی اس کا احترام نہیں کریں گے۔ حکمرانوں سے کہو کہ وہ عام آدمیوں سے یہ سمجھوتا کریں کہ جو قانون ہم نے بنایا ہے، ہم بھی اس کا احترام کریں گے اور تم بھی اس کا احترام کروگے...... اور اگر نہیں تو نہیں، ہرگز نہیں۔ اگر عام آدمی کو قانون کا پابند بنایا گیا تو پھر خاص آدمیوں کو بھی اس قانون کی پابندی کرنی پڑے گی۔ اگر قانون کی دوطرفہ رعایت نہیں کی گئی اور اس کی حرمت کو برقرار نہیں رکھا گیا تو پھر ان بستیوں میں جنگل کے درندے ہی آکر آباد ہوں گے۔"

آپ کے خط

محترم قارئین
السلام علیکم!

فروری 2015ء کا دلفریب شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے..... عہدِ حاضر میں ماہِ فروری کو محبت سے منسوب کیا جانے لگا ہے۔ یہ نظریہ کہیں سے بھی مستعار لیا گیا ہو اور خواہ ایک دن کے لیے ہی سہی، محبت وخوشی کی ہلکی سی لہر ضرور دلوں میں ابھرتی ہے لیکن..... اس حوالے کا جو مخصوص مطلب لیا جاتا ہے وہ بے شمار برائیوں کو جنم دینے کا سبب بھی بن سکتا ہے لہٰذا مثبت رویہ ہی بہترین طرزِ عمل ہے۔ محبت کا ایک خوب صورت حوالہ پھولوں کے مانند معصوم بچے بھی ہیں لیکن دسمبر میں پشاور آرمی پبلک اسکول میں انہی پھولوں کو جس بے دردی سے روندا گیا ملکی تاریخ میں اس سے بدترین مثال اور کوئی نہ ہوگی۔ جانے والے اپنی داستان چھوڑ گئے مگر بچ جانے والے بچے اس خونی داستان کو کبھی نہ بھول پائیں گے۔ خوف کا یہ زہر اس نئی نسل کے اذہان وقلوب کو اپنی آلودگی سے باہر نہ نکلنے دے گا۔ ”بہت دیر کی مہرباں آتے آتے“ کے مصداق ملکی سلامتی کے لیے تمام جماعتوں اور پوری قوم کا ایک نقطے پر متحد ہونا کہ اب مزید لاقانونیت اور دہشت گردی برداشت نہ کی جائے گی..... بلاشبہ مثبت سوچ اور رویہ ہے لیکن قیمتی جانوں کا نقصان کبھی نہ پورا کیا جا سکے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کمزور نظام فرعونیت کو فروغ دینے کا سبب بنتا ہے۔ اگر ”نظام“ کی ابتدا کے بارے میں غور کیا جائے تو ہر انسان کو سب سے پہلے اپنے اندر جھانکنا پڑے گا کیونکہ ”نظام“ ایک ایسی ترتیب کا نام ہے جس سے وجود یا کوئی معاشرہ تشکیل پاتا ہے اور جہاں اس ترتیب میں کچھ گڑبڑ ہوتی ہے وہاں نتائج بھی غلط نکلتے ہیں اور انہی غلط نتائج کی وجہ سے وجود بیمار اور معاشرہ تباہ ہوجاتا ہے۔ لہٰذا نظام کی تبدیلی کے لیے ترتیب کو درست کرنا ضروری ہے۔ اگرچہ حالیہ دنوں میں حکومت کی جانب سے نظام کی درستی کے لیے بہتر اقدامات کیے جارہے ہیں لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کے ثمرات کب تک عوام کے حصے میں آتے ہیں اور اب اچھی امیدوں کی آس لیے چلتے ہیں اپنی نٹ کھٹ محفل کی جانب۔

⌘ درِشہوار پیرزادہ، بہاولپور سے تشریف لائی ہیں ”سسپنس ڈائجسٹ نئے سال کی نوید دیتا ہوا 17 دسمبر کو ملا۔ مگر سانحہ پشاور کا سن کر دل غم سے چور تھا۔ ٹائٹل دل میں سما گیا۔ حسینہ اپنے بالوں میں پھول سجائے نئے سال کی خوشیوں کا انتظار کررہی ہے۔ بے دولتی میں جون ایلیا کی کڑوی کسیلی باتیں پر مشتمل سچ ہے۔ اداریہ اچھا رہا۔ تفسیر عباس بابر صاحب کو صدارت مبارک۔ رمضان پاشا اچھے تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ اعجاز احمد راحیل ماہی کا تبصرہ گو کہ مختصر تھا لیکن جاندار تھا۔ طاہر گلزار ہمیشہ شکوہ کرتی نظر آتی ہیں۔ گل مروت نے بھی اپنے لالاؤں کے ساتھ شادی کے بعد حاضری دی۔ سعدیہ بخاری آپ نے یہ کیوں کہا کہ ٹائٹل دیکھ کر آنکھوں میں موتیا اتر آیا حالانکہ آپ کا موتیا پک گیا ہے۔ اشفاق محی الدین آپ نے زویا اعجاز کے بارے میں درست تجزیہ کیا ہے۔ مہرین ناز کا تبصرہ واقعی اچھا ہوتا ہے۔ میری ہم شہر بشریٰ افضل جی آپ کو مس کرتے ہیں۔ نئے سال کی کہانیاں بہت اچھی اور دلچسپی سے بھرپور ہیں۔ موڈ خوشگوار کرنے کے لیے سب سے پہلے منظر امام کو پڑھا۔ پہلے آپ، واقعی لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی..... دعاؤں سے واقعی تقدیر بدل جاتی ہے اور ہمیں اپنی اچھی نیت اور دعاؤں کا پھل ملتا ہے۔ تنویر ریاض کی چھان بین، ہر انسان میں خامیاں خوبیاں ہوتی ہیں فرشتہ جیسا انسان تلاش کرنے والی لڑکیاں اکیلی رہ جاتی ہیں۔ مرزا امجد بیگ نے کہنہ مشق میں اشتیاق بیگ کے قاتلوں کو بہترین طریقے سے بے نقاب کیا۔ نرگس اور فرید غوری نے قتل پلاننگ کی وحیدہ کو پھنسانے کی مگر مجرم کہیں نہ کہیں غلطی کرہی جاتے ہیں۔ ماروی کو نواب صاحب نے محبت سے شروع کیا اور اب مراد صاحب بھارت میں جرائم کی دنیا میں کھو کر محبت سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ سوائے جنوں، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی اسلام دشمن عناصر کو نئے انداز میں بے نقاب کررہے ہیں لیکن تمام سازشی لوگ منہ کی کھاتے ہیں کیونکہ اسلام دینِ حق ہے۔ سلیم فاروقی صاحب کی بے ثمر مسافت بہترین رہی۔ صفدر کے شب وروز رمشا کی موت اور ثمرہ کی صفدر تک واپسی کی داستان پرفیکٹ تھی۔ امام ابوالعباس اللہ کی رضا میں رہنے والے ہی اللہ سے اور مخلوق سے عزت پاتے ہیں۔ ضیا تسنیم بلگرامی کو اللہ رب العزت ہمیشہ خیر عطا کرے۔ محفل شعروسخن یا محفل دلربا ہی، اتنے اعلیٰ ذوق اشعار کہ دل خوش کرا ٹھے۔ قارئین کے ساتھ سلیکٹرز کے لیے بھی ویلڈن۔ مرسلے بھی قابل تھے۔ 2015ء کا پہلا شمارہ فرسٹ پوزیشن میں پاس ہوا۔“ (بھرپور تبصرہ کرنے کا شکریہ)

⌘ شبانہ حسن، لاہور کینٹ سے چلی آرہی ہیں ”اپنا لاڈلا چہیتا اور پیارا سسپنس اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ 18 دسمبر کو ملا۔ ادب کے افق پر چمکتا ہوا سسپنس وہ درخشاں چاند ہے جس کے اردگرد ان گنت دھنک رنگ ستارے جھلمل جھلمل جھلملا رہے ہیں۔ سرورق بہت پسند آیا۔ میرے ہم وطنوں سانحہ پشاور پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ جب بھی کوئی ایسا ہولناک واقعہ ہوتا ہے ہمارے سیاست دان یک زبان ہوکر ایک ہی لفظ کہتے ہیں کہ ہم اس واقعے کی پرزور مذمت کرتے ہیں۔ کاش پاکستان ہماری زندگی میں ہی امن کا گہوارہ بن جائے۔ تفسیر عباس صاحب کو اتنے بڑے تبصرے کی مبارک باد۔ شاداب وماہتاب آپ نے سوہنی کڑیوں کو یاد کیا اور ہم حاضر۔ ابرار وارث واقعی لائق اسٹوڈنٹ پر کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا۔

طالب حسین ظلہ اللہ تعالیٰ آپ کے اسیری کے دن تمام کرے۔ تبصرہ اچھا تھا۔ عادل خان ہمیں آپ کی ادارے کو دی گئی گزارش اچھی لگی۔ زیب حسن گیارہ مہینے غائب رہنے کی وجہ؟ شوکت بھائی نے گل مروت کی ساری مصروفیات بتا دیں۔ ہارون جھرس اپنے نام پر کیوں ہنسی آئی۔ سلیم فاروقی کی بے ثمر مسافت، صفدر کو غلط صحبت نے بگاڑ دیا تھا مگر رمشا کی معصوم محبت نے اس کو ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے معافی کی صورت میں ثمرہ کا ساتھ عطا کیا، نا قابل معافی ڈاکٹر شیر شاہ سید نے بتایا کہ یورپین مالی بدعنوانی کرنے والوں کو معاف نہیں کرتے لیکن ہم پاکستانی ایسے لوگوں کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ چھان بین، تنویر ریاض ہر انسان میں کوئی نہ کوئی خامی ہوتی ہے۔ کوئی بھی بے عیب نہیں اور لیا کو بے عیب ساتھی چاہیے تھا۔ منظر امام پہلے آپ بیتی میں اپنے مخصوص اسٹائل میں آئے۔ ان کی تحریر پڑھ کر موڈ خوشگوار ہو جاتا ہے۔ سلیم انور شکنجہ میں بتاتے ہیں کہ موٹے لوگ اگر اپنے منہ کو زپ لگا لیں تو بہت سی مشکلات سے بچ سکتے ہیں۔ راہ عشق میں سید احتشام اگر عشق کی راہ سیدھی ہوتی تو ہر انسان اس سے آسانی سے گزر جاتا۔ طاہر جاوید مغل صاحب، یہ الرجی لڑکوں کو کیوں نہیں ہوتی کیونکہ وہ بچی محبت نہیں کرتے اور وہ لڑکیوں کے آنسو کا مطلب بھی نہیں سمجھ پاتے۔ کاشف زبیر کی عفریت ہر ماں اپنی اولاد سے اسی طرح محبت کرتی ہے، میگاٹ بھی چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا زندہ رہے۔ ماروی میں جناب محی الدین نواب آخر کار قارئین کا دل جیتنے میں کامیاب ہو گئے۔ جرائم کی دنیا میں مراد نے بہت دشمن پال لیے۔ سودائے جنوں میں عبدالرب بھٹی صاحب مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن یہودیوں کی سازشیں بے نقاب کر رہے ہیں۔ اسٹوری دلچسپی کی طرف رواں دواں ہے۔ محفل شعر و سخن کا معیار بڑھتا جا رہا ہے۔ ہر شعر و قطعہ پڑھ کر دل جھوم جھوم جاتا ہے۔ زاہد چودھری، عمبرین ناز، سعدیہ بخاری، نورین عباس اور عائشہ ثانی کے انتخاب بہت حسین تھے۔ مرسلے بھی کافی معیاری تھے۔“

✠ **محمد صفدر معاویہ**، خانیوال سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں ”جنوری 2015 کا شمارہ 17 دسمبر کو اپنے شہر خانیوال میں حاصل کیا۔ سرورق کو ڈول اور نیا سال مبارک سے سجایا گیا۔ جون ایلیا کا ایک ایک لفظ قیمتی تھا۔ آپ کا اداریہ قابل تحسین تھا۔ اب یہ لکھتے ہوئے ہاتھ کانپتے ہیں اور دل خون کے آنسو روتا ہے کہ 132 بچوں سمیت 142 افراد کو سلا دیا گیا۔ ظالموں کو ذرا بھی ترس نہ آیا۔ ان پھول جیسے بچوں کا کیا قصور ہے بچے تو بچے ہوتے ہیں چاہے کسی کے بھی ہوں۔ کیا ان کو ذرا بھی خوف نہیں آتا۔ ہمارے بچوں کے ساتھ ایسا ہو جائے تو...... میں پاکستان کی ماؤں کو سلیوٹ کرتا ہوں کہ بچے قربان کروانے کے بعد بھی ان کے حوصلے چٹانوں جیسے ہیں۔ ماؤں کے جنت کے پھول جنت میں چلے گئے۔ جب تک جان میں جان ہے ہم پاکستان کی خاطر پاکستان میں رہنے والوں کی خاطر لڑتے رہیں گے۔ تفسیر عباس بابر کا اچھا تبصرہ تھا۔ ویلڈن۔ قدرت نیازی اور اعجاز احمد راحیل کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ باقی سب دوستوں کے تبصرے بھی بہت نائس تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے عشق ناتمام پڑھی۔ عامر کی قربانی نے بہت متاثر کیا تو وہیں میزہ نے بہت مایوس۔ ماروی عجیب تر اسٹوری جاری ہے۔ مراد ایک سے دوسرے امتحان میں پڑتا جا رہا ہے۔ سودائے جنوں ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے قلم سے لکھی گئی سچ پر مبنی تحریر ہے۔ بے ثمر مسافت، صفدر نے ایک غلطی کی اور کتنا پچھتاوا بھگتنا پڑا۔ کہنہ مشق میں بیگ صاحب نے بہترین وکالت کرتے ہوئے مجرم کو پھانسا۔ باقی سب کہانیاں بھی بیسٹ تھیں۔ اشعار کی محفل اور کترنیں بھی بہترین تھیں۔ سال نو کا پہلا شمارہ بیسٹ رہا۔“

✠ **محمد قاسم رحمان**، ابرار کالونی ہری پور سے محفل کی زینت بنے ہیں ”20 دسمبر کو سسپنس میرے دل کی نگری میں اترا۔ ٹائٹل بہت زبردست۔ ٹائٹل گرل مجھے زویا اعجاز لگی۔ یقین جانیے میرے دماغ میں آپی زویا اعجاز کا ایسا ہی بالکل ایسا ہی خاکہ ہے۔ ساتھ میں اسٹائلش کر کے لکھا ہوا نیا سال مبارک ٹائٹل کو پرفیکٹ کر رہا تھا۔ سب سے پہلے اداریہ پڑھا۔ واقعی ہمارا ملک نازک دور سے گزر رہا ہے اور اس کے ذمے دار ہمارے تمام سیاسی لیڈر ہیں۔ اس مرتبہ کرسی صدارت پر اوکاڑہ سے تفسیر عباس بابر کا قبضہ تھا۔ وزارت کے عہدے پر یوسف سانول فائز تھے۔ گل مروت، قدرت اللہ نیازی ویلکم کرنے اور تبصرہ پسند کرنے کے لیے بنڈل آف تھینکس۔ باقی طاہرہ گلزار اور سید اکبر شاہ شکر ہے آپ دونوں واپس آ گئے۔ دراصل میں نے آپ کی تحریریں پڑھ کر ہی لکھنا شروع کیا تھا۔ کہانیوں کی ابتدا اس مرتبہ خلاف معمول منظر امام کی تحریر سے کی۔ کیا افسانوی ٹاپک تھا۔ حقیقت سے بہت دور۔ طاہر جاوید مغل عرف مغل انکل کیا کہنے آپ کے۔ آپ ایسا لکھتے ہیں کہ پڑھنے والا اس میں ڈوب ہی جاتا ہے۔ اس مرتبہ ڈاکٹر شیر شاہ سید کچھ خاص متاثر نہ کر سکے۔ ماروی کی یہ قسط دھما کا خیز تھی۔ حالات مراد کے حق میں ہو رہے ہیں۔ اس مرتبہ مراد نے زبردست چال چلی۔ دوسری جانب مرینہ سدھرنے کا نام نہیں لے رہی۔ آخری صفحات پر بے ثمر مسافت بہت زبردست رہی۔ ثمرہ اگر اپنے جذبات کو نہ چھپاتی تو مشاق جان بچ سکتی تھی۔ شکنجہ میں سامنتھا ایلسٹن نے بڑی مہارت اور پر اسرار طریقے سے جسم کا وزن ڈیڑھ سو پونڈ کم کر دیا۔ راہ عشق زبردست تحریر تھی مگر انجام غیر متوقع تھا۔ کہنہ مشق مرزا امجد بیگ نے بڑی مہارت کے ساتھ ایک الجھے ہوئے کیس کو حل کیا۔ مجھے شروع ہی سے نرگس پر شک تھا۔ چھان بین اور عفریت اچھے ناولز تھے۔ عشق ناتمام بھی آخر کار تمام ہوا ویلڈن۔ میرا یہ خط فروری میں شائع ہوگا اور 10 فروری کو میرا برتھ ڈے ہے، یقیناً ادارہ مجھے ضرور وش کرے گا۔“

✠ **ادریس احمد خان**، ناظم آباد، کراچی سے محفل میں شریک ہیں ”ٹائٹل پر ہنستے مسکراتے چہرے والی نازنین آنے والے نئے سال کی ساعتوں کے دلفریب نظاروں کے نئے نئے خواب بننے میں مصروف ہیں۔ سال 2014ء جو تلخ یادوں کے الم ناک لمحوں پر مشتمل تھا گزر گیا۔ جس میں ایسے ہی ایسے تھے۔ جس میں تازہ تازہ پشاور کا انسانیت سوز واقعہ انسانیت کے نام پر بدنما دھبہ ہے۔ گزرتے لمحوں میں بھی روز بروز تھر کے بھوک سے بلکتے بچے جو روٹی کے حصول میں ناکام ہو کر جان کی بازی ہار گئے۔ وہ بھی کسی کے جگر گوشے تھے کسی ماں کی آرزو تھے کسی باپ کے ارمان

تھے۔ انسانی جان جو انمول ترین شے ہے جس کا دنیا کی قیمتی سے قیمتی دولت سے موازنہ نہیں کر سکتے۔ افسوس صد افسوس انسان انسانیت کی معراج سے گر گیا ہے۔ انشائیہ جس میں انسان کی بے حسی کو لفظوں میں بیان کیا گیا ہے۔ اداریے میں بھی کچھ یہی اسباب بیان کیے گئے ہیں مگر ہر حالت میں ہر مشکل میں انسان کا کام تو صبر و شکر اور اللہ سے بہتری کی ہی امید رکھنا اور دعا مانگنا لازم ہے کیونکہ وہ مسبب الاسباب ہے۔ سسپنس میں سب سے پہلے سودائے جنوں پڑھی۔ جس میں متعصب جنونی اسرائیلیوں کی مسلمانوں سے ازلی دشمنی کا احوال بیان کیا گیا ہے۔ جنہوں نے ظلم کرنے میں نازیوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ دوسری کہانی محی الدین نواب کی ماروی تھی۔ کہانی بس چل رہی ہے کوئی نیا پن نظر نہیں آرہا ہے۔ تیسری کہانی الیاس سیتاپوری کی کہانی عشقِ ناتمام تھی۔ عفریت کاشف زبیر کی اچھی کہانی تھی۔ جدا انتقام طاہر جاوید مغل کی منفرد کہانی تھی جس میں محبت کے لطیف جذبات کا اظہار کیا گیا۔ کہنہ مشق احمد بیگ کا اچھا کارنامہ تھا۔ راہِ عشق نے بھی اثر پذیری کا کام کیا۔ شعر و سخن میں اچھے اور معیاری اشعار نے مزہ دیا۔ شکنجہ بھی بہتر تھی۔ پہلے آیئے منظر امام کی شگفتہ تحریر تھی۔ امام ابو العباس نے دل کو ایمان کی روشنی سے منور کیا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی تحریر ناقابل معافی نے بھی بہت متاثر کیا۔ ان کی کہانیاں دلوں کو جھنجوڑنے والی ہوتی ہیں۔ چھان بین بھی اچھی لگی۔ اقوال زریں بھی اچھے لگے۔ آخری صفحات کی کہانی بے ثمر مسافت آخری صفحات کی بہترین کہانی تھی۔ صفدر اتنی تگ و دو کے بعد کچھ حاصل نہ کر سکا۔ محبت بھی بے ثمر رہی۔ ہماری طرف سے سسپنس پڑھنے والے قارئین دوستوں کو نئے سال کی پُرخلوص مبارکباد اور دعا کہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کو اپنے نیک مقاصد میں کامیاب کرے اور پاکستان کو ترقی اور استحکام دے اور ماضی اور حال کی ساری کثافتیں دور کردے کہ ہر انسان امن و سکون کی زندگی بسر کرسکے۔ آمین۔"

✠ **اعجاز احمد راحیل، ماہی، ساہیوال سے حاضر خدمت ہیں** "نئے سال کا چمکتا دمکتا شمارہ 18 دسمبر کو مل گیا۔ سمجھ نہیں آتی کیا لکھوں؟ پشاور میں جس طرح ظلم و ستم کی انتہا ہوئی ہے۔ اس کو رقم کرنا قلم ناتواں کے بس کی بات نہیں۔ سرورق پر موجود محبوبہ دلنواز آنکھوں میں امید و یاس کے دیپ جلائے یادِ ماضی کے خوشگوار لمحات اور ادھوری خوشیوں کے سحر میں کھوئی ہوئی لگتی ہے انشائیہ اور اداریہ تو گویا گوہر نایاب ہیں۔ ہماری اصلاح کے ساتھ معلومات میں کچھ اضافہ ہو جاتا ہے۔ کرسی صدارت پر اس دفعہ اپنے بھائی تفسیر عباس بابر براجمان تھے مبارکاں۔ محفل میں برادر سید شکیل حسین کاظمی کی کمی ہمیں ہر بار شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ سب سے پہلے شیر لاہور طاہر جاوید مغل صاحب کی جدا انتقام پڑھی۔ لفظ لفظ اپنے اندر درد سموئے ہوئے ہے۔ دل کی سلطنت جب زیر و زبر ہو جائے تو انسان اپنے جینے کا انتقام کسی نہ کسی صورت پیدا کر ہی لیتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی سودائے جنوں۔ واہ بھٹی صاحب! کیا کہنے۔ بہت عمدہ تحریر ہے۔ بہت ہی گہرے مشاہدے کا نچوڑ ہے۔ یہودیوں نے فلسطین میں جس طرح خون کی ہولی کھیلی ہے مجبور و بے بس نہتے مسلمانوں پر جبر کے پہاڑ توڑے ہیں، مسلمانوں کے سچے جذبے ان کو زک پہنچاتے رہے ہیں۔ سلیم فاروقی کی بے ثمر مسافت آخری صفحات پہ اپنا رنگ جما گئی۔ زیست کی راہتیں ہوں یا بے ثمر مسافتیں مگر جب لگن سچی ہو اور ماں جیسی ہستی کی دعائیں شاملِ حال ہوں تو بے ثمر مسافتیں بھی منزل مقصود پہ پہنچا دیتی ہیں۔ عشقِ ناتمام کا دوسرا حصہ بہت اچھا لگا۔ رشتوں کے گرداب میں الجھا ہوا انسان اپنے راستے کا تعین مشکل سے کر پاتا ہے۔ ہارون کی بے بسی اور منیزہ کی بے حسی اپنی اپنی جگہ۔ فی زمانہ یہی کچھ ہو رہا ہے۔ ماروی محبتوں کی رنگینیوں اور حالات کی سنگینیوں میں کھوئے عاشقوں کی عمدہ داستان ہے۔ جگنی بائی اور اس کی بیٹیاں، عبداللہ کیڈی اسٹوری میں خوشگوار اضافہ ہیں...... پہلے آیئے منظر امام صاحب نے ہلکے پھلکے انداز میں تحریر کی مگر واقعی ہماری زندگی میں کچھ رشتے یا چیزیں دعاؤں کی مرہونِ منت ہوتی ہیں۔"

✠ **ندیم عباس ڈھکو، ساہیوال سے شریکِ محفل ہیں** "سسپنس جنوری 2015ء کے شمارے کا مطالعہ کیا۔ جتنی بھی تعریف کروں، وہ کم ہے۔ اس میں طاہر جاوید مغل کے قلم سے لکھی ہوئی تحریر بے حد پسند آئی۔ میری طرف سے آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔ اس کے علاوہ اس شمارے میں عفریت، چھان بین، ماروی، راہِ عشق، بے ثمر مسافت بے حد پسند آئی۔ میری طرف سے آپ سب کو دل کی گہرائی سے مبارک ہو۔ محفل شعر و سخن بہت اچھی ہے اگر ان کے صفحات میں اضافہ کر دیا جائے تو کیا ہی بات ہے۔ امید کرتا ہوں کہ مجھے اس محفل میں خوش آمدید کہا جائے۔ (خوش آمدید جناب) میں کوشش کروں گا کہ اپنے سب دوستوں کو اس طرف متوجہ کروں اور اگر حوصلہ افزائی ہوئی تو انشاء اللہ جب تک سانسوں نے ساتھ دیا، اس محفل میں حاضر ہوتا رہوں گا۔" (بہت شکریہ)

✠ **احمد خان توحیدی، پاکستان اسٹیل کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں** "اللہ تعالیٰ نیا سال پوری دنیا کے لیے مبارک کرے۔ پاک وطن ترقی پر گامزن ہو (آمین ثم آمین) انشائیہ جون ایلیا بے دولتی، جس قوم کے لیڈران ہنرمند کا بھرا ہوا کشکول اپنی جھولی میں بھر لیں۔ ہنرمند کی بے دولتی بے وقعتی نہ ہوگی تو کیا ہوگی" ماہ دسمبر کی نحوست، سقوط ڈھاکہ کے روپ میں ہی کیا کم تھی۔ جو شقی القلب درندوں نے معصوم کلیوں کو مسل ڈالا۔ ہائے کون دیکھے یہ بے بسی دل کی۔ جگر خراش سانحہ کے بعد کرتا دھرتا لیڈران کو ہوش میں رہ کر مل بیٹھ کر سدباب کرنا چاہیے۔ محفل میں آمد تفسیر عباس تخت پر جلوہ افروز مبارکاں جی۔ سسٹر زویا اعجاز، ہر شاہ فرصت ہو تو چند دنوں میں کیا 24 گھنٹوں میں بھی تھک جاتا ہے۔ سسٹر طاہرہ گلزار، پشاور آپ بھول جانے والی ہستی نہ ہیں۔ سسٹر سعدیہ بخاری، اٹک، پیٹرول و دیگر اشیا حکومت کتنی کم قیمت کر دے ان کا راستہ آسمان کی طرف ہی جاتا ہے . . یہ عوام کا نصیب ہے۔ میم کے دائرے میں ماروی کو چبا ڈالا۔ نواب صاحب نے مراد کو ایمان علی اور عبداللہ کیڈی کو مراد بوتا بنا دیا۔ مراد اور ماروی کی شادی کرا کر ازدواجی زندگی سے لطف اندوز کرا کر خاندان کی نسل بڑھائیں۔ پھر بے ثمر مسافت میں سلیم فاروقی کے ساتھ چل دیے۔ صفدر کی بے راہ روی،

رشا کی المناک موت کا قلبی دکھ ہے۔ ثمرہ اور صفدر کی محبت شادی کے روپ میں اچھا انجام ہے۔ بیگ صاحب کی کہنہ مشق اور ملک صفدر حیات صاحب قاتل تک پہنچ جانے والی کہانیاں پڑھتے بوڑھے ہونے کے ساتھ بور ہونے لگے۔ سو فیصد حق پر ہونے کے باوجود آج کل کی طرح مک مکا والی ناکام کہانیاں بھی لائیں۔ رائمہ، کراچی، قیصر اعوان، سعدیہ بخاری، تفسیر عباس، مہرین ناز اچھے اشعار۔ عشق ناتمام، لاجواب تاریخی تحریر پر الیاس سیتاپوری صاحب کا شکریہ۔ سودائے جنوں پہلے سے زیادہ دلچسپ۔ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ امام ابوالعباس، ایمان تازہ کرنے والی تحریر۔ بلگرامی صاحب کا شکریہ۔ شگفتہ، لائق گزارہ، جدا انتقام، شادی کے بعد لڑکیوں کو سب بھول کر اپنے خاوند کے عشق میں ڈوب جانا چاہیے۔ پیاز چھڑنے والے نزلے کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مجموعی طور پر نئے سال کا پہلا شمارہ اچھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نئے سال میں سب کو اپنی رحمتوں نعمتوں سے مالا مال کرنے کے ساتھ پرسکون امن و امان پاک سرزمین کو ترقی پر گامزن فرمائے۔ آمین ثم آمین“

✠ **محبوب مصور سومرو**، گوٹھ کوٹھری سے محفل میں شریک ہیں: ”دعا ہے دل سے کہ آپ اور آپ کی پوری ٹیم سدا سلامت رہے آمین۔ عرض اور غرض یہ ہے کہ میں ایک چھوٹا سا شاعر ہوں۔ اچانک آپ کا یہ سسپنس ڈائجسٹ ملا۔ آپ کا یہ ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ میرے پڑوسی مولانا اعجاز احمد سومرو صاحب کی چھوٹی سی لائبریری میں پڑھنے کی توفیق ہوئی۔ دسمبر 2014ء والا۔ جون ایلیا کی ”سلامتی کی راہ“ مشعر وسخن تو میرے پسندیدہ سلسلے ہیں۔ یہ ڈائجسٹ تو یقین کریں میرے دل کی باتوں کی طرح ملا ہے۔ ہر ایک صفحہ سبق آمیز ہے۔ دل لبھانے والا ٹائٹل تو دلفریب ہے۔ باقی رسالہ بھی بہت معیاری اور خوب صورت ہے۔“

✠ **نادر سیال**، میانوالی سے شرکت کر رہے ہیں: ”جنوری 2015ء کا شمارہ نئے سال کی طرح بہت خوب صورت امن سلامتی اور تمام اہالیانِ وطن کو بے شمار دعاؤں کے ساتھ۔ مجھ سمیت تمام قارئین جو محفل میں آئے اور جو نہیں آئے ان کو اور جو ہمیں پیارا سسپنس اتنے اچھے لفظوں کے ساتھ سلیقے کے ساتھ چھاپ کر ہم تک پہنچاتے ہیں ان کو امن اور خوشی کا پیغام دیتا ہوا سب کے آنگن میں ہنستا مسکراتا خوشیاں بکھیرتا داخل ہوا اور میرے آنگن میں 18 تاریخ کو پہنچا۔ ٹائٹل گرل نئے سال کی طرح خوب صورت سی پھولوں کو خوبصورت بالوں میں باندھی ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھ کر کہنے لگی نیا سال مبارک ہو۔ رخصت سال 2014ء ہمیں اور پوری قوم کو ایک ایسا زخم دے گیا جو ساری زندگی ہمیں یاد رہے گا۔ جو نہ ختم ہونے والا درد دے گیا۔ پشاور میں ہمارے پھول جیسے بچے جو درندوں کا شکار بنے۔ جب ان کے بارے میں سوچیں تو بدن پہ لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ میری دعا ہے اللہ پاک ان شہید بچوں کے والدین کو صبر جمیل دے۔ میری دعا ہے نیا سال 2015ء کا تمام اہالیانِ وطن کے لیے خوشیاں لے کر آئے۔ سسپنس سے اتنے ماہ غیر حاضر رہا۔ غیر حاضری کی وجہ میری ماں تھی میری پیاری ماں جو مجھے اس بھری دنیا میں اکیلا چھوڑ کر اللہ میاں کے ہاں چلی گئی۔ میری ماں کے لیے بھی دعا کرنا۔ (اللہ آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ہم سب آپ کے غم میں شریک ہیں) تفسیر عباس کو کرسی صدارت پر براجمان بیٹھا پایا مبارکاں۔ قدرت اللہ نیازی آپ کا تبصرہ میں شوق سے پڑھتا ہوں۔ کنول شاہین آپ صرف اپنے کزن کو بتانے آئی تھیں اکبر شاہ ہم آپ کا جملہ تو سمجھ گئے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ سسپنس صرف آپ کا نہیں ہم سب کا ہے۔ احسان سحر اس بار آپ دھیمی رفتار سے تھے کیوں کیا ہوا۔ مہرین ناز عبدالجبار رومی ان سب کے تبصرے اچھے تھے۔ باقی اس بار نئے نام کافی پڑھنے کو ملے اچھی بات ہے۔ الیلی کراچی آپ کہاں گم ہو۔ ناراضگی چھوڑو اور محفل میں انٹری دو۔ سب سے پہلے محی الدین نواب صاحب کی ماروی انداز اور ایکشن کے ساتھ بھرپور آگے جا رہی ہے۔ مراد ایمان علی بن گیا اور عبداللہ کبڈی مراد۔ اگلی تحریر کا بڑی بے تابی سے انتظار ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی سودائے جنوں پڑھی، دوسری قسط بھی ایمان تازہ کر دینے والی تھی۔ بے ثمر مسافت سلیم فاروقی کی بڑی محبت بھی کیا عجیب چیز ہوتی ہے۔ آدمی کو اندھا کر دیتی ہے اپنا نفع نقصان سوچے سمجھے بغیر بہت کچھ ہو جاتا ہے۔ بے چاری رشا کو کس گناہ کی سزا ملی ہے۔ عشق ناتمام الیاس سیتاپوری کی تحریر پڑھی، بہت اچھی لگی۔ منیزہ کو تو دونوں طرف سے سکون نہیں ہے۔ قارئین میں سے ایک مہربان نے مجھے جیل میں خط کے ذریعے وظیفہ بھیجا۔ میں اس کا دل سے شکر گزار ہوں۔“

✠ **وسیم احمد خان**، خانیوال سے تشریف لا رہے ہیں: ”لیجیے ما بدولت کو سسپنس کا مستقل قاری بنے ایک سال ہو چکا ہے۔ اب ہم اپنی پہلی سالگرہ قاری سسپنس نئے سال کی خوشی اور جشن آمد رسول ﷺ اکٹھا منا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نیا سال ہم سب مسلمانوں کے لیے بہت پرامن بنائے۔ 2014ء تو جاتے جاتے بھی سانحہ پشاور کی صورت معصوم بچوں کی شہادت کا دکھ دے گیا، یہ غم ہی اتنا شدید ہے کہ ہم اس کا لفظوں میں مداوا نہیں کر سکتے۔ اس سال 9 خطوط میں سے صرف اور صرف 2 خطوط ہی سسپنس کی محفل کی زینت بن سکے باقی مہینے ہم 2 ماہ تک سیر و تفریح اور بھانجی کی شادی کی وجہ سے کوئی تبصرہ نہ کر سکے۔ دسمبر کا سسپنس بھی کراچی سے خانیوال واپسی پر ٹرین میں خرید کر پڑھنا شروع کیا۔ جنوری کے شمارے کے ٹائٹل پر ایک خوب صورت سی حسینہ خوب صورت انداز لیے جلوہ افروز تھی۔ ٹائٹل ہر لحاظ سے بہترین تھا۔ سب سے پہلے منظر امام کی پہلے آپ، پڑھی۔ پھر اس کے بعد طاہر جاوید مغل کی جدا انتقام پڑھی جوان دیگر تحریروں کی طرح ایک خوب صورت تحریر ہے۔ آخری صفحات پر سلیم فاروقی صاحب کی بے ثمر مسافت پڑھی جس میں غلط صحبت کے اثر پر روشنی ڈالی گئی جو کہ آج کل کے نوجوانان کے لیے مشعل راہ ہے۔ باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں کہ ان کو پڑھ کر اور ان کے تبصرے کی وجہ سے ہم اپنی محفل میں غیر حاضر نہ ہو جائیں۔ محفل شعر و سخن قدرت اللہ نیازی خانیوال، جبران احمد، کراچی، تفسیر عباس اوکاڑہ کے شعروں سے جگمگا رہی تھی۔ باقی سب کے شعروں اور کترنوں نے بھی سسپنس کی خوب صورتی کو چودھویں کا چاند لگا رکھا تھا۔“

✱ زرمین نیازی، کوئٹہ سے پہلی مرتبہ محفل میں شرکت کر رہی ہیں ’’سسپنس پر لگا ’نیا سال مبارک‘ کا Tag بہت زبردست تھا۔ بزم یاراں میں تفسیر عباس بابر اپنے بھرپور اور گراں قدر تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت پر جلوہ افروز تھے۔ بہترین تبصرے پر مبارکباد... شاداب انجم، ماہ تاب، یوسف سانول اور سید محی الدین اشفاق کے تبصرے پیارے تھے۔ طالب حسین طلحہٰ اللہ آپ کو جلد از جلد رہائی عطا فرمائے اور نیا سال آپ کو راس آئے۔ اکبر شاہ کا مختصر سا تبصرہ بھی پسند آیا اکبر شاہ آپ اتنے چھوٹے سے ہو کے اتنی پیاری باتیں کیسے کر لیتے ہو؟ طاہرہ گلزار اور عادل خان کے تبصرے کافی عرصے بعد نظر آئے۔ زیب حسن بھائی میں بھی آپ کی طرح طاہر جاوید کا دیوانہ ہوں۔ پتا نہیں کب آخری صفحات پر طاہر صاحب کی طویل کہانی دیں گے؟ عبدالجبار رومی اک عجیب انداز پڑھنے کو ملا۔ تبصرہ پہلے کر کے بعد میں بتاتے کہ یہ کہانی ہے۔ رانا حبیب الرحمن صاحب اس دفعہ خوش ہو لو ایک چوڑی بھی نہیں تھی، دوشیزہ جی کے ہاتھ میں... عبدالغفور خان اللہ جو بھی فیصلہ کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ آپ کی آئندہ زندگی میں کوئی مشکل نہ آئے اور ہاں آپ کے مشورے کا بہت بہت شکریہ۔ اتنی زبردست قسط وار کہانی سسپنس میں دینے کا شکریہ۔ سب سے پہلے سودائے جنوں پڑھی۔ کیا زبردست قسط تھی۔ لیلیٰ اور باقر کی جوڑی نے اپنے مجاہدین کے ساتھ مل کر یہودیوں کو ناکوں چنے چبوا دیے۔ اسی طرح زبیدہ اور محسن نے بھی اپنی جانوں کی پروا نہ کی اور اپنے کئی ساتھیوں کو خدا کی راہ میں پیش کیا۔ بازغہ اور عابد کئی دفعہ دشمنوں کے نرغے میں آئے اور نکل گئے۔ دیکھو کیا ہوتا عابد تو نکل گیا اور نائمہ کو بھی عبدالرب صاحب بخیر و عافیت نکال ہی دیں۔ اس کے بعد ماروی پڑھی۔ شکر ہے کچھ تبدیلی پڑھنے کو ملی۔ مراد نے اپنی شکل بدلی اور ایمان علی بن گیا۔ ہائے بے چارہ ایمان علی بن کے مزید پھنس گیا۔ سچ ہے اللہ کے کاموں میں مداخلت مہنگی ہی پڑتی ہے۔ عبداللہ کبڈی مراد بن کے دشمنوں کو ابھار رہا ہے لیکن مرینہ سے کم از کم مجھے تو یہی امید تھی کہ وہ اتنی بے وقوف نہیں کہ بونے کو مراد مان لے اور ہوا بھی وہی...... محبوب علی کی انٹری اس دفعہ نہ ہوئی۔ بہرحال قسط میں اس دفعہ کچھ انٹرسٹنگ ٹوئسٹ آئے ہیں۔ سلیم فاروقی کی بے ثمر مسافت پڑھی۔ صفدر کی مسافت بے ثمر تو نہ رہی اسے ثمر مل تو گئی تھی۔ تحریر بہت اچھوتی تھی کہیں بھی کوئی جھول دیکھنے میں نہیں آیا۔ صفدر بے چارہ ساری عمر کا پچھتاوا اپنی جان کو لگا بیٹھا۔ بے چاری رمشا بلاوجہ جان سے گئی۔ سچ ہے محبت انسان کی شناخت بنتی ہے غلط محبت کا برا انجام۔ کاشف زبیر اس دفعہ ایک خونی بلا کا احوال لے کے آئے۔ بے چارہ جیف انتقام لینے کی خواہش میں خود بھی عفریت نما بن کے جل مرگیا۔ منظر امام کی پہلے آیئے والی کہانی...... کہانی کم اور تخول زیادہ لگی۔ ڈاکٹر شیر شاہ کی ہر تحریر معاشرتی المیے سے پر ہوتی ہے۔ یہ بھی معاشرتی ناہمواریوں اور بے ایمانیوں اور ناانصافیوں پر مشتمل تھی۔ محفل شعر و سخن میں سب کے اشعار بہت پسند آئے خصوصاً عبدالغفور خان کا۔ ان دنوں پورا ملک سانحہ پشاور کی وجہ سے سوگوار ہے۔ آج تیسرا دن ہو گیا ہے سولہ دسمبر کو گزرے لیکن آہ و بکا ابھی تک اسی طرح ہے کون ہیں یہ لوگ؟ جن کو بچوں پر بھی ترس نہیں آتا۔ ان خبیثوں کو ذرا رحم نہیں آتا کہ کیسے کیسے ماؤں کے کلیجوں کو انہوں نے آن کی آن لہو میں ڈبو دیا۔ اے اللہ! ہمارے ملک کو اس دہشت گردی کی لعنت سے محفوظ فرما۔ اے اللہ ہمارے لیے یہ نیا سال خوشیوں بھرا بنا دے اور ہماری قوم کی صفوں میں اتحاد و یکجہتی پیدا فرما۔‘‘ (آمین)

✱ مہرین ناز: حیدرآباد سے چلی آرہی ہیں ’’جنوری 2015 کا پہلا دلفریب شمارہ ہمارے زیر نظر ہے۔ نیا سال، نئی سوچ، نئے ولولے مگر... حالات میں کوئی نیا پن نہیں۔ اللہ کرے یہ نیا سال ہماری زندگی اور ملکی حالات و واقعات میں بھی خوشگوار تبدیلی لائے۔ (آمین) ٹائٹل کافی یونیک اور نئے سال کی مناسبت سے تھا۔ فہرست خوب صورت اور آسان لگی۔ انشائیہ پڑھ کر نظریں جھک گئیں، کاش ہمارے حکمرانوں کو بھی یہ آئینہ دکھایا جائے۔ محفل میں تفسیر عباس بابر، بھرپور تبصرے کے ساتھ کرسی پر براجمان تھے۔ اعجاز احمد راحیل آپ اپنے تبصروں میں وہی شاعرانہ انداز لائیں... پلیز۔ طالب حسین طلحہ، عبدالجبار رومی اور عادل خان آپ اچھا تبصرہ کر لیتے ہیں۔ مشق جاری رکھیے۔ زویا اعجاز، سعدیہ بخاری، گل مروت، کنول اور طاہرہ خوب صورت اور جاندار تبصروں کے ساتھ محفل کی رونق بڑھا رہی تھیں۔ ہارون برنی اور رانا حبیب آپ اچھا لکھ لیتے ہیں۔ الیاس سیتاپوری ابتدائی صفحات پر تاریخ کے دلکش لمحات کے ساتھ حاضر ہوئے۔ ویسے تو اس جہاں میں کچھ مکمل نہیں ہے لیکن عشق کی بھی واقعی کوئی حد نہیں۔ عامر کی نے بھائی ابراہیم کے لیے اپنی جان کی قربانی قابل ستائش ہے۔ سلیم فاروقی کے قلم کا نایاب تحفہ بے ثمر مسافت خوب رہی۔ زندگی کی راہتیں ہوں یا بے ثمر مسافتیں بہرحال دلی سکون بھی کسی ایک لمحہ میسر آتا ہے۔ صفدر کی طویل مسافت کو ثمر مل ہی گیا۔ کرے کون بھرے کون، بیچاری رمشا اپنی جان سے گئی۔ سلیم فاروقی صاحب نے لاہور کے خاص ماحول کو بہترین انداز میں اجاگر کیا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی شاہکار سلسلہ وار تحریر امت مسلمہ کے خلاف ہونے والی سازشیں و تباہ کاریاں واقعی عبرت اثر داستان ہے۔ متعصب ڈی کارلو جیسے بدخصلت یہودی مسلمانوں کی ترقی و خوشحالی میں رکاوٹ بنتے رہتے ہیں اور مسلمانوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ عابد شیکھری اور نائمہ بہترین کارنامے انجام دیتے نظر آئے۔ محی الدین نواب کے قلم کا شاہکار ماروی کا اگلا پڑاؤ بہترین رہا۔ محبت کی گہرائیوں کا اظہار اور رنگین لمحات کی سنگینیاں، ماروی نے واقعی ہمارے دلوں میں جگہ بنائی ہے۔ حسام بٹ کہنہ مشق میں مرزا امجد بیگ کی ڈائری سے ایک بہترین کیس لائے۔ مرزا امجد بیگ کے دعواں دار دلائل اور قانونی پیچیدگیاں ہمیشہ اپنی ذہانت سے سلجھا دیتے ہیں۔ ایسے وکیل نایاب ہیں۔ ناقابل معافی، ڈاکٹر شیر شاہ سید کی حقیقت پر مبنی تحریر ہے۔ ماضی کی تلخ یادوں کو دہراتے نظر آئے۔ پاکستانی بدعنوانی کی حقیقت سامنے آئی۔ نکولس جیسا کرپٹ بندہ مسز تیگ کیس بن سکتا مگر یہاں پاکستان میں، اللہ کی پناہ!! راہ عشق، سید احتشام، کسی کو چاہنا اور چاہے جانا اگرچہ کوئی مشکل کام نہیں بلکہ یہ تو فطری تقاضا ہے لیکن احسن طریقے چاہتوں کا ثبوت دینا کسی کسی کا کام ہوتا ہے۔ منظر امام ہمیشہ ہمارے لیے خوشیاں سمیٹ کر آتے ہیں۔ بوجھل اور اداس شاموں میں ان کی تحریر اکسیر کا کام کرتی ہے۔ پہلے آیئے، واقعی پہلے پایئے والی بات ہے۔

عفریت، کاشف زبیر کی عمدہ تحریر، ماں تو ماں ہوتی ہے دوسروں کے لیے عفریت ماں کے لیے پیارا بیٹا۔ محفل شعر و سخن سدا کی طرح دلکش وحسین انتخاب کا گلدستہ مرے لیے بھی دلچسپ تھے۔ جنوری 2015ء کا شمارہ ہمارا پیار سمیٹنے میں کامیاب رہا۔" (بہت شکریہ)

✠ رانا حبیب الرحمٰن، خوش بخت الرحمٰن، سینٹرل جیل لاہور سے شریک ہوئے ہیں" جنوری 2015ء کا شمارہ جس پر نیا سال مبارک خوبصورت انداز میں جگمگا رہا تھا۔ جو بہت خوب صورت لگا۔ ہمارے پیارے ملک میں جہاں جھوٹے دعوؤں اور نئی نئی چالوں کو سیاست کا نام دیا گیا ہے۔ اس وقت ہر طرف فضا سوگوار ہے۔ شمارہ ہاتھ میں آنے کے چند دن پہلے سانحہ پشاور آرمی پبلک اسکول میں بچے اور ٹیچر شہید ہوئے ان کا غم ہمارے لیے بھی ہے کہ ان کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ جیلوں میں فضا سوگوار ہے کہ پھانسی پر عملدرآمد شروع ہو گیا ہے اور فیصل آباد جیل میں 6 آدمی پھانسی پر چڑھا دیے گئے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ اس ملک میں انصاف نہیں ملتا۔ سوگوار حالت میں صرف ناز پری کے تبصرے اور شعر پسند آئے۔ خوشی اسی بات کی تھی کہ سعدیہ بخاری اور کئی دوسرے لوگ بھی شامل تھے۔ شمارہ مجموعی طور پر ٹھیک تھا۔" (کہانیوں پر تبصرا کیوں غائب کر دیا؟)

✠ طاہرہ گلزار، پشاور سے تبصرہ کر رہی ہیں" مجموعی طور پہ اس سال سسپنس پڑھ کے دل سے معراج انکل اور ادارے والوں کے لیے دعائیں نکلیں لیکن سانحہ پشاور سے ہر دل پر قیامت گزر گئی۔ دشمن یہ نہیں جانتے کہ مسلمان موت سے نہیں ڈرتے۔ اللہ ہم مسلمانوں پر اور پاکستان پر اپنی رحمت کی بارش کر دے (آمین) فہرست میں اپنے پسند کے رائٹر کاشف زبیر، طاہر جاوید مغل، عبدالرب بھٹی، منظر امام اور ڈاکٹر شیر شاہ سید کے نام پڑھ کے دل کے دکھ پہ تھوڑا مرہم پڑ گیا۔ انشائیہ میں جون ایلیا کی تحریر بے دولتی پڑھی۔ ہم حساس دل رکھنے والوں کو تڑپا گیا۔ پہلے نمبر پہ لفظوں کے کھلاڑی تفسیر عباس بابر آئے۔ بھائی مبارکاں۔ بڑا دلچسپ اور طویل خط تھا۔ ماہ تاب گل اور سید محی الدین کا مختصر خط بھی اچھا لگا۔ ابرار وارث بھائی یہ سال ہمیں واہگہ کے 60 شہیدوں کے ساتھ 16 دسمبر کو معصوم بچے جو شہید کر دیے گئے یہ داغ دے کے گزر گیا۔ اللہ تعالیٰ آگے ہم پر رحم کرے۔ قدرت اللہ بھائی سرورق کی تعریف کر کے بھابھی سے مار کھانی ہے ہاہاہا۔ احسان سحر بھی 9 لکیروں کے ساتھ حاضر تھے۔ زیب حسن اچھرہ کیا آپ کو سالنامہ نہ کہا جائے ہاہاہا...... سعدیہ بخاری بھی آخر حاضر ہو گئی اپنے بھرپور تبصرے کے ساتھ...... عبدالجبار رومی کا تبصرہ بھی کافی شاندار تھا۔ عبدالغفور خان ساغری اللہ آپ کے اوپر رحم کرے۔ بھائی یہ وقت 2004ء میں مجھ پہ بھی گزر رہا ہے۔ غیر حاضر دوست بابر عباس، آغا فرید احمد خان آف سکھر، بشیر علی خان، ہمایوں سعید اور ماہا ایمان پلیز انٹری دیں۔ سب سے پہلے طاہر جاوید مغل کو بیٹے کی شادی مبارک ہو جو 27 دسمبر کو ہو چکی ہے۔ محبت کے سفیر مغل اعظم کی یہ تحریر محبت بھی شاندار محبت کرنے والوں کی سزا پیاز اور الرجی جوان کا نصیب ہے بہت کچھ سمجھا گیا۔ شکر ہے کہ اللہ نے پیاز پیدا کی ہے...... دوسرے نمبر پر کاشف صاحب کی شاہکار تحریر عفریت پڑھی۔ ویلڈن کاشف زبیر زور قلم اور تیز ہو۔ عبدالرب بھٹی کی تحریر سودائے جنوں۔ بھٹی صاحب کی یہ تحریر اس وقت کے حساب سے سونے پہ سہاگا ہے کیونکہ نئی نسل جو اسلامی باتوں سے دور جا رہی ہے دیکھ کے دل خوش ہوا کہ ایسے موضوع آگے بڑھنا چاہئیں ہمیں بھی لیلیٰ، زبیدہ، عامر، محسن، نائمہ اور عابد سنگھری جیسی نوجوان نسل چاہیے۔ تاریخی کہانی ناتمام عشق الیاس سیتاپوری کی یہ قسط بھی بہت دلچسپ اور یادگار رہی۔ امجد بیگ صاحب کا ایک اور کامیاب کیس اصلی ملزم فرید غوری پکڑا گیا۔ نرگس نے ان کے ساتھ مل کر شوہر کو قتل کیا اور الزام اپنی بے گناہ ملازمہ وحیدہ پہ ڈال دیا لیکن بیگ صاحب تو پھر منجھے ہوئے کھلاڑی ہیں...... منظر امام صاحب کی تحریر پہلے آپ یہ مزاحیہ انداز میں ایک سبق آموز بات سمجھا گئی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی تحریر ناقابل معافی واقعی ناقابل معافی ہی نکلا لیکن ہمارے ملک میں نہیں...... آخری صفحات پر سلیم فاروقی کی تحریر بے ثمر مسافت نے دل دکھی کر دیا۔ صفدر کی خود غرضی نے رمشا کی جان لی اور دولت کی ہوس نے ثمرہ کی زندگی تباہ کر دی۔ زبردست تحریر یاد رکھنے والی۔ آخر میں نیا سال مبارک ہو سب کو۔"

✠ اسماء عبدالغفار انصاری، لاہور سے محفل میں شریک ہیں" جنوری کا پیارا سا شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ خوب صورت لڑکی بالوں میں خوب صورت پھول سجائے مسکراہٹ سے دیکھ رہی ہے۔ جون ایلیا کی خوب صورت باتیں اقوال زریں کی طرح دل میں گھر کر جاتی ہیں۔ باقی سب بہن بھائیوں کے خطوط پڑھے بہت اچھے لگے۔ میں پہلی دفعہ خط لکھ رہی ہوں۔ امید ہے مجھے بھی اس محفل میں خوش آمدید کہا جائے گا (خوش آمدید جناب) عشق ناتمام، راہ عشق، ماروی اور چھان بین بہت اچھی کہانیاں ہیں۔ کہانیوں کا ہر کردار ہی لاجواب ہوتا ہے۔ جیسے عشق ناتمام میں منیزہ کو اولاد سے محروم رکھنے کی بات ہوتی ہے حالانکہ وہ عامر سے بھی بہت محبت کرتی ہے اور پھر وہی عامر اپنی قربانی دے کر اپنے سوتیلے بھائی اور منیزہ کے بیٹے ابراہیم کے لیے امر ہو جاتا ہے۔ یہ تاریخی کہانی بہت پسند آئی مجھے۔"

✠ سیدہ مینا نقوی، بھکر سے تشریف لاتی ہیں" سسپنس سے رشتہ بہت پرانا اور مضبوط ہے محفل میں شرکت کی یہ پہلی کوشش ہے۔ اس امید پر کہ شرف باریابی بخشا جائے گا (خوش آمدید) گھر میں ڈائجسٹ پڑھنے کی اجازت نہ ہونے کے سبب چھپ کر پڑھنا پڑتا ہے اور محفل میں شرکت کے لیے یہ خط بھی بہت ڈر ڈر کر اور چھپ کر لکھنا پڑ رہا ہے۔ سسپنس کی آمد سے قبل ہی پشاور میں ایک اسکول پر حملے اور بچوں کی شہادت کی اندوہناک خبر سنی تو دل لرز اٹھا۔ اللہ پاکستان کو دشمنوں سے محفوظ و مامون رکھے۔ 16 دسمبر سانحہ سقوط ڈھاکا کے دن دشمن ہمیں ایک اور زک پہنچانے میں کامیاب رہا۔ قصور کس کا ہے ابھی تک کوئی پتا نہیں۔ اس سانحے کے بعد سیاسی جماعتوں کا اتحاد خوش آئند ہے۔ شاید یہ سانحہ ہمارے اتحاد کا سبب بن جائے۔ سسپنس اور جاسوسی شروع سے ہی میرے پسندیدہ شمارے رہے ہیں۔ سلنٹ وار اور دیگر کہانیاں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ اس بار صرف رجسٹریشن کروا رہی ہوں، باقی تبصرہ ان شاء اللہ آئندہ ماہ لکھوں گی۔"

✠ **عبدالجبار رومی انصاری،** لاہور سے بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں ”خوب صورت چمکتا دمکتا ٹائٹل گولڈن کلر میں منفرد انداز سے نئے سال کی مبارک باد پیش کر رہا تھا اور اس کے جلو میں پیاری سی مسکراہٹ کے ساتھ دلکش آنکھوں سے جھانکتی نفیس گیسو میں پھول سجائے خوب صورت دوشیزہ نئے سال کی آمد کا اظہار کر رہی تھی۔ یوں جنوری کا ٹائٹل ڈاکرانکل کی کاوشوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ پشاور میں 16 دسمبر کو ایک اسکول میں قیامتِ صغریٰ گزر گئی۔ سفاک دہشت گردوں نے معصوم بچوں کی جان لے لی۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ معصوم بچوں کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے اور ان کے والدین کو صبرِ جمیل دے۔ اے اللہ ہم سب کو اس کڑی آزمائش میں سرخرو فرما (آمین) جون ایلیا نے ٹھیک فرمایا اور ہم کب تک۔ اپنی ہنرمند قوم کی بدولت اپنے پاؤں پہ کھڑے ہوں گے ہمارے حکمرانوں نے تو قوم کو گداگر بنا دیا۔ محفل میں مدیرِ اعلیٰ کی باتیں بھی آج کی عکاسی کی واضح جھلک تھی۔ کرسی صدارت تفسیر عباس بابر نے حصے میں آئی جو ملکی حالات پر نظر رکھے حکمرانوں کی نااہلی پر بات کر رہے تھے بہت زبردست تبصرہ کیا ہے۔ محمد یوسف سانول آپ کی باتیں بھی اچھی لگیں اور ملک صاحب شخصیت کے لحاظ سے بھی گھوڑے تانگے پہ اس وقت اچھے لگے تھے۔ سید محی الدین اشفاق اپنے مختصر تبصرے میں نام کے ساتھ خوب صورت لگ رہے تھے۔ ابرار وارث دیکھو لو بھئی نیا سال کا شمارہ منفرد انداز میں ہی آیا ہے نا۔ طالب حسین طلحہ اللہ تعالیٰ آپ کو جلدی اس قیدِ تنہائی سے نجات دے۔ زویا اعجاز آپ کا انداز بھی متاثر کن ہوتا ہے۔ قدرت اللہ نیازی نے بھی مصروفیت سے ٹائم نکال کے اچھا تاثر دیا ہے۔ اعجاز راحیل وقت کا کہاں پتا چلتا ہے۔ یونہی باتوں باتوں میں ہی بیت جاتا ہے۔ قاسم رحمان ویسے تو آپ کی عمر بھی اسٹڈی کی ہے گھر والوں سے چھپ چھپا کے مگر تبصرہ مکمل کے کرتے ہو۔ ارے طاہر گلزار آپ کی سسپنس سے اپنائیت قابلِ دید ہے۔ زیب حسن اتنا اچھا لکھتے ہو تو ہر ماہ شمارے کی زینت بن جایا کرو ڈیئر۔ سعدیہ بخاری کی حاضری بھی خوب ہے۔ محفل شعر و سخن میں امتیاز علی، سعدیہ بخاری اور مہرین ناز کے شعر اچھے تھے۔ تاریخی پس منظر کی کہانی عشق ناتمام نے زبردست موڑ لیا۔ ایک طرف منیزہ کی اولاد کی خواہش پوری ہوئی تو دوسری طرف آخر میں قتل کی سزا کے لیے عامر نے ابراہیم کی جگہ لے لی۔ ایک عظیم بھائی کے عظیم الشان ایثار پر دل اش اش کر اٹھا۔ کاشف زبیر کی لکھی خوفناک کہانی عفریت نے تو خون خشک کر دیا، زبردست کہانی تھی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی سودائے جنوں کا دوسرا حصہ بھی زبردست رہا۔ لڑکیاں پیاز کیوں کاٹتی ہیں، آنسوؤں کی پردہ داری میں کتنے دکھ چھپے ہوتے ہیں۔ ہائے عورت کی مجبوریاں۔ طاہر جاوید مغل نے جدا انتقام کی صورت گمشدہ محبت کی خوب صورت عکاسی کی ہے۔ شاطر سے شاطر شخص کو بھی اس کی عیاری لے ڈوبتی ہے مگر اس کیس میں پولیس کی تفتیش تو زیرو نظر آئی۔ ہاں مرزا امجد بیگ نے کہنہ مشق کیس میں اپنے جنوں کا زبردست استعمال کیا اور وحیدہ کو بے گناہ ثابت کر کے رہائی دلائی۔ معزز صاحبو ....! اب اس گورکھ دھندے کو ختم ہو جانا چاہیے۔ جارج بے گناہ ہے اور اسمتھ بھی بے گناہ ہے، یہی ہمارا فیصلہ ہے۔ واہ زبردست۔ سید احتشام کی راہِ عشق نے بھی آخر راہ نکال ہی لی۔ سلیم انور کی تحریر شکنجہ بس ٹھیک ہی رہی۔ مٹاپے کو کم کرنے کی نفسیاتی ٹپس اچھی تھیں۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ محی الدین نواب کی سحرانگیز کہانی، روپ بھی اپنے خوب جوبن دکھا رہی ہے۔ کہانی کے ہیرو مراد کہیں تو خوبرو دوشیزاؤں کے حسن میں جکڑے نظر آتے ہیں تو کہیں اپنی پارسائی کی دعا مانگتے ہیں۔ یوں اللہ بھی اس پہ کرم کرتا ہے۔ ہائے ہائے منظر امام نے پہلے آئینے میں مختصر تحریر دے کر بھی مسکراہٹ بکھیر دی۔ پہلے آؤ پہلے پاؤ کا اصول اچھے طریقے سے سمجھا دیا۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی راہِ حق کی مناجتوں اور کرامتوں کے ولی امام ابوالعباس کی خوب صورت باتوں نے ایمان تازہ کر دیا۔ ہر شمارے میں اسلامی کہانی زندگی کو نئی راہ دکھاتی ہے۔ مغرب اور ہمارے معاشرے میں یہی تو فرق ہے کہ وہاں کوئی بدعنوان شخص میئر نہیں بن سکتا مگر ہمارے ہاں کرپشن اور ہر طرح کی برائی سے بڑے بڑے مگرمچھ ہوں گے لیکن پھر کامیاب ہو کر لوٹ مار میں ملوث ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید نے ناقابلِ معافی میں بڑے واضح انداز میں اچھے برے کی تمیز دکھائی ہے۔ کاش کوئی اسے سمجھنے والا ہو۔ وہ ابھی تک جیفری کی باتوں کو نہیں سمجھ پائی تھی اور جیفری اپنی پیشہ ورانہ چھان بین مکمل کر کے جا چکا تھا۔ تنویر ریاض نے اچھی کہانی دی مگر اس میں بھی ٹسک چھوڑ دی۔ اب آخری کہانی کی طرف بڑھیں۔ سلیم فاروقی کی بے ثمر مسافت بھی بہت سے سبق دے گئی۔ اس گھر میں کوئی تو ایسا ہے جو صفدر کے لیے جان دے سکتا ہے مگر معصوم رمشا بھی صفدر کی غلط صحبت کی بھینٹ چڑھ گئی۔ چلو آخر صفدر کی یکطرفہ محبت ثمرہ سے تو شادی ہوئی۔ بعض اوقات دولت کے نشے میں انسان اپنے سے کمزور رشتے داروں کو حقیر سمجھتا ہے تو پھر اُس پر وہ بہت کچھ کھونا پڑتا ہے۔“

✠ **توصیف احمد،** کراچی سے محفل کی زینت بنے ہیں ”16 دسمبر 2014 ملکی تاریخ کا سیاہ ترین دن۔ کسی تبصرہ نگار نے خوب کہا ہے کہ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ سانحہ پشاور سقوطِ ڈھاکا سے بھی بڑا سانحہ ہے جو تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ اپنی وحشت کی آپ بیتی بیان کرے گا۔ اسکول کے طلبا کو ہنگامی صورتِ حال میں خود کو بچانے اور ساتھی کو ابتدائی طبی امداد فراہم کرنے کی تربیت دی جا رہی تھی لیکن ان میں سے شاید کسی کو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ ان کے پاس کسی دوسرے کو کیا خود کو بھی بچانے کا وقت نہیں ہوگا۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ پاکستان سمیت پورے عالم اسلام کے ساتھ اپنے رحم اور فضل کا معاملہ فرمائے (آمین) صدرِ محفل جناب تفسیر عباس بابر کا تبصرہ واقعی شاندار تھا۔ مبارک ہو۔ زویا اعجاز T20 موڈ میں تھیں، خوب صورت تبصرے کے ساتھ۔ بس ایک بات سے متفق نہیں کہ ملک صاحب کی کہانیاں تو سسپنس کی جان ہوتی ہیں اور میں بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ اس کے علاوہ اعجاز احمد راحیل، شوکت شہریار، سعدیہ بخاری اور ہارون جیمز کے تبصرے بھی لائقِ تحسین تھے۔ کہانیوں کی ابتدا اس بار خلافِ معمول بیگ صاحب کی کہنہ مشق سے کی۔ بیگ صاحب ملزم یا مجرم کے بجائے منڈے کے انکوائری آفیسر سے زیادہ نبرد آزما نظر آئے لیکن کہانی کو آخر میں کچھ جلدی میں سمیٹا گیا تھا۔ بہرحال نرگس اور فرید غوری اپنے انجام کو پہنچ گئے۔ محبت کے سفیر طاہر جاوید مغل کی جدا انتقام مختصر لیکن

دل کو چھو لینے والی تحریر تھی۔ نادیہ کو پیاز تو نہیں ملی لیکن برسوں پرانے سوال کا جواب ضرور مل گیا۔ اس کے علاوہ پہلی بار ماروی کا مطالعہ کیا جس میں ڈاکٹر ٹمی سن نے پلاسٹک سرجری کے ذریعے مراد کو ایمان علی یا رابن سن اور عبداللہ کبڈی کو مراد میں تبدیل کر دیا جبکہ کترنوں میں صفحہ نمبر 145 پر قاضی عرفان احمد کی شوخی کا جواب نہیں تھا۔'' (بہت شکریہ پسندیدگی کا)

✠ **محمد زریان سلطان**، اردو بازار، کراچی سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں ''جنوری کا شمارہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ ہمیں ملا۔ نیا سال سب کو مبارک ہو... پہلا پرچہ بھی شاندار تھا۔ تفسیر عباس کا تبصرہ پہلے نمبر پر آیا۔ پڑھ کر اچھا لگا۔ باقی سب ساتھیوں کے تبصرے بھی اپنے اپنے انداز میں محفل پر چھائے رہے۔ مجھے شکوہ ہے کہ محفل میں سب کو ہی اہمیت دی جاتی ہے لیکن جہاں اگر کسی کا نام بلیک لسٹ میں آجائے یا ایک دو ماہ شامل نہ ہو سکے تو محفل میں شریک ہونا بند کر دیتے ہیں.... ناراضگی اپنی جگہ مگر اس طرح ناتا توڑنا اچھا نہیں لگتا۔ اس بار انشائیہ بے وقتی جون ایلیا کا ہر بار شاہکار ہوتا ہے۔ سیکھنے اور سمجھنے کے لیے بہت کچھ ہوتا ہے۔ عشق ناتمام تاریخ کے اوراق کا جادو۔ الیاس سیتاپوری کا انداز واقعی بڑا منفرد ہے۔ کاشف زبیر کی عفریت نے بھی کچھ لمحوں کے لیے خوفزدہ کر دیا تھا۔ آپ جس طرح ماحول کی مکمل عکاسی کرتے رہے یہ آپ کا ہی خاصہ ہے۔ سودائے جنوں بہت عرصہ بعد بین الاقوامی حالات پر کافی دلچسپ سلسلہ شروع ہوا ہے۔ صیہونی طاقتیں امت مسلمہ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچانے کے لیے ہر وقت تیار رہتی ہیں۔ بہرحال مصمم ارادے ہمیشہ کوئی نہ کوئی سمت نکال ہی لیتے ہیں اور سفر جاری رہتا ہے۔ ویلڈن عبدالرب بھٹی صاحب۔ جدا انتقام طاہر جاوید مغل کی احساسات پر مشتمل ایک خوب صورت تحریر جو دلوں پر براہ راست اثر انداز ہو گئی۔ کہنہ مشق مرزا امجد بیگ کا اچھوتا انداز۔ وہ وکیل ہی کیا جو دلیل سے نہ ہرا دے۔ راہ عشق سید احتشام بہت عرصے بعد ایک اچھی کاوش لے کر حاضر ہوئے۔ محفل شعر و سخن کا ہر شعر بہت شاندار اور جاندار تھا۔ شگفتہ سلیم انور نے سٹے سے نجات کا اچھا طریقہ بتایا۔ پہلے آیئے میں منظر امام نے کامیابی حاصل کرنے کا اشارہ دیا۔ تصوف میں ضیا تسنیم بلگرامی نے ایک اور ولی کی داستان لکھی، بہت اچھی لگی۔ ناقابل معافی ڈاکٹر شیر شاہ سید نے مغربی معاشرے کے ایک خوب صورت پہلو سے آشنائی کرائی مگر ہمارے یہاں آخری صفحات پہ بے ثمر مسافت نے بھی دل پر اثر کیا۔ انسان جو چاہتا ہے وہ مشکل سے ہی پورا ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر سال کا پہلا پرچہ بہت خوب صورت تھا۔''

✠ **اطہر حسین**، کراچی سے لکھتے ہیں ''اس دفعہ سسپنس کا ٹائٹل دیکھا تو ٹائٹل پر بنی موہنی صورت والی لڑکی دیکھ کر ماضی کے دریچے وا ہو گئے۔ بقول شاعر یاد ماضی عذاب ہے یارب..... خیر جلدی سے نظریں چرائیں اور فہرست کی طرف متوجہ ہو گئے۔ سب سے پہلے طاہر جاوید مغل صاحب کی جدا انتقام پڑھی۔ کیا کہنے مغل صاحب کے۔ الرجی کا جو بیک گراؤنڈ ظاہر کیا، وہ دل کو چھو گیا۔ یہ محبت چیز ہی ایسی ہے جو نہ جانے انسان کو کیسے کیسے رلاتی ہے۔ پڑھ کے دل بے اختیار اداس ہو گیا۔ رسالہ رکھ کر کچھ دیر سوچوں میں گم ہو گئے۔ کافی دیر بعد کچھ سنبھلے تو دوبارہ ورق گردانی شروع کی۔ اس کے بعد ماروی پڑھی۔ مگر اس میں بچکانا پن دیکھ کر مزہ کرکرا ہو گیا۔ کہانی میں غیر حقیقی واقعات کی بھرمار ہے۔ کاشف زبیر کی عفریت نے انگلش مووی کا مزہ دیا۔ عشق ناتمام یوں تو سلو اسٹوری تھی مگر اینڈ میں کہانی یکدم بدل گئی اور عامر کی قربانی وایثار نے بے حد متاثر کیا۔ سودائے جنوں میں یہودیوں کی سازش کا پردہ فاش کیا گیا۔ واقعی یہودی مسلمانان عالم کو جس طرح نقصان پہنچا رہے ہیں، اس کے لیے امت مسلمہ میں بیداری کی ضرورت ہے۔ راہ عشق بس ٹھیک تھی۔ تنویر ریاض کی چھان بین اچھی کہانی تھی۔ بے ثمر مسافت سلیم فاروقی، انتہائی بورنگ کہانی تھی۔ پہلے آیئے، منظر امام کی ہلکی پھلکی تحریر تھی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید ہمیشہ کی طرح اس بار بھی برائیوں سے پردہ اٹھا رہے تھے۔ شگفتہ بہت اچھی کہانی تھی۔ بہرحال مجموعی طور پر رسالہ بہترین کہانیوں سے مزین تھا۔ امید کرتے ہیں ہمارا تبصرہ ردی کی ٹوکری کی نذر نہیں ہوگا۔''

✠ **انجم کمال**، کراچی سے پہلی بار خط لکھ رہی ہیں۔ ''میں اپنی کزن کے گھر گئی تھی۔ وہاں ایسے ہی سسپنس ڈائجسٹ رکھا نظر آیا۔ ویسے تو مجھے ڈائجسٹ پڑھنے کا کوئی شوق نہیں، مگر نہ جانے دل میں کیا آئی کہ بے اختیار اسے اٹھایا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ بس پھر کیا تھا نہ کھانے کا ہوش نہ کسی اور چیز کی پروا۔ پڑھتی چلی گئی۔ بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ خصوصاً طاہر صاحب کی تحریر نے تو آنسوؤں سے رلا دیا۔ بہت بہت اچھا لکھتے ہیں۔ لفظ لفظ دل میں اتر جاتا ہے۔ بہت خوب صورت تحریر تھی۔ پھر میں نے پچھلا شمارہ اٹھایا اور طاہر صاحب کی دو ڈائریاں پڑھیں۔ یقین کریں آدھے گھنٹے تک روتی رہی۔ مجھے ایسا لگا نہ جانے میں کب سے سسپنس ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں۔ خط لکھنے کا تو نہیں کہہ سکتی مگر اب میں سسپنس کی مستقل ریڈر ہو گئی ہوں۔ دیگر کہانیاں بھی پڑھیں مگر طاہر صاحب کی کہانی سب پہ بھاری تھی۔ خیر ایسا نہیں کہ اور رائٹر اچھا نہیں لکھتے۔ عبدالرب بھٹی کی کہانی بھی بہت اچھی لگی۔ تنویر ریاض، کاشف زبیر، منظر امام کی کہانیاں پڑھ کے بھی مزہ آیا۔ آپ سے گزارش ہے کہ طاہر صاحب کا کوئی سلسلہ وار ناول شروع کریں کیونکہ میں نے ڈائجسٹ پڑھنا شروع ہی انہی کی وجہ سے کیا ہے۔ باقی آپ کا رسالہ بہت معیاری ہے۔ اللہ اسے مزید ترقی دے۔'' (آمین)

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

کہکشاں فاروقی، سیالکوٹ۔ منور حسین، سیالکوٹ۔ احمد خان، راولپنڈی۔ محمد احسن، کراچی۔ عامر حفیظ، داود۔ صبیحہ تبسم، ملتان۔ تسلیم رضا، لاہور۔ عقیل الرحمن، کورنگی، کراچی۔ علیم الدین، نارتھ کراچی۔ رؤف علی، لاہور۔ عنبرین حسن، سکھر۔ راحیل نواب، ملتان۔ انجم نعیم، لانڈھی، کراچی۔ فاخر حسین، لاہور۔ وسیم محمد خان، اردو بازار کراچی۔ حسین افسر، لاہور۔

درماندہ عشق

الیاس سیتاپوری

دنیا میں سب سے مضبوط اور مخلص رشتہ اللہ تعالیٰ نے والدین کا بنایا ہے... اس حقیقت کا ادراک ہر اس شخص کی بہ خوبی ہوگا جس کے سر پر یہ سایہ موجود نہیں، والدین... جو اپنی اولاد کو زمانے کی تپتی دھوپ اور راہ میں بچھے کانٹوں سے بچا کر اپنی شفقت کی چادر میں چھپا لیتے ہیں، بس یہی دکھ اس کی زندگی کا سب سے بڑا روگ بنتا جا رہا تھا جو حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہو کر ایسے لوگوں کے درمیان پھنس گیا تھا جنہیں اس پر ظلم ڈھاتے وقت نہ تو انسانیت کا سبق یاد رہتا ہے اور نہ ہی عذاب الٰہی کا خوف... تاریخ گواہ ہے کہ ایسے کتنے ہی کرداروں نے اپنی تمام تر کم مائیگی کو اپنی ایسی طاقت بنا لیا جس سے نہ صرف زمینی مملکتیں بلکہ دل کی دنیا بھی تسخیر کر لی۔ وہ بھی ایک ایسی ہی داستان رقم کرنے نکلا تھا جس کا ہر لفظ ایک الگ ہی معنیٰ میں ملبوس تھا۔ جس کے ہر موڑ پر تحیر و اسرار پوشیدہ تھے اور پھر رفتہ رفتہ اس کی بھید بھری شخصیت نے ایک اور ہی روپ دھار لیا جس کے باعث تاریخ نے اسے اپنے دامن میں چھپا لیا کیونکہ... اس کی زندگی کے نشیب و فراز سب سے جدا تھے۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

جب ہمایوں ایران کی مدد سے ہندوستان کا دوبارہ بادشاہ بنا تو اس کے ساتھ جو غیر ہندی سپاہ تھی، ان میں فیروز بخت کے والدین بھی شامل تھے جو معرکے میں مارے گئے۔ اس وقت فیروز بخت دو سال کا تھا، ایک مشہدی کو اس پر رحم آیا اور اسے اپنی بیوی کے حوالے کر دیا۔ یہ مشہدی ہمایوں کے ساتھ دہلی چلا آیا۔ مشہدی کی بیوی اپنے دو بچوں کے مقابلے میں فیروز بخت سے برا سلوک کرتی۔ بات بات پر پٹائی بھی ہو جاتی اور مشہدی کی بیوی اس کو جب مارتی یہ ضرور کہتی۔ ”اس کے ماں باپ معلوم نہیں کیسے جاہل اور احمق تھے کہ اس منحوس کا نام فیروز بخت رکھ دیا۔ پیدا ہوتے ہی دو سال کے اندر اندر دونوں کو کھا گیا اور اب ہمیں کھانے آ گیا ہے۔“

ننھے فیروز بخت کی سمجھ میں اس عورت کی باتیں نہیں آتی تھیں لیکن وہ ذرا سہا ضرور رہنے لگا۔ مشہدی کا زیادہ وقت باہر گزرتا تھا کیونکہ وہ ہمایوں کے حفاظتی دستے میں شامل تھا۔ کبھی کبھی ہفتوں گھر کی شکل تک دیکھنا نصیب نہ ہوتی۔ جب گھر آتا تو فیروز بخت کی شکایتوں کا دفتر کھل جاتا۔ اس کی شرارتیں، کام چوریاں، چالاکیاں، گستاخیاں اور معلوم نہیں کیا کیا۔ بیوی یہ بھی کہتی کہ اسے اندیشہ ہے کہ فیروز بخت بڑا ہونے پر اس کے دونوں بچوں کو جان سے مار دے گا۔

رحم دل مشہدی ساری شکایتیں سننے کے بعد بھی کہتا۔ ”خدا سے ڈر اور اس یتیم پر رحم کر، تیرے بھی دو بچے ہیں۔ کہیں فیروز بخت کا وبال ان دونوں کو نہ بھگتنا پڑے۔“

بس یہیں سے ان دونوں میں جھگڑا شروع ہو جاتا اور فضا اتنی بوجھل ہو جاتی کہ پڑوسیوں کو مداخلت کرنا پڑتی۔ پڑوسی بھی فیروز بخت سے ہمدردی کرنے لگے۔ انہی پڑوسیوں میں ایک تاجر بھی رہتا تھا، اس کے کئی کاروبار تھے۔ یہ اسلحہ سازوں سے ہتھیار تیار کرا کے بادشاہ اور اس کی سپاہ کے ہاتھ بیچ دیا کرتا۔ شاہی فوج کے لیے رسد بھی فراہم کرتا۔ یہ تاجر شاہی کارخانوں میں تیار ہونے والے کپڑوں



کے علاوہ چین اور اندرونِ ملک کے مختلف حصوں میں بنے جانے والے کپڑے کا بہت بڑا بیوپاری تھا۔ اس کے سیکڑوں ملازم تھے۔ یہ کاروباری لوگوں کے لیے روپے کے لین دین یعنی ہنڈی کا کام بھی کرتا تھا۔ اس تاجر کا نام داؤد کرمانی تھا اور اس کی ایک بیوہ بہن تھی۔ قلعہ نما حویلی میں بہت سارے نوکروں چاکروں کے ساتھ یہ دونوں تنہا رہتے تھے۔ داؤد نے کسی زمانے میں شادی بھی کی تھی لیکن لوگوں کا کہنا یہ تھا کہ داؤد کو اپنے کاروبار سے زیادہ بیوی پیاری نہیں تھی۔ وہ بیوی اور بہن کو حویلی میں تنہا چھوڑ کر مہینوں غائب رہتا اور جب وطن واپس آتا تو یہاں بھی کاروبار ہی میں الجھا رہتا۔ بیوی کو تنہائی کا احساس گھن کی طرح چاٹتا رہا اور آخرکار شادی کے چھ سال بعد وہ انتقال کر گئی۔

اسی داؤد کرمانی کے پڑوس میں مشہدی کا کنبہ اور فیروز بخت بھی رہتے تھے۔ مشہدی کے گھر میں جب بھی ہنگامہ ہوتا تو داؤد کی بیوہ بہن اپنے نوکروں کو بھیج کر مداخلت کرواتی۔ آخر فیروز بخت آٹھ سال کا ہو گیا۔ اب وہ اپنا اچھا برا خوب سمجھنے لگا تھا۔ فیروز بخت پڑھنا چاہتا تھا لیکن اسے پڑھاتا کون...... مشہدی کے دونوں لڑکے پڑھ رہے تھے۔ فیروز بخت ان دونوں کو مدرسے جاتا دیکھتا تو بہت کڑھتا۔

ایک دن دونوں لڑکے باہر نکلے تو دیکھا کہ فیروز بخت ان کا انتظار کر رہا ہے۔ فیروز بخت انہیں دیکھتے ہی ان کی طرف بڑھا اور بولا۔ ”تم دونوں کے ساتھ میں بھی پڑھنے چلوں گا۔“

مشہدی کے بڑے لڑکے نے پوچھا۔ ”مدرسے میں تو پڑھائی کے پیسے لگتے ہیں، تو پڑھائی کے پیسے کہاں سے دے گا؟“

فیروز بخت لاجواب ہو گیا لیکن وہ پھر بھی ان دونوں کے پیچھے پیچھے مدرسے چلا گیا۔ وہاں دونوں تو پڑھتے رہے اور یہ تماشائی بنا بیٹھا رہا۔ جب یہ تینوں گھر واپس پہنچے تو مشہدی کی بیوی نے فیروز بخت سے کڑک کر پوچھا۔ ”اتنی دیر سے تو کہاں غائب تھا؟“

فیروز بخت نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔ ”میں دونوں بھائیوں کے ساتھ مدرسے چلا گیا تھا۔“

مشہدی کی بیوی نے پے در پے کئی طمانچے رسید کر دیے اور بولی۔ ”خبردار جو آئندہ ان دونوں کو اپنا بھائی کہا۔ تو منحوس کیا یہ چاہتا ہے کہ میرے بچوں کو اپنا بھائی کہہ کر اپنی نحوست کا اثر ان پر بھی ڈال دے۔“

فیروز بخت نے مار سے بچنے کے لیے باہر کا رخ کیا تو مشہدی کی بیوی تیزی سے اس کے پیچھے دوڑی لیکن وہ باہر نکل چکا تھا۔ مشہدی کی بیوی اسے پکڑ نہیں سکی اور دروازے پر کھڑی ہو کر شور کرنے لگی۔ ”لوگو! کیا ستم ہے کہ میں تو اس منحوس کو اپنی اولاد کی طرح پال پوس رہی ہوں اور یہ کم بخت بھاگنے کی دھمکی دے کر گھر سے نکل گیا۔ شوہر کی موجودگی میں گھر سے بھاگتا تو میں ذرا بھی فکر نہ کرتی لیکن ان کی عدم موجودگی میں یہ ہر طرف میرے جھوٹے مظالم کی داستانیں سنا سنا کر مجھے ذلیل و خوار کرتا پھرے گا۔“

مشہدی کی بیوی کی آہ و داویلا سن کر عام حالات اور لاعلمی میں لوگ فیروز بخت کو پکڑ کر مشہدی کی بیوی کے حوالے کر دیتے لیکن تقریباً سبھی کو ان مظالم کا علم تھا جو وقتاً فوقتاً فیروز بخت پر ٹوٹتے رہتے تھے۔ فیروز بخت بھاگ کر داؤد کرمانی کی حویلی کے پھاٹک کے کنارے جا کھڑا ہوا اور اپنے مکان کی طرف دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد ایک عورت سر سے پاؤں تک چادر میں لپٹی ہوئی فیروز بخت کے پاس آن کھڑی ہوئی اور بولی۔ ”دیکھ ابھی تو میں تجھ سے نرمی سے کہہ رہی ہوں کہ میرے ساتھ گھر چلا چل، ورنہ مشہدی کو بلا کر تیری ہڈی پسلی تڑوا دوں گی۔“

فیروز بخت سرتاپا سرکشی اختیار کیے ہوئے تھا، بولا۔ ”اب میں اس گھر میں نہیں جاؤں گا۔“

مشہدی کی بیوی نے پوچھا۔ ”اگر گھر نہیں جائے گا تو کہاں جائے گا؟“

فیروز بخت نے اسی طرح سخت اور اٹل لہجے میں جواب دیا۔ ”میں نے کہہ جو دیا کہ میں کہیں بھی جاؤں لیکن اب میں تیرے ساتھ گھر واپس نہیں جاؤں گا۔ میں دریا میں ڈوب کر جان دے سکتا ہوں، کنوئیں میں چھلانگ لگا سکتا ہوں لیکن تیرے ساتھ گھر ہرگز نہ جاؤں گا۔“

مشہدی کی بیوی اتنا سخت جواب سن کر آپے سے باہر ہو گئی۔ فیروز بخت نے جھک کر کئی پتھر اٹھا لیے اور بڑی سختی سے کہا۔ ”میں نے کہہ جو دیا کہ اب میں گھر نہیں جاؤں گا۔ اگر تو نے زیادہ زبردستی کی تو میں پتھروں سے تیری شکل بگاڑ دوں گا۔“

مشہدی کی بیوی ڈر گئی۔ فوراً گھر واپس جانے لگی لیکن اسی وقت داؤد کرمانی ایک رتھ نما گاڑی میں بیٹھا ہوا اپنے پھاٹک کی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس رتھ کو چار گھوڑے کھینچ رہے تھے اور چاروں گھوڑوں کا رنگ بالکل سفید تھا مگر ان کی دمیں سیاہ تھیں۔ فیروز بخت رتھ کو پھاٹک کی طرف آتے دیکھ کر لپکا اور التجا کی۔ ”مجھے بچا لو، اس ظالم

عورت سے مجھے بچالو۔"

گاڑی ایک دم رک گئی اور اس پر سے پانچ آدمی یکے بعد دیگرے اترے۔ ان پانچوں میں چار تو خدمت گار تھے اور پانچواں داؤد کرمانی خود تھا۔ مشہدی کی بیوی نے بھی ان سب کو اترتے دیکھ لیا تھا۔ وہ رک گئی اور یہ دیکھنے لگی کہ فیروز بخت کے ساتھ اب کیا پیش آتا ہے۔

داؤد کرمانی نے فیروز بخت سے پوچھا۔ "بیٹے! کیا بات ہے، یہ ہاتھوں میں پتھر لیے کیوں کھڑا ہے؟"

فیروز بخت نے مشہدی کی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ مجھے پکڑنے آرہی تھی اور اگر یہ مجھے پکڑتی تو میں ان پتھروں سے اس کی شکل بگاڑ دیتا۔"

مشہدی کی بیوی لپک کر ان کے قریب پہنچی اور داؤد سے کہا۔ "بھائی! ذرا اس کے ہاتھ سے پتھر تو لے لے، پھر میں سب کچھ سچ سچ تجھے بتا دوں گی۔"

داؤد نے فیروز بخت سے کہا۔ "یہ پتھر مجھے دے دے۔"

فیروز بخت نے ذرا شک وشبے سے پہلے تو مشہدی کی بیوی کی طرف دیکھا پھر داؤد کی طرف دیکھ کر پتھر پھینک دیے۔ مشہدی کی بیوی نے جھپٹ کر انہیں اٹھالیا اور فیروز بخت سے بولی۔ "بول اب کیا کہتا ہے؟ میں پھوڑوں تیرا سر ان پتھروں سے؟"

داؤد نے فیروز کا ہاتھ پکڑ کر اپنی آڑ میں کرلیا اور افسوس سے کہا۔ "خاتون! میں شرمندہ ہوں کہ لڑکے سے پتھر پھنکوا کر انہیں تیرے ہاتھوں میں جانے دیا اور اس ذرا سے واقعے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ واقعات کچھ بھی ہوں، ان میں زیادتی تو نے ہی کی ہوگی۔ یہ لڑکا سعادت مند معلوم ہوتا ہے۔"

مشہدی کی بیوی نے چمک کر جواب دیا۔ "معلوم نہیں کن منحوسوں نے اس کا نام فیروز بخت رکھا تھا۔ نام فیروز بخت اور نحوست کا یہ عالم کہ پیدا ہونے کے دو سال کے اندر اپنے والدین کو کھا گیا اور جب سے میرے گھر آیا ہے مجھے پریشان کررہا ہے۔ میں نے اسے دو سال کی عمر سے اپنے پاس رکھا ہے، بالکل بیٹوں کی طرح لیکن اب سنپولیے کی طرح مجھی کو ڈس لینا چاہتا ہے۔"

داؤد نے فیروز بخت کی طرف دیکھا، اس نے مٹھی بھینچ کر اور آنکھیں بند کرکے جواب دیا۔ "میں اس ظالم عورت کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ میں مرجاؤں گا لیکن اس کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔"

داؤد نے اپنے ذہن پر ذرا سا زور دیا۔ آنکھیں بند کیں اور انگلیوں سے کنپٹی کو دباتے ہوئے بولا۔ "تو کیا تو وہی لڑکا ہے جس کو اکثر و بیشتر پیٹا جاتا تھا اور محلے کے لوگ بیچ بچاؤ کرادیا کرتے تھے؟"

مشہدی کی بیوی نے جواب دیا۔ "تو اس نے پورے شہر میں مجھے بدنام کرنے کا منصوبہ بنا رکھا ہے۔ میں اس کی چالوں میں نہیں آؤں گی اور میں خود بھی یہ نہیں چاہتی کہ تو میرے ساتھ رہے لیکن مجھے ذرا اپنے شوہر کا خوف اور خیال ہے جو اسے گھر واپس لے جانا چاہتی ہوں ورنہ میں یہیں اسے مارتی اور جب تک توبہ نہ کروالیتی ہرگز نہ چھوڑتی۔"

داؤد نے اپنے خدمت گاروں سے کہا۔ "فیروز بخت کو اسی وقت اندر لے جاؤ۔ میں اس دلچسپ اور تیز طرار عورت سے کچھ باتیں کرلوں۔"

اس کے فوراً بعد مشہدی کی بیوی سے رجوع کیا گیا، پوچھا۔ "کیا یہ سچ ہے کہ تیرا یہ بیٹا ہمیشہ تجھ کو ستاتا اور پریشان کرتا چلا آرہا ہے اور بقول تیرے یہ منحوس بھی ہے؟"

"ہاں! اور کوئی ایسا ویسا بہت زیادہ، خدا بچائے اس کی نحوست سے۔"

مشہدی کی بیوی نے پرجوش لہجے میں کہا تو داؤد نے ذرا سختی سے کہا۔ "خاتون! چونکہ یہ بچہ تمہارا نہیں ہے۔ منحوس اور گستاخ بھی ہے، تیرے حق میں دردِ سر بھی رہا ہے اس لیے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ تو اس سے نجات ہی حاصل کرلے؟"

مشہدی کی بیوی نے جواب دیا۔ "مجھے تو کوئی اعتراض نہیں لیکن جب تک مشہدی، میرا شوہر واپس نہ آجائے فیروز بخت میرے ہی پاس رہے گا۔"

داؤد نے بے مروتی سے کہا۔ "خاتون! ایمان داری کی بات تو یہ ہے کہ اب میں اس کو اپنے پاس ہی رکھوں گا۔ جب تیرا شوہر مشہدی آجائے تو مجھ کو مطلع کردینا میں تیرے شوہر سے باتیں کرکے اور پوری طرح مطمئن ہوجانے کے بعد لڑکے کو کسی کے حوالے کردوں گا۔ یوں خالی خولی باتیں بنا کر اسے مجھ سے کوئی بھی نہیں لے سکتا۔"

داؤد حویلی کے اندر چلا گیا۔ گاڑی اور گھوڑوں کو سائیس نے سنبھال لیا اور خود خدمت گاروں سے پوچھ کر فیروز بخت کے پاس گیا۔ وہ ایک کمرے میں سر جھکائے کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کی محویت کا یہ عالم تھا کہ داؤد کمرے میں داخل ہوا، چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا مگر فیروز بخت کو پتا بھی نہ چلا۔

داؤد کچھ دیر ساکت کھڑا اس کی شکل دیکھتا رہا۔ اسے یہ لڑکا بہت اچھا لگا۔ مایوسی اور بے بسی کا یہ ننھا مجسمہ کسی سوچ

میں گم تھا۔ داؤد نے سکوت توڑا۔ "ہاں لڑکے! اب بتا کہ بات کیا ہے؟"

لڑکا کھڑا ہو گیا۔ اس تفصیل طلب سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، بولا۔ "کچھ بھی نہیں۔"

داؤد مسکرایا۔ "اگر بات کچھ بھی نہ تھی تو اتنا بڑا ہنگامہ کیوں ہو گیا..... یہ عورت تیری ماں تھی کیا؟"

فیروز بخت نے جواب دیا۔ "نہیں، وہ میری ماں نہیں ہے۔"

داؤد نے کہا۔ "اچھا تو یہیں رہ، میں اس سے بات کرلوں گا لیکن ایک بات کا....."

اس وقت داؤد کی بیوہ بہن گلنار بھی آ گئی اور لڑکے کو دیکھ کر بے زاری ظاہر کی۔ فیروز بخت پھر سہم گیا۔ گلنار کے لب و لہجے میں مشہدی کی بیوی کا رنگ جھلک رہا تھا۔ اس نے سہمی سہمی نظروں سے گلنار کو دیکھا اور سر جھکا لیا۔ داؤد نے بہن سے کہا۔ "گلنار! لڑکے کو کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بڑا دکھی معلوم ہوتا ہے۔"

داؤد اپنی بہن کو لے کر چلا گیا اور فیروز بخت، گلنار سے بھی خوف زدہ ہو گیا۔ وہ اس حویلی میں بھی مشہدی کی بیوی کا وجود محسوس کرنے لگا۔ یہ الگ بات تھی کہ یہاں مشہدی کی بیوی کا نام گلنار تھا اور گلنار داؤد کی بہن تھی۔

داؤد نے ایک ملازم فیروز بخت پر متعین کر دیا اور اسے حکم دیا کہ وہ لڑکے کے آرام و آسائش کا خاص خیال رکھے۔ حویلی کے خدمت گار حیران تھے کہ داؤد نے اس لڑکے میں ایسی کون سی بات دیکھ لی کہ اسے فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھا دیا لیکن گلنار کو لڑکا اچھا نہیں لگا۔ اس کا بھائی داؤد اس سے بہت محبت کرتا تھا لیکن اب اس محبت میں یہ لڑکا بھی شریک ہو گیا تھا۔

داؤد کو اپنے کاروباری سفر پر احمد آباد روانہ ہونا تھا لیکن اب وہ رک گیا تھا۔ مشہدی کی بیوی بار بار محلے کے آدمی بھیج رہی تھی کہ اس کا بیٹا اسے واپس کیا جائے لیکن داؤد یہ جواب دے کر واپس کر دیتا کہ لڑکا اس کا نہیں ہے مشہدی کے آنے پر بات ہو جائے گی۔

داؤد کی لاعلمی میں گلنار کے اکسانے پر مشہدی کی بیوی چادر اوڑھ کر خود حویلی پہنچ گئی اور وہاں ہنگامہ کر دیا۔ دربانوں سے جھگڑنے لگی۔ "میرا لڑکا مجھے واپس کر دو ورنہ میں بادشاہ سے شکایت کروں گی اور اس حویلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گی۔"

اس وقت داؤد حویلی میں موجود نہیں تھا۔ دربانوں نے گلنار کو مطلع کیا۔ گلنار نے حکم دے دیا کہ لڑکا عورت کے حوالے کر دیا جائے۔

لیکن فیروز پر متعین ملازم نے حکم ماننے میں پس و پیش سے کام لیا۔ اس کو فیروز بخت سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ اس نے کہا۔ "جب تک میرا مالک مجھے یہ حکم خود نہ دے، میں لڑکا اس عورت کے حوالے نہیں کروں گا۔"

گلنار شیرنی کی طرح بپھر کر بولی۔ "تو کیا بک رہا ہے لڑکا اسی وقت اس عورت کے حوالے کیا جائے گا۔ یہ میں کہہ رہی ہوں، یہ میرا حکم ہے اور اس حویلی کا ہر فرد جانتا ہے کہ میری حکم عدولی کا نتیجہ کیا ہو گا۔"

خدمت گار نے بھی سختی سے جواب دیا۔ "بی بی! میں نے اس حویلی کا نمک کھایا ہے اس لیے میں نمک حرامی نہیں کر سکتا۔ اگر اس حویلی کا مالک مجھے یہ حکم دیتا تو میں فوراً تعمیل کرتا لیکن مالک کی عدم موجودگی میں اس کے نافذ حکم کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔"

گلنار غصے میں تھر تھر کانپ رہی تھی۔ وہ اس کمرے کی طرف تیز تیز قدموں سے بھاگی جس میں فیروز بخت رہتا تھا۔ اس کے پیچھے خدمت گار بھی دوڑا۔ گلنار نے کمرے میں داخل ہوتے ہی فیروز بخت کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ اس وقت جامن کھا رہا تھا۔ گلنار نے ہاتھ پکڑ کر جھٹکا جو دیا تو سارے جامن بکھر گئے اور فیروز بخت منہ کے بل گرتے گرتے بچا۔ گلنار نے اسے کھینچ کر کمرے سے باہر کر دیا، بولی۔ "چل، تو یہاں کیا کر رہا ہے۔ تیری ماں تجھے لینے آئی ہے۔ اس کے ساتھ اپنے گھر جا، یہاں کب تک رہے گا۔"

فیروز بخت نے خوف زدہ آواز میں جواب دیا۔ "میری کوئی ماں نہیں، میری ماں تو کب کی مر چکی۔"

گلنار نے اسے دھکا دے کر گرا دیا۔ "کیا اس عورت نے تجھ کو پالا پوسا نہیں ہے؟ کیا یہ تیری ماں نہیں کہلائے گی؟ احسان فراموش..... اگر تو اس عورت کو ماں نہیں مانتا تو میں تجھ سے کیا امید کروں گی۔ تو میرے بارے میں بھی اسی قسم کی باتیں کرے گا۔"

خدمت گار فیروز بخت اور گلنار کے بیچ میں آ کر بولا۔ "آپ اس لڑکے کا ہاتھ چھوڑ دیجیے۔ میں نے کہہ جو دیا کہ جب تک اس حویلی کا مالک آ نہیں جائے گا، یہ لڑکا یہیں اس حویلی میں رہے گا۔"

گلنار نے خدمت گار کو بھی ڈانٹ دیا۔ "اس کے ساتھ تو بھی نکل جا اس حویلی سے..... ورنہ میں دھکے دے کر نکلوا دوں گی۔"

خدمت گار تن کر کھڑا ہو گیا۔ "میرے بارے میں کسی کو حکم نہ دیجیے گا کیونکہ میں یہ فیصلہ کر چکا ہوں کہ جو بھی میرے مقابلے پر آئے گا، میں اس کا مقابلہ کروں گا اور پھر یا تو اپنی جان دے دوں گا یا پھر اس کی جان لے لوں گا۔"

گلنار نے کوئی پروا کیے بغیر فیروز بخت کو کھینچنا شروع کر دیا۔ فیروز بخت رو رو کر خوشامدیں کرنے لگا۔ "مجھے اس ظالم عورت کے حوالے نہ کیجیے۔ میں اس ظالم عورت کے پاس نہیں جاؤں گا۔ میں چھت سے کود کر جان دے دوں گا لیکن اس سفاک عورت کے گھر نہیں جاؤں گا۔"

گلنار بدستور چیخ رہی تھی۔ "اس کو لے جاؤ، اس... بدذات کو اس حویلی سے ابھی وقت نکال دو۔"

خدمت گار پھر گرجا۔ "میں کہتا ہوں تم لوگ میرے آڑے نہ آؤ ورنہ اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔"

یہ کہہ کر خدمت گار نے کمر سے خنجر نکال لیا اور ہوا میں لہراتے ہوئے بولا۔ "خبردار جو کسی نے اس لڑکے کو ہاتھ لگایا۔ اگر ہاتھ لگایا تو میں آنتیں نکال لوں گا۔"

لیکن گلنار پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے ایک بار پھر فیروز بخت کو دھکا دینا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی خدمت گار نے گلنار پر حملہ کر دیا۔ پھر جو شور و غل مچا تو قیامت ہی کھڑی ہو گئی۔ خدمت گار نے گلنار کا گریبان پکڑ لیا اور کئی زوردار جھٹکے دے کر ایک طرف دھکیل دیا۔ "کیا میں نے پہلے ہی یہ نہیں بتا دیا تھا کہ فیروز بخت کو کوئی ہاتھ نہ لگائے۔"

گلنار بھی ہار ماننے والی عورت نہیں تھی۔ اس نے دوسرے خدمت گاروں کو آواز دی جو فوراً دوڑ کر اس کے پاس آ گئے۔ گلنار نے لڑکے کے خدمت گار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس کو باندھ کر مارا جائے اور جب تک میں منع نہ کروں مرمت ہوتی رہے۔"

لیکن خدمت گار پر قابو پانا آسان کام نہیں تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "دیکھو! تم لوگ مجھ سے دور ہی رہنا ورنہ اس وقت تو مجھ پر خون سوار ہے۔ میں دو ایک کی جان لیے بغیر نہیں رہوں گا۔"

خدمت گاروں کو ہچکچاتے دیکھ کر گلنار بالکل بے قابو ہو گئی۔ پاؤں پٹختی ہوئی مشہدی کی بیوی کی طرف چل دی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "تم سب نمک حرام ہو۔ تم سب میری حکم عدولی کر کے اچھا نہیں کر رہے ہو۔ بھائی داؤد کو آنے دو، ایک ایک کو نکلوا نہ دوں تو میرا نام گلنار نہیں۔"

ایک خدمت گار نے فیروز بخت کے خدمت گار سے کہا۔ "تو نے یہ اچھا نہیں کیا۔" پھر اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "اور تم سب نے بھی گلنار کا حکم نہ مان کر اپنے حق میں بہت برا کیا ہے۔"

فیروز بخت کے خدمت گار نے اکڑ کر جواب دیا۔ "میں کہتا ہوں کہ تو میرے منہ نہ لگ ورنہ میرا دماغ بہت خراب ہو رہا ہے۔ اس وقت تو میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنی بات اونچی رکھوں گا اور کسی کی بات ہرگز نہ مانوں گا۔ جس کی ہمت ہو میرے مقابلے میں آئے اور تجربہ کرے۔"

یہ دوسرا خدمت گار بھی بڑا گرم مزاج تھا۔ مقابلے کو بڑھا لیکن دوسرے کئی خدمت گاروں نے بیچ بچاؤ کروا دیا۔ ابھی یہ فتنہ ذرا دبا ہی تھا کہ گلنار، مشہدی کی بیوی کو لے کر آ گئی اور فیروز بخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ رہا تیرا بیٹا، اس کا ہاتھ پکڑ اور اپنے گھر لے جا۔ اب یہ یہاں نہیں رہ سکتا۔"

فیروز بخت مشہدی کی بیوی کو اپنے قریب دیکھ کر بلی سے خوف کھائے چوہے کی طرح کمرے میں کھڑے ہوئے تخت کے پیچھے جا چھپا۔ مشہدی کی بیوی اس کی طرف دوڑی لیکن فیروز بخت کے خدمت گار نے اس کا راستہ روک لیا اور گرج کر بولا۔ "خبردار جو لڑکے کو ہاتھ لگایا۔"

مشہدی کی بیوی خدمت گار کے ہاتھ میں خنجر دیکھ کر ڈر گئی۔ منہ پر چادر ڈال کر رونے لگی۔ "لوگو! یہ کیسا ظلم ہے کہ میری اولاد کو مجھ سے جدا رکھا ہے۔ فیروز بخت میرا لڑکا ہے، خدا کے لیے میرے حوالے کر دو۔"

اچانک خدمت گاروں میں ہلچل مچ گئی اور وہ ادھر ادھر دبکنے لگے لیکن فیروز بخت کا خدمت گار اپنی جگہ پر ڈٹا کھڑا رہا۔ گلنار بھی ایک طرف سمٹ گئی اور مشہدی کی بیوی جہاں کھڑی تھی، وہیں گھونگٹ نکال کر بیٹھ گئی۔ اب ان سب کے سامنے داؤد آ چکا تھا۔ خدمت گار داؤد کی طرف تیزی سے بڑھا اور جھک کر اس کے پاؤں پکڑ لیے، گڑگڑاتے ہوئے بولا۔

"مالک! آپ مجھے نوکری سے نکال دیجیے کیونکہ اگر میں آپ کے حکم کی تعمیل کرتا ہوں تو حویلی کے دوسرے لوگ میرے دشمن ہو جاتے ہیں۔"

گلنار چیختی ہوئی بولی۔ "بھائی اس نمک حرام کو اسی وقت نکال دے اس حویلی سے ورنہ میں اسے قتل کر دوں گی۔"

مشہدی کی بیوی رونے لگی۔ "ہائے میرا لڑکا، میرے فیروز بخت کو واپس کر دے ورنہ میں یہیں اپنی جان دے دوں گی۔"

داؤد نے گرج دار آواز میں کہا۔ "حویلی میں رونے

دھونے کی کوئی ضرورت نہیں، اب شور وغل بند ہوجانا چاہیے۔"

مشہدی کی بیوی نے چیخ کر جواب دیا۔ "میرا لڑکا میرے حوالے کردو، ورنہ میں قیامت اٹھادوں گی۔"

داؤد نے خدمت گار کو حکم دیا۔ "اگر یہ عورت خود سے نہ جائے تو اس کو زبردستی دھکے دے کر نکال دے۔"

خدمت گار مشہدی کی بیوی کی طرف بڑھا۔ گلنار، بھائی کے خوفناک تیور دیکھ کر سامنے سے ٹل گئی۔ مشہدی کی بیوی نے خدمت گار کو اپنی طرف بڑھتے اور گلنار کو فرار ہوتے جو دیکھا تو اس کی ہمت بھی جواب دے گئی اور وہ پھاٹک کی طرف بھاگ گئی۔ کچھ دیر بعد مطلع صاف ہوگیا۔ داؤد فیروز بخت کے کمرے میں داخل ہوا اور ادھر ادھر دیکھ کر خدمت گار سے پوچھا۔ "یہ فیروز بخت کہاں چلا گیا؟"

خدمت گار نے جواب دیا۔ "مالک! اگر اس وقت آپ نہ آجاتے تو معلوم نہیں کیا ہوجاتا۔ فیروز بخت اسی کمرے میں کہیں چھپا ہوگا۔"

داؤد نے کہا۔ "فیروز بخت کو تلاش کر، یہ معاملہ کیا تھا؟"

خدمت گار نے فیروز بخت کو تخت کے پیچھے سے نکال لیا۔ وہ سہما سہما سر جھکا کر داؤد کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں اور رخساروں پر آنسوؤں کے قطرات کے علاوہ خشک آنسوؤں کی لکیریں بھی تھیں۔ داؤد نے پھر پوچھا۔ "یہ معاملہ کیا تھا؟ یہ عورت حویلی میں یہاں تک کس طرح آگئی؟"

خدمت گار نے پوری تفصیل بتادی اور کہا۔ "گلنار بی بی نے اگر اس عورت کی ہمت افزائی نہ کی ہوتی تو وہ حویلی میں اس کمرے تک نہیں آسکتی تھی۔" اس کے بعد وہ زار و قطار رونے لگا اور ہچکیاں لیتے ہوئے بولا۔ "میں نے گلنار بی سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ جب تک خود مالک مجھے یہ حکم نہیں دیں گے کہ اس لڑکے کو اس عورت کے حوالے کردیا جائے، میں کسی اور کا حکم نہیں مانوں گا۔ اس پر گلنار بی بی نے مجھے نکلوا دینے کی دھمکی دی۔"

داؤد پر خدمت گار کے رونے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ تحکمانہ انداز میں جواب دیا۔ "پھر روتا کیوں ہے؟ کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ میں تجھے نکال دوں گا؟ تو خوش ہوجا کہ میں تجھ کو نہیں نکالوں گا۔"

اس کے بعد داؤد فیروز بخت کی طرف متوجہ ہوا۔ فیروز بخت پرسش احوال پر بلک بلک کر رونے لگا۔ داؤد نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ارے تو کیوں رو رہا ہے۔ تو بالکل محفوظ ہے اس حویلی میں۔ تیرا تو بال۔ کا بھی نہیں ہوگا۔

"آج میں نے تیرے سرپرست مشہدی سے بھی تیرے بارے میں بات کرلی ہے۔ مشہدی تو بڑا رحم دل اور بہت اچھا آدمی ہے۔ وہ اپنی بیوی کے مظالم اور جبر پر خاصا شرمندہ نظر آرہا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی میں نے اس کو یہ پورا واقعہ سنایا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں تجھے اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں تو وہ بہت خوش ہوا اور کھلے دل سے اجازت دے دی کہ میں تجھے اپنے پاس رکھ سکتا ہوں۔ ہاں مشہدی کبھی کبھی تجھے دیکھنے آجایا کرے گا۔"

داؤد کی باتوں نے فیروز بخت اور خدمت گار دونوں کو خوش کردیا۔ خدمت گار نے رک رک کر کہا۔ "لیکن یہاں بھی ایک......"

داؤد نے ڈانٹ دیا۔ "زیادہ بکواس نہ کر، میں اس حویلی اور اس کے لوگوں کے بارے میں تجھ سے زیادہ جانتا ہوں۔ جو کچھ ہوگیا ہوگیا۔ اس پر کسی قسم کی رائے زنی یا اس کا بار بار ذکر کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔"

فیروز بخت فرطِ جوش میں داؤد سے چمٹ جانا چاہتا تھا لیکن ہمت نہیں پڑی اور اس نے سر اٹھا کر داؤد کو سرسری نظروں سے دیکھا اور اس کے پاؤں پکڑ لیے، بولا۔ "اب میں یہیں رہوں گا آپ ہی کے پاس، میں کہیں نہیں جاؤں گا۔"

داؤد نے اس کو اپنے قدموں سے اٹھا کر سینے سے لگالیا، بولا۔ "بیٹے! اس کو تو اپنی حویلی سمجھ اور پچھلی باتوں کو بھول جا۔ تو یہ سمجھ کہ تو ایک بہت بڑے تاجر کا بیٹا ہے اور اب تجھ پر کوئی ظلم نہیں کرسکے گا۔"

کچھ دیر بعد داؤد نے فیروز بخت کو اپنے سینے سے جدا کیا اور خدمت گار سے کہا۔ "تو اس کا، فیروز بخت کا خدمت گار ہے۔ اس لیے تجھ پر کسی اور کی خدمت گزاری فرض نہیں ہے۔ تو اپنا سارا وقت اس کو دے گا کیونکہ یہ میرا وارث ہے میری دولت، میری جائداد اور میرے کاروبار کا واحد وارث۔"

داؤد کے اس فیصلے کا حویلی کے لوگوں پر متضاد اثر ہوا لیکن خوش کوئی نہ ہوا۔ گلنار کو سب سے زیادہ دکھ ہوا۔ یہ فیصلہ گلنار کے لیے ناقابلِ قبول اور ہتک آمیز تھا۔ رات کے کھانے کے بعد داؤد نے عشا کی نماز پڑھی اور کچھ دیر چہل قدمی کے بعد جب وہ اپنی خواب گاہ میں داخل ہوا تو وہاں گلنار پہلے سے موجود اس کا انتظار کررہی تھی۔ داؤد اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پوچھا۔ "گلنار! خیریت تو ہے، آج یہاں کیسے؟"

گلنار نے ترش لہجے میں جواب دیا۔ "آج میں اس لیے یہاں آبیٹھی ہوں کہ آپ کو شادی پر مجبور کروں، اب

آپ کو شادی کر لینا چاہیے۔"

داؤد نے بے دلی سے تکیہ اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا اور گلنار کے سامنے بیٹھ گیا، پوچھا۔ "گلنار! ایک دم شادی کا خیال کیونکر آ گیا؟"

گلنار نے جواب دیا۔ "صرف اس لیے کہ آپ کے کاروبار، جائداد اور دولت کا کوئی وارث بھی تو ہونا چاہیے۔"

داؤد نے مسکرا کر کہا۔ "گلنار! میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تیری شادی کر دی جائے کیونکہ میری شادی بیکار رہے گی اور ویسے بھی میں نے فیروز بخت کو اپنا بیٹا بنا لیا ہے اور اب یہی میرا وارث اور میرے کاروبار، جائداد اور دولت کا مالک بھی ہوگا۔ میں نے یہ فیصلہ خوب سوچ سمجھ کر کیا ہے۔"

گلنار ایک دم پھٹ پڑی۔ مشتعل ہو کر بولی۔ "بھائی! آپ میری باتوں کا برا مانیں یا بھلا لیکن میں اس لڑکے کے معاملے میں چپ نہیں رہوں گی۔ کیا آپ اس لڑکے کے بارے میں تفصیل سے جانتے ہیں؟"

داؤد نے پوچھا۔ "میں نے مشہدی سے معلوم کر لیا ہے اس کے والدین شریف لوگ تھے۔ میں تیرا مطلب نہیں سمجھا تو کہنا کیا چاہتی ہے؟"

گلنار نے برا سا منہ بنایا، بولی۔ "مشہدی کوئی فرشتہ تو نہیں ہے۔ وہ جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔ فیروز بخت کسی کی ناجائز اولاد بھی ہو سکتا ہے۔"

داؤد مشتعل ہو کر کھڑا ہو گیا۔ "گلنار! بس اپنی زبان کو لگام دے، میں تیری مزید بکواس نہیں سن سکتا۔ میں نے جب ایک بار یہ کہہ دیا کہ مشہدی ایک شریف انسان ہے اور اس نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ فیروز بخت کے والدین بہت شریف تھے تو اب کسی کو بکواس کی اجازت نہیں دی جائے گی۔"

گلنار رونے لگی، دوپٹے کے پلو سے دونوں آنکھیں چھپالیں اور سسکیاں لے لے کر کہنے لگی۔ "بھائی! اگر آپ اس لاوارث کے بارے میں اتنے ہی جذباتی ہو رہے ہیں تو میں اپنی زبان بند رکھوں گی لیکن میں یہ بات بار بار اور ہزار بار کہوں گی کہ آپ کی جائداد، دولت اور کاروبار کا وارث آپ کا اپنا بیٹا ہی ہونا چاہیے۔ میں اس لاوارث لڑکے کی ہمیشہ مخالفت کروں گی۔"

داؤد نے کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ دونوں ہاتھ پیچھے کمر پر باندھ لیے اور خیالوں میں گم ہو گیا۔ گلنار سسکیاں لے لے کر معلوم نہیں کیا کیا کہتی رہی، داؤد کچھ بھی نہ سن سکا۔ آخر وہ یہ کہتا ہوا اپنی مسہری پر دوبارہ بیٹھ گیا۔ "گلنار! میری شادی ہو یا نہ ہو لیکن تیری شادی ضرور ہوگی کیونکہ میرا خیال ہے کہ تو تنہائی سے اکتا رہی ہے۔"

گلنار نے اس فیصلے کو جھنجلاہٹ سے سنا اور چلی گئی لیکن داؤد کو الجھن میں ڈال گئی۔ اس لڑکے نے تو اس کا اور اس حویلی کا سکون تباہ و برباد کر دیا تھا۔

☆☆☆

فیروز بخت کا خدمت گار بڑی تن دہی اور محبت سے اس کی خدمت گزاری میں مشغول تھا۔ داؤد نے فیروز بخت کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک اتالیق رکھ دیا۔ یہ اتالیق اس کا استاد بھی تھا۔ گلنار شب و روز حسد کی آگ میں جھلس رہی تھی اور اسے اب فیروز بخت کے ساتھ ہی اس کے خدمت گار اور اتالیق کے خلاف بھی سوچنا اور کچھ نہ کچھ کرنا پڑ رہا تھا۔ فیروز بخت اس کشمکش میں مبتلا تھا کہ وہ کیا کرے؟ گلنار اور اس کے زیر اثر خدام کے منفی اور حاسد رویوں پر صبر کرے یا راہِ فرار اختیار کرے یا پھر داؤد کے طفیل خوش قسمتی سے اس کو جو بلند مرتبہ میسر آ گیا تھا، اس کا حاکمانہ اظہار بھی کرے لیکن فی الحال ایک بات صاف تھی۔ وہ یہ کہ فیروز بخت نے جس بدتر ماحول میں ہوش سنبھالا، اس نے فیروز بخت میں ایک ڈر اور ایک نامعلوم سا اندیشہ دل میں بٹھا دیا تھا۔ رشتوں کی آبرو ختم کر دی تھی اور انسانی شفقت، محبت اور رحم دلی اور ہمدردی کو بے معنی اور فضول قرار دے دیا تھا۔ اس کو داؤد کے فیصلے کی پائیداری پر یقین نہیں تھا اور اسے یقین کی حد تک یہ وہم پریشان کرتا رہتا تھا کہ داؤد کی مہربانیاں وقتی ہیں اور یہ کسی بھی دن ختم ہو سکتی ہیں۔ ان احساسات اور خیالات میں پروان چڑھنے والا فیروز بخت اپنے اعمال اور کردار میں بڑائی اور برتری نہیں پیدا کر سکا۔ وہ اتالیق سے اس طرح پیش آتا جس طرح کوئی ملازم اپنے آقا سے پیش آتا ہے۔ وہ اپنے خدمت گار سے یوں باتیں کرتا جس طرح کوئی احسان مند اپنے محسن سے بولتا ہے۔ وہ اپنی خواہشوں کا اظہار بھی التجا آمیز پیرائے میں کرتا۔ داؤد کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ ان نازک امور پر غور کرتا، دیکھتا اور کوئی مناسب قدم اٹھاتا اور اگر وہ ان باتوں کو محسوس بھی کرتا تو ان کی تہ میں موجود عوامل اور عناصر کے تجزیے سے لاعلم اور محروم رہتا۔ اور جب مرض کی تشخیص ہی نہ ہو سکے تو اس کا علاج کس طرح کیا جا سکتا ہے؟

داؤد کو اپنے کاروباری سفر پر روانہ ہونا تھا۔ وہ احمد آباد جا رہا تھا لیکن احمد آباد جانے سے پہلے وہ گلنار کی شادی کر دینا چاہتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ گلنار کو احساسِ تنہائی ہمیشہ پریشان کرتا رہے گا اور گلنار جب خود پریشان ہوگی تو

دوسروں کو بھی پریشان کرے گی اور اس کا سب سے زیادہ نشانہ فیروز بخت بنے گا۔

اس کی بہن بیوہ تھی اور اتنی جلدی رشتہ نہیں مل سکتا تھا۔ اس نے اپنی اس فکر کا ذکر تاجر برادری میں کیا اور کئی تاجروں نے گلنار سے شادی کرنے کی خواہش کی لیکن یہ رشتے داؤد کو ناپسند تھے۔ داؤد اب رک بھی نہیں سکتا تھا، اس لیے اس نے گلنار کی شادی کا مسئلہ مستقبل پر چھوڑ دیا اور جانے سے پہلے اپنی بہن کو سمجھایا کہ میری عدم موجودگی میں فیروز بخت کے ساتھ کوئی ایسا سلوک نہ کرنا جو میری مرضی کے خلاف ہو۔

گلنار نے پھر اصرار کیا۔ ''بھائی! میں کہتی ہوں آپ شادی ضرور کرلیں کیونکہ اپنا خون اپنا ہوتا ہے۔''

داؤد نے جواب دیا۔ ''لیکن گلنار تو یہ کیوں نہیں سوچتی کہ شادی کے بعد جو بچے ہوں گے جن میں لائق بھی ہوں گے اور نالائق بھی۔ کبھی نالائق نکل سکتے ہیں اور یہ نالائق اولاد میری ہر چیز کو تباہ و برباد کردے گی۔ جائداد، دولت اور کاروبار کے حصے بخرے ہوں گے۔ نالائق اولاد مجھے اور خاندان کو ذلیل کردے گی۔ اس لیے میں شادی نہیں کروں گا۔''

گلنار نے وہی رٹ لگائی۔ ''خاندان کا نام کیسے چلے گا، نسل کس طرح قائم رہے گی؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''کیسا خاندان اور کس کی نسل؟ فیروز بخت کو اپنے باپ کا نام تک معلوم نہیں۔ اس لیے اس کا باپ میں ہوں۔ اپنی ولدیت کے خانے میں وہ میرا نام لکھے گا، میری نسل فیروز بخت سے چلے گی۔''

گلنار کی سمجھ میں داؤد کی باتیں ذرا بھی نہیں آرہی تھیں۔ بولی۔ ''بھائی! یہ کیسی باتیں کررہے ہیں آپ؟ فیروز بخت کے باپ کی جگہ آپ کا نام لکھا جائے۔ اس سے آپ کی نسل چلے گی؟ یہ کیسی بے تکی اور بے سروپا باتیں کررہے ہیں آپ؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''گلنار! میری بہن، نسلیں بادشاہوں کی چلتی ہیں یا ان لوگوں کی چلتی ہیں جو غیر معمولی کام کرگزرتے ہیں۔ عامیوں کی حیثیت ہی کیا جو ان کی نسل اور نام چلے۔ عامیوں سے ان کی زندگی ہی میں کون واقف ہوتا ہے جو ان کی اولاد کو ان کے نام سے پہچانا جائے گا۔ میرے بعد اگر لوگوں نے کچھ یاد رکھا تو یہی یاد رکھیں گے کہ فیروز بخت میرا بیٹا ہے۔''

گلنار نے منہ بنا کر پوچھا۔ ''اگر فیروز بخت نے شادی کرلی اور اس کی اولاد ہوئی تو..... تو کیا ہوگا؟''

داؤد نے کہا۔ ''میں فیروز بخت کو سمجھاؤں گا کہ میری ہی طرح وہ بھی شادی نہ کرے اور ابھی تک میں نے یہی اندازہ لگایا ہے کہ فیروز بخت میرے حکم، میری خواہش اور میری رضا کی تعمیل کرے گا۔''

گلنار بولی۔ ''آپ جو چاہیں کریں، لیکن میں آپ کی شادی ضرور کرواؤں گی۔''

داؤد ہنس دیا۔ ''دیکھا جائے گا۔''

یہاں سے اٹھ کر وہ فیروز بخت کے پاس چلا گیا اور دیر تک یہی سمجھاتا رہا کہ میری عدم موجودگی میں کسی سے لڑنے جھگڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر ایک کو خوش رکھنا ہے۔

اس کے بعد خدمت گار کو سمجھایا۔ ''فیروز بخت کا بہت خیال رکھنا۔ آنے پر کوئی شکایت سننے میں نہ آئے۔''

آخر میں اتالیق کو ہدایت کی۔ ''دیکھو، خبردار جو گلنار یا کسی اور سے تنگی پیدا کی۔ تیرا کام یہ ہے کہ دو تین سال بعد جب میں واپس آؤں تو فیروز بخت کو پڑھا لکھا اور شائستہ پاؤں کیونکہ اس کو بڑی ذمے داریاں سنبھالنا ہیں۔''

اتالیق کی تنخواہ کی ذمے داری گلنار کے سپرد کی گئی۔

داؤد احمد آباد روانہ ہوگیا کیونکہ اس کا کاروبار یہ تھا کہ چھپا ہوا کپڑا اچھینٹ، رومال اور [illegible] کے تھان سورت کی بندرگاہ سے خلیج فارس کے ملکوں کو بھجوائے۔ اس کے کارندے یہ کام اس کی عدم موجودگی میں انجام دیتے رہتے تھے لیکن اس کاروبار کی نگرانی تو بہرحال اسی کو کرنا تھی۔ وہ چلا گیا اور اس کے جاتے ہی گلنار نے سکھ کی سانس لی۔

فیروز بخت ایک بار پھر خود کو تنہا اور بے یارو مددگار محسوس کرنے لگا۔ خدمت گار زیادہ دلیر تھا اور وہ فیروز بخت کی ہمت بندھاتا رہتا تھا۔ گلنار اکثر فیروز بخت کے پاس پہنچ جاتی اور اس کے خدمت گار اور اتالیق کو جھڑکنا شروع کردیتی۔ اس طرح دو تین ماہ کے اندر ہی اس نے یہ اثر قائم کردیا کہ اس حویلی میں گلنار ہی سب کچھ ہے اور اس سے اختلاف مول لے کر کوئی شخص رہ نہیں سکتا۔ لیکن خدمت گار پر یہ تاثر نہیں قائم ہوسکا کیونکہ وہ اس حویلی کی فضا اور اس کے ہر فرد سے اچھی طرح واقف تھا لیکن داؤد کی عدم موجودگی میں فیروز بخت کی حمایت کرنا بڑا مشکل کام تھا۔ گلنار بھی خدمت گار ہی کو سب سے زیادہ خوار کرنے کی کوشش کرتی۔

تین ماہ بعد گلنار نے اتالیق کی اجرت کی ادائیگی روک دی۔ اتالیق کچھ دن تو اجرت کے بغیر ہی اپنا کام کرتا رہا لیکن پھر تنگ آگیا اور فیروز بخت سے پوچھا۔ ''میں

پیسوں کے بغیر اپنا کام کس طرح جاری رکھوں؟ آخر میرا اپنا کنبہ بھی تو ہے۔"

فیروز بخت نے جواب دیا۔"استادِ محترم! میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں کیونکہ میں اس حویلی میں زبردستی رہ رہا ہوں اور مجھے نہیں معلوم کہ میں کب تک یہاں رہ سکوں گا۔اس لیے آپ جو مناسب سمجھیں کریں۔"

اتالیق نے سکوت اختیار کیا اور کچھ دیر سوچتا رہا پھر کہا۔"اچھا میں اس شری عورت سے ایک بار بات کرلوں، اس کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔"

یہاں خدمت گار بھی موجود تھا، بولا۔"بات چار چھ ماہ کی ہوتی تو آدمی جھیل بھی سکتا تھا لیکن مالک کی واپسی دو تین سال بعد ہوگی، اس لیے ان مشکلات پر کسی نہ کسی طرح قابو پانا ضروری ہے۔"

فیروز بخت نے جواب دیا۔"میں خود کو اس حویلی کے لائق نہیں سمجھتا اور داؤد تاجر نے میرے بارے میں جو فیصلہ کیا ہے، میں نے اس پر ابھی تک صدقِ دل سے یقین نہیں کیا۔میرا خیال ہے کہ میں اس حویلی سے چپ چاپ فرار ہو جاؤں اور آپ دونوں بھی اسی طرح اپنے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ کرلیں۔"

اتالیق نے نرمی اور محبت سے کہا۔"برخوردار! تیرا فیصلہ بچکانہ ہے۔میں اس سے اتفاق نہیں کرسکتا۔میں پہلے اس شری خاتون سے بات کروں گا اور وہ جو جواب دے گی، اس کی روشنی میں کوئی فیصلہ کروں گا۔"

ان تینوں میں صلاح مشورے جاری تھے کہ حویلی کے جاسوس خدمت گاروں نے گلنار کو خبر کردی کہ فیروز بخت، اتالیق اور خدمت گار تینوں مل کر گلنار کے خلاف کسی قسم کی سازش میں مشغول ہیں۔گلنار گرجتی ہوئی کمرے میں گئی اور تینوں کو خوب لتاڑا اور فیروز بخت کو حکم دیا کہ اب تو نوکروں کی طرح کام کرے گا تو یہاں رہ سکتا ہے۔اس کی فضول باتوں سے بےزار ہو کر اتالیق نے تلخ مسکراہٹ سے کہا۔"خاتون! آپ خود ہی بولے جارہی ہیں، کسی اور کو بولنے کا موقع ہی نہیں دے رہیں۔کچھ میری بھی تو سنیں، میں آپ سے ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

گلنار نے تنک کر کہا۔"تو کیا ضروری باتیں کرے گا مجھ سے؟ میں خود تجھے یہ حکم دے رہی ہوں کہ تو آئندہ اس حویلی میں قدم نہیں رکھے گا کیونکہ اب حویلی میں تیری ضرورت باقی نہیں رہی۔"

اتالیق نے بھی بےرخی سے جواب دیا۔"محترم خاتون! میں اس حویلی میں آپ کا بلایا ہوا نہیں آیا ہوں۔ مجھے داؤد تاجر نے فیروز بخت کے لیے رکھا تھا اور اب وہی مجھے جواب بھی دے سکتا ہے۔"

گلنار نے جنونی کیفیت میں چیخ کر کہا۔"اگر تجھے داؤد نے رکھا تھا تو وہی تیری اجرت بھی دے گا۔"

اتالیق نے بڑے تحمل سے کہا۔"خاتون! آپ میری باتیں بھی سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں کہہ رہا ہوں کہ اس لڑکے پر مجھے آپ کے بھائی داؤد نے متعین کیا ہے اور اسی کے حکم پر میں علیحدگی اختیار کروں گا۔ میں آپ کو اس سے زیادہ حیثیت نہیں دے سکتا کہ آپ داؤد کی بہن ہیں، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔"

گلنار نے اتالیق کو قہر بھری نظروں سے دیکھا اور کہا۔"تو یہ بات ہے تب پھر اب داؤد کے پاس ہی جا اور فیروز بخت، اس منحوس کو بھی اپنے ساتھ ہی لیتا جا۔اب اس حویلی میں نہ تو قدم رکھے گا اور نہ ہی فیروز بخت رہے گا۔اگر تجھ کو اس سے ہمدردی ہے تو اس کو اپنے ساتھ ہی لے جا۔"

اتالیق غصے میں کھڑا ہوگیا۔"دیکھیے خاتون! اپنی زبان کے بےجا استعمال سے گریز کیجیے ورنہ میں بھی بادشاہ تک پہنچ سکتا ہوں اور اس کے بعد جو کچھ ہوگا، اس کی ذمے داری آپ پر ہوگی۔"

گلنار کچھ ڈری، نرمی سے بولی۔"اچھا، اب آپ تشریف لے جائیں۔"

اتالیق نے جواب دیا۔"اس وقت تو میں چلا جاؤں گا لیکن میری آمدورفت جاری رہے گی اور اس وقت تک جاری رہے گی جب تک آپ کے بھائی داؤد واپس نہیں آجاتے۔"

گلنار نے کہا۔"لیکن یہ سوچ کر تشریف لایئے گا کہ میں آپ کو کچھ نہیں دوں گی۔"

اتالیق نے جواب دیا۔"بہتر ہے، دیکھا جائے گا۔"

اتالیق کے جاتے ہی گلنار خدمت گار پر برس پڑی، بولی۔"اور دیکھ میں تجھے ایک بار پھر سمجھا رہی ہوں کہ تو ٹھیک ہوجا۔مجھے بس اس کا خیال آتا ہے کہ تو اس گھرانے کا پشتنی خدمت گار ہے۔تو نے اس حویلی میں آنکھ کھولی اور یہیں ہوش سنبھالا۔اب یہ بات تجھ کو کسی طرح بھی زیب نہیں دیتی کہ اس حویلی کا نمک کھائے اور اسی سے غداری کرے۔"

خدمت گار نے جواب دیا۔"گلنار بی بی! میں نے کوئی غداری نہیں کی۔میں نے آپ کے بھائی کا حکم مانا ہے اور اس کی ایمان داری سے تعمیل کی ہے۔اگر آپ اس کو

غداری کہتی ہیں تو یہ مجھ پر سراسر ظلم ہے۔"

گلنار پاگل ہو رہی تھی۔ بپھری ہوئی خدمت گار کے سر پر چڑھ گئی۔ "بس اب تو اپنی زبان بند کر لے، میں زیادہ بکواس نہیں سن سکتی۔ تو وہی نمک حرام ہے جس نے اس ناجائز لڑکے کی خاطر خنجر نکال لیا تھا۔"

فیروز بخت تلملا کر کھڑا ہو گیا۔ "بس اب اور کچھ نہ کہیے گا۔ میں اس حویلی کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں گا۔"

گلنار نے اس کو دونوں شانوں سے پکڑ لیا۔ "تو نہیں جائے گا تو اس حویلی میں اس دن تک رہے گا جب تک میرا بھائی داؤد واپس نہ آ جائے۔" پھر خدمت گار سے کہا۔ "میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اب تیرے بجائے حمدو، فیروز بخت کے پاس رہے گا۔ تو حویلی کے دوسرے کام کرے گا۔"

خدمت گار تلملا کر بولا۔ "گلنار بی بی! یا تو میں فیروز بخت کے پاس رہوں گا یا اس حویلی کو چھوڑ دوں گا۔"

گلنار نے جاتے ہوئے کہا۔ "میں جا کر حمدو کو بھیج رہی ہوں تو چھٹی کر اور کل تک یہ فیصلہ کر لے کہ تجھے میری شرائط پر حویلی میں رہنا ہے یا یہاں سے چلے جانا ہے؟"

گلنار چلی گئی لیکن خدمت گار اپنی جگہ کھڑا رہا۔ فیروز بخت رو رہا تھا۔ اس نے خدمت گار سے کہا۔ "تو اس حویلی میں رہ میں کہیں اور چلا جاتا ہوں۔"

خدمت گار نے بڑے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ "نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔ میں نے تو لمحوں میں یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر اس حویلی میں رہوں گا تو مالک کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے رہوں گا ورنہ آپ کے ساتھ نکل جاؤں گا۔"

فیروز بخت نے عاجزی سے کہا۔ "میں ایک بدقسمت لڑکا ہوں۔ میری بدقسمتی کا اثر تم پر اور استادِ محترم پر بھی پڑ رہا ہے، اس لیے تم دونوں کی بہتری اسی میں ہے کہ میرا ساتھ چھوڑ دو۔"

خدمت گار نے جواب دیا۔ "نہیں، ہماری بہتری اسی میں ہے کہ آپ کا ساتھ نہ چھوڑیں۔ اپنے مالک کے مزاج سے میں خوب واقف ہوں۔ وہ آدمیوں کے پہچاننے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ انہوں نے میرے سپرد جو خدمت کی ہے تو وہ جانتے تھے کہ میں ان کے حکم کی ہر حال میں تعمیل کروں گا۔ اسی طرح انہوں نے آپ کی تعلیم و تربیت پر جو استاد لگایا ہے، مالک اس سے بھی اچھی طرح واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ حالات کچھ بھی ہوں، استاد اپنا کام جاری رکھیں گے۔ آپ ہمت نہ ہاریں ورنہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔"

فیروز بخت نے شکستہ دلی سے کہا۔ "لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ اس ظالم عورت کا مقابلہ کروں۔"

خدمت گار نے جواب دیا۔ "لیکن ہمت ہارنے سے کام نہیں چلے گا، ہمت تو کرنا ہی پڑے گی۔"

اسی وقت حمدو آ گیا، بے رخی سے بولا۔ "اب تو یہاں سے چلا جا کیونکہ یہاں کی خدمت میرے ذمے کر دی گئی ہے۔"

خدمت گار نے نرمی سے سمجھایا۔ "دیکھ حمدو! تو اس معاملے میں نہ پڑ، تو اپنے مالک کے مزاج سے واقف ہے۔ اگر تو نے گلنار بی بی کا حکم مان لیا تو تجھے یہ بات بھی جاننا چاہیے کہ مالک کے آنے پر تیرا برا حشر ہوگا۔"

حمدو نے جواب دیا۔ "دوست! تو ہی بتا میں کیا کروں؟ مالک تو آئے گا ڈھائی سال بعد...... اس دوران اگر میں گلنار بی بی کا حکم نہ مانوں گا تو یہ میرا برا حال کر دیں گے۔"

خدمت گار نے کہا۔ "میرے پاس اس کا بھی حل ہے۔"

حمدو نے پوچھا۔ "وہ کیا بتا تو سہی؟"

خدمت گار نے جواب دیا۔ "دیکھ پہلے میری ایک بات ذرا غور سے سن لے، اس کے بعد کچھ کرنا۔ پہلی بات تو یہ کہ مالک شادی وادی نہیں کرے گا اور اسی وجہ سے اس نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا ہے گویا ہم سب کے مستقبل کا مالک یہ لڑکا ہے۔ ہمیں اپنے مستقبل کے لیے اس کا خیال رکھنا ہوگا، اس کی خدمت کرنا ہوگی اور خدانخواستہ اس لڑکے کو کوئی نقصان پہنچ گیا تو اس سے دو مختلف سمتوں سے بربادیاں وارد ہو سکتی ہیں۔ ایک تو مالک کی طرف سے اور دوسری بادشاہ کی طرف سے کیونکہ استادِ محترم ایک بااثر شخص ہیں اور یہ امر طے شدہ ہے کہ اگر فیروز بخت کو کوئی نقصان پہنچا تو استادِ محترم اس معاملے کو بادشاہ تک لے جائیں گے۔ بعد میں اس کا کچھ بھی نتیجہ نکلے، میں نہیں جانتا۔"

حمدو بھی پریشان ہو گیا، تنگ آ کر پوچھا۔ "دوست! تو ہی بتا پھر میں کیا کروں؟"

خدمت گار نے جواب دیا۔ "تو یہ کر کہ بظاہر تو فیروز بخت سے بری طرح پیش آ لیکن اندر ہی اندر اس کا خاص خیال رکھ اور اس طرح ڈھائی تین سال گزار دے۔"

حمدو نے فیروز بخت کی طرف دیکھا۔ "کیوں میاں صاحبزادے! آپ کا کیا خیال ہے؟"

فیروز بخت نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے، مجھے تو آپ لوگوں کی طرف سے جو مشورہ ملے گا، میں اس پر عمل کروں گا بس۔"

حمدو نے کہا۔ "اچھا میرے دوست! اب تو فوراً چلا

جا۔ میں وہی کروں گا جس کا تو نے مشورہ دیا ہے، خدا میری مدد کرے۔"

خدمت گار حمدو کو چھوڑ کر گلنار کے پاس چلا گیا تو حمدو نے ہاتھ جوڑ کر فیروز بخت کو سمجھایا۔ "چھوٹے مالک! اگر میں کسی وقت آپ کو ڈانٹوں، پھٹکاروں یا کوئی نازیبا سلوک کروں تو مجھے معاف کر دینا کیونکہ اس حویلی میں مجھے اپنی عزت آبرو کا خیال رکھنا ہے۔ بڑی موذی عورت سے پالا پڑا ہے۔"

فیروز بخت نے بے بسی سے جواب دیا۔ "بھائی! اگر تم مجھے مار بھی لو گے تب بھی میں خاموش رہوں گا کیونکہ میرا اس حویلی میں تم دونوں کے علاوہ ایک بھی حمایتی نہیں۔"

فیروز بخت کا دماغ الجھنوں میں گھرا معلوم نہیں کیا کچھ سوچنے میں مشغول تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا اور سوچتے ہی سوچتے سو گیا۔

☆☆☆

حمدو نے یہ روش اختیار کی کہ جب بھی گلنار کو آتے دیکھتا، فیروز بخت کے خلاف سخت رویہ اختیار کرتا اور اس کو ایسی ایسی سناتا کہ فیروز بخت یہ جاننے کے باوجود کہ یہ سب دکھاوے کے لیے ہے برداشت نہ کر پاتا اور رونے لگتا لیکن گلنار کے جاتے ہی حمدو معافی مانگ لیتا اور فیروز بخت بہل جاتا۔ اتالیق کی آمدورفت جاری تھی اور وہ کسی مطالبے کے بغیر فیروز بخت کی تعلیم و تربیت میں مشغول تھا۔ گلنار یہ تماشا بڑی بے چینی سے دیکھ رہی تھی۔ اس بے چینی اور الجھن میں ایک سال نکل گیا۔ فیروز بخت بھی خاصا بدل گیا۔ اب اس میں پہلے کے مقابلے میں سمجھ بھی زیادہ آ گئی تھی اور حالات کا مقابلہ کرنے کی ہمت بھی بڑھ گئی تھی۔

گلنار ڈر رہی تھی کہ اگر اس کا بھائی داؤد واپس آ گیا تو اسے کیا جواب دے گی اور اس کی بڑی بے عزتی ہو جائے گی۔ اس لیے اس نے خوب اچھی طرح غور و فکر کر کے دو لائحہ عمل پر خود کو آمادہ کیا۔ پہلا لائحہ عمل یہ تھا کہ اس کو مشہدی کی بیوی کے حوالے کر دیا جائے اور دوسرا تھا اس کا ہمیشہ کے لیے قصہ پاک کر دینا چاہیے۔ اس نے فجر کے بعد مشہدی کی بیوی کو طلب کیا۔ اس کو کچھ رقم دی اور کہا۔ "جس طرح بھی ممکن ہو، فیروز بخت کو اپنے ساتھ لے جا اور میرا پیچھا چھڑا۔"

مشہدی کی بیوی نے جواب دیا۔ "بی بی! اگر میرا شوہر بھی میرے ہی جیسا ہوتا تو آج یہ بدبخت اس حویلی کے بجائے میرے اپنے گھر میں ہوتا لیکن وہ میری مخالفت کرتا ہے۔ کہتا ہے فیروز بخت کو حویلی میں رہنے دو۔"

گلنار نے سختی سے کہا۔ "لیکن میں نے اس سے یہ اندازہ لگایا ہے کہ تم دونوں میاں بیوی فیروز بخت کو حویلی میں داخل کر کے میری دولت، جائداد اور کاروبار پر قبضہ کرنا چاہتے ہو لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔"

مشہدی کی بیوی نے دونوں ہاتھ کان پر رکھے۔ "میری توبہ۔ میں نے تو یہ سوچا تک نہیں۔ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

گلنار نے جواب دیا۔ "میں نے جو کچھ کہا ہے، خوب سوچ سمجھ کر کہا ہے۔ میں تجھے اس کا بہت اچھا سبق دے سکتی ہوں لیکن میں ایسا اس لیے نہیں کروں گی کہ میں غریبوں کی آہ نہیں لوں گی۔ اب تو اس کو اپنے ساتھ لے جا۔ اگر تو اس کو اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو گئی تو میں تجھے مالا مال کر دوں گی۔"

مشہدی کی بیوی نے جواب دیا۔ "اچھا بی بی! آپ مجھے فیروز بخت کے پاس لے چلیے، میں ابھی بات کیے لیتی ہوں۔"

گلنار اس کو ساتھ لے کر فیروز بخت کے پاس چلی گئی۔ اس وقت حمدو فیروز بخت کے لیے پھل لے گیا تھا اور فیروز بخت سیب کی ایک قاش منہ میں رکھ چکا تھا۔ حمدو نے گلنار کو خلاف توقع آتا دیکھا تو فیروز بخت کی طرف بڑھا اور سامنے رکھی ہوئی سیب کی طشتری اٹھائی اور فیروز بخت کے گال پر ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ برا بھلا کہتے ہوئے بولا۔ "میں یہ پوچھتا ہوں کہ میری لاعلمی میں یہ سیب کس نے پہنچا دیے تیرے پاس؟ جو کچھ منہ میں ہے تھوک دے ورنہ میں گلا دبا کر نکال لوں گا تیرے حلق سے۔"

فیروز بخت نے سیب کی قاش پوری طرح چبائے بغیر ہی اگل دی اور کوئی جواب نہیں دیا۔

حمدو نے اس کا گلا پکڑ لیا اور اس کو دبانے لگا، بولا۔ "کیا تو نے میری بات سنی نہیں؟ میں کیا کہہ رہا ہوں؟"

فیروز بخت نے منہ کھول کر دکھا دیا۔ "یہاں تو کچھ بھی نہیں۔ اگر یقین نہیں آتا تو خود دیکھ لے۔"

حمدو نے طیش میں کہا۔ "میں تیرا منہ کیوں دیکھوں، میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ آخر یہ سیب کس طرح آئے، پہنچائے کس نے؟"

فیروز بخت کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس کا نام لے، آخر کہہ دیا۔ "میں نہیں جانتا کہ یہاں کون لایا۔ یہ سیب مجھے تو یہاں رکھے ہوئے مل گئے تھے۔ میں سمجھا کہ میرے ہی لیے رکھے گئے ہیں۔"

حمدو نے اس کی مرمت شروع کر دی، بولا۔ "میں نے یہ مار بھی تیرے لیے ہی اٹھا رکھی ہے، لے یہ بھی لے لے۔"

گلنار، فیروز بخت کو پٹتے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ بہ ظاہر مشہدی کی بیوی کو دیکھ کر افسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھ لیا تو نے اپنی آنکھوں سے کہ اس حویلی میں تیری اولاد کی کیا عزت ہے؟''

مشہدی کی بیوی نے جواب دیا۔ ''ہاں دیکھ لیا، یہ اس کا مستحق بھی ہے۔'' پھر فیروز بخت سے پوچھا۔ ''او نا ہنجار بچے بتا، اب تیرے کیا ارادے ہیں؟ اگر تو میرے ساتھ چلا چلے تو تیری جان اس مار پیٹ اور دھول دھپے سے چھوٹ جائے گی ورنہ یہیں جوتے کھاتا رہ۔''

فیروز بخت نے کہا۔ ''میں مار کھا لوں گا مگر رہوں گا اسی حویلی میں۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا کیونکہ میں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ جیوں گا تو اسی حویلی میں اور اگر مروں گا تو اسی حویلی میں۔''

مشہدی کی بیوی نے فیروز بخت کا گریبان پکڑ کر گھسیٹا، بولی۔ ''چل میرے ساتھ ورنہ اپنی جان اور تیری جان ایک کردوں گی۔''

فیروز بخت نے مشہدی کی بیوی کو دھکا دے کر گرا دیا، بولا۔ ''او ظالم عورت! وہ دن گئے جب میں تیرے ظلم سہہ لیا کرتا تھا۔ خبردار جو میرے جسم کو ہاتھ لگایا۔''

مشہدی کی بیوی کا خون کھول گیا۔ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی بولی۔ ''حویلی میں حرام کی کھا کھا کر بڑی طاقت آگئی ہے۔ تو نے دھکا دے کر مجھے گرا دیا۔ میں اس کا بدلہ لوں گی۔''

وہ چیخ چیخ فیروز بخت پر پل پڑی۔ حمدو نے مشہدی کی بیوی کو دھکا دے کر الگ کردیا۔ ''بی بی! اب اس پر اتنا ظلم بھی نہ کر، میں اس کو پہلے ہی بہت مار چکا ہوں۔ اب تجھے نہیں پیٹنے دوں گا۔''

گلنار شیرنی کی طرح بپھر کر حمدو کے سر پر پہنچ گئی۔ غضب ناک آواز میں کہا۔ ''حمدو! ان دونوں کے جھگڑے میں تو کیوں پڑ رہا ہے؟''

حمدو نے جواب دیا۔ ''بی بی! آپ مانیں یا نہ مانیں، یہ بڑی زیادتی ہے۔ آپ اس عورت کو حویلی سے نکال دیں ورنہ کوئی ناخوشگوار واقعہ ہوجائے گا تو آپ اس کو سنبھال نہیں سکیں گی۔''

گلنار کچھ ڈری، پوچھا۔ ''کیا ناخوشگوار واقعہ ہوجائے گا؟''

حمدو گلنار کو ایک طرف لے گیا۔ سرگوشی میں سمجھایا۔ ''بی بی! اتالیق کی تعلیم و تربیت نے لڑکے میں ہمت اور سرکشی پیدا کردی ہے اور مجھے صاف نظر آرہا ہے کہ مشہدی کی بیوی کا کام تمام ہوجائے گا۔ اگر خدانخواستہ میرا اندیشہ درست نکلا تو آپ مشہدی کی بیوی کی لاش کو کہیں چھپاتی پھریں گی۔''

گلنار نے کہا۔ ''تیرے اندیشے درست ہیں۔ یہ لڑکا تو میرے لیے مصیبت بن گیا ہے۔ تو ہی بتا میں اس سے کس طرح نجات حاصل کروں؟''

حمدو نے جواب دیا۔ ''پہلے مشہدی کی بیوی کو حویلی سے رخصت کردیجیے، اس کے بعد میں کوئی مشورہ دوں گا۔''

گلنار فوراً مشہدی کی بیوی کے پاس پہنچی اور اسے حکم دیا۔ ''اے عورت! اب تو یہاں سے چلی جا کیونکہ فیروز بخت کے تیور بتا رہے ہیں کہ اب یہ اس حویلی سے نہیں جائے گا اور اب میں بھی اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ فیروز بخت کو یہیں رہنے دیا جائے۔ یہ ہمارا کیا لیتا ہے اگر یہاں رہنے سے اس کی زندگی بنتی ہے تو بننے دی جائے۔ اب میں بھی اس کی مخالفت سے باز آتی ہوں۔''

مشہدی کی بیوی حیران و پریشان گلنار کی شکل دیکھتی رہ گئی۔ فیروز بخت۔۔۔ غموں سے چور گلنار کی زبان سے ہمدردی آمیز کلمات سن کے بے اختیار ہوگیا اور گلنار کے پاؤں پکڑ لیے۔ ''گلنار میری مالکہ! میں آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔ میں قسم کھا کر یقین دلا سکتا ہوں کہ میں کوئی کمین نہیں ہوں۔ میرا ضمیر کہتا ہے کہ میرے والدین شریف تھے کیونکہ میں اپنے کسی محسن کے لیے ہمیشہ اچھے جذبات محسوس کرتا ہوں۔ میں آپ کے احسانات کا بدلہ اپنی زندگی تک سے اتارنے کی صلاحیت اور ہمت رکھتا ہوں۔ آپ مجھے آزما کر تو دیکھیں۔''

گلنار نے مشہدی کی بیوی کو گھور کر دیکھا اور سختی سے حکم دیا۔ ''تو ابھی تک یہیں موجود ہے؟ تو جاتی کیوں نہیں؟ میں کہتی ہوں تو اپنا ایک لمحہ ضائع کیے بغیر چلی جا یہاں سے۔ اب یہ یہیں اس حویلی میں رہے گا۔''

مشہدی کی بیوی لرزتی، کانپتی چلی گئی لیکن اب اسے گلنار پر بھی غصہ آرہا تھا۔

اب گلنار نے پینترا بدلا اور فیروز بخت کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ''فیروز بخت! میں اپنے کیے پر نادم ہوں۔ مجھے معاف کردے۔'' پھر حمدو سے کہا۔ ''وہ سیب کی طشتری کہاں رکھ آیا تو ذرا لے تو آ۔ مجھے تو یہ بھوکا لگ رہا ہے۔''

فیروز بخت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، وہ جذبۂ احسان مندی سے مغلوب ہوکر گلنار سے چمٹ جانا چاہتا تھا لیکن اپنے کمتر ہونے کے احساس سے وہ ایسا نہیں کرسکا۔

آنسوؤں سے لبریز آنکھیں لمحہ بھر کے لیے اوپر اٹھائیں۔ گلنار کے چہرے پر ڈال کر پھر جھکالیں۔ گلوگرفتہ آواز میں کہا۔ ''میری محسنہ! میری مالکہ! میں آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں؟ میں اس کا کوئی معاوضہ تو نہیں دے سکوں گا لیکن اس طرح میں آپ کا بے دام غلام ضرور ہوگیا ہوں۔''

گلنار نے آہستہ آہستہ اس کی پشت تھپتھپائی اور کہا۔ ''فیروز بخت! جو کچھ ہوا ہوگیا۔ اب تجھ پر کوئی زیادتی نہ ہوگی۔ اب میری آنکھیں کھل چکی ہیں اور ابھی ابھی میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ تیرے لیے جو کچھ بھی کرسکتی ہوں، ضرور کروں گی اور یہی میرا کفارہ بھی ہوگا۔''

فیروز بخت، گلنار کے سامنے کھڑا روتا رہا اور گلنار اس کو تسلیاں اور دلاسے دیتی رہی۔

☆☆☆

پوری حویلی رات کی سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ فیروز بخت اپنی بیدار قسمت پر سوچ سوچ کر لطف اندوز ہو رہا تھا۔ سدا کی ناکامیوں کا شکار دل بہت خوش تھا اور فیروز بخت کو اپنا روشن اور تابناک مستقبل اپنے سامنے کھڑا دکھائی دے رہا تھا۔ ابھی تک جس سے اسے دکھ پہنچا تھا، ان کے نام بار بار ذہن کی سطح پر ابھر ابھر کر غائب ہو رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ جس دن بھی دادا کے کاروبار، دولت اور جائداد کا مالک بنے گا، گلنار کی وفاداری کا حلف ضرور اٹھائے گا۔ اس کی ذہنی سطح پر وہ نام بھی ابھر رہے تھے جنہوں نے اس کو ستایا تھا اور وہ اس کے انتقام کے مستحق تھے۔ کبھی دل کہتا ان سے بدلہ ضرور لینا اور کبھی اندر سے یہ آواز لگاتا کہ معاف کردے بھول جا۔ دوسری طرف گلنار بہت بے چین تھی اور خالی دماغ میں معلوم نہیں کیا کیا آرہا تھا۔ حمرو، گلنار کی خواب گاہ میں چوری سے داخل ہوا۔ فیروز بخت کا پرانا خدمت گار حمرو کو خواب گاہ میں جاتے دیکھتا رہا۔ وہ حمرو کی جرأت اور بے باکی پر حیران تھا۔ وہ گلنار کی خواب گاہ کے پاس ہی برآمدے میں اس طرح بیٹھ گیا کہ ایک ستون سے آڑ لیے ہوئے تھا اور رات کی سیاہی اس کی پردہ پوشی کررہی تھی۔ وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ حمرو اندر کتنی دیر رہتا ہے۔

گلنار، حمرو کو دیکھتے ہی مسہری سے نیچے آگئی اور مضطربانہ سوال کیا۔ ''حمرو! تو آگیا؟ میں تو تیرا انتظار ہی کررہی تھی۔''

حمرو نے جواب دیا۔ ''ہاں میں آتو گیا ہوں لیکن ڈر رہا ہوں کہ کہیں کسی نے آتے ہوئے دیکھ نہ لیا ہو۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو آپ کی بڑی بدنامی ہوگی اور میرا حویلی میں اعتبار اٹھ جائے گا۔''

گلنار نے کہا۔ ''لیکن دن میں آزادی سے بات کرنا مشکل ہے۔ مجھے کسی پر اعتبار نہیں رہا، حویلی کی فضا مکدر ہوگئی ہے۔''

حمرو نے جواب دیا۔ ''اس میں کیا شک، فیروز بخت کا خدمت گار سب سے زیادہ ناقابلِ اعتبار ہے کیونکہ اس نے مجھ سے، جس قسم کی باتیں کی ہیں، اگر میں ان کا تفصیل سے ذکر کروں تو آپ جوشِ غضب سے دیوانی ہوجائیں گی۔''

گلنار نے ایک تپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''حمرو! اس پر بیٹھ کر باتیں کر اور تجھے قسم ہے کہ مجھ سے کوئی بات چھپانا نہیں۔ سب کچھ صاف صاف بتادے۔''

حمرو بے تکلفی سے تپائی پر بیٹھ گیا۔ اس کے پاس ہی گلنار بھی بیٹھ گئی۔ دونوں پاس پاس اس طرح بیٹھے تھے کہ آقا اور غلام کا امتیاز باقی نہ رہا۔ گلنار نے بڑی بے چینی سے کہا۔ ''ہاں تو اب بتا وہ کون سی باتیں ہیں جو تو مجھ سے کرنا چاہتا ہے؟''

حمرو نے جواب دیا۔ ''گلنار بی بی! میں آپ کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ آپ فیروز بخت کے خلاف کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں جس سے بعد میں شرمندہ ہونا پڑے کیونکہ فیروز بخت بھی بے یارومددگار تھا مگر اب نہیں ہے۔ اگر اس حویلی میں اس کو کچھ ہوگیا تو یہ سمجھ لیجیے کہ ایک قیامت اٹھ کھڑی ہوگی۔ بات بادشاہ تک پہنچ جائے گی۔''

گلنار نے کہا۔ ''یہ بات تو میں خود بھی سمجھ چکی ہوں لیکن حمرو میں یہ قطعی فیصلہ کرچکی ہوں کہ فیروز بخت ہم میں نہیں رہے گا۔ اگر یہ یہاں رہ گیا تو میں اسے اپنی ہار سمجھوں گی۔''

حمرو نے جواب دیا۔ ''بی بی! آپ فیروز بخت سے خوشگوار تعلقات رکھیں۔ اس سے اچھا سلوک کریں تاکہ وہ آپ کو اپنا ہمدرد اور بہی خواہ سمجھنے لگے کیونکہ میں نے تجربے سے ایک بات سیکھی ہے۔ آپ اپنے دشمن کو علی الاعلان نفرت سے زیر نہیں کرسکتیں، ہاں اس سے محبت آمیز سلوک کرکے اگر اس کو غافل کردیں گی تو اس کا بہ آسانی قلع قمع کرسکیں گی۔''

گلنار نے بے چینی سے ٹہلنا شروع کردیا۔ بالکل بھوکی شیرنی کی طرح تحکمانہ لہجے میں بولی۔ ''حمرو! میں کچھ نہیں جانتی۔ اب میں اس جھگڑے کو ختم کردینا چاہتی ہوں۔ میں اس بدبخت کا قصہ پاک کردینا چاہتی ہوں۔ اگر اس سلسلے میں تو میری مدد کرسکتا ہے تو کر ورنہ میں کسی اور کا انتظام کرتی ہوں۔''

حمدو نے کچھ پس و پیش سے کہا۔ ''میں آپ کا یہ کام کرسکتا ہوں لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا آپ سمجھ بیٹھی ہیں۔ اور آپ کو یہ بات بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ اگر آپ نے اس راز میں کسی اور کو شریک کیا تو چند پریشانیاں اور مول لے لیں گی۔''

گلنار نے جواب دیا۔ ''میں کچھ نہیں جانتی، میں اس لڑکے سے زیادہ دنوں تک مفاہمت نہیں کرسکتی۔''

حمدو نے کہا۔ ''لیکن آپ کو اپنی مرضی کے خلاف یہ سب کرنا پڑے گا۔ ویسے یہ کام میں انجام دے سکتا ہوں مگر اس کے لیے آپ کو بھی کچھ کرنا پڑے گا۔''

گلنار نے تڑپ کر جواب دیا۔ ''تو کچھ نہ کچھ کی بات کررہا ہے، میں یہ کہہ رہی ہوں کہ میں اپنی مقصد برآری کی خاطر سب کچھ کرگزرنے کے لیے تیار ہوں۔''

حمدو نے ادھر ادھر دیکھ کر گلنار کی طرف دیکھا اور اپنی نظریں جھکالیں۔ آہستہ سے پوچھا۔ ''پھر میں عرض کروں؟''

گلنار نے تیزی سے کہا۔ ''کہہ کہہ، سوچتا کیا ہے؟''

حمدو نے کہا۔ ''یہ کام جو آپ مجھ سے لینا چاہتی ہیں، بڑا خطرناک ہے اور میں نے تو ابھی دنیا کا مزہ بھی نہیں اٹھایا۔''

''کیا مطلب......؟'' گلنار اس کے قریب آکھڑی ہوئی۔ ''تو کہنا کیا چاہتا ہے، صاف صاف کہہ۔''

حمدو گھبرا رہا تھا مگر کوئی جذبہ اس کی ہمت افزائی بھی کررہا تھا۔ بولا۔ ''بی بی! سیدھی سی بات تو یہ ہے کہ میری تو ابھی تک شادی بھی نہیں ہوئی، اگر میں اس پُرخطر کام میں پھنس گیا اور پھر کیفر کردار کو پہنچا دیا گیا تو میری ساری حسرتیں دل کی دل میں رہ جائیں گی۔''

''مطلب بیان کر؟''

''میں مضبوطی چاہتا ہوں، تحفظ کا خواہش مند ہوں۔''

گلنار نے کہا۔ ''تو منصوبہ بتا، دولت میں خرچ کروں گی۔''

حمدو نے رک رک کر کہا۔ ''دولت پر مجھے اعتبار نہیں ہے۔ میں آپ کے دل میں وہ جذبہ ٹٹول رہا ہوں جو کسی برے وقت میں میری حفاظت کرسکتا ہے جس پر میں اعتماد کرسکتا ہوں۔''

گلنار نے درشت لہجے میں کہا۔ ''صاف صاف بات کیوں نہیں کرتا، آخر تو کہنا کیا چاہتا ہے؟''

حمدو نے بڑی بے حیائی سے کہا۔ ''بی بی! میں آپ کی محبت چاہتا ہوں۔ میری ابھی تک شادی نہیں ہوئی اور آپ بیوہ ہوچکی ہیں۔ مجھے عورت کی ضرورت ہے اور آپ کو ایک مرد کی......''

گلنار نے حمدو کے گال پر ایک تھپڑ رسید کردیا۔ ''تو کیا کہہ رہا ہے، کچھ سمجھ بھی رہا ہے؟''

حمدو نے گال سہلاتے ہوئے منہ بنا کر کہا۔ ''میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، خوب سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں اور میری آپ سے درخواست ہے کہ میں نے جو کچھ کہا اس کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔''

گلنار نے جواب دیا۔ ''میں فیروز بخت کو اس لیے دفعان کرنا چاہتی ہوں کہ وہ میرے خاندان کا نہیں۔ تو اس حویلی کا ملازم ہے اور خدا کی شان کہ تو اتنی بڑی بات سوچ رہا ہے۔ میں تجھے قتل کرا دوں گی۔ تو نے بہت بڑی گستاخی کی ہے۔ تو اسی وقت نکل جا میری خواب گاہ سے، ورنہ میں تجھے......''

حمدو نے بات کاٹ دی، بولا۔ ''میں خواب گاہ سے نہیں نکلوں گا کیونکہ میں یہاں خود سے نہیں آیا ہوں۔ آپ نے مجھے بلایا تھا اس لیے میں آگیا۔ آپ معاملے کی نزاکت پر غور کیجیے۔ اگر اس وقت ہم دونوں نے شور و غل کیا تو رسوائی کس کی ہوگی؟ یہ بھی تو سوچیے۔''

گلنار نے بھنچی بھنچی آواز میں کہا۔ ''میں کہتی ہوں تو یہاں سے نکل جا، میں فیروز بخت کو نہیں قتل کرا دوں گی میں تجھ سے کوئی کام نہ لوں گی کیونکہ تو موقع پرست اور ابن الوقت ہے۔''

حمدو ذرا بھی پریشان نہیں تھا، بڑے اطمینان سے بولا۔ ''میں نے کہہ جو دیا کہ میں یہاں سے اس وقت تک نہیں جاؤں گا جب تک اپنا مطلب حاصل نہ کرلوں۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ میں اس کا چرچا نہیں کروں گا۔ بالکل اسی طرح راز رکھوں گا جس طرح فیروز بخت کے قتل کا راز رہے گا۔''

گلنار اسے دھکے دے کر نکال دینا چاہتی تھی لیکن ہاتھ لگاتے ہوئے ہچکچاتی تھی۔ دانت کچکچا کر بولی۔ ''میں شور کرکے خدمت گاروں کو بلالوں گی کہ تو میری اجازت کے بغیر میری خواب گاہ میں گھس آیا ہے۔''

حمدو نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''آپ جو چاہیں کریں، مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن آپ جو کرنا چاہتی ہیں، اس کا اعلان کرکے مجھ سے نہیں جیت سکتیں۔ اب ہم دونوں کی بہتری اسی میں ہے کہ ہم دونوں فیروز بخت کے معاملے میں ایک سمجھوتا کرلیں۔ میں آپ کے خدمت گار کی طرح فیروز بخت ہی کو نہیں جس کو کہیں گی ٹھکانے لگادوں گا لیکن شرط یہی ہے کہ آپ بھی میری خواہش پوری کرتی رہیں۔''

گلنار کھسیا رہی تھی، بولی۔ ''تو بڑی جرأت کررہا ہے۔ اگر یہ بات مشہور ہوگئی اور بھائی داؤد کو بھی اس کا علم

ہو گیا تو کچھ پتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟"

حمرو نے جواب دیا۔ "معاملاتِ شوق میں انجام ونجام نہیں سوچا جاتا۔ اگر میں آپ کے وصل کا مزہ چکھ لوں تو اس کے بعد میں ہر وقت اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے پر آمادہ و تیار نظر آؤں گا۔"

"میں پھر بھی کہوں گی کہ تو اپنی حد سے بڑھ رہا ہے ذرا ہوش میں آ۔"

حمرو نے جواب دیا۔ "پہلے تو میں ہوش میں تھا لیکن جب سے اس خواب گاہ میں آیا ہوں، اپنے ہوش وحواس گنوا چکا ہوں۔"

گلنار نے اپنا سر پکڑ لیا۔ "میں کس مصیبت میں پھنس گئی تجھ کو اعتماد میں لے کر؟"

حمرو نے جواب دیا۔ "گلنار بی بی! افسوس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، آگے بڑھیے اور معاملہ پکا کر لیجیے۔"

لیکن اسی وقت فیروز بخت کے خدمت گار نے دروازے پر دستک دی اور پھر تواتر سے دستک دیتا رہا، وہ سرگوشی میں کہہ رہا تھا۔ "گلنار! دروازہ کھولیے، مالک واپس آ گئے۔"

اس آواز اور آواز کے مفہوم نے گلنار سے زیادہ حمرو کو پریشان کر دیا۔ تیزی سے دروازہ کھلا اور حمرو رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر ایک طرف فرار ہو گیا۔ حمرو اتنی تیزی سے بھاگا تھا کہ اس کو یقین تھا کہ خدمت گار اسے نہیں پہچان سکا ہوگا۔

گلنار شرمائی شرمائی کمرے کے دروازے پر آ کھڑی ہوئی، پوچھا۔ "کون ہے، ستار، فیروز بخت کے خدمت گار؟ کون آ گیا؟ کہاں آ گیا؟"

خدمت گار گلنار کے قریب چلا گیا۔ اس نے کمرے سے آنے والی مدھم روشنی میں گلنار کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی لیکن صاف نہیں دیکھ سکا۔ خدمت گار کو ایک موقع ہاتھ آ گیا تھا، پوچھا۔ "گلنار بی بی! یہ حمرو آپ کی خواب گاہ میں کیوں آیا تھا؟"

گلنار نے انکار کر دیا۔ "میری خواب گاہ میں حمرو آیا تھا؟ یہ کس نے کہہ دیا تجھ سے؟"

خدمت گار نے جواب دیا۔ "گلنار بی بی! مکریے نہیں، میں نے اس کو داخل ہوتے بھی دیکھا تھا اور چوروں کی طرح فرار ہوتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔"

گلنار بہت چڑچڑی ہو رہی تھی، پوچھا۔ "بھائی داؤد کہاں ہیں؟"

خدمت گار نے جواب دیا۔ "مالک تو نہیں آئے لیکن میں نے حمرو کی واپسی کا بڑا انتظار کیا۔ جب وہ آپ کی خواب گاہ سے دیر تک نہیں نکلا تو میں نے اسے بھگانے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا۔"

گلنار ایک دم چراغ پا ہو گئی، چیختی ہوئی بولی۔ "کیا قیامت ہے، بھائی داؤد کیا گئے کہ خدمت گار تک شیر ہو گئے۔"

وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔ خدمت گار گھبرا گیا۔ پہلے تو اس کے جی میں آئی کہ بھاگ کھڑا ہو لیکن بھاگنے سے پہلے ہی دوسرے خدمت گار بھی وہیں پہنچنے لگے اور خدمت گار کو بھاگنے کا موقع ہی نہ ملا۔ ان میں حمرو سب کے آخر میں آیا۔

کسی خدمت گار نے پوچھا۔ "بات کیا ہے؟"

گلنار نے فیروز بخت کے خدمت گار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "خدا کے لیے اس مردود سے میرا پیچھا چھڑاؤ، یہ رات کے سناٹے میں میری خواب گاہ میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب میں اسے ایک پل بھی حویلی میں رہنے نہیں دوں گی۔"

خدمت گار فیروز بخت کے خدمت گار پر جھپٹے۔ ان جھپٹنے والوں میں حمرو بھی تھا۔

فیروز بخت کا خدمت گار انہیں سمجھانے لگا۔ "بھائیو! میری بات تو سن لو پہلے۔ میں نے گلنار بی بی کی خواب گاہ کا دروازہ نہیں تھپتھپایا تھا۔ یہ مجھ پر الزام لگا رہی ہیں۔ یہ مجھ پر تہمت لگائی جا رہی ہے۔ واقعہ اس کے برعکس ہے اور مجھے تو اس کو دہراتے ہوئے بھی شرم محسوس ہو رہی ہے۔"

حمرو نے آگے بڑھ کر خدمت گار کو پکڑ لیا اور دوسرے خدمت گاروں سے کہا۔ "بھائیو! یہ حویلی کی عزت کا معاملہ ہے۔ گلنار بی بی نے جو کچھ کہا، کیا اس سے ہمیں غیرت نہیں آئی؟ یہ تو بڑے شرم کی بات ہے۔"

خدمت گار نے حمرو کو دھکا دے کر خود کو چھڑانے کی کوشش کی، بولا۔ "کیا یہ غلط ہے کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو اس خواب گاہ میں گھسا تھا؟"

حمرو ہنس دیا، مذاق اڑاتے ہوئے بولا۔ "دوستو! ذرا اس کی بدحواسی تو ملاحظہ فرمائیے یعنی میں اس خواب گاہ میں تھا گویا۔"

گلنار بدستور چیختے جا رہی تھی۔ "میں تم سب کو حکم دیتی ہوں کہ اس کو خوب خوب پیٹو اور ادھ موا کر کے حویلی سے باہر نکال دو۔"

گلنار کے حکم کی اس طرح تعمیل ہوئی کہ خدمت گار

کے پہلا تھپڑ حمدو نے رسید کیا اور اس کے بعد دوسرے خدمت گار برس پڑے۔ خدمت گار ستار نے بھی ان کا مقابلہ کرنا چاہا لیکن دو چار ہاتھ مارنے کے بعد دوسروں کی مار سے بے دم ہو کر گر گیا۔

گلنار برابر چیخ رہی تھی۔ ''اس نے میری عزت آبرو کا مذاق اڑایا ہے۔ مجھ پر تہمت لگائی ہے اور خراب نیت سے میری خواب گاہ پر دستک دی تھی۔ میں تو اس کو نہیں معاف کر سکتی، میں اس کا خون پی جاؤں گی۔''

حمدو نے گلنار کو سمجھایا۔ ''نہیں گلنار بی بی! اسے ادھ موا کر کے حویلی کے باہر پھکوا دیجیے۔ اس نے جو کچھ کیا، اس کے ہم سب گواہ ہیں اور اس نے جو کچھ کرنا چاہا تھا، اس کے پس منظر اور مقصد سے بھی آگاہ ہیں۔ اس لیے اس کی قدیم خدمات کے پیش نظر حویلی سے نکلوا کر یہ حکم دے دیجیے کہ آئندہ یہ کہیں نظر نہ آئے ورنہ بہت برا انجام ہوگا۔''

گلنار نے اپنی خواب گاہ میں واپس جاتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگ جو مناسب سمجھو کرو کیونکہ میرا دماغی توازن درست نہیں ہے اور میں جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی ایسا ویسا قدم نہ اٹھا دوں تو مجھے اس کی نمک خواری کے پیشِ نظر بعد میں افسوس ہوگا۔''

خدمت گار ستار اتنا پٹ چکا تھا کہ مزاحمت کی طاقت ہی نہ رہی تھی۔ شور و غل سن کر فیروز بخت بھی وہاں پہنچ گیا اور اس نے اپنے خدمت گار کو ادھ موا دیکھا تو بے چین ہو گیا۔ بے اختیار اس پر جھک گیا اور بڑے کرب سے پوچھا۔ ''تم لوگ اسے کیوں مار رہے ہو؟ اس کا گناہ؟''

حمدو نے فیروز بخت کو آغوش میں سمیٹ کر ایک طرف کر دیا، بولا۔ ''چھوٹے مالک! آپ نہ پڑیے اس معاملے میں۔ اس نے ایک ایسا گناہ کیا ہے کہ اگر مالک یہاں ہوتا تو قتل کر دیتا۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''لیکن یہ تو بہت شریف انسان ہیں۔''

اس وقت خواب گاہ کا دروازہ کھلا اور اندر سے گلنار نکلی۔ فیروز بخت کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر لے گئی اور دروازہ دوبارہ بند کر لیا۔

فیروز بخت کو اپنی مسہری پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ ''فیروز بخت! تو خود بھی جانتا ہے کہ اس حویلی کا وارث تو ہے اور بھائی داؤد نے تجھے اپنا بیٹا بنا لیا ہے۔ اس تعلق سے میں تیری اور اس حویلی کی عزت و آبرو ہوں، کیا تجھ کو معلوم ہے کہ آج تیرے خدمت گار نے میرے ساتھ کیا کیا؟''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''مجھ کو کچھ نہیں معلوم۔''

گلنار نے شرما کر کہا۔ ''آج اس نے میری خواب گاہ کے در پر دستک دی۔ اس کی نیت خراب تھی اور خدا نے مجھ کو بال بال بچا لیا۔''

فیروز بخت نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ''تب پھر اس کے ساتھ جو کچھ ہوا خوب ہوا۔ وہ اسی سلوک کا مستحق تھا۔''

گلنار بڑی دیر تک اس سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہی۔ فیروز بخت اب خود کو حویلی کا اہم ترین فرد سمجھنے لگا تھا اور جب گلنار نے اس سے درخواست کی کہ وہ اس رات اس کی خواب گاہ میں رہ جائے تو اس کو اپنے لیے بڑی عزت اور فخر کی بات سمجھ کر وہ رک گیا۔

کافی رات گئے گلنار کی خواب گاہ پر پھر دستک ہوئی۔ فیروز بخت ابھی تک جاگ رہا تھا۔ دستک کی آواز پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ گلنار بھی جاگ رہی تھی لیکن اس نے سونے کی اداکاری کی اور وہ دستک پر دستک دینے والے کو پہچان گئی تھی۔ گلنار نے اشارے سے فیروز بخت کو سمجھایا کہ کسی کو بھی میری بابت کچھ بھی نہ بتایا جائے۔

فیروز بخت نے دروازے سے کان لگا کر دریافت کیا۔ ''کون ہے اور آپ اتنی رات گئے کس سے ملنے آئے ہیں؟''

باہر سے حمدو نے جواب دیا۔ ''جناب! میں حمدو بول رہا ہوں۔ دروازہ کھولیے، میں چند باتیں کر کے واپس چلا جاؤں گا۔''

گلنار نے اشارے سے فیروز بخت کو سمجھایا کہ حمدو سے پوچھے وہ مجھ سے کس قسم کی باتیں کرے گا اور یہ کہ اس وقت میں خواب گاہ میں نہیں ہوں۔

جب فیروز بخت نے حمدو سے یہ سب کچھ کہا تو وہ برا مان گیا، بولا۔ ''فیروز بخت! تم میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کر رہے ہو۔ حالانکہ میں نے تو ایک دن اور ایک بار بھی کوئی کام تم سے نہیں لیا اور نہ آئندہ کوئی کام لینے کا ارادہ ہے اور میں نے تمہارا خیال ہی رکھا ہے۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''اس وقت خواب گاہ میں گلنار بی بی تشریف نہیں رکھتیں۔ جب آئیں گی تو تمہارا پیغام انہیں پہنچا دوں گا۔''

حمدو نے کہا۔ ''ان سے کہہ دینا کہ میں نے خدمت گار کی اتنی پٹائی کروا دی ہے کہ وہ ہفتوں اپنے پیروں سے نہیں چل سکتا۔''

حمدو تو یہ کہہ کر چلا گیا مگر گلنار کو چین نہیں ملا۔ فیروز بخت سے کہا۔ ''فیروز بخت! میں تجھ کو اپنے قریب ہی رکھوں گی اور

راتوں کو اس خواب گاہ میں سلاؤں گی تا کہ مجھے ڈر نہ لگے۔"

فیروز بخت کو رہ رہ کر اپنے خدمت گار کی رکیک حرکت پر غصہ آرہا تھا لیکن وہ کربھی کیا کرسکتا تھا۔ خاموش رہا اور یہ فیصلہ کرلیا کہ آئندہ وہ اپنے خدمت گار کی حمایت نہیں کرے گا اور گلنار کے دامن میں پناہ لے گا۔

صبح حالات معمول پر تھے۔ خدمت گار کی پٹائی پر وہ وقتی طور پر خوش ہوگئی تھی کیونکہ اس وقت حمرو کی خواب گاہ میں موجودگی کے راز پر پردہ ڈالنا مقصود تھا لیکن سب کچھ ہوچکنے کے بعد جب اس نے یک سوئی سے سوچا تو اس کو حمرو سے خوف محسوس ہونے لگا۔ حمرو کی جسارتیں ایک دم ظاہر ہوئی تھیں۔ اب اس کے سامنے کئی مسئلے تھے۔ ایک مسئلے نے کئی مسئلے پیدا کردیے تھے۔ پہلے فیروز بخت مسئلہ بن گیا تھا اور اس مسئلے پر قابو پانے کے لیے جب اس نے دوسروں کا تعاون حاصل کیا اور انتہائی قدم اٹھانا چاہا تو چند نئے مسئلے اٹھ کھڑے ہوئے اور اب اصل مسئلہ تو پس منظر میں چلا گیا اور حمرو ایک نیا مسئلہ بن کر سامنے آگیا تھا۔ اب اس پر قابو پانے کے۔ یہ دماغ سوزی کرنا پڑ رہی تھی۔ پہروں کے غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ فی الحال فیروز بخت سے الجھنا یا اس مسئلے پر سر کھپانا اچھی بات نہیں ہے، پہلے حمرو کا بندوبست کیا جائے۔

گلنار نے خیالوں ہی خیالوں میں تمام خدمت گاروں کا جائزہ لیا تو ان میں سب سے زیادہ وفادار اور سچا فیروز بخت کا خدمت گار ستار ہی نظر آیا۔ اس نے اسے حویلی میں دوبارہ بلوانے کا فیصلہ کرلیا۔ دن کی روشنی میں حمرو، فیروز بخت کے پاس آیا اور مطلع کیا کہ آپ کا اتالیق آیا ہے۔

اس نے گلنار سے بھی نظریں ملانا چاہیں لیکن گلنار نظریں چرا گئی اور کہا۔ "فیروز بخت کے ساتھ میں بھی چلوں گی۔"

حمرو نے کہا۔ "آپ وہاں کیوں جائیں گی' فیروز بخت کی خدمت پر تو مجھے متعین کیا گیا ہے، میں جاؤں گا آپ یہیں رہیں۔"

گلنار نے برا مان کر سختی سے کہا۔ "فیروز بخت کی خدمت پر ستار کو متعین کیا گیا تھا' اس کو ہٹا کر میں نے تجھے متعین کردیا تھا۔ اب میں ہی تجھ کو ہٹا بھی سکتی ہوں اور دوسری بات یہ کہ تو میری مرضی اور میرے فیصلوں پر رائے زنی کرنے والا کون ہے؟"

حمرو نے نرمی سے کہا۔ "آپ مالک ہیں جسے جو چاہیں حکم دیں۔"

گلنار نے حکم دیا۔ "ستار کہاں ہے اس کو بلالا۔"

حمرو نے پوچھا۔ "ستار کو؟ اس ستار کو جو رات آپ کی خواب گاہ میں داخل ہونے کی کوشش کررہا تھا۔"

گلنار تلملا گئی، بولی۔ "ہاں اسی ستار کو اور یہ میں کسی اور سے بہتر جانتی ہوں کہ میری خواب گاہ میں کون داخل ہوا تھا اور کس کے کیا ارادے تھے؟"

حمرو نے جواب دیا۔ "اچھا تو کسی اور نے بھی آپ کی خواب گاہ میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی اور کوئی داخل ہو بھی گیا تھا۔"

گلنار کا اشتعال بڑھتا جارہا تھا، بولی۔ "حمرو! میں حکم دے رہی ہوں اس کی تعمیل کرو ورنہ میں تیرے خلاف بھی کوئی سخت قدم اٹھاسکتی ہوں۔"

حمرو چلا گیا، فیروز بخت نے پوچھا۔ "کیا آپ بھی میرے استادِ محترم کے پاس چل رہی ہیں؟"

گلنار نے جواب دیا۔ "ہاں، تیرے ساتھ میں بھی چلوں گی۔"

چلتے چلتے فیروز بخت نے پوچھا۔ "کیا یہ بات درست ہے کہ کسی اور نے بھی آپ کی خواب گاہ میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی اور کوئی داخل بھی ہوگیا تھا؟"

گلنار تیوریوں پر بل ڈال کر ایک دم کھڑی ہوگئی۔ "فیروز بخت! حدِ ادب، تم اپنی حد میں رہو میں اپنے ذاتی معاملات میں مداخلت برداشت نہیں کرسکتی۔"

فیروز بخت ڈر کر چپ ہوگیا۔ وہ دونوں ایک ساتھ اتالیق کے پاس پہنچے، اتالیق احتراماً کھڑا ہوگیا۔ گلنار نے اتالیق سے کہا۔ "استادِ محترم! اگر میں یہیں رہوں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

اتالیق نے جواب دیا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

گلنار نے اتالیق سے کہا۔ "استادِ محترم! داؤد کی عدم موجودگی میں، میں بڑی مشکلات میں پھنس گئی ہوں۔ کچھ آپ ہی مشورے دیں۔"

اتالیق نے جواب دیا۔ "محترم خاتون! مشکلات آسمان سے نہیں آتیں۔ آدمی کی اپنی کوتاہی اور غلطیاں، مشکلات کی صورت اختیار کرلیتی ہیں......"

گلنار نے کہا۔ "اچھا پہلے آپ فیروز بخت کو پڑھالیں، اس کے بعد باتیں کروں گی آپ سے۔"

اتالیق فیروز بخت کی پڑھائی میں مشغول ہوگیا۔ سہ پہر کو حمرو نے بھی گلنار کو مطلع کیا کہ زخمی ستار کہیں چلا گیا ہے تلاش کے باوجود نہیں مل سکا۔

گلنار نے جواب دیا۔ "جب تک ستار مل نہ جائے تو

بھی اس حویلی سے باہر رہے گا۔"

حمرو اس حکم سے پس و پیش میں پڑ گیا۔ گلنار اس کی ذہنی پریشانی اور اس کے ارادوں کو چہرے کے تاثرات میں تلاش کرتی رہی۔

حمرو نے آہستہ سے پوچھا۔" اور فیروز بخت کی خدمت میں کون حاضری دے گا؟"

گلنار نے جواب دیا۔"فیروز بخت میرے ساتھ رہے گا اور اس کی خدمت میں بھی وہی شخص رہے گا جس کو میں پسند کروں گی۔"

حمرو، گلنار کی برہمی دیکھ کر سامنے سے ٹل گیا۔ اتالیق نے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔"محترم خاتون! میں آپ کے بھائی داؤد کے بہی خواہوں اور مداحوں میں سے ہوں۔ اس شریف انسان نے کبھی کبھی مجھ سے ذاتی مشورے بھی لیے ہیں۔ آپ کے اور حویلی کے معاملے میں، میں نے ہمیشہ اس کو یہی مشورہ دیا کہ بیوہ بہن کو اتنی بڑی حویلی میں تنہا مت چھوڑو، جس کا وہ یہ جواب دیتا کہ یہ سارے خدمت گار پشتنی ہیں اور وہ انہیں الگ نہیں کر سکتا لیکن خاتون! شرع اور اسلام کی رو سے ان پشتنی نوجوان خدمت گاروں میں تیرا رہنا جائز نہیں ہے۔ نیتوں کا حال خدا کو ہی معلوم ہے لیکن ہم نادان اور ضعیف البیان انسان حالات اور تجربوں ہی سے سیکھتے اور خود کو بناتے بگاڑتے ہیں۔"

گلنار نے کہا۔" اب میں اپنے خدمت گاروں سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہوں کیونکہ وہ میرے خلاف سازشوں میں مشغول ہیں۔"

اتالیق نے فیروز بخت کی طرف اشارہ کیا۔"خاتون! آپ اس کو اپنا سمجھیں اور اس پر اعتماد کریں۔ جس دن آپ اس پر اعتماد کرنے لگیں گی اور اسے اپنا اور اپنے خاندان کا مسئلہ نہیں بنائیں گی اس دن آپ کو سکون مل جائے گا اور خدمت گار بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔ خاتون! یہ تو آپ جانتی ہی ہیں کہ دھواں وہیں سے اٹھتا ہے جہاں آگ ہوتی ہے۔ سازشیں بھی وہیں ہوتی ہیں جہاں کا ماحول اور ماحول کے افراد سازشی ہوتے ہیں۔"

گلنار نے پوچھا۔" پھر اب میں کیا کروں استادِ محترم؟"

اتالیق نے جواب دیا۔" آپ فوراً ہی اپنے بھائی کو بلا لیجیے اور بھائی کے آنے تک ہر اس خدمت گار کو نکال باہر کریں جو حویلی کی سازشوں میں حصہ لے رہا ہو۔"

گلنار نے آہستہ سے کہا۔"افسوس کہ میں نے ستار کو پٹوا کر بڑی غلطی کی۔ اگر وہ مل جائے تو میں اس کی مدد سے حالات پر قابو پا سکتی ہوں۔"

اتالیق نے جواب دیا۔"اس کی تلاش کوئی مسئلہ نہیں۔ میں تلاش کروا دوں گا۔"

گلنار نے پوچھا۔"میں بھائی داؤد کو کس طرح بلواؤں؟"

اتالیق نے جواب دیا۔" داؤد کو بھی میں ہی بلواؤں گا کیونکہ تجار کی اندرونِ ملک آمدورفت تو جاری ہی رہتی ہے۔ کسی نہ کسی سے آپ کا پیغام داؤد تک پہنچا دیا جائے گا۔"

گلنار نے دیوار کی ڈھلتی ہوئی دھوپ کی طرف دیکھا۔ سہ پہر ہو چکی تھی، شام بھاگی چلی آ رہی تھی اور اسے شام کی آمد سے وحشت ہو رہی تھی۔ اس نے اتالیق سے درخواست کی کہ وہ چند یوم اس حویلی میں رہ جائے لیکن اتالیق کا یہ عذر تھا کہ وہ شاہی خاندان کے چند بچوں کو پڑھاتا ہے اور وہاں جانا بہت ضروری ہے۔ اگر وہاں جانا ضروری نہ ہوتا تو وہ اس حویلی میں رہ بھی سکتا تھا۔

اتالیق چلا گیا اور گلنار، فیروز بخت کو اپنے ساتھ لے کر کمرے میں چلی گئی۔

☆☆☆

حویلی کی پُرسکون فضا میں سرگوشیاں گونج رہی تھیں۔ خدمت گار آپس میں گلنار کی بابت باتیں کر رہے تھے۔ اس نے حمرو کو ستار کی تلاش میں روانہ کیا ہے، اس ستار کی تلاش میں جو رات کی تاریکی میں گلنار کی خواب گاہ کا در کھٹکھٹا رہا تھا۔ اب گلنار اس کے لیے بے چین تھی۔ خدمت گاروں کو ایک نیا موضوع ہاتھ آ گیا تھا...... انہیں یقین تھا کہ ستار اور گلنار میں کسی قسم کی افہام و تفہیم موجود ضرور ہے ورنہ اس کے چلے جانے کے بعد یہ تڑپ کیوں؟ اس کی تلاش کیا معنی رکھتی ہے؟

فیروز بخت بھی حیران تھا کہ اس ذلیل اور نالائق ستار کو دوبارہ کیوں بلوایا جا رہا ہے۔ وہ اس سلسلے میں کسی سے کوئی بات نہیں کر سکتا تھا کیونکہ یہ بات گلنار کو سخت ناگوار گزر رہی تھی۔ جب تک وہ مشہدی کے پاس رہا، اس قسم کے حالات سے بھی واسطہ نہ پڑا تھا۔ وہاں مشہدی کی بیوی کی تلخ کلامیاں اور زیادتیاں تھیں۔ اب جو قسمت نے یاوری کی اور اس حویلی میں داخل کر دیا تو یہاں کا ماحول مشہدی کے گھر سے زیادہ برا نظر آیا۔ یہاں تو اس کی آزادی چھن گئی تھی۔ ایک اچھے مستقبل کی امید میں اسے دھوئیں کے گرداب میں قید کر دیا گیا تھا۔

☆☆☆

کئی دن بعد حمدو واپس آ گیا۔ اس کے ساتھ زخمی ستار بھی آ گیا تھا۔ حمدو نے کئی خدمت گاروں کی موجودگی میں طنزاً کہا۔ ''گلنار بی بی! جس ستار کے لیے آپ پریشان تھیں، اسے میں نے بڑی مشکل سے پایا ہے۔''

گلنار آگ بگولا ہو گئی۔ اپنے کمرے سے مرحوم باپ کا بید اٹھا لائی اور حمدو پر پل پڑی۔ وہ دیوانگی میں چیخ رہی تھی۔ ''میں اس ذلیل حمدو کو جان سے مار دوں گی، میں اسے قتل کر دوں گی۔''

حمدو بھاگا نہیں، بڑے تحمل سے مار کھاتا رہا اور شروع سے آخر تک اس کی کوشش یہی رہی کہ گلنار کے بید کی ضرب اپنے ہاتھوں پر روکتا رہے۔ وہ مار کھا رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ''گلنار بی بی! میں نے اس حویلی کا نمک کھایا ہے۔ اگر آپ مجھے جان سے بھی مار دیں گی تب بھی میں نہیں بولوں گا اور اپنی جان دے دوں گا۔''

زخمی ستار لنگڑاتا ہوا بیچ میں آ گیا، بولا۔ ''گلنار بی بی! بس کیجیے، اسے معاف کر دیجیے۔''

گلنار اپنے کمرے میں چلی گئی اور اسے اندر سے بند کر کے رونے لگی۔

ستار کے علاوہ دوسرے خدمت گار آپس میں کہنے لگے۔ ''ہمیں ان معاملوں میں نہیں پڑنا چاہیے کیونکہ گلنار بی بی آج کل بہت زیادہ غصے میں رہتی ہیں۔''

ستار نے جواب دیا۔ ''تم لوگ معاملات کو سمجھنے کی کوشش کرو اور اس قسم کی چہ میگوئیاں مت کرو۔''

حمدو نے بھی ستار کی تائید کی، بولا۔ ''مار تو میں کھا رہا تھا اور تم لوگ کیوں پریشان ہو رہے ہو؟''

ایک اور خدمت گار بولا۔ ''ہمیں واقعی پریشان نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ہمیں معلوم تو کچھ بھی نہیں اور پریشان خوامخواہ ہوتے ہیں۔ اب ہمیں چپ ہو جانا چاہیے اور کسی کے معاملے میں کوئی دخل نہیں دینا چاہیے۔''

جب سارے خدمت گار چلے گئے اور حمدو اور ستار رہ گئے تو ستار نے حمدو کو سمجھایا۔ ''حمدو! تو جس راستے پر چل نکلا ہے، وہ بہت خطرناک ہے۔''

حمدو نے جواب دیا۔ ''بھائی ستار! میں نے تو تجھے پہلے ہی سب کچھ بتا دیا ہے۔ میں بالکل بے گناہ ہوں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ گلنار بی بی میرے ذریعے ایک خطرناک کام کروانا چاہتی تھیں بس اس کی منصوبہ بندی کے لیے خود ہی اپنی خواب گاہ میں بلا لیا تھا اور ہزار رازداری کے باوجود جس سے تو واقف ہو گیا تھا اور پھر جو کچھ ہوا اس سے تو اتنا ہی واقف ہے جتنا میں، گلنار بی بی۔ پھر میں نے دوسرے ساتھیوں کی مدد سے گلنار بی بی کے حکم ہی پر مارا پیٹا بھی تھا اور بی بی ہی کے حکم پر میں نے تجھے حویلی کے باہر پھنکوا دیا تھا اور پھر انہی بی بی کے حکم پر میں تجھے تلاش کر کے حویلی میں دوبارہ لے آیا۔ اب اس سے زیادہ تابعداری اور کیا ہو سکتی ہے۔''

یہ باتیں فیروز بخت بھی سن رہا تھا۔ اب وہ اور زیادہ پریشان ہو گیا۔ اصل بات ابھی راز تھی۔ ستار نے کہا۔ ''بھائی حمدو! میں تجھے گناہ گار نہیں ٹھہرا رہا۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ جو کچھ کر ہاتھ پاؤں بچا کر۔ وفاداری میں بڑی بچت ہے اب اگر مالک داؤد نے مجھ سے یہ پوچھا کہ خواب گاہ والے واقعے میں تو نے کیا دیکھا تھا تو میں یہی کہوں گا کہ میں نے حمدو کو داخل ہوتے دیکھا اور خواب گاہ سے تو اس وقت نکلا جب میں نے دستک دی۔ اس سے زیادہ میں ایک بات بھی نہ کہوں گا، خواہ کچھ بھی ہو جائے۔''

حمدو نے پوچھا۔ ''گلنار بی بی ناراض ہیں، اب میں کیا کروں؟''

ستار نے جواب دیا۔ ''تو کوشش کر کہ گلنار بی بی سے دور دور رہے۔''

حمدو نے پوچھا۔ ''اگر انہوں نے مجھے حویلی سے نکال دینا چاہا؟''

ستار نے جواب دیا۔ ''میں تجھے نہیں جانے دوں گا اور کسی بھی طرح روک کے رکھوں گا۔''

حمدو نے مضطربانہ پوچھا۔ ''پھر یہ وعدہ؟''

''ہاں ہاں وعدہ، میں نے کہہ دیا۔''

''کیا میں فیروز بخت کی خدمت میں موجود رہوں؟''

ستار نے جواب دیا۔ ''نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ فیروز بخت کے پاس میں رہوں گا۔''

حمدو سرد آہ بھر کے بولا۔ ''واہ ری قسمت..... کیسی مصیبت میں پھنسا دیا تو نے۔''

جب وہ چلا گیا تو ستار، فیروز بخت کو اس کے اپنے کمرے میں لے گیا اور پوچھا۔ ''میری عدم موجودگی میں آپ کہاں، کس کے پاس رہتے تھے؟''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''گلنار بی بی کے پاس کیونکہ انہوں نے خود ہی اپنے پاس رکھ لیا تھا۔''

''آپ کے ساتھ ان کا سلوک کیسا رہا؟''

''بہت اچھا، مجھے پہلے جیسی گلنار کہیں نظر نہیں آئیں۔''

ستار نے کہا۔ ''فیروز بخت! میرے چھوٹے مالک،

یہ گلنار بی بی کا دوسرا روپ تھا۔ کیا آپ نے اس روپ میں خلوص اور محبت کی جھلک دیکھی؟"

فیروز بخت نے جواب دیا۔ "مجھے تو خلوص اور محبت کے علاوہ کچھ نظر ہی نہیں آیا۔"

ستار نے کہا۔ "آپ، مجھ پر اعتبار کیجیے صرف مجھ پر کیونکہ یہاں کوئی بھی قابل اعتماد نہیں لیکن ظاہر یہی کیجیے کہ آپ سب پر اعتبار کرتے ہیں۔ آپ کی نظر میں کوئی بھی مشتبہ یا غیر معتبر نہیں۔"

فیروز بخت نے احسان مندی سے جواب دیا۔ "جو تو کہے گا میں اس پر عمل کروں گا۔"

اور ستار ایک بار پھر فیروز بخت کی خدمت میں مصروف ہوگیا۔ حویلی میں جو ہنگامے اتفاقیہ برپا ہوئے تھے، ان کی وجہ سے فیروز بخت محفوظ ہوگیا تھا۔ خوش قسمتی نے فیروز بخت کو پیچھے ہٹا کر گلنار کے مقابلے میں حمرو کو کھڑا کردیا تھا۔ فیروز بخت کی تعلیم اور تربیت کا کام بڑی آسانی اور سکون سے جاری تھا۔

حمرو کا کانٹا گلنار کے دل میں ہر وقت کھٹکتا رہتا تھا۔ اس کا حویلی میں رہنا گلنار کے حق میں خطرناک تھا۔ اس لیے وہ ہر وقت اس فکر میں رہتی کہ کسی طرح اس کو صاف کردیا جائے۔ حمرو کو صاف کردینا اتنا مشکل کام نہیں تھا، اس کے نتائج البتہ خطرناک تھے۔ حمرو حویلی سے نکل کر گلنار کے خلاف بری بری باتیں کرسکتا تھا اور اس کی زبان کو تالا لگانا گلنار کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ ستار سے مشورہ لینا چاہتی تھی لیکن اس لیے نہیں لے رہی تھی کہ ستار کی قربت اور گفتگو سے کوئی نیا مسئلہ نہ اٹھ کھڑا ہو اس لیے وہ خاموش رہی لیکن حمرو ..... نے بالکل ہی قطع تعلق کرلیا تھا۔ درحقیقت حمرو اب بھی اس تاک میں تھا کہ کسی طرح گلنار سے بات کرے۔ وہ تنہائی میں روتا رہتا اور جب خدمت گار ساتھی رونے کا سبب پوچھتے تو وہ جواب دیتا کہ میں نے اس کا گھر نمک کھایا ہے اور اب میں اسی گھر میں اپنے اعتبار کا جنازہ اٹھتے نہیں دیکھ سکتا۔ گلنار بی بی مجھ سے، ناراض ہیں اور میں ان کی ناراضی کو زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کرسکتا۔

جب حمرو کو کوئی اور موقع نہ ملا تو اس نے فیروز بخت کی چاپلوسی شروع کردی اور کسی طرح یہ بتانے میں کامیاب ہوگیا کہ گلنار کی میٹھی میٹھی باتوں پر یقین نہ کرے کیونکہ گلنار نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح فیروز بخت کو ختم ضرور کروادے گی۔

فیروز بخت سخت پریشان ہوگیا۔ وہ اس جہنم کدے سے بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن ستار اس کی اس طرح دل جوئی کرتا کہ وہ پھر بہل جاتا اور حالات کا مقابلہ کرنے پر آمادہ ہوجاتا۔

حمرو ستار کی خوشامد کرتا کہ گلنار سے معافی دلوادے۔ وہ اکثر روتا رہتا تھا۔

دوسری طرف ملک کے حالات بھی بدل رہے تھے۔ ہمایوں کا انتقال ہوچکا تھا۔ بیرم خاں نے بہ مقام کلانور چودہ سالہ اکبر کی تاج پوشی کرا کے اس کی بادشاہت کا اعلان کردیا تھا اور مسجدوں کے خطبوں اور ٹکسال کے سکوں میں اکبر کا نام شامل کردیا گیا تھا۔ آئمہ مساجد خطبوں میں اکبر کا نام لے کر دعائیں دے رہے تھے۔ بیرم خاں اکبر کا اتالیق اور سرپرست تھا اور اکبر اعظم ابھی صرف اکبر بادشاہ تھا۔ ملک کے مختلف حصوں میں بغاوتیں سر اٹھا رہی تھیں اور بیرم خاں ان باغیوں کے سر کچلنے میں مشغول تھا۔ بادشاہ ابھی تک دہلی نہیں آیا تھا لیکن دہلی والے بادشاہ کا انتظار ضرور کررہے تھے۔ فیروز بخت کا اتالیق بہت پریشان تھا کیونکہ شاہی خاندان میں انتشار پھیلا ہوا تھا اور کچھ پتا نہ تھا کہ بیرم خاں کی سرپرستی کیا رنگ اختیار کرتی ہے۔ چودہ سالہ اکبر خود حکومت کرنے کے لائق ہوتا بھی ہے یا بیرم خاں خود ہی اقتدار سنبھال لیتا ہے۔

شاہی خاندان بیرم خاں کو شک وشبے کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ان حالات میں اتالیق دوسرے درد دیکھ رہا تھا اور اسے داؤد کی واپسی کا انتظار تھا۔ اس نے کئی تاجروں کے ذریعے خط بھی لکھے اور داؤد کو حویلی کے حالات لکھ بھیجے۔ داؤد نے کئی ماہ بعد ان خطوط کے جوابات روانہ کردیے۔ ان میں ایک خط گلنار کے نام بھی تھا۔ اس نے اتالیق کو جو خط لکھے تھے، ان کا مضمون ایک تھا، الفاظ جدا جدا۔ ہر خط میں بس اس بات پر زور دیا تھا کہ فیروز بخت کی تعلیم وتربیت بھرپور ہونا چاہیے کیونکہ اس کو جس مقصد کے لیے تیار کیا جارہا ہے، وہ اس کا متقاضی ہے کہ فیروز بخت میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔

دوسری طرف گلنار کے خط میں لکھا تھا۔

"گلنار! کیا میں نے تجھ پر زور نہیں دیا تھا کہ تو شادی کرلے لیکن تو نے تساہل اختیار کیا اور اس مسئلے کو میری واپسی تک کے لیے ملتوی کردیا لیکن اتالیق کے خطوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے تیری شادی نہ کرکے سخت غلطی کی ہے۔

"میں تیری پریشانیوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ حویلی کے خدمت گار مسئلہ بنے ہوئے ہیں لیکن میں ان کی بابت کوئی سخت حکم اس لیے نہیں دے رہا ہوں کہ وہ پشتنی خدمت گار ہیں۔ میں ان کو اپنے کاروبار میں لگا سکتا

ہوں لیکن انہیں اس وقت تک کاروبار میں لگانا ٹھیک نہیں ہے جب تک کہ میں خود ان کی نگرانی اور تربیت نہ کروں۔ تجھے یاد ہوگا کہ میں نے یہ خدشہ ظاہر کیا تھا کہ اتنے خدمت گاروں کو تو قابو میں کس طرح رکھے گی اور یہ کہ حویلی کے نظم ونسق کو تو کس طرح چلائے گی۔ تو، تو نے زور و شور سے یہ بات کہی تھی کہ عورتوں نے تو ملکوں اور قوموں پر حکومت کی ہے تو کیا میں چند خدمت گاروں کو قابو میں نہیں رکھ سکوں گی اور ایک حویلی کا نظم ونسق نہیں چلا سکوں گی؟ چنانچہ اب تجھے اندازہ ہوا کہ یہ کتنا دشوار ہے۔

''گلنار! فیروز بخت کا خاص خیال رکھنا اور اس کی تعلیم وتربیت میں کوتاہی نہ کرنا۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں تو نے اس کے خلاف کوئی محاذ آرائی نہ کی ہو۔ اگر خدمت گاروں کی مدد سے کسی قسم کی محاذ آرائی کی گئی تو اس کا لازمی نتیجہ نکلے گا کہ خدمت گار نافرمانی اور سازش میں مصروف ہو جائیں گے اور تیرے رازوں میں شریک ہو کر تجھ سے مراعات اور مفادات حاصل کرنے لگیں گے۔ رہا فیروز بخت کا مسئلہ تو اس پر تجھے یقین رکھنا چاہیے کہ اس بارے میں، میں نے جو فیصلہ کرلیا ہے وہ بدلا نہیں جا سکتا اور یہ کہ اگر آج تو نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا اور اس کے ساتھ زیادتیاں کی گئیں تو اس کا خمیازہ تجھی کو بھگتنا پڑے گا کیونکہ کل جب فیروز بخت جوان ہو جائے گا اور میرے کاروبار، دولت اور جائداد کا انتظام اس کے ہاتھ میں چلا جائے گا تو اس دن وہ آج کی زیادتیوں کا بدلہ ضرور لے گا۔

''میں اگر بہت جلدی آیا تب بھی ایک سال لگ جائے گا کیونکہ مجھے ننھے کے تھان رنگے ہوئے کپڑوں کے تھان چھینٹ اور رومال وغیرہ کی بہت بڑی مقدار خلیج کے ملکوں کو روانہ کرنا ہے اور یہ کام بڑا وقت چاہتا ہے۔ اس دوران تو اتالیق کی مدد سے اپنے مسائل پر قابو پا سکتی ہے۔ میں نے اسے لکھ دیا ہے کہ وہ حویلی کے خدمت گاروں پر حاکمی کرے۔ تو اگر مناسب سمجھے تو اتالیق کے کنبے کو اپنی حویلی ہی میں بلا کر رکھ لے۔''

گلنار نے اس خط کا مفہوم کسی کو بھی نہیں بتایا۔ وہ اتالیق کی مداخلت بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے اتالیق سے کہہ دیا کہ بھائی داؤد کی ہدایت کے بموجب وہ خدمت گاروں پر حاکمی کر سکتا ہے لیکن اس کے اپنے معاملوں میں دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ فیروز بخت کے سلسلے میں اس کے ارادے نہیں بدلے تھے۔ وہ اب بھی ایک ایسے لڑکے کو اپنے بھائی کا وارث بنانے پر تیار نہیں تھی جس کے ماں باپ کا کوئی پتا نہیں تھا اور وہ ایک بار پھر ہمت کر کے فیروز بخت کی تباہی کے درپے ہوگئی۔

حویلی میں یہ افواہ گشت کر رہی تھی کہ داؤد کا خط آیا ہے اور اس میں خدمت گاروں کے بارے میں خاص ہدایات دی گئی ہیں۔ حمدو ڈر رہا تھا کہ کہیں اس کے خلاف تو کچھ نہیں لکھ دیا گیا لیکن جب اس کو یہ بتایا گیا کہ حویلی کے خدمت گار اتالیق کے حوالے کر دیے گئے ہیں تو وہ کسی حد تک مطمئن ہوگیا کیونکہ اتالیق کو شیشے میں اتار لینا اس کے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا۔

گلنار نے ستار کو اعتماد میں لینے کی کوشش کی لیکن وہ باتوں میں آنے والا آدمی نہیں تھا۔ حمدو بہت ہوشیار آدمی تھا اور موقع کی تلاش میں تھا۔ گلنار اس سے اب بھی خفا تھی لیکن اس خفگی میں پہلے جیسی شدت نہیں رہی تھی۔ خدمت گاروں میں ایک یہ افواہ بھی موجود تھی... کہ ستار اور گلنار میں کوئی خاص تعلق ضرور ہے۔ اس تعلق کی ٹوہ میں ہر کوئی تھا اور ان دونوں کو پکڑنے کی فکر میں تھا۔ فیروز بخت کو اپنے کام سے کام تھا، وہ کسی معاملے میں دخل نہیں دینا چاہتا تھا۔

رمضان آیا تو سبھی صوم وصلوٰۃ میں لگ گئے۔ گلنار بھی پانچوں وقت کی نماز کے بعد یہی دعائیں مانگتی۔ ''خدا بھائی داؤد کے دل ودماغ کو بدل دے اور وہ شادی کرلے تاکہ جائز وارث پیدا ہو جائے۔''

حمدو ہر نماز کے بعد یہ دعا مانگتا۔ ''خدایا مجھے ان مشکلات سے نکال دے اور گلنار بی بی کے دل ودماغ کو میری طرف مائل کردے۔''

ستار کی دعا تھی۔ ''خدایا انسانی شر سے ہر ایک کو محفوظ رکھ اور انہیں صراطِ مستقیم دکھا۔''

لیکن ان دعاؤں کا اثر کہیں بھی ظاہر نہیں ہو رہا تھا کیونکہ داؤد اب بھی شادی پر تیار نہیں تھا اور اس نے بدستور فیروز بخت ہی کو اپنی دولت اور کاروبار وغیرہ کا وارث بنا رکھا تھا۔

گلنار اب بھی حمدو پر مائل نہیں تھی اور بدستور بیزار تھی۔ فیروز بخت بدستور آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھا ہوا تھا اور داؤد کے بارے میں جو دعا مانگی تھی وہ دعا مانگنے سے پہلے ہی قبول ہو چکی تھی۔

ستار کی دعا بھی نامقبول تھی کیونکہ بشر کا شر اس کے نام ہی میں موجود تھا۔ اس کو شر سے الگ کس طرح کیا جا سکتا تھا اور رہا اس کا صراطِ مستقیم پر چلنا تو یہ صراطِ مستقیم کے مفہوم ہی سے واقف نہیں تھا تو اس پر چلتا کس طرح؟

سحری میں جب خدمت گار روزے کی نیت باندھنے

سے پہلے کھانے پینے میں مشغول ہوتے تو حمرو اپنی کوٹھری سے گلنار کی خواب گاہ کی روشنی پر نظریں جمائے رہتا اور ٹھنڈی سانسیں بھرتا رہتا۔ کئی بار اس نے ارادہ کرلیا کہ کچھ بھی ہو، وہ گلنار کی خواب گاہ میں گھس جائے گا اور اس کے قدموں پر سر رکھ کر معافی مانگ لے گا لیکن جب اس کے نتائج پر نظر کرتا تو سہم جاتا اور اپنے ارادے سے باز آجاتا۔ آخر اس نے ایک بار پھر ستار کا سہارا لیا اور اس کی خوشامد کی کہ وہ گلنار سے معافی دلوادے تاکہ وہ داؤد کے آنے پر عتاب کا نشانہ نہ بنے۔

رمضان کے بعد عید کی نماز پڑھ کر جب خدمت گار حویلی میں واپس آئے تو روایت کے مطابق ان سب نے باری باری گلنار کو سلام کیا اور عید کی مبارک باد پیش کی۔ سب سے پہلے اتالیق پہنچ اور اس نے گلنار کو سلام کرنے کے بعد عید کی مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”گلنار! میں نے نماز کے بعد تیرے لیے بطورِ خاص دعا مانگی کہ تو اپنے مقصد میں کامیاب ہو۔“

گلنار نے جوب دیا۔ ”استادِ محترم! اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی تو آپ کو نواز دوں گی۔“

خدمت گاروں میں ستار کے بعد حمرو بھی پہنچا اور نہایت ادب سے سلام کیا۔ گلنار نے منہ پھیر لیا۔ ستار وہیں موجود تھا۔ اس نے سفارش کی۔ ”گلنار بی بی! اس کو معاف کردیجیے۔ یہ اپنی سزا کو پہنچ چکا ہے۔“

گلنار نے ستار کو بھی جھڑک دیا۔ ”تو خاموش رہ، اس کی سفارش نہ کر۔“

ستار باہر نکل گیا لیکن حمرو ڈھٹائی سے بیٹھا رہا۔ خاموشی کی وجہ سے گلنار کو شبہ گزرا کہ شاید دونوں چلے گئے۔ اس نے جیسے ہی منہ پھیرا تو حمرو کو تنہا کھڑا دیکھ کر گھبرا گئی۔ پوچھا۔ ”تو یہاں کیوں کھڑا ہے؟ چلا کیوں نہیں جاتا؟“

حمرو نے جواب دیا۔ ”گلنار بی بی! میں نہیں جاؤں گا۔“

گلنار نے پریشان ہوکر پوچھا۔ ”تو کیوں نہیں جائے گا یہاں سے؟“

حمرو نے جواب دیا۔ ”کیونکہ یہ موقع بڑی مشکل سے ملا ہے مجھے۔“

گلنار نے بے مروتی سے کہا۔ ”میں تجھے حکم دیتی ہوں کہ تو چلا جا یہاں سے ورنہ میں کسی کو آواز دے کر بلالوں گی۔“

حمرو نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔ ”آپ مجھے معاف کردیجیے کیونکہ جب تک آپ معاف نہیں کریں گی، میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔“

گلنار نے جواب دیا۔ ”میں اس لیے معاف نہیں کروں گی کہ تو نے اس رات جو کچھ کیا تھا، وہ ایسا نہیں ہے کہ معاف کردیا جائے۔“

حمرو نے گلنار کے قدموں میں جھک کر پاؤں پکڑنا چاہے لیکن وہ پیچھے ہٹ گئی اور حمرو کو ڈانٹا۔ ”حمرو! میں کہتی ہوں تو یہاں سے چلا جا ورنہ میں تجھے وہ سبق دوں گی کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔“

حمرو بھی اڑا رہا، بولا۔ ”گلنار بی بی! جب آپ نے بید سے میری پٹائی کی تھی تو میں اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں تھا اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس دن اگر آپ مجھے جان سے بھی ماردیتیں تو میں اف تک نہ کرتا اور مرجاتا۔ چنانچہ آج بھی میں اس وقت تک یہاں سے نہیں ٹلوں گا جب تک آپ مجھے معاف نہیں کردیں گی۔“

گلنار نے تذبذب سے کہا۔ ”لیکن تو نے جو گستاخی کی تھی، اس کی سزا تجھے ملنی چاہیے نہ کہ معاف کردیا جائے۔“

حمرو جواب دینے ہی والا تھا کہ فیروز بخت آگیا اور آتے ہی بڑے ادب سے سلام کیا۔ گلنار نے خندہ پیشانی سے سلام کا جواب دیا اور حمرو سے کہا۔ ”اس وقت تو چلا جا، پھر کسی وقت آنا پھر بات کروں گی۔“

حمرو کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی اور وہ فوراً چلا گیا۔

فیروز بخت نے گلنار کو جس انداز میں کھڑے دیکھا تھا، اس سے ناقابلِ فہم شکوک سے پیدا ہوگئے تھے۔ ہوشیار گلنار نے بھی فیروز بخت کے تردد کو کچھ کچھ سمجھ لیا۔ وہ بیٹھ گئی اور مسکراتے ہوئے فیروز بخت کو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ فیروز بخت بیٹھ گیا۔

گلنار نے پوچھا۔ ”فیروز بخت! تو بہت دیر میں آیا، خیریت تو تھی، کہاں رہ گیا تھا؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”استادِ محترم کے پاس رک گیا تھا ورنہ میں سب سے پہلے حاضر ہوتا۔“

گلنار نے کہا۔ ”عید کی خوشیاں مبارک۔ تو کتنا خوش قسمت ہے کہ والدین کا کہیں پتا نہیں۔ بچپن میں مشہدی نے سہارا دے دیا اور قسمت نے زیادہ زور مارا تو اس حویلی میں داخل کردیا اور اب اور زیادہ مزے آرہے ہیں۔“

فیروز بخت کو گلنار کی باتوں میں طعن وطنز کی رمق محسوس ہوئی۔ وہ اس کا کوئی جواب دے سکتا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ گلنار نے پوچھا۔ ”کیا تجھ کو معلوم ہے کہ میرے پاس بھائی داؤد کا خط آیا ہے؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”نہیں، مجھے نہیں معلوم۔“

گلنار نے کہا۔ ''بھائی داؤد نے اپنے خط میں یوں تو بہت کچھ کہا ہے لیکن اس میں تیرے بارے میں بہت کچھ ہے۔''

فیروز بخت یہ پوچھتے ہوئے ڈرا کہ اس میں میرے بارے میں کیا کچھ لکھا ہے۔ اسے شبہ تھا کہ کہیں خط میں اس کے خلاف تو لکھ کر نہیں آگیا کچھ۔ اس نے پوچھا تو کچھ بھی نہیں بس سوالیہ نظروں سے صورت دیکھتا رہ گیا۔

گلنار نے اس کی پریشانی اور بے چینی محسوس کرلی، بولی۔ ''تو پریشان نہ ہو، خط میں تیرے خلاف ایک لفظ بھی نہیں، بس ہر جگہ یہی ہدایت موجود ہے کہ تیری تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی جائے کیونکہ بھائی داؤد کے بعد تجھی کو سب کچھ سنبھالنا ہے۔''

فیروز بخت نے شکر گزار نظروں سے گلنار کی طرف دیکھا اور آنکھیں جھکالیں۔

گلنار نے کہا۔ ''فیروز بخت! میں تجھے یقین دلا رہی ہوں کہ میں تیری ہمدرد ہوں اور بہت ممکن ہے کہ یہاں کے بعض سازشی عناصر تجھے ورغلائیں کہ میں تیری دشمن ہوں اور تیری جان کے درپے ہوں۔''

فیروز بخت نے انکساری سے جواب دیا۔ ''مجھے آپ کے خلوص پر اعتماد اور بھروسا ہے۔''

گلنار نے کہا۔ ''نہیں، بس تجھ سے یہ نہیں کہتی کہ تو مجھ پر بھروسا کر۔ فیروز بخت! میں اپنی طبیعت اور مزاج کے بارے میں ایک بات بتا دینا چاہتی ہوں۔ وہ یہ کہ میں بڑی حساس اور جذباتی ہوں۔ جب تو نیا نیا اس حویلی میں آیا تھا تو میں نے تیری بڑی مخالفت کی تھی اور یہ بھی درست ہے کہ اس میں تیری جان کے درپے تھی لیکن آہستہ آہستہ مجھے عقل آگئی اور میں اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ مجھے تیری مخالفت نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اگر میں اس وقت تجھ سے اچھا سلوک کروں گی تو کل تو میرا سہارا بنے گا۔ میں تیری دشمن نہیں ہوں۔ اب میں تیری ہمدرد اور بہی خواہ ہوں۔ فیروز بخت! میں دل کی بری نہیں ہوں۔''

گلنار کی باتوں نے فیروز بخت کا دل جیت لیا۔ وہ حیران تھا کہ اتنی اچھی اور مہربان عورت کے بارے میں حویلی کے لوگ کیسی کیسی باتیں کرتے رہے ہیں۔ گلنار نے داؤد کے خط کی عبارت کے بارے میں سب کچھ صاف صاف بتا دیا تھا۔ وہ اگر کچھ ..... نہ بتاتی تو فیروز بخت کو کچھ بھی معلوم نہ ہوتا۔ اس نے احسان مندانہ نظروں سے گلنار کی طرف دیکھا اور فرطِ جذبات سے آنکھوں میں آنسو آگئے۔ گلنار اس کی دلی کیفیات کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ اچانک اپنی جگہ سے اٹھی اور فیروز بخت کو شانوں سے پکڑ لیا۔ بولی۔ ''میں تجھے کس طرح یہ یقین دلاؤں کہ میں تیری ہمدرد ہوں، تیرا بھلا چاہتی ہوں۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''مجھے آپ کی ہر بات پر یقین ہے۔ میں آپ کے خلوص پر شبہ کرنے کی ہمت تک نہیں کرسکتا۔''

گلنار نے اسے سینے سے لگالیا، بولی۔ ''آ، میرے سینے سے لگ جا اور مجھے اچھی طرح بھینچ لے کیونکہ میں تجھے اپنا بھائی سمجھتی ہوں۔ چھوٹا بھائی۔ تو میرا بھائی ہے، میرا چھوٹا پیارا بھائی۔ خبردار جواب تو نے کسی قسم کی مغائرت برتی۔ اس حویلی میں اس طرح رہ جس طرح میں رہتی ہوں اور بھائی داؤد رہتے ہیں کیونکہ یہ تیری حویلی ہے اور بھائی داؤد کی حویلی ہے۔''

وہ گلنار کے سینے سے چمٹا ہوا ایک عجیب سی لذت محسوس کر رہا تھا۔ اس کے رگ و پے میں سنسناہٹ دوڑ رہی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی گلنار کا رعب بھی طاری تھا، خوف بھی طاری تھا اور اس رعب اور خوف نے اس کی ساری لذت، ساری خوشی اور سارا کیف ہوا کردیا۔

گلنار نے اس کی پیشانی کا بوسہ لیا، بولی۔ ''فیروز بخت! تو کافی عرصے سے اس حویلی میں رہ رہا ہے۔ ایک بات تو بتا؟''

اس نے کہا۔ ''پوچھیے۔''

گلنار نے پوچھا۔ ''جب تو مشہدی کے پاس رہتا تھا تو کیا سارا دن گھر ہی میں پڑا رہتا تھا، گھر سے باہر نہیں نکلتا تھا؟''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''میں گھر سے نکلتا کیوں نہیں تھا۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلتا کودتا تھا۔''

گلنار نے کہا۔ ''لیکن جب سے تو اس حویلی میں آیا ہے، میں نے تو تجھے ایک بار بھی حویلی سے باہر جاتے نہیں دیکھا۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں حویلی میں آنے کے بعد ایک بار بھی باہر نہیں گیا۔''

''بھلا کیوں؟ کوئی خاص سبب؟''

اس نے جواب دیا۔ ''سبب تو کوئی خاص نہیں لیکن حویلی کے باہر واقعی نہیں گیا۔''

''حالانکہ تجھے باہر جانا چاہیے۔''

''ہاں جانا تو چاہیے۔''

گلنار نے اس کو اپنے پاس ہی بٹھا کر بے تکلفی سے کہا۔ ''جہاں تک حویلی سے باہر نہ جانے کا تعلق ہے، میں اس کے سبب سے واقف ہوں۔''

فیروز بخت نے پوچھا۔ "اس کا کیا سبب ہے آپ کے نزدیک؟"

گلنار نے جواب دیا۔ "اس کا سبب ہے تیرا تکلف، تیرا کمتر ہونے کا احساس۔ تو آج تک خود کو حویلی کا آدمی نہیں سمجھتا رہا۔ تو خود کو حویلی کا ایک ایسا شخص سمجھتا رہا ہے جو بطور مہمان فروکش ہے شاید اس سے زیادہ کچھ نہیں۔"

فیروز بخت نے کہا۔ "آپ کا خیال درست ہے کیونکہ جب تک آپ مجھے اس حویلی کا ایک فرد نہ مان لیتیں، میں اپنے آپ کو مہمان سے زیادہ کس طرح سمجھ لیتا۔"

گلنار نے بڑی محبت سے کہا۔ "اچھا میرے پیارے بھائی اب میں کہتی ہوں کہ تو اس حویلی کا ایک فرد، محض ایک فرد نہیں، خاص فرد، بھائی داؤد کے بعد اہم ترین فرد ہے۔ اب میری خواہش ہے کہ تو اس حویلی میں آزادی سے رہ۔ اس حویلی میں بھی اور حویلی کے باہر کی دنیا بھی دیکھ۔ ان خدمت گاروں پر حکم چلا اور ان کے ساتھ دہلی کے بازاروں اور خاص خاص جگہوں کی سیر کر۔ کاروباریوں، بیوپاریوں سے ملاقاتیں کر اور اشیائے تجارت کا مشاہدہ کر کیونکہ حویلی میں رہنے کا یہ مطلب ہے کہ کنوئیں کا مینڈک بنا رہے گا۔ تو سیاح بن جو گھاٹ گھاٹ کا پانی پی کر بلا کا تجربہ کار ہو جاتا ہے۔ جسے دنیا شناسی اور مردم بینی آ جاتی ہے۔"

فیروز بخت کا حال ہی کچھ عجیب تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس پر دنیا اتنی مہربان کبھی نہیں ہوئی تھی۔ یہ عید اس کے لیے واقعی پیام عید لے کر آئی تھی۔

☆☆☆

حمدو ہشاش بشاش اپنی خدمات انجام دے رہا تھا کیونکہ اس کو معاف کر دیا گیا تھا۔ وہ حویلی میں گلنار کی تعریفیں کرتا پھر رہا تھا۔ ستار بھی خوش تھا کہ گلنار نے اس کی سفارش کا خیال کیا تھا۔ اتالیق اس پر حیران تھا کہ گلنار، فیروز بخت پر بہت مہربان ہو گئی تھی۔ وہ اکثر و بیشتر فیروز بخت کی بابت اتالیق سے سوال و جواب کرتی رہتی۔ فیروز بخت اب خاصا سمجھدار ہو چکا تھا۔ اب اس نے گلنار کی ہدایت پر حویلی کے باہر نکلنا شروع کر دیا تھا۔ ستار اس کے ساتھ ہوتا۔ ایک گھوڑے پر فیروز بخت ہوتا اور دوسرے پر ستار۔ ستار اس بات پر حیران تھا کہ یہ نو دس سالہ لڑکا گھڑسواری خوب کر لیتا ہے۔ کبھی کبھی یہ دونوں دریائے جمنا کے کنارے نکل جاتے اور کشتیوں کے ادھر ادھر جانے کے منظر سے لطف اندوز ہوتے رہتے۔

اتالیق اس سیر و تفریح کے خلاف تھا لیکن گلنار اس کی چلنے ہی نہ دیتی تھی اور فیروز بخت کا یہ حال تھا کہ گلنار کے مقابلے میں اب اتالیق کی بھی کوئی حیثیت نہیں رہ گئی تھی۔ اتالیق، فیروز بخت کی سرد مہری سے نالاں تھا اور اس کے انداز و اطوار سے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ شاید اب فیروز بخت کو اتالیق کی ضرورت ہی نہیں رہ گئی تھی۔

اس دوران میں ایک تاجر حویلی میں آیا اور گلنار سے کہا کہ میں احمد آباد جا رہا ہوں، اس لیے داؤد کے نام کوئی پیغام ہو تو دے دو، پہنچا دوں گا۔ گلنار نے جواب دیا۔ "میں پیغام زبانی نہیں دوں گی، میرا خط لیتا جا۔" اس کے بعد فیروز بخت سے کہا۔ "ایک خط تو بھی لکھ دے تاکہ بھائی داؤد کو تیری لیاقت کا علم ہو جائے۔"

فیروز بخت اپنا خط لکھنے لگا اور گلنار اپنا خط۔

گلنار نے اپنے خط میں لکھا تھا۔ "بھائی داؤد! آپ میری طرف سے ذرا بھی پریشان نہ ہوں کیونکہ میں نے بگڑے ہوئے معاملات کو سنوار لیا ہے اور پیچیدہ گتھیوں کو سلجھا لیا ہے۔ آپ نے میری شادی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے میں اتفاق کرتی ہوں لیکن میں یہ نہیں مان سکتی کہ مجھے اتنی جلدی شادی کر لینا چاہیے۔ مجھے آپ کی بعجلت واپسی کا بھی انتظار نہیں، جب مناسب سمجھیں آ جائیں لیکن خدا کے لیے عجلت میں معاملات کو بگاڑ نہ دیجیے گا۔

"فیروز بخت کی بابت آپ نے جو کچھ لکھا ہے، میں اس سے اتفاق کرتی ہوں اور آج کل اس پر بہت توجہ دے رہی ہوں۔ جو کچھ کہہ رہی ہوں اس کے ثبوت میں فیروز بخت کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط بھی روانہ کر رہی ہوں۔

"آج کل میں ببول نہیں بو رہی جو کانٹے کاٹنا پڑ جائیں، میں جو کچھ بو رہی ہوں خدا اس کا اجر ضرور دے گا۔ بھائی داؤد! میں فیروز بخت کی مخالف نہیں بلکہ اب تو اس کی سب سے زیادہ ہمدرد اور بہی خواہ ہوں لیکن میرے بھائی میں ایک بات پھر کہوں گی، وہ یہ کہ بھائی آپ شادی ضرور کریں اور اس سے جائز اولاد پیدا کریں۔ اپنا خون اپنا ہی ہوتا ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آپ کو یہ دکھا دوں گی کہ مستورات، ہوشیاری، ذہانت اور تدبر میں کسی سے کم نہیں ہوں۔ جو عورتیں اپنی قوم یا ملک پر حکومت کر سکیں، ان کو جتنی بھی داد دی جائے کم ہے لیکن اپنی حویلی پر میں شاندار حکومت کروں گی۔"

دوسری طرف فیروز بخت نے جواب میں لکھا تھا۔ "گلنار بی بی مجھ پر اتنی زیادہ مہربان ہیں کہ میں کیا بیان کروں۔ پہلے میں حویلی میں بند رہا کرتا تھا لیکن اب میں

حویلی سے باہر بھی نکلنے لگا ہوں۔ گلنار بی بی کی مہربانیوں اور شفقتوں سے میں حویلی کا انتہائی اہم فرد سمجھا جاتا ہوں۔

"جب آپ تشریف لائیں گے تو مجھ کو بالکل بدلا ہوا پائیں گے۔ ستار پرخلوص خدمت گار ہے، اسی طرح حمرو بھی۔ دوسروں کا مجھے کوئی تجربہ نہیں۔ حویلی میں چھوٹے موٹے ہنگامے تو ہوتے رہتے ہیں لیکن ان سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

اتالیق نے لکھا۔ "داؤد! میں نہیں جانتا کہ تو کب تک واپس آرہا ہے لیکن حویلی کے رنگ ڈھنگ بتارہے ہیں کہ یہاں کوئی بڑا طوفان آنے والا ہے۔ فیروز بخت ان دنوں پڑھائی پر توجہ نہیں دے رہا ہے۔ گلنار نے اسے گھومنے پھرنے کی آزادی دے دی ہے۔

"میں نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ کسی کو اپنا دشمن نہیں بنائیں گے لیکن کسی کی زندگی بھی تباہ نہیں ہونے دیں گے۔ آپ فیروز بخت کو لکھ دیں کہ تعلیم وتربیت کے اکتساب میں تساہل اور کاہلی سے کام نہ لے ورنہ پچھتائے گا۔"

ان تینوں کے خط چلے گئے اور حویلی میں حسبِ معمول زندگی ہوگئی۔

ستار، فیروز بخت کے ساتھ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پر چلا گیا۔ اتالیق بیزار ہوکر اپنے گھر چلا گیا۔ اس سکون اور سناٹے میں گلنار نے حمرو کو بلایا اور اس سے ایک کھلی جگہ پر باتیں کرنے لگی۔

حمرو کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اب وہ پھر گلنار کے پاس آزادی سے آنے جانے لگا تھا۔ خدمت گاروں میں مختلف قسم کی سرگوشیاں جاری تھیں۔ گلنار نے حمرو کو اشارے سے بلایا لیکن اس بار وہ حمرو کے ساتھ بند کمرے میں نہیں بیٹھی بلکہ چھوٹی سی چوکی پر برآمدے ہی میں بیٹھ گئی۔ حمرو اس کے سامنے کھڑا ہوگیا۔

گلنار نے کہا۔ "حمرو! کیا تو کوئی ایسا کام نہیں نکال سکتا کہ تو میرے سامنے بیٹھ کر وہ کرتا رہے اور میں تجھ سے باتیں کرتی رہوں؟"

حمرو مارے خوشی کے دیوانہ ہوگیا، بولا۔ "مجھ سے باتیں کیجیے گا؟ میں اس ایک کام کے لیے ہزاروں کام نکال سکتا ہوں۔"

گلنار نے کہا۔ "تب پھر جلدی کر، باتیں نہ بنا۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

حمرو بہت سارے چاول نکال لایا اور ان سے مٹی کنکر کے ٹکڑے چننے لگا، بولا۔ "اب بتائیے، آپ کون سی باتیں کرنا چاہتی ہیں؟"

گلنار نے جواب دیا۔ "دیکھ حمرو! میں تجھ پر اعتبار اب بھی نہیں کرتی۔"

حمرو کے ہاتھ سست پڑگئے، پوچھا۔ "مجھ پر اعتبار کیوں نہیں کرتیں آپ...... اس کی وجہ؟"

گلنار نے جواب دیا۔ "اس کی وجہ یہ ہے کہ تو نے اپنا اعتبار خود ہی گنوادیا۔"

حمرو نے بڑے کرب سے گلنار کی طرف دیکھا، کہنے لگا۔ "جب آپ نے مجھے معاف ہی کردیا ہے تو اب اس ذکر کو نہ چھیڑیے۔ میں شرمندہ ہوجاتا ہوں۔ ایک غلطی تھی جو سرزد ہوگئی تھی۔"

گلنار نے کہا۔ "اول تو میں ابھی تک تیری توبہ سے مطمئن نہیں ہوں اور اگر میں مطمئن ہو بھی جاؤں تو کیا تو اس کا مزید یقین دلانے کو تیار ہے؟"

حمرو نے جوش وخروش سے جواب دیا۔ "آپ مجھ سے کوئی کام لے کر دیکھیے۔ میں آپ کو مطمئن کرنے کے لیے اپنی جان تک کی بازی لگا سکتا ہوں۔ میں اب ایسی کوئی دوسری غلطی نہیں کروں گا اور پہلی غلطی کے کفارے میں کسی دن جان گنوا کے دکھادوں گا۔"

گلنار چپ ہوگئی اور حمرو کے ہاتھ کنکر چننے میں سست پڑگئے۔ دونوں ہی کسی سوچ میں پڑگئے۔

حویلی کے خدمت گار دور سے تماشا دیکھ رہے تھے۔

آخر دیر بعد گلنار ہوش میں آئی اور حمرو کو مخاطب کیا۔ "حمرو! آج کل میں فیروز بخت سے کس طرح پیش آرہی ہوں؟"

حمرو نے جواب دیا۔ "بہت اچھی طرح، بڑی محبت سے۔"

گلنار نے پوچھا۔ "تیرا کیا خیال ہے، ایسا کیوں ہے؟ کیا میں فیروز بخت کو اپنے بھائی داؤد کی جائداد، دولت اور کاروبار کا وارث ماننے پر آمادہ ہوگئی ہوں؟"

حمرو نے متذبذب ہوکر جواب دیا۔ "اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ اس پر مہربان کیوں ہوتیں یا پھر یہ ہوگا کہ مالک داؤد نے آپ کو کوئی خط بھیجا ہوگا جس میں یہ ہدایت ہوگی کہ آپ فیروز بخت سے اچھی طرح پیش آئیں۔"

گلنار نے جھڑک دیا۔ "احمق کہیں کا، جب میں نے بھائی داؤد کی زبان کا احترام نہیں کیا تو ان کے خط کا کیا احترام کروں گی۔"

حمرو نے حیرت سے پوچھا۔ "تب پھر آپ فیروز بخت پر اتنی مہربان کیوں ہیں؟"

گلنار نے بڑے مزے میں جواب دیا۔ "اس لیے

کہ تو نے مشورہ دیا تھا۔"

حمرو نے حیرت سے پوچھا۔"میں نے مشورہ دیا تھا، کیا مطلب؟"

گلنار نے کہا۔"اس کا ایک ہی مطلب ہے۔ تو نے ہی مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں فیروز بخت کو دوست بن کر نقصان پہنچاؤں کیونکہ دشمن بن کر ٹھکانے لگانے میں بڑے خطرات ہیں لیکن اگر دوستی کے پردے میں دشمنی کی جائے تو بڑا مزہ آتا ہے۔ اب میں یہی کر رہی ہوں۔ میں نے فیروز بخت کو اپنے اعتماد میں لے لیا ہے اور اب میں جانتی ہوں کہ جو چاہوں کر سکتی ہوں۔"

حمرو کو یاد آیا کہ اس نے اس قسم کا کوئی مشورہ دیا تو تھا۔

گلنار بولتی رہی۔"اب وہ وقت آگیا ہے کہ فیروز بخت کا کام تمام کر دیا جائے لیکن میں اسے حویلی میں نہیں مارنا چاہتی اور یہ بھی نہیں چاہتی کہ اسے زہر سے ہلاک کیا جائے۔"

حمرو نے تردد سے پوچھا۔"آپ کو جو کچھ کہنا ہے، تذبذب سے نہ کہیے۔"

گلنار کہتی رہی۔"اس معاملے میں ستار پر اعتبار نہیں کر سکتی کیونکہ اس کی سنگدلانہ وفاداری میری لیے مصیبت ہے۔ اس معاملے میں، میں تجھ سے مدد چاہتی ہوں، تیری اعانت کی طالب ہوں۔"

حمرو نے ذرا پینترا بدلا، بولا۔"میں نے کہہ تو دیا کہ میں آپ کی خاطر اپنی جان تک دے سکتا ہوں لیکن میں اپنی جان اس وقت دے سکتا ہوں جب مجھے معلوم ہو جائے کہ میرا جان دینا آپ کے دل پر اثر انداز ہوگا اور آپ میری قربانی کا کوئی مطلب لیں گی۔"

گلنار چونک پڑی، حمرو پھر بہک رہا تھا۔ تیوریاں بدل کر پوچھا۔"میرے دل پر کیا اثر چاہتا ہے تو اور تیری قربانی کا کیا مطلب لینا چاہیے مجھے؟ میں تیرا مطلب نہیں سمجھی؟"

حمرو نے ذرا احتیاط سے کام لیا، سنبھل کر جواب دیا۔"میرا ان باتوں سے کوئی خاص مطلب نہیں ہے بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ جب میں آپ کی یہ خطرناک خدمت انجام دے چکوں تو اگر میں کسی مصیبت میں گرفتار ہونے لگوں، اس وقت آپ میرے لیے بڑھ چڑھ کر کچھ کر گزریں اور میں اپنی جان سے......"

گلنار نے بات کاٹ دی۔"اب فضول باتیں نہ کر۔ تیرا دل صاف نہیں ہے اور میرا خیال ہے کہ تیری نیت میں اب بھی فتور موجود ہے۔ جب تک تو پاک صاف نہ ہو جائے، میرا تجھ سے اس قسم کی باتیں کرنا فضول ہے۔"

حمرو تلملا کر بولا۔"میرا دل بالکل صاف ہے۔ میری نیت میں کوئی فتور نہیں۔ بس میں آپ سے باتیں کرتے کرتے ذرا بہک جاتا ہوں اور کچھ نہیں۔"

گلنار نے جواب دیا۔"بس یہ تیرا بہک جانا ہی برا ہے۔"

حمرو اچانک چپ ہو گیا اور پھر بولا۔"آپ کی مرضی، آپ مجھ سے کام لیں یا نہیں۔ اب میں کچھ بھی نہیں کہوں گا۔"

گلنار نے حمرو کو روکنے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں رکا۔ اس کے چلے جانے کے بعد گلنار دیر تک یہ جائزہ لیتی رہی کہ حمرو کی نیت صاف ہے یا اس کا شبہ درست ہے لیکن حمرو نے بات بڑھانے کے بعد اچانک ختم کر دی تو اس سے گلنار خاصی پریشان ہو گئی۔

فیروز بخت ستار کے ساتھ مہرولی میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پر کھڑا آنسو بہا رہا تھا۔ اسے اپنے اوپر اور اپنے حالات پر یقین نہیں تھا۔ گلنار کی تسلیاں اسے خواب وخیال لگتی تھیں۔ اتالیق کی مہربانیاں بہلاوا معلوم ہوتی تھیں اور ستار کی وفاداریاں ناپائدار اور عارضی لگ رہی تھیں۔ وہ حالات کی سفاکیوں کی وجہ سے یقین کی دولت سے محروم ہو گیا تھا۔

جب وہ مہرولی سے واپس آیا تو گلنار کی تیز نظریں اس کا پیچھا کرتی رہیں۔ وہ حمرو کو فیروز بخت سے دور رکھنا چاہتی تھی کیونکہ اس کو حمرو پر زیادہ اعتبار نہیں تھا۔ گلنار نے فیروز بخت کو اپنے پاس بلالیا اور اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگی۔ فیروز بخت نے اس کا تاثر یہ لیا کہ شاید خواجہ بختیار کاکیؒ کے مزار پر مانگی جانے والی دعا کا اثر اتنی جلدی ظاہر ہو رہا ہے۔

اتالیق خدمت گاروں کی حاکمی کے فرائض انجام دینے لگا تھا لیکن گلنار کے آگے اس کی زیادہ نہ چلتی تھی۔ اتالیق بھی اپنا وقت گزار رہا تھا کیونکہ نیا بادشاہ ابھی تک دہلی نہیں آیا تھا اور اتالیق ان غیر یقینی حالات میں معلق ہو کر رہ گیا تھا۔ گلنار نے اتالیق کے سپرد ایک اور کام کر دیا۔ اس نے اتالیق سے کہا کہ وہ اب فیروز بخت کو نظری تعلیم کے ساتھ عملی تعلیم بھی دے۔

چنانچہ اتالیق فیروز بخت کے ساتھ انسانوں میں آنے جانے لگا۔ وہ آدمیوں کے مختلف ہجوم میں فیروز بخت کو لے جاتا اور ان کی نفسیات اور عادات کی بات بتاتا اور مشاہدہ کرواتا۔ وہ فیروز بخت کو حکماء میں لے گیا اور اسے یہ بات محسوس کروائی کہ طبیب، جس کو انسانی امراض کے علاج کا علم

آتا ہے، وہ کس طرح انسانوں کی جیبیں کاٹتا ہے۔ اس نے دنیادار مشائخ کی خانقاہوں کی سیر کروائی کہ دیکھو کس طرح تارک الدنیا دکاندار اپنی دکانیں چلا رہے ہیں۔ اس نے بازاروں میں گھمایا پھرایا کہ دیکھو تجارت میں کس طرح شریفانہ انداز میں ڈکیتیاں ہو رہی ہیں۔ اتالیق نے فیروز بخت کو نصیحتیں کرتے ہوئے بتایا۔ ''فیروز بخت! دنیا کے جملہ علوم کی تحصیل کا مقصد خود شناسی اور مردم شناسی ہے۔''

فیروز بخت نے پوچھا۔ ''استادِ محترم! یہ دنیا شناسی اور مردم شناسی کس علم سے حاصل ہوتی ہے؟''

اتالیق نے جواب دیا۔ ''فیروز بخت! تجربے، غور و فکر اور عقل سے اور ان کو جلا علوم سے ملتی ہے۔ اگر تو نے خود میں غور و فکر مشاہدے اور عقل سے کام لینے کی عادت ڈال لی تو بہت جلد اس لائق ہو جائے گا کہ مردم شناسی میں ماہر ہو جائے۔ تو ایک بات ہمیشہ ذہن نشین رکھ کہ ہر انسان جو تجھ سے مخاطب ہوگا، اپنی باتوں سے اپنا تعارف کرواتا رہے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ تو سمجھنے میں کوتاہی کر جائے۔''

فیروز بخت نے کہا۔ ''استادِ محترم! میں نے جن حالات میں ہوش سنبھالا ہے اس میں، میں نے مایوسی کے علاوہ کچھ نہیں پایا۔ آپ مجھ کو کوئی ایسی نصیحت کیجیے جو زندگی بھر میری راہنمائی کرے۔''

اتالیق نے کہا۔ ''میری بات توجہ سے سن۔ اگر تجھ سے کوئی یہ پوچھے کہ دنیا میں اچھی بات کیا ہے تو، تو جواب دے گا کہ دوسروں پر اعتبار کرنا کیونکہ دوسروں پر اعتماد و اعتبار کے بغیر دنیا آگے نہیں بڑھ سکتی لیکن اگر کوئی تجھ سے یہ پوچھے کہ دنیا کی سب سے اچھی بات کیا ہے تو اس کا جواب ہوگا کہ کسی پر اعتبار نہ کرنا کیونکہ دنیا میں انسان نے زبردست نقصان اعتبار اور اعتماد ہی سے اٹھائے ہیں۔''

اتالیق کی یہ نصیحت اس نے گرہ میں باندھ لی۔

اتالیق تو یہ نصیحت کر کے کنارہ کش ہو گیا لیکن فیروز بخت کو پریشان اور خلجان میں مبتلا کر دیا۔ کچے اور ناپختہ ذہن نے اس کے دل و دماغ پر گلنار کا اعتماد بڑھا دیا تھا لیکن اس نصیحت کے بعد گلنار کا اعتماد بھی اٹھ گیا۔ وہ بڑی مشکل میں تھا کہ اگر وہ گلنار کا اعتماد نہ کرے اور عدم اعتمادی ظاہر کرے تو اس کا انجام کیا ہوگا؟

اب فیروز بخت میں بڑی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ وہ گلنار سے بہت کم ربط و ضبط رکھتا اور اگر کبھی گلنار سے بولنا ہی پڑ جاتا تو بڑے اعتبار آمیز لہجے میں بات کرتا اور اپنی کوئی بات صحیح نہ بتاتا۔

اتالیق کے نظری اور عملی علوم کا درس جاری تھا اور گلنار کے سینے پر سانپ لوٹ رہے تھے۔

صبح سورج ابھی زیادہ اونچا نہیں پہنچا تھا کہ اتالیق فیروز بخت کو اپنے ساتھ لے کر منڈی چلے گئے تاکہ اس کا مشاہدہ بھی کروا دیا جائے۔ اس کے جاتے ہی گلنار نے حمرو کو طلب کیا اور اس سے کہا۔ ''آج تجھ کو میرے کمرے اور خواب گاہ کی صفائی کرنی ہے اور یہ صفائی میں اپنی نگرانی میں کرواؤں گی۔''

حمرو نے جواب دیا۔ ''میں آپ کا خدمت گار ہوں۔ مجھ سے جو کام چاہیں لیں، میں بے چون و چرا انجام دوں گا۔''

گلنار نے اسے کام سے لگا دیا۔ اس کے بعد بولی۔ ''اس دن تو مجھ سے ناراض کیوں ہو گیا تھا؟''

حمرو نے سرد مہری سے جواب دیا۔ ''آپ مجھ پر اعتبار جو نہیں کرتیں۔''

گلنار نے کہا۔ ''کس نے کہہ دیا کہ میں تجھ پر اعتبار نہیں کرتی۔ میں تجھ پر اتنا اعتبار کرتی ہوں کہ اس حویلی میں تجھ سے زیادہ کوئی اور معتبر نہیں۔''

حمرو نے نظریں ملائے بغیر کام کرتے ہوئے پوچھا۔ ''لیکن میں اس پر کیسے یقین کروں؟''

گلنار نے جواب دیا۔ ''اس طرح کہ اب میں تجھ سے اپنا خاص کام لینے والی ہوں جس کی میں ابھی تک منصوبہ بندی کرتی رہی ہوں اور اس کام کے بارے میں تیرے علاوہ کوئی اور کچھ بھی نہیں جانتا۔''

حمرو نے کہا۔ ''میں نے آپ سے کہہ جو دیا کہ میں آپ کی خاطر اگر اپنی جان بھی گنوا دوں گا تو مجھے افسوس نہیں ہوگا۔''

گلنار نے بڑی معنی خیز لہجے میں پوچھا۔ ''تو، تو تیار ہے؟''

حمرو نے جواب دیا۔ ''بالکل، آپ جب چاہیں آزمالیں۔''

گلنار نے کہا۔ ''اگر یہ بات ہے تو میرا منصوبہ سن لے اور اس کو اچھی طرح سمجھ بھی لے۔''

حمرو کا ہاتھ رک گیا، بولا۔ ''بتائیے؟''

گلنار نے لجاجت سے کہا۔ ''اگر تو میرا یہ کام کر دے گا تو میں تجھ سے وعدہ کرتی ہوں کہ تجھ کو اس حویلی میں ایک ایسا خاص مقام دوں گی کہ دوسرے رشک کریں گے۔''

حمرو نے کہا۔ ''کام بتائیے؟''

گلنار نے باہر نکل کر دیکھا کہ وہاں کوئی اور تو موجود نہیں ہے اور جب ادھر سے مطمئن ہو گئی تو بولی۔ ''دیکھو حمرو! میں یہ کسی حال میں بھی گوارا نہیں کر سکتی کہ فیروز بخت بھائی

کی دولت اور جائداد اور کاروبار کا مالک بن جائے۔ میں بار بار یہ کہہ چکی ہوں کہ میں فیروز بخت کو کسی کی جائز اولاد ماننے کو تیار نہیں ہوں۔ گر مجھے اس کے ماں باپ کا علم ہوتا تو میں اس کی ذرا بھی مخالفت نہ کرتی اور بھائی داؤد کی ہر چیز اس کے حوالے کرنے میں مسرت وانبساط محسوس کرتی لیکن یہ جانتے ہوئے کہ فیروز بخت معلوم نہیں کس کا بیٹا ہے، میں اپنی یا بھائی داؤد کی ایک چیز بھی اسے نہیں دوں گی۔''

حمدو نے کہا۔''آپ اپنا مطلب بیان کیجیے۔''

گلنار نے جواب دیا۔''میں فیروز بخت کو اپنی راہ سے ہٹا دینا چاہتی ہوں اور یہ کوئی ایسا کام نہیں ہے جسے تو نہ کر سکے۔''

حمدو نے بڑی بے چارگی سے کہا۔''آپ حکم دیں گی تو یہ کام چٹکی بجاتے ہو جائے گا۔''

گلنار نے برا سا منہ بنا کر کہا۔''بس اسی بات سے میں چڑتی ہوں کہ تو باتوں میں حفظِ مراتب کا کوئی خیال نہیں رکھتا۔''

حمدو نے تلخی سے بچنے کے لیے کام کی بات شروع کر دی۔''مجھے کام بتائیے، میں ابھی اس کی تیاری شروع کر دیتا ہوں اور اللہ نے چاہا تو ہفتے عشرے میں تکمیل کو پہنچا دوں گا۔''

گلنار بولی۔''میں یہ چاہتی ہوں کہ فیروز بخت کا کام حویلی سے باہر کہیں اور تمام کیا جائے۔''

حمدو نے پوچھا۔''پھر کہاں اور کس طرح؟''

گلنار نے جواب دیا۔''یہ میں کیا بتاؤں گی۔ یہ تو، تو خود سوچے گا۔''

حمدو سوچ میں پڑ گیا، کچھ سوچتا رہا پھر پوچھا۔''کیا میں آپ سے یہ پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ جب فیروز بخت کا جھگڑا چکا دیا جائے گا اور حویلی میں آپ ہی آپ ہوں گی تو اس وقت میں کیا ہوں گا؟ میری کیا حیثیت ہوگی؟''

گلنار نے ناراضی سے کہا۔''پھر وہی بے تکا سوال۔ اس سوال کا جواب مستقبل پر چھوڑ دے۔ مجھ پر اور مستقبل پر۔ میں تجھ سے بااصرار یہ کہوں گی تو جب تک یہ کام نہ کر لے مجھ سے یہ سوال نہیں کرے گا۔''

حمدو چپ ہو گیا۔ گلنار نے کہا۔''میں نے فیروز بخت کو ادھر ادھر بھیجنا شروع کر دیا ہے۔ تو اپنا کام کہیں بھی کر سکتا ہے جا کر۔''

حمدو نے جواب دیا۔''آپ فکر نہ کریں۔ آج رات تک میں یہ منصوبہ تیار کر لوں گا اور پھر چند دنوں کے اندر ہی جو کچھ ہوگا، ہو جائے گا۔''

گلنار نے اس دن اس کا بڑا خیال رکھا۔ یہاں تک کہ دوپہر کا کھانا بھی اپنے ساتھ ہی کھلایا۔

اس دن حمدو شام کو فیروز بخت کے پاس پہنچ گیا اور بڑی بے تکلفی سے پوچھا۔''چھوٹے مالک! خیریت تو ہے۔ آج کل آپ بہت زیادہ گھوم پھر رہے ہیں؟''

فیروز بخت نے حمدو کو سرسری نظروں سے دیکھا اور بڑی خوش اخلاقی سے جواب دیا۔''حمدو! آؤ بیٹھو، کہاں سے آرہے ہو؟''

حمدو نے جواب دیا۔''آج میں نے حویلی کے ایک بڑے حصے کی صفائی کی۔ بہت زیادہ تھک گیا ہوں۔ اس لیے میں نے سوچا کہ آپ کے پاس بیٹھ کر اچھی اچھی باتیں کر کے دل بہلا لوں۔ اس طرح تکان بھی اتر جائے گی۔''

فیروز بخت نے مسکرا کر جواب دیا۔''ضرور، ضرور مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

ستار بھی پاس موجود تھا۔ حمدو سے کہا۔''کیا باتوں کے لیے تجھے اور کوئی نہیں ملا؟ چھوٹے مالک سے باتیں کرنا مناسب نہیں ہے کیونکہ میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے استاد محترم فرما رہے تھے کہ بڑے آدمیوں کو زیب نہیں دیتا کہ وہ چھوٹوں کو منہ لگائیں کیونکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر چھوٹوں سے بے تکلف ہوا جائے تو وہ سر چڑھ جاتے ہیں اور کام ٹھیک نہیں کرتے۔''

فیروز بخت ان دونوں کے بحث ومباحثے میں دلچسپی لینے لگا۔ حمدو نے تلخی سے کہا۔''بھائی ستار! تم ہم دونوں کے درمیان منافرت کے بیج نہ ڈالو۔ چھوٹے مالک کا مزاج دوسرے مالکوں جیسا نہیں ہے اس لیے میں یہاں باتیں کرنے آجاتا ہوں۔''

فیروز بخت نے کہا۔''میرے مخلص اور ہمدرد دوست تو فکر نہ کر اور استاد کی بات کا برا نہ مان کیونکہ یہ جھڑکیاں میں خود بھی بخوشی کھا سکتا ہوں اور اس لیے کھا سکتا ہوں کہ جھڑکیاں دینے والے کی نیت پر میں شبہ نہیں کر سکتا۔''

حمدو کے دل پر اس جواب نے وہ اثر کیا کہ اس کا دل لرز گیا۔ اس نے جھک کر فیروز بخت کے پاؤں پکڑ لیے اور معافی مانگتے ہوئے بولا۔''چھوٹے مالک! میں آپ کی نیکی اور شرافت کا دل سے قائل ہوں۔ کیا آپ میرے ساتھ روشن چراغ دہلی کے مزار پر چلنا گوارا کریں گے؟''

فیروز بخت نے جواب دیا۔''میں آپ کے ساتھ روشن چراغ دہلی کے مزار پر چلوں گا اور ان کی کرامات اور

واقعات سنوں گا۔ مجھے بزرگانِ دین کے مزار پر جا کر بڑی خوشی محسوس ہوتی ہے۔''

ستار نے اپنے طور پر کہا۔ ''لیکن چھوٹے مالک آپ کو اپنے اتالیق کی بات مان لینا چاہیے۔''

فیروز بخت نے ستار کی پروا کیے بغیر بے سوچے سمجھے حمدو سے کہا۔ ''میں نے کہہ تو دیا کہ ضرور چلوں گا اور استاد محترم اگر ناراض ہوں گے تو میں انہیں سمجھا لوں گا۔'' ستار حیران فیروز بخت کی صورت دیکھتا رہ گیا۔

حمدو نے کہا۔ ''کوئی جلدی نہیں ہے، کل تو نہیں پرسوں کے بعد سہی۔ بزرگانِ دین کے مزاروں پر جانے سے بگڑے کام بن جاتے ہیں اور آدمی کی دنیا اور آخرت سنور جاتی ہے۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''اس دوران میں استاد محترم سے جانے کی اجازت بھی لے لوں گا۔''

حمدو نے تشویش سے پوچھا۔ ''اگر استاد نے اجازت نہ دی تو؟''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''استاد محترم فرماتے ہیں کہ میں اپنی ذات میں اعتماد پیدا کروں، خود اعتمادی بحال کروں اور اس کے لیے ضروری ہے کہ مجھے کبھی کبھی تنہا بھی چھوڑ دیا جائے۔''

ستار اور حمدو، فیروز بخت کی عاقلانہ باتیں سن کر حیران رہ گئے اور اتالیق کی محنت کا ثمر دیکھ کر دل ہی دل میں اسے داد دینے لگے۔

حمدو کے چلے جانے کے بعد ستار نے فیروز بخت کو سمجھایا۔ ''چھوٹے مالک! میں آپ سے عمر میں بڑا ہوں اور آپ اتالیق کی محنت کی وجہ سے علم و فضل میں بڑھ گئے ہیں لیکن میں اپنی جہالت اور نادانی کے باوجود آپ کو سمجھاؤں گا کہ آپ حمدو پر زیادہ بھروسا نہ کیجیے گا کیونکہ گلنار بی بی کا دل آپ کی طرف سے اب بھی صاف نہیں ہے اور حمدو گلنار بی بی کا خاص آدمی ہے۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''استاد محترم نے مجھے ایک بڑے کام کی بات بتائی ہے۔ وہ یہ کہ اعتماد کرنا اچھی بات ہے اور اعتماد نہ کرنا اس سے بھی زیادہ اچھی بات ہے۔ چنانچہ اب میں استاد محترم کے اس قول پر عمل کر کے دنیا کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

ستار لاجواب ہو گیا لیکن وہ فیروز بخت کو یہ سمجھانے پر مصر تھا کہ وہ حمدو پر اعتبار نہ کرے۔ اس نے اس کام میں اتالیق کی مدد لینا چاہی۔ اتالیق کہیں گیا ہوا تھا اور کچھ پتا نہ تھا کب تک واپس آئے گا۔ اس دوران اس نے یہ تماشا دیکھا کہ فیروز بخت کو گلنار نے بلا لیا اور اس کو بڑی محبت سے اپنے پاس بٹھا لیا۔ گلنار نے فیروز بخت کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور کہا۔ ''فیروز بخت! مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ اب تو علم و عقل کی باتیں کرنے لگا ہے۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''ان میں آپ کی دعاؤں اور استاد محترم کی جانفشانی کا بڑا دخل ہے۔''

گلنار نے کہا۔ ''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اس حویلی کے لیے یہ ضروری ہے کہ تو ہر طرح لائق فائق ہو جائے۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''میرا لائق فائق ہونا... بیکار تھا اگر آپ کی مرضی بھی شاملِ حال نہ ہوتی۔''

گلنار نے پوچھا۔ ''میں نے سنا ہے کہ استاد محترم تجھ میں خود اعتمادی اور اعتمادِ ذات بحال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں؟''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''ہاں کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ کسی انسان سے خود اعتمادی اور اعتمادِ ذات چھین لی جائے تو گویا اس کا سب کچھ چھین لیا گیا اور اگر کسی انسان کے پاس خود اعتمادی اور اعتمادِ ذات کے سوا کچھ بھی نہیں تو اس کے پاس سب کچھ ہے۔''

گلنار اس کی خردمندانہ باتیں سن کر ڈانواں ڈول ہو گئی اور ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ فیروز بخت کو زندہ رکھا جائے لیکن یہ لمحاتی جذبہ فوراً کافور ہو گیا۔ گلنار نے کہا۔ ''میں تو سیدھی سادی ایک بات جانتی ہوں۔ بھائی داؤد کا کاروبار تجھے سنبھالنا ہے۔ دولت اور جائداد کا انتظام تجھے کرنا ہے۔ اب اگر تجھ میں اتنی صلاحیت موجود نہیں ہوگی کہ تو کسی کے مشورے اور رائے کے بغیر اپنا کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ آہستہ آہستہ چالاک لوگ تجھ پر، تیری عقل اور تیری رائے پر، تیرے فیصلوں پر حاوی آ جائیں گے اور پھر جو کچھ تیرے پاس ہوگا، وہ دوسروں کے قبضے میں چلا جائے گا۔''

''بے شک، بے شک۔'' فیروز بخت نے کہا۔ ''آپ بجا فرماتی ہیں۔''

گلنار نے کہا۔ ''اگر تجھے مجھ پر اعتماد ہے تو پھر اتالیق کے بعد دوسرا درجہ مجھے دے اور میں جو کچھ کہوں، اس پر غور کر اور جب تو اس سے متفق ہو جائے تو اس پر عمل کر۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''میں آپ پر اعتبار کرتا ہوں۔ آپ کی شفقت، آپ کی محبت پر بھروسا کرتا ہوں اور یہ حقیقت ہے کہ میں آپ کو اتالیق کے بعد کا نہیں ان

کے مساوی درجہ دیتا ہوں اور یہ ناممکن ہے کہ آپ مجھے کوئی مشورہ دیں اور اس پر عمل نہ کروں۔“

گلنار نے کہا۔ ”فیروز بخت! وہ استاد محترم ہوں یا کوئی اور...... تیرا ہمدرد بھائی داؤد اور میرے سوا کوئی اور نہیں ہوسکتا۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”میں جانتا ہوں۔“

گلنار نے کہا۔ ”مجھے معلوم ہوا ہے کہ حمد و تجھے کہیں لے جانا چاہتا ہے؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”آپ نے صحیح سنا ہے۔ وہ مجھے روشن چراغ دہلی کے مزار پر لے جانا چاہتا ہے۔“

گلنار نے کہا۔ ”لیکن اس کے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ تجھ کو اعتمادِ ذات کی بحالی کے لیے ہر کام کسی کے سہارے کے بغیر انجام دینا چاہیے۔ روشن چراغ دہلی، بختیار کاکیؒ، نظام الدین اولیاؒ غرضیکہ تجھے جہاں بھی جانا ہے، تنہا جا اور ہر معاملے میں خود فیصلے کرنے کی عادت ڈال۔ تو استاد محترم سے کہہ دے کہ کچھ دنوں کے لیے وہ تجھے تنہا چھوڑ دیں۔“

فیروز بخت گلنار سے اتنا متاثر تھا کہ اب گلنار کے مقابلے میں اتالیق بھی کچھ نہیں تھا۔ جواب دیا۔ ”میں نے تو فیصلہ کرلیا ہے کہ اب میں آپ کے مشوروں کو ترجیح دوں گا اور استاد محترم کے مشوروں پر عمل کرنے میں تساہل سے کام لوں گا۔“

گلنار نے کہا۔ ”لیکن ایک بات کا خیال رہے کہ تو جو قدم بھی اٹھائے، اس سے مجھے مطلع ضرور کردیا کر۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”ضرور، ضرور۔“

پھر گلنار، فیروز بخت سے دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔

☆☆☆

داؤد کا ایک اور خط آگیا۔ اس میں اس نے لکھا تھا کہ وہ عنقریب واپس آجائے گا اور گلنار سے یہ بھی خواہش کی تھی کہ وہ ایک خط فیروز بخت سے بھی لکھوا کر روانہ کرے۔

لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اس بار اتالیق کو کوئی خط بھی نہیں لکھا تھا۔ اتالیق کو افسوس بھی ہوا لیکن وہ اس کی شکایت کس سے کرتا۔ گلنار نے فوراً ہی اس کا جواب دے دیا اور اس میں فیروز بخت کی بڑی تعریف کی۔ اس نے لکھا کہ فیروز بخت میں بلا کی خودشناسی آگئی ہے اور وہ ایسی باتیں کرنے لگا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ وہ اعتمادِ ذات بحال کرنے کی کوششیں کررہا ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ بھائی داؤد جب آؤ گے اور فیروز بخت کو دیکھو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔ کیونکہ یہ دس گیارہ سالہ لڑکا بڑی عالمانہ اور فلسفیانہ باتیں کرنے لگا ہے۔ میں نے فیروز بخت کو بہت پہلے ہی کیوں نہیں پہچان لیا تھا۔ میں آپ کی مردم شناسی کی قائل ہوگئی ہوں۔“

گلنار نے ایک خط فیروز بخت سے بھی لکھوایا۔ فیروز بخت نے اپنے خط میں لکھا۔

”میرے محسن! میرے عظیم کرم فرما! میں آپ کا کس طرح شکریہ ادا کروں۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں بار بار آپ کی خدمت اور اطاعت میں اپنی جان دیتا رہوں، تب بھی میں آپ کے احسانِ عظیم کی ادائیگی سے قاصر رہوں گا۔

”میں اپنے اتالیق کا بھی شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھ میں نظری اور عملی علوم کی منتقلی میں جو محنت کی ہے، وہ کسی اور کے بس کی بات نہیں تھی اور خاص کر جب میں اپنے حالات اور ایام پر غور کرتا ہوں جب حویلی میں گلنار بی بی میری مخالفت پر کمربستہ تھیں اور انہوں نے استاد محترم کی ادائیگی بھی روک لی تھی۔ استاد محترم اس وقت بھی مجھ سے دور نہیں رہے اور اپنا کام جاری رکھا جس کے لیے میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ اگر آپ ہی کی نیت صالح نہ ہوتی تو یہ استاد محترم میرے لیے شاید کبھی نہ کرسکتے۔ انہوں نے مجھے خود شناسی، خدا شناسی اور مردم شناسی کے بے مثال درس دیے ہیں۔ انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا ہے کہ میں کسی پر اعتبار یا اعتماد نہ کروں کیونکہ دنیا کے عظیم دھوکے اور بے مثال فریب اعتماد ہی کی وجہ سے کھائے جاتے ہیں۔“

اس کے بعد اس نے گلنار کی تعریفیں کیں۔ ”گلنار بی بی کے بارے میں، میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے پہلے مجھے پہچانا نہیں تھا لیکن پھر جیسے ہی پہچان لیا، وہ مجھ پر مہربان ہوگئیں۔ میں ان سے زیادہ کسی اور کو خود پر مہربان نہیں پاتا۔ اگر وہ مجھ پر مہربان نہ ہوتیں تو میں آج یہ نہ ہوتا جو اپنے خط میں نظر آرہا ہوں۔“

لیکن جب یہ خط گلنار نے پڑھا تو اس نے بڑی نرمی سے فیروز بخت کو حکم دیا کہ اپنے خط سے اتالیق کے ذکر والا حصہ حذف کردے کیونکہ اتالیق نے جو کچھ کیا، وہ اس کا ایک ایسا فرض تھا جس کا معاوضہ دیا گیا ہے اور جو چیز معاوضے سے خریدی گئی ہو اس کا احسان ماننا یا شکریہ ادا کرنا کیا معنی۔ چنانچہ فیروز بخت نے اتالیق کا ذکر حذف کردیا اور خط کو نقل کرکے دوبارہ گلنار کے حوالے کردیا۔

اب گلنار حویلی میں تنہا وہ ذات تھی جس کا کوئی مدمقابل

نہیں تھا۔ اتالیق اور ستار کی قدرو قیمت خاک میں ملادی گئی تھی۔ اب یہ دونوں فیروز بخت کی نظر غرض کے بندے تھے۔ اس تبدیلی کو اتالیق اور ستار یکساں محسوس کر رہے تھے لیکن بولتے ہوئے گھبراتے تھے۔ اتالیق پریشان تھا کہ کہیں ساری محنت پر پانی نہ پھر جائے۔ وہ اب بھی فیروز بخت کے سامنے کام کی باتیں کرتا رہتا تھا لیکن اب ان باتوں میں پہلے جیسا زور نہیں تھا۔ اس تبدیلی کو فیروز بخت بھی اچھی طرح محسوس کر رہا تھا۔ ستار بھی کڑھ رہا تھا لیکن اس کا علاج سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ حمرو نے بھی کئی بار میٹھی میٹھی باتیں کیں مگر ان باتوں کا فیروز بخت پر کوئی اثر نہ ہوا۔

ایک دن صبح صبح اتالیق حویلی میں داخل ہوا تو اس نے فیروز بخت کو کہیں جانے کے لیے تیار دیکھا۔ فیروز بخت نے اتالیق کو دیکھتے ہی بے پروائی سے کہا۔ ''استاد محترم! آج میں آپ کو وقت نہیں دے سکوں گا کیونکہ میں ذرا باہر جارہا ہوں۔''

اتالیق کو غصہ آگیا۔ ''فیروز بخت! یہ تو بول رہا ہے؟''

''ہاں استاد محترم! یہ میں بول رہا ہوں۔ کوئی خاص بات؟''

''نہیں، یہ تو نہیں بول رہا۔ آواز تیری ہے مگر بول کوئی اور رہا ہے۔''

فیروز بخت نے کہا۔ ''استاد محترم! یہ آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ان پیچیدہ باتوں کا میں مطلب نہیں سمجھا؟''

اتالیق نے جواب دیا۔ ''میں نے جس فیروز بخت کو تعلیم و تربیت دی ہے، وہ مجھ سے یوں بے تکلفی سے بات نہیں کرسکتا۔''

فیروز بخت نے ہنس کر کہا۔ ''اچھا تو یہ بات ہے لیکن استاد محترم! میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے آپ کو اذیت پہنچے۔''

اتالیق نے فیروز بخت کو دونوں شانوں سے پکڑ لیا اور اسے ہلاتے ہوئے بولا۔ ''فیروز بخت! میں نے تجھ سے کیا کہا تھا؟ کیا میں نے تجھ سے یہ بات نہیں کہی تھی کہ دوسروں پر اعتبار کرنا اچھی بات ہے مگر کسی پر اعتبار نہ کرنا اس سے بھی اچھی بات ہے۔''

''ہاں، مجھے آپ کا یہ قول اچھی طرح یاد ہے استاد محترم۔''

''پھر تو نے اس پر عمل کیا؟''

''ہاں، میں اس پر عمل بھی کر رہا ہوں۔ کیا کوئی خاص بات ہے جسے آپ کو بتانا چاہیے تھا؟''

اتالیق نے ذرا غصے میں جواب دیا۔ ''تیرا دماغ جلد ٹھکانے آجائے گا۔ اگر تو نے میرے اس قول کو حرزِ جاں نہ بنایا تو خدا ہی جانے تیرا کیا حشر ہوگا۔''

فیروز بخت نے کہا۔ ''آپ مجھ سے اس قسم کی باتیں نہ کریں۔''

اتالیق نے کہا۔ ''میری بات سمجھنے کی کوشش کر۔ سوچ اور غور کر کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''آپ نے مجھ کو یہ درس دیا ہے کہ میں کسی پر اعتبار نہ کروں۔ چنانچہ میں اس پر عمل کر رہا ہوں اور اب میں کسی پر بھی اعتبار نہیں کرتا جس میں آپ کی ذات بھی شامل ہے۔''

اتالیق غصے سے بے قابو ہونے لگا، کہا۔ ''تو گستاخی کر رہا ہے۔''

''میں کوئی گستاخی نہیں کر رہا۔''

اتالیق نے پھر سمجھانے کی کوشش کی۔ ''فیروز بخت! میں تیرا ہمدرد ہوں، استاد ہوں۔ تجھے میری باتوں پر تو اعتبار کرنا ہی پڑے گا کیونکہ میں تیرا اتالیق تیرا استاد ہوں۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''استاد محترم! گستاخی معاف۔ آپ نے مجھے تعلیم و تربیت دے کر کوئی احسان نہیں کیا کیونکہ میں نے آپ سے یہ چیز قیمت دے کر حاصل کی ہے۔ میں نے آپ کو آپ کی اتالیقی اور استادی کا معاوضہ دیا ہے۔ جب کوئی چیز معاوضہ ادا کر کے حاصل کی گئی ہو تو اس پر دکاندار کا احسان کیسا؟''

اتالیق کا سر چکرانے لگا، بڑے دکھ سے پوچھا۔ ''یعنی تو مجھ کو ایک دکاندار اور خود کو ایک گاہک سمجھتا ہے؟''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''بے شک، میں اس سے زیادہ سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں۔''

اتالیق نے کہا۔ ''تب پھر میں آج کے بعد اس حویلی میں قدم نہ رکھوں گا۔''

فیروز بخت نے کہا۔ ''استاد محترم! آپ کو اس وقت تک آتے رہنا ہے جب تک چچا داؤد واپس نہ آجائیں کیونکہ وہی آپ کو مجھ پر متعین کر کے گئے تھے۔''

اتالیق نے غصے میں کہا۔ ''فیروز بخت! مجھ سے فضول باتیں نہ کر، اب میں تجھ سے کوئی بات نہ کروں گا۔''

فیروز بخت نے ذرا ادب سے کہا۔ ''گلنار بی بی کی باتیں ایک طرف لیکن میں اب بھی اپنے دل میں آپ کی عزت محسوس کرتا ہوں۔''

اتالیق نے پوچھا۔ ''گلنار تجھ کو کیا سبق دیتی ہے؟''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''وہ کہتی ہیں کہ میرا گلنار اور چچا داؤد سے زیادہ کوئی بھی ہمدرد نہیں۔ یہ کہ میں کسی پر بھی بھروسا نہ کروں کیونکہ فیصلے مجھے کرنے ہوں گے،

کاروبار میں سنبھالوں گا، دولت اور جائداد میرے تصرف میں ہوگی۔"

اتالیق نے آہستہ سے کہا۔ "اناللہ وانا الیہ راجعون، میں گلنار کی حماقت کا کیا کروں؟ بس یہی کہوں گا کہ تو نے اس طرح لوگوں پر اعتبار کرنا شروع کر دیا تو تو تباہ و برباد ہو جائے گا۔"

فیروز بخت نے کہا۔ "اور مجھ سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ میں اپنا ہر کام خود انجام دوں۔ اس کے علاوہ میں دہلی اور دنیا کو کسی کے ساتھ نہیں، خود تنہا چل پھر کر دیکھوں گا اور اس وقت بھی روشن چراغ دہلی کے مزار پر تنہا جارہا ہوں۔"

"فیروز بخت! میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ تو اب بھی ہوش میں آجا کیونکہ میرے علاوہ یہاں کوئی بھی ایسا نہیں جو تجھے بے لوث مشورہ دے۔"

فیروز بخت نے جواب دیا۔ "استاد محترم! اس وقت تو میں چراغ دہلی کے مزار پر جارہا ہوں، واپسی پر بات کروں گا۔"

اتالیق نے ہمدردی سے کہا۔ "خدا تجھے راہِ راست دکھائے۔"

ان دونوں کی باتیں ستار بھی سن رہا تھا لیکن وہ ان کے سامنے نہیں تھا، اچانک سامنے آکر بولا۔ "استاد محترم! آپ چھوٹے مالک کی باتوں کا برا نہ مانیے گا۔ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اپنی دانست میں درست کہہ رہے ہیں کیونکہ ان کی اپنی ذات ادھوری اور ناقص ہے۔ گلنار بی بی بھی تو کوئی چیز ہیں۔"

فیروز بخت نے دونوں سے کہا۔ "آپ دونوں باتیں کریں۔ میں دوپہر کے بعد آپ دونوں سے باتیں کروں گا۔ اس وقت تک اجازت دیجیے۔"

فیروز بخت چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی اتالیق اور ستار سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ فیروز بخت، چراغ دہلیؒ کے مزار پر جاچکا تھا۔

☆☆☆

فیروز بخت نے گھوڑے کو ایک درخت سے باندھ دیا اور خود چراغ دہلیؒ کے روضے میں چلا گیا۔ وہاں اس نے فاتحہ پڑھی اور بڑی دیر تک دعائیں مانگتا رہا۔ اس کا دل بھر آیا اور کپکپاتی آواز میں بولا۔ "حضرت چراغ دہلیؒ! لوگ کہتے ہیں کہ آپ انسانوں کی دعاؤں کو باب اجابت تک پہنچانے کا وسیلہ بن جاتے ہیں۔ اس خوش خبری نے مجھے آپ کے در تک پہنچایا ہے۔ میں ایک عاجز، بے نوا لڑکا آپ کے توسط سے استعانت چاہتا ہوں۔ میں مردم شناسی، خود شناسی اور خدا شناسی کا طالب ہوں۔ میں نے اپنی اس نوعمری میں ہی وہ وہ تماشے دیکھے ہیں کہ انسانوں سے نفرت ہونے لگی ہے۔ میں سکون چاہتا ہوں اور ایک ایسی زندگی کا طالب ہوں جس میں مکروفریب، ریاکاری، عیاری اور انسانوں کی دل آزاری کے پہلو نہ ہوں۔ مجھے انسانوں کے شر سے پناہ دیجیے۔"

جب وہ یہ دعا مانگ رہا تھا تو اس کے پاس ہی دوسرے لوگ بھی فاتحہ پڑھنے میں مشغول تھے۔ چاروں طرف بارہ در تھے اور اس کے ستون سنگِ خارا کے تھے۔ داخلے کا دروازہ ایک ہی تھا جو جنوب میں واقع تھا۔ فیروز بخت نے دروازے کے پاس چند آدمی کھڑے دیکھے جو اسی کی طرف دیکھ رہے تھے اور ان کے چہرے رومالوں میں چھپے ہوئے تھے۔ فیروز بخت فاتحہ پڑھ کر اور دعا مانگنے کے بعد جب درگاہ سے باہر نکلنے لگا تو رومالوں سے چہروں کو چھپائے ہوئے لوگوں نے اسے روک لیا۔ ایک نے پوچھا۔ "تیرا نام کیا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "فیروز بخت..... کیوں کیا بات ہے؟"

ان میں جو سب سے زیادہ طاقت ور نظر آتا تھا، اس نے فیروز بخت کا بازو پکڑ لیا اور بولا۔ "اگر فیروز بخت تیرا ہی نام ہے تو ادھر آ میرے ساتھ تاکہ میں تجھے بتاؤں کہ ہم کون ہیں۔"

یہ پانچ آدمی تھے۔ انہوں نے فیروز کو درمیان میں لے لیا اور درگاہ سے باہر نکل آئے۔ درگاہ کے باہر دالان کے چبوترے پر بہت سارے لوگ بیٹھے اور لیٹے ہوئے تھے۔ بیٹھے ہوئے لوگوں میں حمدو بھی نظر آیا۔ فیروز بخت نے حمدو کو آواز دی۔ "حمدو! ذرا میرے پاس تو آ۔" پھر اپنے آس پاس موجود آدمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "معلوم نہیں، یہ کون لوگ ہیں اور معلوم نہیں کہاں اور کیوں مجھے لے جارہے ہیں۔"

حمدو اپنی جگہ سے اٹھا تو اس کے ساتھ دو دوسرے آدمی بھی اٹھے لیکن حمدو کے قریب آنے سے پہلے ہی طاقتور اجنبی نے فیروز بخت کو ڈانٹ دیا۔ "یہ آدمی ہمارا کیا کرلے گا؟ تو اسے کیوں زحمت دے رہا ہے؟"

حمدو اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ فیروز بخت کے قریب پہنچا اور اجنبی سے سختی سے پوچھا۔ "تم لوگ کون ہو اور میرے چھوٹے مالک کو کیوں اور کہاں لے جارہے ہو؟"

طاقتور اجنبی نے جواب دیا۔ "فیروز بخت میرے مرحوم بھائی کی نشانی ہے۔ میں ایک مدت سے اس کی تلاش میں تھا۔ شہدی نے بتایا کہ اس نے میرے بھتیجے کو تاجر داؤد کرمانی کے حوالے کر دیا ہے۔ میں اس کی تلاش میں داؤد کی

حویلی پہنچا تو معلوم ہوا کہ فیروز بخت روشن چراغ ولیؒ کی درگاہ گیا ہوا ہے۔ چنانچہ ہم لوگ اسے تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آگئے اور خدا کا شکر ہے کہ آخر اسے پالیا۔"

حمدو نے پوچھا۔ "تو اب تم لوگ میرے چھوٹے مالک کو کہاں لے جاؤ گے؟"

اجنبی نے جواب دیا۔ "جہنم میں۔ تو یہ سوال کرنے والا کون ہے اور میں اس سوال کا جواب کیوں دوں تجھے؟"

فیروز بخت نے کہا۔ "میں تیرا بھتیجا نہیں ہوں اور میں تیرے ساتھ نہیں جاؤں گا۔"

اجنبی نے سختی سے کہا۔ "تو میرے ساتھ کیوں نہیں جائے گا؟ میں تجھے زبردستی اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

فیروز بخت نے جواب دیا۔ "تو مجھے زبردستی کیسے لے جائے گا اپنے ساتھ؟ میں تجھے نہیں جانتا اور پھر اگر میں واقعی تیرا بھتیجا ہوں تو اب تک تو کہاں تھا؟"

حمدو نے سختی سے کہا۔ "میرے چھوٹے مالک کو چھوڑ دے ورنہ میں زبردستی چھڑا لوں گا۔"

اجنبی مذاق اڑاتے ہوئے بولا۔ "تو زبردستی چھڑا لے گا اس کو، میرے بھتیجے کو؟ سبحان اللہ! تو ابھی ہم سے واقف نہیں ہے اس لیے ایسی بات کررہا ہے۔" پھر اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ "جھگڑنے کی کوئی ضرورت نہیں، فیروز بخت کو لے کر نکل چلو لیکن اگر کوئی مزاحم ہو تو اس کا سر کچل دو۔"

یہ کہہ کر اجنبی نے فیروز بخت کو دھکا دے کر اپنے ایک ساتھی کے حوالے کردیا۔ فیروز بخت لڑکھڑاتا ہوا اس سے جا ٹکرایا۔ اس نے فوراً ہی فیروز بخت کو دبوچ لیا اور پھر یہ پانچوں آدمی فیروز بخت کو زبردستی کھینچتے گھسیٹتے دالان سے باہر لے چلے۔

حمدو اپنے دونوں ساتھیوں کو لے کر مزاحم ہوا لیکن اجنبی نے تلوار یا خنجر کی مدد لیے بغیر ہی ان تینوں پر جھپٹ کر مکوں اور گھونسوں سے بدحواس کردیا۔ حمدو اور اس کے دونوں ساتھی پریشان اور خوفزدہ ہو کر منتشر ہوگئے اور چیخنا چلانا شروع کردیا۔ "لوگو...! بچاؤ یہ بدمعاش ہمارے چھوٹے مالک کو پکڑے لیے جارہے ہیں۔ خدا کے لیے ہماری مدد کرو۔"

لوگ ادھر ادھر سے دوڑنے بھاگنے لگے لیکن پانچوں اجنبی اتنے چست اور چالاک تھے کہ فیروز بخت کو گھوڑے پر بٹھا کر ایک طرف فرار ہوگئے۔ حمدو اور اس کے دونوں ساتھی شور ہی کرتے رہ گئے۔ حمدو نے کچھ دور تک ان کا پیچھا بھی کیا لیکن پھر واپس آگیا۔ اب اس کے ہوش وحواس درست ہورہے تھے۔ وہ درگاہ کے باہر دالان کے چبوترے پر سر جھکا کر بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کرکے کچھ سوچنے لگا پھر آپ ہی آپ مسکرایا اور آہستہ سے کہا۔ "خس کم جہاں پاک۔"

اپنے دونوں ساتھیوں کو حکم دیا۔ "اب تم دونوں بھی جاسکتے ہو۔ کل کسی وقت حویلی آجانا اور اپنا معاوضہ لے جانا۔"

درگاہ کے چند آدمی حمدو کے پاس آئے اور پوچھا۔ "بھائی! یہ معاملہ کیا تھا؟"

پہلے تو حمدو گھبرایا لیکن پھر حواس کو مجتمع کرتے ہوئے کہا۔ "صاحبان! اس لڑکے کو ہمارے مالک نے پالا تھا لیکن اب وہ جبکہ دس گیارہ سال کا ہوچکا ہے تو اس کا چچا اسے چھین کر لے گیا۔"

کسی نے پوچھا۔ "کہاں لے گیا؟"

اس نے جواب دیا۔ "کیا پتا کہاں لے گیا؟"

لیکن انہی لوگوں میں سے ایک آواز آئی۔ "لیکن ہمیں معلوم ہے کہ فیروز بخت کہاں گیا اور اس کو کون لے گیا؟"

حمدو نے گھبرا کر آواز کی طرف دیکھا تو اتالیق اور ستار کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ حمدو کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

اتالیق، حمدو کے سر پر پہنچ گیا اور پوچھا۔ "حمدو! سچ بتا یہ فیروز بخت کو کون لوگ لے گئے؟ ابھی ابھی میں نے اسے پانچ آدمیوں کے نرغے میں کہیں جاتے ہوئے دیکھا ہے۔"

حمدو نے جواب دیا۔ "میں نہیں جانتا اور میں نے تو چھوٹے مالک کو ان موذیوں سے چھڑانے کی بھی کوشش کی تھی۔"

اتالیق نے پوچھا۔ "کیا تو یہاں فیروز بخت کے ساتھ آیا تھا؟"

"نہیں، مجھے تو یہاں گلنار بی بی نے بھیجا تھا کیونکہ فیروز بخت اکیلا آرہا تھا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ تو فیروز بخت سے دور دور رہ کر اس کی نگرانی کر، چنانچہ میں گلنار بی بی کے حکم کی تعمیل میں یہاں تک آگیا تھا۔"

اتالیق نے طنز کیا۔ "سبحان اللہ! جب تک فیروز بخت اغوا نہیں ہوا تھا، وہ چھوٹے مالک کہلاتا تھا لیکن اس کے جاتے ہی اب وہ محض فیروز بخت رہ گیا ہے۔ اس سادگی پر قربان جائیے کہ جرم کو چھپانے کی جتنی کوشش کی جارہی ہے، وہ اتنا ہی ظاہر ہورہا ہے۔"

ستار نے حمدو کو ملامت کی۔ "حمدو! تو نے بڑا غلط کام کیا ہے، تجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

حمدو روہانسا ہوگیا۔ "آپ دونوں میری بات پر یقین کیوں نہیں کرتے؟ میں خود پریشان ہوں کہ آخر گلنار بی بی کو جواب کیا دوں گا۔"

اتالیق نے کہا۔ ''پریشان تو ہم دونوں ہیں اور یہ سوچ رہے ہیں کہ آج کل میں جب داؤد آئے گا تو ہم دونوں اسے کیا جواب دیں گے۔ ہمارے پاس تو کوئی معقول عذر بھی نہیں اور پھر اس عذر کو داؤد ماننے ہی کیوں لگا۔ رہ گئیں گلنار بی بی تو ہم دونوں جانتے ہیں کہ وہ تجھ سے فیروز بخت کے بارے میں کوئی جواب طلب کریں گی ہی نہیں کیونکہ یہ جو کچھ ہوا ہے، اس میں وہ شروع سے آخر تک شریک رہی ہیں۔''

حمدو نے ذرا اکڑ کر پوچھا۔ ''یہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں کیا آپ گلنار بی بی کے سامنے بھی کہہ سکتے ہیں؟''

اتالیق نے سختی سے جواب دیا۔ ''گلنار بی بی تو کیا جس کے سامنے بھی کہو، کہہ سکتا ہوں کیونکہ میں اس حویلی کا ملازم نہیں رہا جس میں تیری گلنار بی بی رہتی ہیں۔''

ستار نے کہا۔ ''اور آج سے میں نے بھی اس حویلی کو خدا حافظ کہہ دیا ہے۔''

حمدو گھبرایا کہ اب کیا ہوگا؟ کیونکہ یہ دونوں ہی کسی حد تک اس سازش سے آگاہ معلوم ہوتے تھے جو گلنار نے فیروز بخت کے سلسلے میں تیار کی تھی۔ اس نے نرمی سے کہا۔ ''استاد محترم! اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ فیروز بخت کے ساتھ میں نے کچھ کیا ہے تو آپ مجھے سزا دلوا سکتے ہیں۔ میں بالکل بے قصور ہوں۔''

''کون خطا کار اور کون بے خطا ہے، اس کا فیصلہ تو داؤد کی موجودگی میں ہوگا لیکن تو نے یہ جو کچھ کیا ہے، اچھا نہیں کیا۔'' اس کے بعد ستار سے کہا۔ ''ستار! تو بھی خطا کار ہے۔ تجھے فیروز بخت کو تنہا نہیں آنے دینا چاہیے تھا۔''

ستار نے کہا۔ ''اگر میں فیروز بخت کے ساتھ ہوتا بھی تو اس سے کیا فرق پڑ جاتا۔ وہ پانچ تھے اور ہم دو۔ ہم ان پانچ کا کس طرح مقابلہ کر سکتے تھے۔''

اتالیق نے بڑے دکھ سے کہا۔ ''یہ جو کچھ ہوا، بہت برا ہوا۔ میں تو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔''

حمدو نے ان دونوں کی خوشامد کی۔ ''آپ دونوں حویلی تک چلیں گے؟''

اتالیق نے طنزاً کہا۔ ''اب ہم دونوں وہاں کس کے پاس اور کیا لینے جائیں گے؟''

حمدو نے بڑی کوشش کی کہ وہ ان دونوں کو بھی حویلی لے جائے لیکن اتالیق اور ستار اس پر کسی طرح بھی راضی نہ ہوئے۔

حمدو حویلی چلا گیا اور اتالیق اور ستار ایک ساتھ کہیں اور چلے گئے۔

☆☆☆

حمدو جیسے ہی حویلی میں داخل ہوا، اس نے گلنار کو مضطربانہ ادھر اُدھر ٹہلتے دیکھا۔ حمدو نے سامنے جاتے ہی پوچھا۔ ''مزاج معلّی؟''

گلنار نے بھنچی بھنچی آواز میں پوچھا۔ ''کمبخت! فیروز بخت کہاں ہے؟''

حمدو نے ادھر اُدھر دیکھ کر سرگوشی میں کہا۔ ''وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچ گیا۔''

گلنار نے فرطِ خوشی میں پوچھا۔ ''سچ؟''

حمدو نے جواب دیا۔ ''میں بالکل سچ عرض کر رہا ہوں۔''

گلنار نے بے اختیار کہا۔ ''حمدو! تو نے وہ کام کیا ہے کہ اس کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔ میں کس زبان سے تیرا شکریہ ادا کروں۔ تو نے اس حویلی اور میرے خاندان پر احسانِ عظیم کیا ہے...... احسانِ عظیم۔ اس احسان کا اجر آسان نہیں ہے۔ آج میں بہت خوش ہوں، بے انتہا خوش۔''

حمدو نے آہستہ سے کہا۔ ''آپ خود پر قابو پائیے۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر حویلی کے کسی خدمت گار نے آپ کی یہ باتیں سن لیں تو غضب ہو جائے گا۔ اندر چلیے وہیں باتیں ہوں گی۔''

گلنار نے سرشاری میں کہا۔ ''حمدو! اس وقت میں بے حد خوش ہوں اور کسی سے بھی خوفزدہ ہونے کو تیار نہیں۔ اگر تو بقیہ باتیں اندر چل کر کرنا چاہتا ہے تو چل، اندر چل کر ہی کرلیں گے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت میں اتنی خوش اور نڈر ہوں کہ کسی سے بھی خوفزدہ ہونے کو تیار نہیں۔''

حمدو نے جواب دیا۔ ''خوفزدہ ہونے کو تو میں خود بھی تیار نہیں ہوں لیکن ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا ہے جس سے میں بہت زیادہ خوف زدہ ہوں۔''

گلنار اسے اپنے کمرے میں لے گئی اور پوچھا۔ ''ہاں تو اب بتا، تو کس بات سے خوف زدہ ہے؟''

حمدو نے جواب دیا۔ ''جب میں نے فیروز بخت کو پانچ بدمعاشوں کے حوالے کیا تو وہیں ایک طرف سے اتالیق اور ستار بھی نمودار ہو گئے۔''

گلنار نے گھبرا کر پوچھا۔ ''وہ دونوں کہاں سے آ گئے؟ انہیں کس نے خبر دی تھی؟''

حمدو نے جواب دیا۔ ''مجھے کچھ نہیں معلوم، میں کیا بتاؤں۔''

گلنار نے التجا آمیز پیرائے میں کہا۔ ''حمدو! کیا تجھے

یقین ہے کہ فیروز بخت کا کام تمام کر دیا گیا ہوگا؟''

''مجھے پورا یقین ہے۔''

''اور کیا تجھے یہ یقین ہے کہ اتالیق اور ستار کسی منصوبے کے بغیر اچانک وہاں پہنچ گئے تھے؟''

''نہیں، مجھے یہ یقین نہیں ہے۔''

گلنار نے حمرو کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔''اگر تجھے یہ یقین نہیں ہے تو یہ بھی بتا کہ یہ دونوں مجھے کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں؟''

حمرو نے جواب دیا۔''میں کچھ نہیں جانتا۔ آپ نے یہ کام میرے سپرد کیا تھا، میں نے اسے کر دیا۔ بس، اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا۔''

گلنار نے زور دے کر سوال کیا۔''میں جو پوچھ رہی ہوں، اس کا جواب دے کیونکہ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو اس میں ہم دونوں ہی پکڑے جائیں گے۔ اس لیے اس مسئلے پر ہمیں اسی وقت غور و فکر کر لینا چاہیے۔''

حمرو نے بے رخی سے کہا۔''گلنار بی بی! میں نے کہہ جو دیا کہ یہ جو کچھ ہوا ہے، آپ کے حکم اور آپ کی خواہش پر ہوا ہے، اس لیے مجھے بچانا آپ کا فرض ہے اور اگر آپ مجھے بچانے میں ناکام رہیں تو پھر اپنے دفاع میں، میں خود کوئی قدم اٹھاؤں گا اور میرے اس قدم سے آپ کو فائدہ ہوگا یا نقصان، میں کچھ نہیں جانتا۔''

گلنار نے کہا۔''اچھا، تب پھر تو ایک کام کر۔ تو کچھ دنوں کے لیے حویلی سے غائب ہو جا پھر ہفتے عشرے میں اس طرح واپس آ جانا گویا تجھے بھی اغوا کر لیا گیا تھا۔ اس دوران تو اپنے اغوا کی ایک فرضی داستان بھی گھڑ سکے گا۔''

حمرو نے جواب دیا۔''لیکن میں جاؤں کہاں؟ میرا تو کوئی ٹھکانا بھی نہیں۔''

گلنار فکر میں ڈوب گئی، بڑی دیر تک سوچتی رہی۔ حمرو اس کی پریشانی سے خوش ہوتا رہا۔ اس نے فکر و تردد کی زخم خوردہ گلنار کے ایک اور چرکا لگایا، بولا۔''میں جہاں بھی چھپوں گا پکڑا جاؤں گا کیونکہ میں ایک عام آدمی ہوں اور کسی عام آدمی کے پاس ہی چھپ سکوں گا۔''

گلنار اٹھ کر ملحقہ کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔''میں ابھی آتی ہوں۔ جب تک میں واپس نہ آ جاؤں تو یہیں رہے گا، کہیں جائے گا نہیں۔''

وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی اور حمرو گلنار کی پریشانی پر دل ہی دل میں خوش ہوتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آئی اور حمرو سے سرگوشی میں کہا۔''حمرو! تو دوران روپوشی ملحقہ کمرے میں رہے گا۔ میں نہایت ہوشیاری سے تجھے کھانا پانی پہنچاتی رہوں گی۔ پھر جب میں تجھے باہر نکلنے کا حکم دوں گی تو فوراً باہر آ جائے گا اور اس دوران اپنی گمشدگی کی ایک داستان بھی تیار کر لے گا۔''

چنانچہ گلنار، حمرو کو اپنے ساتھ لے کر اس کمرے میں چلی گئی۔ اس کمرے میں گلنار کا سامان رکھا ہوا تھا۔ لحاف، چادریں، تکیے اور معلوم نہیں کیا کیا کچھ۔ گلنار نے ایک بوسیدہ سے تخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''یہ تخت تیرے آرام کے لیے ہے لیکن خبردار جو اس سے زیادہ تجاوز کیا۔ تیرے کھانسنے یا چھینکنے تک کی آواز نہیں آنا چاہیے کیونکہ چھینک یا کھانسی سے تو پکڑا جائے گا اور سارا کھیل بگڑ جائے گا۔''

حمرو اس کمرے میں بند ہونے کے خیال ہی سے گھبرا رہا تھا لیکن پھر کچھ سوچ کر راضی ہو گیا۔ گلنار نے حمرو کو اس کمرے میں چھوڑا اور تسلی کے چند کلمات ادا کر کے اپنے کمرے میں واپس چلی آئی۔

اسی دن سے حمرو کی تلاش بھی شروع ہو گئی۔ گلنار نے فیروز بخت اور حمرو کی گمشدگی کی خبر عام کر دی۔ حویلی کے خدمت گاروں نے ان کی تلاش شروع کر دی۔ جن لوگوں نے حمرو کو حویلی میں واپس آتے دیکھ لیا تھا، ان سے یہ کہنا پڑا کہ وہ فیروز بخت کے اغوا کی خبر دینے آیا تھا۔ اس کے بعد اس کی تلاش میں خود بھی نکل گیا۔

شام کو اتالیق اور ستار بھی حویلی میں داخل ہوئے اور گلنار سے ملاقات کی۔ گلنار ان دونوں پر برس پڑی۔''جب فیروز بخت کو اغوا کیا گیا تو تم لوگ بھی وہیں موجود تھے پھر تم دونوں نے فیروز بخت کو آزاد کیوں نہیں کروایا؟ تم دونوں نے یہ نمک حرامی کیوں کی؟''

اتالیق کا چہرہ سرخ ہو گیا، بولا۔''گلنار بی بی! یہ آپ کس قسم کی زبان استعمال کر رہی ہیں؟ آئندہ احتیاط کریں ورنہ میں آپ کا لحاظ نہیں کروں گا۔''

گلنار نے بدستور تلخ لہجے میں کہا۔''میں ادب لحاظ کی قائل بھی نہیں۔ فیروز بخت کے اغوا میں تم دونوں کا ہاتھ بھی ہو سکتا ہے ورنہ اس غریب کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں۔''

اتالیق نے کہا۔''ہم دونوں کا ہاتھ؟ یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ آپ اپنے ہوش و حواس میں تو ہیں؟''

گلنار نے غصے میں جواب دیا۔''میں اپنے ہوش و حواس میں ہوں لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم دونوں اپنے ہوش میں ہرگز نہیں۔ اب میں تم دونوں کا ادب لحاظ بالکل

نہیں کروں گی اور تمہیں حکم دیتی ہوں کہ فیروز بخت کو جہاں کہیں چھپایا ہے، اسے واپس لے آؤ۔ اور اب تو حمرو کی بابت بھی تمہیں بتانا پڑے گا کہ اسے کہاں چھپایا ہے کیونکہ وہ بھی غائب ہے۔''

ستار نے غصے میں تلملاتے بل کھاتے ہوئے کہا۔ ''گلنار بی بی! آپ ہم دونوں پر شک ہی کر رہی ہیں تو ہمارا اس حویلی میں رہنا فضول ہے۔''

اتالیق نے کہا۔ ''اور سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہمیں ان دونوں کے اغوا سے، فائدہ بھی کیا پہنچے گا؟''

گلنار نے جواب دیا۔ ''فائدے یا نقصان کی بات تو مجھے معلوم نہیں۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ تم دونوں بھائی داؤد کی نظر میں مجھے خوار کرنے کے لیے ایسا کر رہے ہو۔ تم دونوں کے دل میں ایسی کوئی بات ہے تو وہ فضول ہے۔ آخر کار... تم دونوں ہی کو ذلیل و خوار ہونا پڑے گا اس لیے تم دونوں کی بہتری اسی میں ہے کہ فیروز بخت اور حمرو کو واپس لے آؤ۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تم دونوں کو رسوا نہیں کروں گی اور تم پر کسی قسم کا الزام نہیں آنے دوں گی لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ تم دونوں بھی میرا ساتھ دو۔''

اتالیق نے برا سا منہ بنایا۔ ''اگر آپ مجھے ذلیل و خوار کرنا چاہتی ہیں تو ایسا کرنا آپ کے اختیار میں نہیں ہے۔ میں نے جب ایک بار کہہ دیا کہ فیروز بخت کے اغوا میں میرا کوئی ہاتھ نہیں اور حمرو کہاں چلا گیا، میں کچھ بھی نہیں جانتا تو ان دونوں کے دریافتِ حال میں آپ کی طرف سے اتنا اصرار کیوں؟''

گلنار نے کہا۔ ''صرف اس لیے کہ تم دونوں فیروز بخت کی حمایت اور ہمدردی میں پیش پیش تھے۔''

اتالیق نے جواب دیا۔ ''ہاں، ہم دونوں واقعی پیش پیش تھے لیکن بعد میں آپ کی مہربانیاں دیکھ کر میں خاموش ہو گیا تھا۔ شاید یہ ستار بھی خاموش ہو گیا تھا......''

گلنار نے بات کاٹ دی۔ ''پھر یہ دونوں چلے کہاں گئے؟''

اتالیق نے جواب دیا۔ ''میں نے فیروز بخت کو اغوا ہوتے دیکھا ہے لیکن وہ اغوا کر کے کہاں لے جایا گیا ہے، میں نہیں جانتا۔'' پھر آہستہ سے کہا۔ ''اور گلنار بی بی! اس وقت میں آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ اگر فیروز بخت نہ ملا تو میں اس حویلی میں قدم نہیں رکھوں گا۔ میں تو فیروز بخت کا اتالیق تھا۔ جب حویلی میں وہی نہیں رہا تو پھر میں یہاں آ، جا کر کیا کروں گا۔ میری یہاں کوئی ضرورت نہیں رہ جاتی۔''

گلنار نے کہا۔ ''ایسی بات نہیں ہے، آپ دونوں کو اس قسم کی باتیں نہیں سوچنا چاہئیں۔ میں تو اس لیے پریشان ہوں کہ بھائی داؤد کو کیا جواب دوں گی؟ اور میں تم دونوں کو اس لیے روک رہی ہوں کہ تمہیں بھائی داؤد کے روبرو میری بے گناہی کی گواہی دینا ہوگی۔ میں تو دن رات یہ دعا کرتی ہوں کہ کسی طرح حمرو واپس آ جائے کیونکہ وہ بھی میرا اہم گواہ ہے۔''

ستار کو مجبوراً رکنا پڑا لیکن اسے یہ ڈر تھا کہ کہیں اس سے کوئی ایسا سلوک نہ کرے جس سے ستار کو کوئی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ جائے۔ اتالیق اپنے مسئلے کو ستار سے الگ رکھنا چاہتا تھا کیونکہ گلنار بار بار یہ کہتی تھی کہ ستار اپنا مسئلہ اتالیق سے گڈمڈ کیوں کرتا ہے جبکہ ستار حویلی کا پشتینی خدمت گار ہے اور اتالیق کو عارضی طور پر رکھا گیا تھا۔

اتالیق نے جاتے جاتے کہا۔ ''میں وقتاً فوقتاً آتا جاتا رہوں گا اور اس دوران گلنار بی بی کو فیروز بخت کی تلاش جاری رکھنا چاہیے۔''

اتالیق کے جاتے ہی گلنار نے ستار کی بڑی خبر لی۔

گلنار نے زیادہ تند و تیز لہجے میں کہا۔ ''تو اچھی طرح جانتا ہے کہ میں نے شروع شروع میں تو فیروز بخت کی کچھ مخالفت کی تھی لیکن بعد میں، میں اس سے ہمدردی کرنے لگی تھی۔ اگر میں فیروز بخت کے خلاف کچھ کرتی تو ان ابتدائی دنوں میں ہی کر گزرتی۔''

ستار، گلنار کے فضول سوال و جواب اور صفائی سے عاجز آ گیا، بولا۔ ''آپ نے فیروز بخت کے خلاف کبھی کچھ سوچا بھی ہو گا لیکن میں نے تو کبھی ایسا خیال تک نہ کیا کیونکہ میں اپنے مالک کا تابعدار ہوں۔''

گلنار نے سختی سے کہا۔ ''میں تجھ سے زیادہ باتیں کر کے خود کو ذلیل نہیں کروں گی۔ اب اپنی کوٹھری میں جا اور اس وقت تک اپنی صورت نہ دکھا جب تک میں خود نہ بلاؤں۔''

ستار چلا گیا لیکن اس کے چہرے پر غم و غصے کی جھلک نمایاں تھی۔

☆☆☆

حمرو کو نہایت احتیاط سے ضروریاتِ زندگی پہنچا دی جاتیں۔ جب اس طرح چار دن گزر گئے تو حمرو نے گلنار سے پوچھا۔ ''گلنار بی بی! مجھے کب تک یہاں بند رہنا پڑے گا؟''

گلنار نے کہا۔ ''بس چند دن اور تجھے یہاں کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟''

حمرو نے جواب دیا۔ ''پریشانی تو کوئی نہیں، سوائے قید

تنہائی کی اذیت کے۔ تنہائی اور سکوت سے میں تنگ آ گیا ہوں۔"

گلنار نے ہنس کر کہا۔ "میرے پاس اس کا علاج بھی ہے۔ اول تو دو دن اور صبر کر، اس کے بعد میں تجھے حویلی کے باہر پہنچا دوں گی۔ تو ادھر ادھر گھوم پھر کر واپس آ جائے گا اور اپنے اغوا کی کوئی فرضی کہانی سنا کر حویلی میں دوبارہ رہنے لگے گا۔ ان دو دنوں میں جب بہت زیادہ دل گھبرائے تو میرے کمرے کے دروازے پر آہستہ آہستہ دستک دے لیا کر۔ میں دروازہ کھول کر تجھے اندر بلا لوں گی اور آہستہ آہستہ باتیں کر کے تیری پریشانی کا علاج کر دیا کروں گی۔"

حمدو نے خوش ہو کر کہا۔ "گلنار بی بی! آپ کتنی اچھی ہیں۔"

گلنار نے حمدو کی باتوں کا کوئی اثر لیے بغیر پوچھا۔ "اچھا، تو ایک بات تو بتا۔ فیروز بخت کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے؟ کیا وہ جہنم رسید ہو چکا ہو گا؟"

حمدو نے جواب دیا۔ "گلنار بی بی! میں نے فیروز بخت کا جو حشر کیا ہے، اس کے نتیجے میں وہ یا تو قتل کیا جا چکا ہو گا یا پھر اپنے آبائی وطن ایران جا چکا ہو گا کیونکہ میں نے اسے ایسے ایرانیوں کے حوالے کر دیا ہے جو ایک عرصے سے اسے تلاش کرتے پھر رہے تھے اور ان کے تیور بتاتے تھے کہ وہ فیروز بخت کو ٹھکانے لگا دینے کی غرض سے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔"

گلنار نے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔ "لیکن میں تجھ سے حتمی اور قطعی جواب چاہتی ہوں۔ میں فیروز بخت کے کیفر کردار تک پہنچ جانے کا قطعی یقین چاہتی ہوں۔"

حمدو نے جواب دیا۔ "آپ اس پر قطعی یقین کر لیں۔"

لیکن گلنار کو حمدو کے ان جوابات نے تشویش میں ڈال دیا اور وہ ایک بار پھر فکر مند ہو گئی۔

اسی دن، رات کو جب حویلی میں فانوس، قندیلیں اور شمعیں روشن ہو گئیں۔ خدمت گاروں کی کوٹھریاں مدھم دیوں کی ٹمٹماہٹ سے دہر دہر ہونے لگیں تو گلنار حویلی کا جائزہ لینے کے لیے اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ اس کے حصے کو مردانے اور خدمت گاروں کی کوٹھریوں سے ایک لمبی دیوار علیحدہ کرتی تھی۔ یہ دیوار شرقاً غرباً حویلی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتی تھی۔ شمالی حصے میں زنان خانہ تھا اور جنوبی حصے میں مردانہ کمرے اور خدمت گاروں کی کوٹھریاں تھیں۔ اسی حصے میں حویلی کا پھاٹک بھی تھا۔ زنانہ اور مردانہ حصوں کے سامنے وسیع و عریض صحن تھے۔ حویلی کو دو حصوں میں تقسیم کر دینے والی دیوار کے بڑے حصے میں جالیاں بنی ہوئی تھیں اور ان جالیوں سے دوسری طرف اچھی طرح دیکھا جا سکتا تھا۔

نصف رات تک گلنار کروٹیں بدلتی رہی۔ اب وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھی کہ فیروز بخت کا حشر کیا ہوا۔ وہ چپکے سے باہر نکلی اور حدِ فاصل کی دیوار کے پاس کھڑی ہو کر جالیوں کے اس پار خدمت گاروں کی کوٹھریوں کا جائزہ لینے لگی۔ کوٹھریوں کے اندر سے ہلکی ہلکی روشنی جھانک رہی تھی۔ بقیہ حصے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ جالیوں کے پاس سے ہٹ کر گلنار نے آسمان کی طرف دیکھا اوپر چاند کا کہیں پتا نہیں تھا لیکن آسمان کا دامن تاروں سے بھرا تھا۔ گلنار ہر طرف سے خوف و دہشت کی سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں۔ ہوا کی سنسناہٹ میں خطرات کی آہٹیں تھیں۔ اس نے ایک بار پھر جالیوں کے اس پار مردانہ حصے کا جائزہ لیا۔ اس حصے کی نگرانی اور نگہداشت سردست ستار کے ذمے تھی۔ گلنار اس کمرے کے قریب والی جالیوں کے پاس گئی اور جہاں شمعیں روشن تھیں، اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ستار کے کمرے کا جائزہ لیا لیکن کچھ نظر نہیں آیا۔ یہاں بھی ہر طرف سناٹا اور سکوت طاری تھا۔ جب گلنار کو ہر طرح یہ اطمینان ہو گیا کہ آس پاس کوئی موجود نہیں ہے تو وہ اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔ ابھی وہ بیٹھی بھی نہیں تھی کہ حمدو والے دروازے سے دستک کی آواز سنائی دی۔ گلنار نے اپنے ہونٹ دروازے سے چپکا دیے، پوچھا۔ "کیا بات ہے حمدو؟"

دوسری طرف سے حمدو نے جواب دیا۔ "دروازہ کھولیے۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔"

گلنار نے ذرا تامل اختیار کیا، پوچھا۔ "یہ دل کیوں گھبرا رہا ہے؟ خیریت تو ہے؟"

حمدو نے جواب دیا۔ "گلنار بی بی! مجھ پر رحم کیجیے اور دروازہ کھول دیجیے ورنہ میں چیخ چیخ کر رونا شروع کر دوں گا۔ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ اگر کچھ دیر دروازہ اور نہ کھلا تو میں مر جاؤں گا۔"

گلنار اس دھمکی سے ڈر گئی اور دروازہ کھول دیا۔ حمدو تیزی سے کمرے میں داخل ہو کر فرش پر ڈھیر ہو گیا اور اس کی پتلیاں چڑھ گئیں اور سینہ لوہار کی دھونکنی کی طرح پھولنے دبنے لگا۔ گلنار اس پر جھک گئی اور گھبرا کر پوچھا۔ "حمدو! یہ تجھے کیا ہو گیا؟ طبیعت کو اپنے قابو میں رکھ، ہوش میں آ۔"

اس کے بعد وہ ایک پیالے میں پانی لے آئی اور حمدو کے منہ پر چند چھینٹے دے کر حلق میں چند قطرے ٹپکا دیے۔

حمدو نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے چھت کی طرف دیکھا اور ہذیانی آواز میں پوچھا۔ "کیا زمین گھوم رہی ہے؟

ارے یہ چھت میرے اوپر کیوں آئی جا رہی ہے؟''

گلنار نے اپنے آنچل سے ہوا دینا شروع کر دی اور اسے تسلی دی۔ ''حمرو! ہوش میں آ۔ نہ زمین گھوم رہی ہے اور نہ ہی چھت اوپر آئی جا رہی ہے۔ میری طرف دیکھ اور دل کو قابو میں رکھ۔''

حمرو نے دیوانہ وار گلنار کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اپنے اوپر گرا لیا اور زبردستی سینے سے لگا کر سہمے ہوئے بچے کی طرح بولا۔ ''گلنار! مجھے ڈر لگ رہا ہے، میرا دل قابو میں نہیں ہے۔ خدا کے لیے مجھے اپنے سینے سے لگائے رکھ۔ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے، میں مر جاؤں گا۔''

گلنار سب کچھ بھول کر اپنے آپ کو چھڑوانے لگی۔ ڈانٹتے ہوئے بولی۔ ''حمرو! یہ تو کیا کر رہا ہے؟ یہ جانتا ہے کہ اس کا کیا انجام ہوگا؟ تو قتل کر دیا جائے گا، چھوڑ دے مجھے۔''

لیکن حمرو کی گرفت معمولی نہیں تھی، اس نے اور زیادہ جکڑ لیا۔ عالمِ سرخوشی میں بولا۔ ''گلنار! اب خطرے اور خوف کی بات نہ کر۔ اب میں صبر نہیں کر سکتا۔ مزید برداشت میرے بس میں نہیں۔''

گلنار نے بڑی زور کا دھکا دیا اور طنزاً کہا۔ ''تو یہ تیرا مکر تھا شاید۔''

حمرو نے جواب دیا۔ ''صرف مکر نہ کہہ گلنار..... مکرِ عاشق کہہ کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔''

گلنار نے اس کا ہاتھ دانتوں میں دبا لیا لیکن ابھی وہ چاب نہیں سکی تھی کہ حمرو نے دھمکی دی۔ ''گلنار! اگر تو نے مجھے کاٹا تو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لے۔ میں چیخ چیخ کر رونا شروع کر دوں گا اور اب تک جو کچھ بھی ہو چکا ہے، اس سے پوری حویلی کو مطلع کر دوں گا۔''

گلنار سہم گئی، بولی۔ ''لیکن تو نے تو مجھ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ تو ایسی غلطی نہیں کرے گا۔''

حمرو نے جواب دیا۔ ''اگر میں یہ وعدہ نہ کرتا تو تیرا دوبارہ اعتبار کس طرح حاصل کرتا۔''

اب حمرو زیادہ بے تکلف ہو رہا تھا۔ وہ گلنار کو آغوش میں لیے ہوئے اٹھا اور سختی سے کہا۔ ''گلنار! اگر تو نے اب بھی چیر پھر سے کام لیا تو، تو ہی نقصان اٹھائے گی۔ میرا کچھ بھی نہ جائے گا اور میں یوں بھی اپنی جان تجھ پر قربان کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔''

گلنار بری طرح حمرو کی گرفت میں آ چکی تھی۔ اس نے ایک بار پھر خود کو چھڑوانے کی کوشش کی لیکن حمرو نے اسے پوری قوت سے دبوچے رکھا اور اس کو اپنی آغوش میں جکڑے ہوئے گلنار کی مسہری تک لے گیا۔ گلنار نے عاجزی سے پوچھا۔ ''حمرو! تو یہ کیوں نہیں سوچتا کہ اس سے تجھے حاصل کیا ہوگا؟ میری شادی تو تجھ سے ہو نہیں سکتی۔''

حمرو نے جواب دیا۔ ''نہ ہو شادی، میں خود بھی جانتا ہوں کہ میری شادی نہیں ہو سکتی لیکن گلنار! آدمی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے میرا بھی یہی حال ہے۔ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں اور اپنے دل میں یہ طے کر چکا ہوں کہ میں اپنی آتشِ شوق کو آبِ وصال سے بجھاؤں گا ضرور۔ اس کے بعد میرا جو حشر بھی ہو، پروا نہیں کیونکہ یہ سودا ان داموں میں بھی سستا ہے۔''

اب وہ دونوں مسہری پر پاس پاس بکھرے ہوئے لیٹے تھے۔ گلنار کو اس سے سخت کراہیت محسوس ہو رہی تھی۔

حمرو نے ایک ہاتھ سے گلنار کی زلفیں چہرے پر سے ہٹائیں۔ ''گلنار! تیرے چہرے پر زلفوں کا سایہ یوں لگتا ہے گویا چاند بدلیوں میں چھپ گیا۔''

گلنار نے کوئی جواب نہ دیا لیکن اس وقت اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا اور اسے رہ رہ کر اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے بڑی ندامت سے کہا۔ ''حمرو! میں نے تجھے رازدار بنا کر اور تیرے سپرد ایک نازک کام کر کے سخت غلطی کی ہے...... زندگی کی بدترین غلطی اور تو میری کمزوریوں سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔''

حمرو نے جواب دیا۔ ''میں نے کہہ جو دیا کہ میں نے تیرے وصال کی خاطر اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیا۔ اگر میں اب جان سے بھی مار دیا جاؤں گا تو مجھے اپنی جان کے زیاں کا افسوس نہیں ہوگا۔''

گلنار نے پوچھا۔ ''اگر میں تجھے یہ یقین دلاؤں کہ میں بھائی داؤد کے آنے پر اس سے یہ درخواست کروں گی کہ میں تجھ سے شادی کرنا چاہتی ہوں اور اس طرح تجھے اپنا شوہر بنانا چاہتی ہوں جس طرح تم نے فیروز بخت کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا تو مجھے یقین ہے کہ وہ انکار نہیں کریں گے۔''

حمرو نے کہا۔ ''یہ تجویز بھی بڑی اچھی ہے۔ اگر تو اپنے اس منصوبے میں کامیاب ہو گئی تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ ہوگی۔''

گلنار نے کہا۔ ''اگر تو میری اس تجویز سے متفق ہے تو ذرا صبر سے کام لے اور اس کام کو جائز ہونے دے۔''

حمرو نے ہنس کر جواب دیا۔ ''اب میں اتنا بے وقوف بھی نہیں ہوں کہ تو اتنی آسانی سے مجھے بے وقوف بنا لے۔ میں اس موقع کو تو کسی طرح ضائع کرنے پر تیار نہیں۔ میں نے جو

ارادہ کرلیا ہے اس کی تکمیل کیے بغیر میں باز نہیں آؤں گا۔"

گلنار نے بڑی۔ بے بسی سے کہا۔" لیکن حمرو! یہ بڑی زیادتی ہے۔ یہ مجھ پر ظلم ہے اور تو میری کمزوریوں سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔"

حمرو نے جواب دیا۔" یہاں کمزوریوں سے کون فائدہ نہیں اٹھاتا۔ کیا تو نے میری کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی؟"

گلنار روہانسی ہوگئی، بولی۔" حمرو! اگر تو باز نہ آیا تو میں رو دوں گی۔"

حمرو نے بھنچی بھنچی آواز میں ذرا سختی سے کہا۔"میں نے کہہ جو دیا کہ میں باز نہیں آؤں گا کیونکہ میں نے اپنے مقصد کی حصولیابی کی خاطر بڑا صبر کیا ہے، بڑی ذلتیں سہی ہیں۔"

اس کے بعد حمرو نے اس کی پیش نہ چلنے دی۔ کچھ دیر تو گلنار نے مزاحمت کی لیکن پھر وہ بھی بے بس ہوگئی۔

☆☆☆

حمرو اب بھی گلنار کی قید میں تھا۔ اس رات اس نے جو کچھ کیا وہ ایسا نہیں تھا جسے گلنار بہ آسانی بھلا دیتی۔ حمرو دوبارہ اس کمرے میں اس لیے واپس چلا گیا تھا کہ اسے اب یہ یقین ہوگیا تھا کہ گلنار اس کے قابو میں آچکی ہے اور وہ اسے بہ آسانی اپنی خواہش کے مطابق کام میں لایا کرے گا لیکن گلنار نے اسے کمرے میں بند کرتے ہی واضح کردیا۔" تو نے جو کچھ کیا، اچھا نہیں کیا۔ تجھے اس کی سزا ضرور ملے گی۔"

حمرو کے پسینے چھوٹ گئے، بولا۔" گلنار! اگر تو نے کچھ کہا سنا تو اس کا انجام پہلے ہی سوچ لینا۔"

گلنار نے جواب دیا۔"میں انجام کو اچھی طرح سوچ چکی ہوں اس لیے میں کسی سے بھی نہیں ڈرتی۔ تو نے میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے، میں اس کی سزا ضرور دوں گی۔ اگر تو نے اب نکل بھاگنے کی کوشش کی تو میں اس کی بھی خبر گیری کروں گی اور تجھے بھاگنے نہیں دوں گی۔"

حمرو اپنے کمرے میں ٹہلنے لگا۔

رات کے پچھلے پہر حمرو نے پھر دستک دی اور رو رو کر یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس کا دل بیٹھا جا رہا ہے، دروازہ کھول دے لیکن گلنار اس کے فریب میں نہیں آئی۔ حمرو نے اسے ایک بار پھر دھمکی دی کہ اب میں چیخ چیخ کر رونا شروع کردوں گا جس سے دوسرے خدمت گاروں کو بھی میری موجودگی کی خبر ہوجائے گی۔

اس دھمکی کا گلنار پر وقتی اثر ہوا لیکن پھر جلد ہی اپنی حالت پر قابو پالیا، بولی۔" حمرو! میں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ اب میں ہر ذلت برداشت کرلوں گی لیکن دوبارہ قعرِ مذلت میں نہیں گروں گی۔ تو جتنا بھی شور کرنا چاہے کر، میں دروازہ نہیں کھولوں گی اور جب تیرا شور سن کر خدمت گار مجھ سے کچھ پوچھیں گے تو میں ان سے کہہ دوں گی کہ تو حویلی والوں کی نظروں سے بچتا بچاتا اندر آگیا تھا اور میں نے اس کمرے میں تجھے اس لیے بند کردیا ہے جب تک بھائی داؤد واپس نہیں آتے۔ وہی تیرا فیصلہ کریں گے۔"

حمرو نے معاملے کی سنگینی کا اندازہ لگایا تو لرز گیا۔ اس نے ایک بار پھر خوشامد کی۔" گلنار! مجھے معاف کردو۔ تم مجھے دن کے اجالے میں نکال دو۔ میں خاموشی سے کہیں چلا جاؤں گا اور آئندہ تجھے پریشان نہیں کروں گا۔"

گلنار نے جواب دیا۔" حمرو! تیرا اعتبار اٹھ گیا میرے دل سے۔ اب تو میں تیری کسی بات کا بھی اعتبار نہیں کروں گی۔"

حمرو سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔" گلنار! مجھ پر رحم کر۔"

گلنار نے بے رحمی سے کہا۔"میں رحم نہیں کروں گی کیونکہ رحم تو ان پر کیا جاتا ہے جو دوسروں پر بھی رحم کرتے ہیں۔"

حمرو نے زور زور سے دروازہ پیٹنا شروع کردیا اور چیخا۔"میں دروازہ توڑ دوں گا۔ اگر دروازہ نہ کھلا تو میں قیامت کھڑی کردوں گا۔ میں ہنگامہ کردوں گا۔"

رات کے سناٹے میں حمرو کا شوروغل پوری حویلی میں گونج گیا۔ ستار اور دوسرے خدمت گار بیدار ہوگئے۔ گلنار نے بوکھلائے ہوئے انداز میں دروازہ کھول دیا اور تاکید کی۔" خبردار جو تو نے مزید شوروغل کیا۔ میں ابھی تجھ سے بات کرتی ہوں۔ میرا خیال ہے حویلی کے سبھی لوگ بیدار ہوچکے ہیں....."

حمرو نے گلنار کو پکڑ لیا۔ اس وقت وہ پاگل ہو رہا تھا۔ گلنار کو گدی سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور کہا۔" چالاک عورت! کیا تو اب بھی دھوکا دے سکتی ہے؟ اب میں تیرے داؤ میں نہیں آؤں گا۔"

گلنار نے چھڑوانے کی کوشش کی، بولی۔" حمرو! مجھے چھوڑ دے، دیکھ مجھے باہر آہٹیں محسوس ہو رہی ہیں۔ ستار اور دوسرے خدمت گار بیدار ہوچکے ہیں اور شاید وہ پرسشِ احوال کے لیے ادھر آنے کی کوشش کریں گے۔"

حمرو نے فاتحانہ شان سے کہا۔" تو نے میرے ساتھ جو زیادتی کی ہے، اس کا جواب تو یہی ہے کہ ان معاملات

سے سبھی کو مطلع کر دیا جائے۔"

گلنار نے گردن چھڑوانے کی کوشش کی اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں حمرو کے ہاتھوں میں پیوست کر دینا چاہیں۔

دوسری طرف ستار اور دوسرے خدمت گار حدِ فاصل پر کھڑے پکار پکار کر پوچھ رہے تھے۔ "گلنار بی بی! کیا بات ہے؟ یہ شوروغل کیسا تھا؟ یہ کون چیخ رہا تھا؟ کیا یہ آپ کی طرف شور ہو رہا تھا؟"

گلنار نے سرگوشی میں کہا۔ "حمرو! خدا کے لیے مجھے چھوڑ دے ورنہ یہ سب یہاں آجائیں گے اور ہم دونوں رسوا ہو جائیں گے۔"

حمرو نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ "کیا میں نے پہلے ہی تجھے اس خطرے سے آگاہ نہیں کر دیا تھا؟"

گلنار نے کہا۔ "اس وقت تو چھوڑ دے، باقی باتیں ہوتی رہیں گی۔ پہلے میں ان لوگوں کو واپس تو کر آؤں۔"

حمرو نے کچھ سوچ کر گلنار کو چھوڑ دیا اور دھمکی دی۔ "میں تجھے چھوڑے دے رہا ہوں لیکن زیادہ چالاکی سے کام نہ لینا ورنہ اس کا اس سے زیادہ برا انجام ہوگا۔"

گلنار نے بڑی بے بسی سے کہا۔ "اچھا، اب تو خاموشی سے بیٹھ جا۔ میں ان لوگوں سے باتیں کر کے واپس آتی ہوں۔ خدا کے لیے اب چپ ہی رہنا ورنہ بڑی رسوائی ہوگی۔"

گلنار، حمرو کو اپنے کمرے میں چھوڑ کر حویلی کی درمیانی دیوار کے پاس چلی گئی۔ وہاں ستار اور دوسرے خدمت گار اس کا انتظار کر رہے تھے۔ گلنار نے جماہی لے کر یہ جتانے کی کوشش کی گویا وہ نیند سے اٹھ کر آئی ہے۔ جاتے ہی سوال کیا۔ "کیا بات ہے؟ تم لوگوں نے یہ کیسا شوروغل مچا رکھا ہے؟ میری تو نیند حرام ہو گئی۔"

خدمت گاروں نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا، ستار نے عرض کیا۔ "گلنار بی بی! شوروغل کی آواز تو آپ کی طرف سے آئی تھی۔"

گلنار نے ستار کا جواب ہنسی میں اڑا دیا، بولی۔ "شوروغل میری طرف کیوں ہونے لگا؟ اپنی طرف جا کر دیکھو اور مجھے مطلع کرو کہ معاملہ کیا ہے۔"

کس میں اتنی ہمت تھی کہ گلنار سے بحث کرتا۔ وہ سب اپنا سا منہ لے کر واپس چلے گئے۔ گلنار نے غصے میں... بہ آوازِ بلند کہا۔ "اور دیکھو! اگر شوروغل کا سبب معلوم ہو جائے تو مجھے ضرور مطلع کرنا ورنہ مجھے پریشان نہ کرنا۔ تم لوگ آپس میں لڑتے جھگڑتے ہو اور میری نیند خواہ مخواہ خراب کرتے ہو۔"

خدمت گار کچھ دیر تو چپ چاپ وہیں کھڑے رہے اس کے بعد واپس گئے اور حویلی کے مختلف حصوں میں گھوم پھر کر شوروغل کا سبب جاننے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔

گلنار اپنے کمرے میں چلی گئی۔ وہاں حمرو ایک کونے میں بیٹھا ہوا بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے گلنار کو دیکھتے ہی سوال کیا۔ "کیا وہ لوگ واپس چلے گئے؟"

"ہاں، واپس چلے گئے لیکن میں نے ان کے چہروں کے تاثرات سے بھی اندازہ لگایا ہے کہ انہیں میری بات کا یقین نہیں آیا ہے اور انہیں شبہ ہے کہ شوروغل زنان خانے ہی سے بلند ہوا تھا۔"

حمرو نے کہا۔ "ان کا شبہ درست ہے۔ انہیں زنان خانے میں داخل ہو جانا چاہیے تھا۔"

گلنار بہت افسردہ ہو رہی تھی۔ حمرو اپنی جگہ سے اٹھا اور گلنار کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے چہرے کو اپنے سامنے کر لیا، بولا۔ "گلنار! تو کتنی ہی موقع شناس اور عقل مند کیوں نہ ہو لیکن میرے معاملے میں تو نے حماقت اور کم عقلی کا ثبوت دیا ہے۔ آ، میری آغوش میں آجا اور تمام اندیشے اپنے دل و دماغ سے نکال دے۔"

گلنار نے جواب دیا۔ "حمرو! جب میں تجھے یہ یقین دلا رہی ہوں کہ داؤد بھائی کے آنے پر تجھ سے شادی کر لوں گی تو، تو پریشان کیوں ہو رہا ہے؟"

حمرو پر دیوانگی طاری تھی، گلنار کو زبردستی چمٹا لیا، بولا۔ "گلنار! میں جو کچھ آج حاصل کر سکتا ہوں اس کی حصولیابی کل پر کیوں چھوڑوں۔ میں خوب جانتا ہوں کہ تو جو کچھ کہہ رہی ہے، وہ محض فریب ہے۔ میں اس پر کس طرح یقین کر لوں۔"

گلنار کے دل میں برے برے خیالات آرہے تھے۔ اس کے عزائم خطرناک ہو رہے تھے۔ اس نے کمرے میں رکھی ہوئی تلوار اور پیش قبض پر نظریں ڈالیں اور دل میں ارادہ کر لیا کہ موقع پاتے ہی وہ حمرو کو ہلاک کرنے کی کوشش کرے گی۔ اگر اس میں کامیاب ہو گئی تو ٹھیک ورنہ پھر دیکھا جائے گا۔

حمرو نے گلنار کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے تلوار اور پیش قبض کی طرف دیکھا اور گلنار کو چھوڑ کر تلوار اور پیش قبض پر قبضہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "گلنار! کیا خیال ہے؟ کیا تو ان ہتھیاروں سے کوئی کام لینا چاہتی تھی؟" اس کے بعد اس نے دونوں ہتھیاروں کو کھڑکی کے باہر پھینک دیا اور کہا۔ "ان کا یہاں کیا کام؟"

گلنار نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن حمرو نے پکڑلیا، بولا۔ ''کہاں چلیں گلنار بیگم...... مجھ سے بھاگنا فضول ہے۔''

اس کے بعد اس نے گلنار سے وہ سلوک کیا کہ وہ اپنے کیے پر پچھتاتی رہی۔ اب فیروز بخت کا کوئی ذکر ہی نہ ہوتا۔ حمرو اپنی مطلب برآری میں مصروف تھا۔ گلنار کے سینے میں انتقام کی بھٹی جل رہی تھی۔ اس نے حمرو کے چہرے سے اندازہ لگالیا کہ اگر اس نے ذرا سی بھی مزاحمت کی تو حمرو اسے ذلیل بھی کرے گا اور ہلاک بھی کردے گا۔ وہ خاموش رہی اور خود کو بالکل ہی حمرو کے حوالے کردیا۔

حمرو گلنار کو پوری رات روندتا رہا۔ آخر میں جب حمرو کے دوسرے کمرے میں جانے کی باری آئی تو حمرو نے اس میں جانے سے انکار کردیا اور کہا۔ ''اب میں تنہا نہیں رہوں گا۔ میرے قیام کا اسی کمرے میں بندوبست ہونا چاہیے۔''

گلنار نے جواب دیا۔ ''حمرو! اب تو حد سے بڑھتا جارہا ہے۔ میں تجھے اپنے کمرے میں کس طرح رکھ سکتی ہوں؟''

حمرو نے نرمی سے کہا۔ ''میں اپنے قید خانے میں ایک بار پھر جاسکتا ہوں لیکن اسی صورت میں جب مجھے یقین ہو جائے کہ میں اس قید خانے سے نکل بھی سکوں گا۔''

گلنار نے کہا۔ ''جب میں تجھے یہ کہہ رہی ہوں کہ بھائی داؤد کے آتے ہی میں تجھ سے شادی کرلوں گی تو، تو اعتبار کیوں نہیں کرتا اور میں یوں بھی کل تجھے حویلی سے نکال دوں گی اور جب تو حویلی میں دوبارہ داخل ہوگا تو اس طرح گویا تو اغوا کرنے والوں کے چنگل سے نکل بھاگا ہے۔''

حمرو نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ ''سچا وعدہ؟''

''اب میں جھوٹا وعدہ کس طرح کرسکتی ہوں۔ تو نے میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے، میری اور پوری دنیا کی رائے میں اس کا اس سے بہتر کوئی حل نہیں کہ میں تجھ سے شادی کرلوں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میں اپنے ضمیر کے ہاتھوں ہمیشہ ہلکان رہوں گی۔''

حمرو نے قید خانے میں جاتے ہوئے کہا۔ ''گلنار! میں تجھ پر ایک بار پھر اعتبار کررہا ہوں۔ اگر میرے ساتھ دھوکا کیا گیا تو میں بھی ایک ایسا قدم اٹھاؤں گا کہ دنیا عبرت حاصل کرے گی۔''

حمرو اپنے کمرے میں چلا گیا اور گلنار نے اسے اپنی طرف سے مقفل کرکے سکھ کی سانس لی۔

حمرو کی عدم موجودگی میں گلنار کا مارے غصے کے برا حال ہوگیا۔ حمرو اپنے قید خانے میں جاتے ہی سوگیا۔ اب اسے کوئی فکر نہ تھی۔ بس وہ گلنار کو اپنانے کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔

حمرو کو بڑی خوب صورتی سے حویلی کے باہر نکال دیا گیا حالانکہ وہ اس کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ حویلی سے نکلتے ہی شہر کی خاک چھاننے لگا۔ اس دن دوپہر کو ایک تاجر نے داؤد کے دو خط گلنار کو دیے۔ ایک خط گلنار کے نام تھا اور دوسرا اتالیق کے نام۔ گلنار کے خط میں لکھا تھا۔

''پیاری گلنار! میں چند ماہ میں واپس آرہا ہوں۔ جب سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ تو نے فیروز بخت سے اپنی نفرت ختم کردی ہے اور اب دن رات اس کی فلاح و بہبود کے بارے میں سوچا کرتی ہے، میں بہت خوش ہوں۔ گلنار! یہ لڑکا ہم دونوں کا ساتھ دے گا۔ آج ہم دونوں اس پر احسان کریں گے، کل وہ اس کا حساب کتاب چکائے گا۔

''جب سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ فیروز بخت خاصا لائق ہوگیا ہے، میں بہت خوش ہوں اور اس کی لیاقت کے مشاہدے کے لیے بے چین ہورہا ہوں۔ دعا کرو میں جلد از جلد وطن پہنچوں اور وہ تماشے اپنی آنکھوں سے دیکھوں جن کا ذکر تمہارے خط میں پڑھتا رہا ہوں۔ اتالیق کا خط اس کے حوالے کردیا جائے۔''

گلنار، اتالیق کا خط پڑھنے کے لیے بے چین تھی۔ اتالیق کا خط کھلا۔ یہ نسبتاً گلنار کے خط سے لمبا تھا۔ اس میں لکھا تھا۔

''استاد محترم! میں آپ کی محنت کے ثمرات دیکھنے کے لیے بے چین ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ فیروز بخت عالمانہ مباحثے کرنے لگا ہے۔ واللہ یہ ایک ایسی خبر ہے کہ میں اس کے بارے میں جتنا سوچتا رہوں، حیرت بڑھتی جاتی ہے۔

''میں آپ سے مؤدبانہ درخواست کرتا ہوں کہ فیروز بخت کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔ میں آپ کو آپ کا محنتانہ تو نہیں دے سکتا لیکن جب فیروز بخت فارغ التحصیل ہوجائے گا تو میں آپ کو نوازدوں گا۔

''استاد محترم! مجھے آپ لوگ بہت یاد آتے ہیں۔ روز و شب کے کسی حصے میں آپ کو یاد ضرور کیا جاتا ہے۔ جب سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ بہن گلنار بھی فیروز بخت پر بہت زیادہ توجہ دے رہی ہے تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔

''میں عنقریب واپس آرہا ہوں۔ یہاں میرا دل نہیں لگ رہا۔ میں آتے ہی پہلے تو فیروز بخت کو سینے سے لگا کر

چند یوسے دوں گا، اس کے بعد کوئی دوسرا کام کروں گا۔

"استاد محترم! اگر میں اپنے اس منصوبے میں کامیاب ہو گیا اور فیروز بخت نے میری صحیح جانشینی کی تو میں اپنی زندگی کے بہترین تجربے میں شاندار کامیابی حاصل کرلوں گا۔ میں فیروز بخت کو یہ وصیت کروں گا کہ وہ بھی شادی نہ کرے اور اس طرح کسی لاوارث بچے کو پال پوس کر تعلیم و تربیت سے سنوار کر اپنا جانشین بنائے کیونکہ میں یہ نہیں چاہتا کہ جس دولت، جائداد اور کاروبار کو میں نے اتنی جانفشانی، محنت اور نفس کشی سے قائم اور برقرار رکھا ہے، وہ شادی کے بعد بہت ساری اولاد میں تقسیم ہو کر ختم ہو جائے کیونکہ شادی سے جب اولاد پیدا ہوتی ہے، ان میں کچھ نالائق نکل جاتی ہیں اور ایک آدھ لائق اولاد اپنے حصے کو محفوظ رکھتی ہے تو بعد میں اس کی نالائق اولاد اسے ضائع کر دیتی ہے لیکن میں اپنے بعد یہ عمل نہیں دہرانا چاہتا۔ میں فیروز بخت کو ہدایت اور وصیت کروں گا کہ میری طرح وہ بھی زندگی بھر شادی نہ کرے اور میری طرح وہ بھی کسی لاوارث بچے سے میرے اس منصوبے کو زندہ اور برقرار رکھے پھر فیروز بخت بھی میری طرح اپنے جانشین کو بھی ہدایت اور وصیت کرے گا اور یہ عمل نسلوں جاری رہے گا۔ یقیناً کچھ لوگ یہ سوچیں گے اور آپس میں سوال کریں گے کہ اس عجیب و غریب عمل سے آخر مجھے کیا فائدہ پہنچے گا؟ ان کے اس سوال کا میرے پاس ایک ہی جواب ہے۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں، ہمیں اس کے نفع و نقصان کی پروا کیے بغیر کچھ ایسے کام بھی کرنا چاہئیں جس سے دنیا کو کچھ عجیب و غریب نتائج حاصل ہوں۔ میرا یہ تجربہ بھی دنیا کو عجیب و غریب نتیجوں سے چونکا دے گا۔ بس یہی میری اس کوشش اور تجربے کا ماحصل ہوگا کیونکہ دنیا میں انسان کا نام اس کی کسی ایسی ہی کوشش اور کام کے سبب زندہ رہتا ہے۔ فاتح اپنی فتوحات اور بادشاہ اپنی کشور کشائی سے نام زندہ رکھتے ہیں لیکن میں فاتح یا بادشاہ نہیں ہوں اس لیے اپنا نام اس طرح زندہ رکھنے کی کوشش کروں گا۔

"جیسا کہ میں نے لکھا ہے میں بہت جلد وطن واپس آرہا ہوں اور آپ کی محنت اور کوشش کا ثمر دیکھوں گا۔"

گلنار نے اتالیق کا خط پڑھ کر بند کر کے رکھ دیا اور اس کا انتظار کرنے لگی۔ شام کو پریشان حال حمدو بھی آگیا۔ خدمت گاروں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ انہیں حمدو کے اچانک آنے سے بڑی خوشی ہوئی تھی لیکن ستار نسبتاً کم خوش تھا۔ وہ اپنی گمشدگی کی ایک عجیب لرزہ خیز داستان لے کر آیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ اس کو انہی لوگوں نے اغوا کیا تھا جن لوگوں نے فیروز بخت کو روشن چراغ دہلی کی درگاہ سے اغوا کیا تھا۔ یہ ایرانی لوگ تھے اور اسے فیروز بخت کے ساتھ ہی ایران لے جانا چاہتے تھے۔ ان ایرانیوں نے فیروز بخت اور حمدو کو اغوا کرنے کے پہلے تو انہیں غار میں قید کر دیا۔ یہاں دونوں کے ساتھ تکلیف دہ سلوک کیا گیا۔ ایرانی فیروز بخت کو ڈانٹتے پھٹکارتے رہے کہ ہوش سنبھالنے کے بعد اس نے اپنے رشتے داروں کو تلاش کیوں نہیں کیا۔ انہوں نے فیروز بخت کے کئی طمانچے رسید کیے اور کہا کہ اس کی عدم موجودگی میں ایران میں اس کی آبائی جائداد پر دوسروں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ فوراً ایران چل۔ اس کے بعد ان لوگوں نے حمدو کی پٹائی کر دی کیونکہ فیروز بخت نے حمدو کی شکایت کر دی تھی کہ خدمت گزاری کے دوران حمدو نے فیروز بخت کو بہت ستایا تھا۔ حمدو نے یہ بھی بتایا کہ ان لوگوں نے اسے بھوکا پیاسا رکھا اور کئی دن سونے نہیں دیا۔ آخر میں وہ لوگ خود حمدو کو جنگل میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ کر ایران چلے گئے اور وہ اس نامعلوم اور گمنام جنگل میں کئی دن بھٹکتا رہا۔ حمدو نے جنگل میں بھٹکنے اور درندوں سے ڈرنے کا ایسا لرزہ خیز سماں باندھا کہ سننے والوں کی کپکپی چھوٹ گئی لیکن ستار نے اس کی داستان سرائی میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔

خدمت گاروں کے بعد وہ گلنار سے ملا اور اس کو بھی یہی داستان سنادی۔ گلنار نے افسوس کرتے ہوئے پوچھا۔ "وہ لوگ فیروز بخت کو کہاں لے گئے؟"

حمدو نے جواب دیا۔ "مجھے کچھ پتا نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ وہ ایران چلا گیا۔"

گلنار نے خدمت گاروں کو کام بتا کر رخصت کر دیا اور تنہائی میں حمدو سے پوچھا۔ "تیری اس داستان کا تیرے ساتھیوں نے کیا اثر لیا ہے؟"

حمدو نے جواب دیا۔ "انہیں میری باتوں کا یقین آگیا ہے اور وہ سب افسوس کر رہے تھے۔"

گلنار نے پوچھا۔ "ستار کیا کہہ رہا تھا؟"

حمدو نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے اس پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔"

گلنار نے سر جھکا لیا، ذرا دیر بعد بولی۔ "تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ ستار نے تیری باتوں کا یقین نہیں کیا؟"

"ہو سکتا ہے، میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

گلنار نے سختی سے کہا۔ "تو اپنی اس فرضی داستان پر

اڑا رہے گا اور اسے اپنے ذہن میں سختی سے بٹھائے رکھے گا تا کہ اگر ہزار بار بھی تجھ سے پوچھا جائے تو بھی سب کچھ دہراتا رہے۔"

حمرو نے جواب دیا۔ "میں نے اسے اچھی طرح ذہن میں بٹھالیا ہے۔ اب اگر دس ہزار بار بھی مجھ سے پوچھا جائے تو میں اسی طرح دہراتا رہوں گا۔"

گلنار نے افسردگی سے کہا۔ "بھائی داؤد کا خط آیا ہے۔ وہ عنقریب آجائیں گے۔"

"آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے؟"

گلنار نے جواب دیا۔ "سردست اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوگی۔"

حمرو کا دل ڈوبنے لگا۔ "کیوں، آخر کیوں؟"

گلنار نے کہا۔ "اس لیے، کہ تو نے میری کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور میں نے وہ وعدہ مجبوری میں کیا۔"

حمرو کو غصہ آنے لگا لیکن اب حالات دوسرے تھے اور اس غصے سے اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا، بولا۔ "گلنار! تو، تو زیادتی کررہی ہے۔"

گلنار یک دم برہم ہوگئی۔ "ادب سے بات کر۔ زبان سنبھال کر...... میں بہت کچھ برداشت کرچکی ہوں۔"

حمرو نے دھمکی دی۔ "میں اپنی فرضی داستان سے مکر بھی سکتا ہوں اور تجھے بدنام بھی کرسکتا ہوں۔"

گلنار نے حمرو کے رخسار پر بھرپور طمانچہ رسید کیا۔ "اب میں تجھے قتل کروادوں گی۔ تو زبان تو کھول کر دیکھ۔ حویلی کے دوسرے خدمت گار تیرا گھور نکال دیں گے۔"

حمرو گال سہلانے لگا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور وہ کچھ کہے بغیر باہر چلا گیا۔ بظاہر وہ بازی ہار چکا تھا اور اس کا کوئی امکان نہیں نظر آتا تھا کہ ہاری ہوئی بازی کو جیت میں بدل دے۔

گلنار نے اسی وقت ستار کو بلا کر ہدایت کردی کہ حمرو پر خاص نظر رکھی جائے اور اس کو زنان خانے کی طرف نہ آنے دیا جائے۔ ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کردی کہ حمرو کو فرار نہ ہونے دیا جائے اور اگر ضرورت پڑے تو اس کو چند ماہ کے لیے قید کردیا جائے۔ ستار، گلنار کے احکام پر حیرت زدہ نہیں تھا، بڑی گرم جوشی سے عرض کیا۔

"ہم خدمت گاروں میں سب سے زیادہ بدطینت حمرو ہے۔ میں نے تو بھی اس پر اعتبار کیا ہی نہیں۔"

کئی دن بعد اتالیق آیا تو اس کا خط اس کے حوالے کردیا گیا۔ اتالیق نے اس خط کو کئی بار پڑھا اور مزے لیتا رہا۔ آخر میں پوچھا۔ "کیا فیروز بخت کا کچھ پتا چلا؟"

گلنار نے حمرو کی داستان سنادی، بولی۔ "میرا خیال ہے وہ ایران چلا گیا ہے۔"

اتالیق نے فکرمند لہجے میں کہا۔ "پھر میں کیا جواب دوں گا داؤد کو۔ میں تو بہت پریشان ہورہا ہوں۔"

گلنار نے جواب دیا۔ "اس ناگہانی افتاد کی ذمے داری مجھ پر یا آپ پر تو عائد نہیں۔ بھائی داؤد اس کا کسی کو ذمے دار قرار دینے سے رہے۔ میں انہیں سمجھادوں گی۔"

اتالیق نے کہا۔ "محترم خاتون! داؤد آپ کا بھائی ہے۔ آپ انہیں مجھ سے بہتر جان سکتی ہیں لیکن فیروز بخت کے معاملے میں، میں داؤد کو آپ سے بہتر جانتا ہوں۔ فیروز بخت کی گمشدگی کا ان پر برا اثر پڑے گا۔"

گلنار نے بے پروائی سے کہا۔ "ہوسکتا ہے آپ کا خیال درست ہو لیکن مجھے یقین ہے کہ میں بھائی داؤد کو سمجھالوں گی اور انہیں شادی پر آمادہ کرلوں گی۔"

اتالیق نے آہستہ سے کہا۔ "ہوسکتا ہے لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ داؤد کو اپنا ہم خیال بنا سکیں۔ اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو میں یہ عرض کروں گا کہ اگر آپ نے اس قسم کی باتیں کیں تو داؤد کو آپ پر شک ہوسکتا ہے۔"

"کس قسم کا شک؟"

"یہ شک کہ فیروز بخت کو کہیں آپ نے تو غائب نہیں کروادیا۔"

گلنار نے مسکرا کر کہا۔ "بھائی داؤد مجھ پر اس قسم کا شک نہیں کرسکتے اور بالفرض محال اگر انہوں نے شک کیا تو میں حمرو کو پیش کردوں گی جس کو اسی دن ان لوگوں نے اغوا کرلیا تھا اور بڑی مشکل سے جان بچا کر واپس آیا ہے۔"

ستار بھاگا ہوا آیا اور اتالیق سے کہا۔ "استاد محترم! آپ کو مالک نے ایک خط کے ذریعے حویلی کے خدمت گاروں کی حاکمی بخشی تھی۔ کیا آپ اپنے اس فرض کو اب بھی انجام دے رہے ہیں؟"

اتالیق نے جواب دیا۔ "نہیں کیونکہ میں نے داؤد کی اس خواہش کو کبھی قبول نہیں کیا۔"

ستار کچھ کہنے کے لیے بے چین تھا، بولا۔ "تب پھر میں گلنار بی بی سے کہہ رہا ہوں کہ وہ حمرو پر سختی کریں کیونکہ وہ بڑی بے تکی باتیں کرتا پھر رہا ہے۔"

گلنار کے ہوش و حواس جاتے رہے، گھبرا کر پوچھا۔ "وہ کیا کہہ رہا ہے؟"

ستار نے اٹک اٹک کر جواب دیا۔ "بی بی! وہ ایسی باتیں ہیں کہ میں انہیں دہرا نہیں سکتا۔"

اتالیق نے سوالیہ نظروں سے گلنار اور ستار کو باری باری دیکھا۔ گلنار نے اتالیق سے کہا۔ "استاد محترم! اب آپ جا سکتے ہیں۔ دو چار دن بعد تشریف لائیں، میں بعض ضروری امور پر بات کروں گی۔"

اتالیق بے چون و چرا اٹھ کر چلا گیا۔ ستار رکا رہا۔ جب اتالیق نظروں سے اوجھل ہو گیا تو گلنار نے ستار کو حکم دیا۔ "تو استاد محترم کے پیچھے پیچھے جا اور دیکھ کہ کہیں حمرو ان سے کوئی بات تو نہیں کرتا۔"

ستار فوراً چلا گیا اور کچھ دیر بعد واپس آ کر بتا دیا کہ حمرو نے اتالیق سے کوئی بات نہیں کی۔ گلنار نے ستار کو اپنے پاس بٹھا لیا اور نرمی سے پوچھا۔ "ہاں تو اب بتا، حمرو کس قسم کی باتیں کر رہا ہے؟"

ستار نے ذرا رک رک کر جواب دیا۔ "وہ معلوم نہیں کیا کچھ کہہ رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فیروز بخت کو آپ نے غائب کروایا ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اسے کسی نے بھی اغوا نہیں کیا تھا، وہ آپ کی خواہش پر خود ہی روپوش ہو گیا تھا۔"

گلنار گھبرا گئی، بولی۔ "حمرو کو اسی وقت میرے پاس لے آ، میں اس سے پوچھوں گی کہ وہ یہ کیا بکواس کر رہا ہے۔"

ستار گیا اور حمرو کو بلا لایا۔ نظروں ہی نظروں میں نہ جانے کیا باتیں ہو گئیں کہ جیسے ہی گلنار نے پوچھا۔ "حمرو! تو یہ کیا بکواس کرتا پھر رہا ہے؟"

حمرو نے ہنس کر پوچھا۔ "کیسی بکواس؟ میں تو کچھ بھی نہیں کہہ رہا۔"

گلنار نے ستار سے کہا۔ "تو ہی بتا یہ کیا کہہ رہا تھا۔"

ستار نے جواب دیا۔ "یہ آپ کے سامنے مکر رہا ہے اس لیے میں کیا بتاؤں کہ یہ کیسی بکواس کر رہا تھا۔"

گلنار نے غصے میں کہا۔ "تم دونوں دفع ہو جاؤ۔ میں تمہاری صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔"

ستار اور حمرو ایک ساتھ مڑے، ستار آگے تھا اور حمرو پیچھے۔ حمرو نے جاتے جاتے مڑ کر گلنار کی طرف دیکھا۔ گلنار نے ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ ستار کو چھوڑ کر واپس آ جا۔

چنانچہ وہ ستار کو اس کی کوٹھری میں چھوڑ کر چپکے سے گلنار کے پاس واپس آ گیا۔ گلنار نے حمرو کو دوبارہ اس کے سابقہ قید خانے میں پہنچا دیا، شرارت آمیز مسکراہٹ سے بولی۔ "تیری سزا یہی ہے کہ یہاں پھر سے قید ہو جا۔"

حمرو نے پوچھا۔ "میں کب تک یہاں قید رہوں گا؟"

گلنار نے بڑی ادا سے کہا۔ "تو، تو یوں بھی میرا قیدی ہے، اس لیے تیرا یہ سوال فضول ہے۔"

حمرو نے کہا۔ "نہیں، اس سے کام نہیں چلے گا۔ میرے سینے میں آگ لگ رہی ہے اور پورے جسم میں کوئی شے کیف و سرور کی طرح بہہ رہی ہے۔ میں اس سے گلو خاصی چاہتا ہوں۔"

گلنار نے جواب دیا۔ "تو بڑا شاطر انسان ہے۔ ذرا صبر کر میں اس کا علاج بھی کر دوں گی۔"

گلنار نے جلدی جلدی بناؤ سنگار کیا اور سج سجا کے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ حمرو جب دوبارہ اس کے سامنے آیا تو گلنار دلہن کی طرح اس کے سامنے کھڑی تھی۔ حمرو نے اس کو آغوش میں لے لیا، بولا۔ "گلنار! خدا کی قسم تو میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

گلنار نے جواب دیا۔ "میری سمجھ میں تو نہیں آیا۔ تو نے یہ جو لوگوں میں اول فول کیا ہے، اس کا عام اثر کیا دیکھا؟"

حمرو نے کہا۔ "میں نے اس پر غور ہی نہیں کیا اب تک۔ پھر اس سوال کا کیا جواب دوں۔"

گلنار نے کہا۔ "بہرحال تو جو کچھ کر رہا ہے، اچھا نہیں کر رہا۔ میں چاہتی تھی تو ذرا صبر سے کام لے لیکن تو صبر نہیں کر سکتا اور بے صبری کا جو نتیجہ نکلے گا تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔"

حمرو نے اپنا مشغلہ جاری رکھا، بولا۔ "میں فکر نہیں پالتا اور یہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں نے آپ کی خاطر اپنی زندگی کو بیچ کر دیا ہے۔ میں موت سے بھی نہیں ڈرتا۔ اگر آپ کے لیے میری زندگی بھی ختم ہو جائے تو میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔"

گلنار نے اکتاہٹ سے کہا۔ "میں تیری زندگی کا خاتمہ کیوں چاہنے لگی؟"

حمرو نے جواب دیا۔ "یہ بات تو میں خود بھی نہیں جانتا لیکن تو نے میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔"

گلنار نے کہا۔ "اچھا، اب فضول باتیں بند کر اور مجھ سے وعدہ کر کہ آئندہ اس طرح زبان نہیں کھولے گا۔"

حمرو نے جواب دیا۔ "میں یہ وعدہ تو کر لوں گا لیکن تو بھی وعدہ کر کہ مجھے پریشان نہیں کرے گی اور اپنا وعدہ پورا کرے گی۔"

گلنار نے کہا۔ "اب میں بار بار کیا وعدہ کروں۔ ایک بار کر چکی ہوں، کیا وہ کافی نہیں ہے۔ اور تو یہ کیوں نہیں سوچتا کہ میں کوئی معمولی عورت تو نہیں جو ایک بار وعدہ کر کے مکر جائے۔"

حمدو نے کہا۔ "میں بھی کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں کیونکہ میں نے تجھ سے جو عہد کیا، پورا کیا۔"

گلنار کا شاطر دماغ اس وقت بھی منصوبہ بندی میں مصروف تھا۔ اس نے معلوم نہیں کیسے کیسے منصوبے بنا ڈالے۔ وہ حمدو سے بیزار تھی لیکن اپنی کمزوری کی وجہ سے بے عذری اختیار کیے ہوئے تھی۔

☆☆☆

جیسے تیسے وقت گزرتا رہا۔ حمدو نے اپنی زبان قابو میں کرلی تھی۔ گلنار اس کی خواہشات پوری کرتی رہی۔ اتالیق کی آمدورفت جاری رہی۔ ستار، حمدو اور گلنار کے معاملات سے آگاہ ہو چکا تھا لیکن اپنی زبان بند کیے ہوئے تھا۔ دوسرے خدمت گار بھی آپس میں کچھ عجیب سی سرگوشیاں کرنے لگے تھے۔ آخر دو ماہ دس دن بعد داؤد بھی آ گیا۔ خدمت گاروں کی فوج نے داؤد کا شاندار استقبال کیا اور گلنار بھائی کو دیکھتے ہی اس کے سینے سے لگ کر زاروقطار رونے لگی۔ حمدو کا رویہ ان سب سے الگ اور محتاط تھا۔ اتالیق قافلے کے پڑاؤ سے داؤد کے ساتھ حویلی تک آیا تھا۔

داؤد بہت تھکا ہوا تھا۔ اس نے اتالیق سے کہا۔ "استاد محترم! آپ جا سکتے ہیں کیونکہ میں بہت تھکا ہوا ہوں اور آرام کرنا چاہتا ہوں۔" پھر ذرا ذہن پر زور دیا اور پوچھا۔ "اور ہاں، وہ فیروز بخت کہاں ہے، وہ تو کہیں نظر ہی نہیں آرہا ہے؟"

اتالیق نے جواب دیا۔ "آپ بہت تھکے ہوئے ہیں، ذرا آرام فرمالیں پھر حاضر ہو جاؤں گا اور فیروز بخت کو بھی پیش کردیا جائے گا۔" اتالیق نے یہ کہہ کر گلنار کی طرف دیکھا اور نظریں جھکالیں۔

داؤد نے پوچھا۔ "فیروز بخت اس وقت کہاں ہے اور وہ میرے پاس کیوں نہیں آیا؟"

لیکن اتالیق کوئی جواب دیے بغیر ہی چلا گیا۔ داؤد نے گلنار سے پوچھا۔ "گلنار بہن! بات کیا ہے، فیروز بخت کہاں ہے؟"

گلنار نے جواب دیا۔ "سفر کی تکان آپ کے چہرے سے جھلک رہی ہے۔ اس وقت تو آپ آرام کے سوا... کچھ سوچیں ہی نہیں۔ فیروز بخت کہاں جائے گا وہ بھی مل لے گا، آرام سے فرصت پانے کے بعد۔"

ان کے سامنے ستار بھی کھڑا تھا، داؤد نے بڑے پیار سے بلایا اور پوچھا۔ "ستار! تیرا کیا حال ہے؟ خیریت تو ہے تو خاصا گم صم نظر آرہا ہے؟"

ستار دو قدم آگے بڑھا اور مسکرا کر جواب دیا۔ "میں گم صم تو نہیں ہوں، خاصا خوش ہوں اور یہ خاموشی بھی زیادہ دیر کے لیے نہیں ہے۔"

داؤد واقعی بہت تھکا ہوا تھا۔ وہ ایک مسہری پر دراز ہوگیا۔ اس کے پیچھے پیچھے گلنار بھی پہنچ گئی اور پوچھا۔ "بھائی داؤد! احمد آباد میں آپ کا کیا حال رہا؟"

داؤد نے جواب دیا۔ "احمد آباد میں اچھا حال رہا۔ سوائے اس کے کہ میں تم لوگوں سے بہت دور رہوں۔"

گلنار نے جب یہ دیکھا کہ داؤد کی حالت زیادہ خراب ہو رہی ہے تو اس نے اس کو سو جانے کا زبردستی حکم دیا۔ داؤد تھوڑی دیر میں واقعی سو گیا۔ کئی گھنٹے سوتا رہا۔ اس دوران گلنار کا دماغ بڑی تیزی سے کام کررہا تھا۔ ساڑھے چھ گھنٹے بعد داؤد بیدار ہو گیا۔ اس نے چند ساعتوں کے بعد حکم دیا۔ "ارے تم لوگوں نے تو مجھ سے کچھ مانگا ہی نہیں۔"

گلنار نے بڑے استغنا سے جواب دیا۔ "میں جو موجود ہوں۔ کسی تیسرے کو اس معاملے میں کچھ بولنے کی ضرورت نہیں اور بھائی داؤد! میں یہ ناپسند کرتی ہوں کہ آپ اپنے خدمت گاروں سے بے تکلف ہو جائیں۔ انہیں اگر کچھ دینا بھی ہے تو وہ میں دوں گی کیونکہ آپ کی بہ نسبت میں زیادہ بہتر جانتی ہوں کہ خدمت گاروں سے کس طرح پیش آنا چاہیے۔"

داؤد مسکرانے لگا، ہنس کر بولا۔ "بہتر ہے، میں تیری مرضی کے خلاف کوئی کام نہ کروں گا۔" پھر ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔

"بہن گلنار! کیا بات ہے، یہ فیروز بخت ابھی تک غائب ہے؟ آخر وہ آیا کیوں نہیں، بات کیا ہے؟"

گلنار نے کسی قدر پس و پیش سے جواب دیا۔ "بھائی! آپ پریشان نہ ہوں ذرا صبر و تحمل اختیار کریں۔"

داؤد نے ستار کو بلا کر حکم دیا۔ "تو بھاگ کر جا اور استاد محترم کو بلا لا۔"

ستار فوراً بھاگا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ داؤد نے گلنار سے کہا۔ "جب میں نے خط پڑھا کہ فیروز بخت علمی مباحثے میں حصہ لینے لگا ہے تو میں بہت خوش ہوا کیونکہ علمی مباحثے میں حصہ لینا مذاق نہیں ہے۔"

گلنار نے نظریں جھکالیں، بولی۔ "بھائی! آپ نے اپنے ایک خط میں مجھے شادی کرنے کا مشورہ دیا تھا، کچھ یاد ہے آپ کو؟"

داؤد نے جواب دیا۔ "ہاں، اچھی طرح یاد ہے، کیوں؟ کیا کوئی نوجوان پسند آگیا؟"

گلنار نے کہا۔ ”ہاں لیکن میں اس نوجوان کا ابھی ذکر نہیں کروں گی۔“

داؤد نے پوچھا۔ ”کیوں؟ آخر یہ تامل کیوں؟“

گلنار نے کہا۔ ”بھائی! میری سمجھ میں آپ کی یہ بات ابھی تک نہیں آئی کہ آپ نے ایک ایسے لڑکے کو اپنا بیٹا کیوں بنالیا جس کے والدین کا کوئی پتا نہیں؟“

داؤد ایک دم سنجیدہ ہوگیا، بولا۔ ”گلنار! ایسی باتیں نہ کر مجھ سے۔“

گلنار نے پوچھا۔ ”وہ کیوں؟“

داؤد نے جواب دیا۔ ”اس لیے کہ تو بڑے تکبر کی بات کرنے لگتی ہے اس طرح۔“

گلنار نے کہا۔ ”بھائی! اگر فیروز بخت کی بابت یہ معلوم ہوجائے کہ وہ کسی ایسے والدین کا لڑکا ہے جو ہمارے خدمت گاروں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے تو آپ کے احساسات کیا ہوں گے؟“

داؤد نے جواب دیا۔ ”گلنار بہن! میں الحمدللہ مسلمان ہوں اور مسلمانوں میں ہندوؤں کی طرح طبقات نہیں ہوتے۔“

گلنار نے پوچھا۔ ”کیا ستار اور دوسرے خدمت گار ہمارے برابر کے ہیں؟ کیا ہم ان کے آقا نہیں ہیں؟“

داؤد نے جواب دیا۔ ”میں نے کہہ جو دیا کہ اسلام میں طبقات نہیں ہیں۔ ستار، حمدو اور دوسرے خدمت گار مسلمان ہونے کی وجہ سے ہمارے بھائی ہیں۔“

گلنار نے نظریں نیچی کرلیں، بولی۔ ”شاید اسی لیے آپ فیروز بخت کو اپنا بیٹا سمجھتے ہیں۔“

”بے شک، تیرا خیال درست ہے۔“

گلنار نے آہستہ سے کہا۔ ”اور اگر میں یہ کہوں کہ میں نے اپنے لیے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا ہے جو معاشرے میں کوئی بڑا مقام نہیں رکھتا تو آپ کیا کہیں گے؟“

داؤد نے جواب دیا۔ ”میں کیا کہوں گا، کچھ بھی نہیں کیونکہ میں معاشرے میں بڑے چھوٹے کا زیادہ قائل نہیں ہوں۔“

گلنار نے مزید تشریح چاہی۔ ”بھائی! اگر آپ کو کسی طرح یہ معلوم ہوجائے کہ فیروز بخت ہمارے کسی خدمت گار کا بیٹا ہے تو آپ کے کیا احساسات ہوں گے اور آپ کس حد تک اپنے موجودہ فیصلے پر قائم رہیں گے؟“

داؤد نے جواب دیا۔ ”گلنار! میں نے فیروز بخت کو بیٹا بنایا ہے اس لیے میں اس کے خاندانی پس منظر اور حسب نسب میں کوئی دلچسپی نہ لوں گا۔ مگر تو یہ بتا کہ تو مجھ سے بار بار ایک ہی بات کیوں کرتی ہے؟ اس سے تیرا مقصد کیا ہے؟“

گلنار نے آہستہ سے کہا۔ ”بھائی! میں نے حمدو کو پسند کرلیا ہے، میں حمدو سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔“

داؤد سناٹے میں آگیا۔ کچھ دیر چپ چاپ گلنار کا چہرہ دیکھتا رہا پھر پوچھا۔ ”یہ تو کیا کہہ رہی ہے گلنار؟“

گلنار نے جواب دیا۔ ”مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکی۔ اب میرے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا۔“

داؤد خاموش ہوگیا اور گلنار کے جھکے ہوئے چہرے کو تکتا رہا پھر پوچھا۔ ”اس پر میں غور کروں گا اور سوچوں گا کہ یہ کام ہو بھی سکتا ہے یا نہیں۔“

گلنار نے کہا۔ ”اس میں ایسی کون سی دشواری ہے۔ جب آپ خاندانی پس منظر اور حسب نسب کے قائل ہی نہیں، تب پھر اس کام میں کیا پیچ ہوسکتی ہے؟“

داؤد نے موضوع بدل دیا، پوچھا۔ ”لیکن تو نے ابھی تک فیروز بخت کو مجھ سے نہیں ملوایا۔ اس میں کیا مسئلہ یا دشواری ہے؟ کیا فیروز بخت اس حویلی میں موجود نہیں ہے؟“

گلنار نے شپٹا کر جواب دیا۔ ”بھائی! آپ کو تاریکی میں رکھنا مناسب نہیں رہے گا۔ اگر آپ فیروز بخت کے بارے میں ساری تفصیل استاد محترم سے سن لیں تو زیادہ مناسب ہے۔“

داؤد نے ستار کو حکم دیا۔ ”استاد محترم کو بلا، میں ان سے مشورہ کروں گا۔“

ستار چلا گیا۔ داؤد نے گلنار کو حکم دیا۔ ”گلنار! تو میرے سامنے سے چلی جا کیونکہ تیری باتوں نے میرے دل ودماغ کو مشتعل کردیا ہے اور مجھے خود معلوم نہیں کہ میں کیا کر بیٹھوں گا۔“

گلنار فوراً ہی چلی گئی۔ داؤد بے چینی سے ٹہلتے ٹہلتے حویلی کے ایک ایک کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ وہ گلنار کے کمرے میں بھی گیا اور گلنار کے ملحق کمرے میں بھی۔ وہ معلوم نہیں کیا تلاش کررہا تھا۔ آخر اس نے ایک رومال پالیا۔ یہ رومال لے کر وہ گلنار کے پاس پہنچا۔ گلنار بہت سہمی ہوئی تھی۔ داؤد کے ہاتھ میں رومال دیکھ کر پریشان ہوگئی۔

داؤد نے پوچھا۔ ”گلنار! یہ رومال کس کا ہے؟“

گلنار کانپ رہی تھی، بولی۔ ”میں نہیں جانتی۔“

داؤد نے پوچھا۔ ”یہ ملحقہ کمرا کس کا ہے؟“

گلنار نے جواب دیا۔ ”میرا لیکن میں اس میں رہتی نہیں ہوں۔“

داؤد کے لہجے میں کچھ اور سختی آگئی۔ ”میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس کمرے میں کسی اور کا گزر ممکن ہے یا نہیں؟“

گلنار نے جواب دیا۔ ''نہیں یہاں کسی اور کا گزر تقریباً ناممکن ہے۔''

داؤد نے گرج کر پوچھا۔ ''اگر یہاں کسی اور کا گزر ناممکن ہے تو پھر تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ یہ رومال کس کا ہے؟''

گلنار کے پاس ایک ہی جواب تھا۔ ''میں نہیں جانتی کہ یہ رومال کس کا ہے۔''

داؤد نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ رومال کس کا ہے۔ یہ رومال اس شخص کا ہے جس سے تو شادی کرنا چاہتی ہے۔ ہاں، اب بتا کہ فیروز بخت کہاں ہے؟''

گلنار کا پورا جسم لرز گیا۔ وہ گڑگڑا کر بولی۔ ''بھائی! میں بے گناہ ہوں۔''

داؤد نے اس سے سختی سے کہا۔ ''میں یہ نہیں پوچھ رہا کہ تو گناہ گار ہے یا بے گناہ، میں تو تجھ سے یہ پوچھ رہا ہوں کہ فیروز بخت کہاں ہے؟ اور یہ سمجھ کر تجھ سے یہ سوال کر رہا ہوں کہ میں جانتا ہوں کہ تو اس سوال کا جواب دے سکتی ہے۔''

''بھائی۔'' گلنار تقریباً نیم بے ہوش ہو گئی اور بستر پر گر گئی۔ داؤد اسے اس کے حال پر چھوڑ کر چلا گیا۔

☆☆☆

اتالیق اور ستار ایک ساتھ حویلی میں داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے نوعمر بادشاہ اکبر کے محل سرا کی عورتوں کی سواری تھی۔ داؤد کو جب یہ بتایا گیا کہ بادشاہ دہلی میں آچکا ہے اور بادشاہ کی مشاطائیں ایک خاص مقصد سے دہلی کے گھروں اور حویلیوں کا جائزہ لیتی پھر رہی ہیں تو وہ پریشان ہو گیا۔

محل سرا کی خواتین میں سے ایک نے پوچھا۔ ''اس حویلی کا مالک کہاں ہے؟''

ایک خدمت گار نے ان عورتوں کو داؤد کے پاس پہنچا دیا۔ یہ تین عورتیں تھیں اور صورت شکل سے بڑی تیز طرار نظر آتی تھیں۔ ان کے ساتھ دو شاہی پیادے بھی تھے۔ داؤد نے خواتین سے پوچھا۔ ''محترم خواتین! یہ معاملہ کیا ہے؟''

اتالیق ان میں سے ایک خاتون کو جانتا تھا کیونکہ شاہی خاندان کے جن بچوں کو پڑھاتا تھا، وہاں یہ خاتون بھی نظر آتی رہی تھی۔ اتالیق نے بھی اس خاتون سے وہی سوال کیا، جو داؤد کر چکا تھا۔ ''خاتون! آپ کی تشریف آوری کا مقصد...... یہ معاملہ کیا ہے؟''

خاتون نے ایک شانِ استغنا سے پوچھا۔ ''اس حویلی میں کتنی عورتیں رہتی ہیں اور کتنی لڑکیاں؟''

داؤد نے کہا۔ ''اس حویلی میں بس ایک عورت رہتی ہے اور وہ ہے میری بہن گلنار۔ اس کو عورت کہیے یا لڑکی کیونکہ عمر زیادہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ لڑکی سمجھی جائے گی لیکن بیوہ ہونے کی وجہ سے اسے عورت کہیں گے۔''

عورت نے کہا۔ ''میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔''

داؤد نے پوچھا۔ ''آخر کیوں؟ آپ اسے کیوں دیکھنا چاہتی ہیں؟''

اتالیق نے داؤد کے کان میں کہا۔ ''آپ شاہی خاتون سے اس قسم کا سوال نہ کیجیے۔ آپ کے سوال کا جواب میں معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

داؤد بہت پریشان تھا۔ عورت نے سختی سے کہا۔ ''کیا تو نے میری بات نہیں سنی؟ میں تیری بہن کو دیکھنا چاہتی ہوں اور خبردار جو تو نے لیت و لعل سے کام لیا۔''

داؤد ان عورتوں کو لیے ہوئے گلنار کے پاس چلا گیا۔ گلنار بہت دیر سے رو رہی تھی جس سے اس کا چہرہ تمتما گیا تھا۔ ان عورتوں نے گلنار کو خوب اچھی طرح دیکھا اور داؤد سے پوچھا۔ ''کیا یہ بیوہ ہے؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''ہاں، یہ بیوہ ہے۔ میں نے ایک بار کہہ جو دیا۔''

اتالیق نے پوچھا۔ ''یہ معاملہ کیا ہے؟''

عورت نے جواب دیا۔ ''نوعمر بادشاہ جلال الدین اکبر دہلی میں تشریف لائے ہیں۔ ان کی دل بستگی کے لیے حسین عورتوں اور لڑکیوں کی تلاش ہو رہی ہے چنانچہ دہلی کے معززین میں سے عورتوں اور لڑکیوں کا انتخاب تیزی سے عمل میں آرہا ہے۔''

داؤد کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اتالیق مبہوت، ایک ایک کی شکل دیکھتا رہ گیا۔ اس نے عورت سے پوچھا۔ ''آپ نے گلنار کو دیکھا؟ کیا فیصلہ کیا آپ لوگوں نے؟''

عورت نے جواب دیا۔ ''ہمارے فیصلے کا علم تو بعد میں ہوگا لیکن یہ لڑکی اس وقت تک حویلی میں رہے گی جب تک تم لوگوں کو ہمارے فیصلے کا علم نہ ہو جائے۔''

داؤد نے جواب دیا۔ ''لیکن اس کا تو رشتہ طے ہو چکا ہے۔''

عورت نے جواب دیا۔ ''فیصلے سے پہلے رشتہ بھی نہیں ہوگا۔''

عورتیں دیکھ کر واپس چلی گئیں۔ داؤد نے اپنا سر پکڑ لیا۔ اتالیق سے کہا۔ ''استادِ محترم! میں بہت پریشان ہوں۔''

اتالیق نے جواب دیا۔ ''داؤد! پریشان ہونے کی

کوئی ضرورت نہیں ہے، اللہ جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے۔"

داؤد نے کہا۔"ان عورتوں کی غیر متوقع آمد نے میرے جذبات اور عزائم کا گلا گھونٹ دیا ہے۔"

اتالیق نے جواب دیا۔"میں نے کہہ جو دیا کہ اس میں بھی اللہ کی بہتری ہی ہوگی ہمارے لیے۔"

داؤد بیٹھ گیا، بولا۔"استاد محترم! آپ بھی بیٹھ جائیں۔ میں آپ کی موجودگی میں گلنار سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

اتالیق نے جواب دیا۔"ہاں، باتیں کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن وہ کچھ اس طرح ہوں کہ گلنار کی بہت زیادہ بے عزتی نہ ہو جائے۔"

داؤد نے کہا۔"اسی خیال سے میں ستار کو ذرا دور رکھ رہا ہوں۔"

اس کے بعد داؤد، اتالیق اور گلنار تینوں ایک جگہ بیٹھے اور داؤد نے گفتگو کا آغاز کیا۔ داؤد نے گلنار سے کہا۔"ہاں تو گلنار! استاد محترم تیرے سامنے موجود ہیں۔ اب بتا، فیروز بخت کہاں ہے؟"

گلنار نے بڑی بے بسی سے اتالیق کی طرف دیکھا اور کہا۔"استاد محترم! آپ تو عینی شاہد ہیں، بتائیے فیروز بخت کے ساتھ کیا ہوا؟"

اتالیق نے کہا۔"کیا میں سب کچھ صاف صاف بتادوں؟"

گلنار نے جواب دیا۔"ہاں، آپ سب کچھ صاف صاف بتادیجیے۔"

اتالیق نے کہا۔"محترم خاتون! میں جو کچھ بتاؤں گا، اس میں آپ کا دامن بھی محفوظ نہیں رہے گا۔"

گلنار پریشان تو ہوئی لیکن ہمت کرکے جواب دیا۔"آپ اس کی پروا نہ کریں۔"

اتالیق نے داؤد کی طرف دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔"فیروز بخت کو گلنار نے کبھی بھی پسند نہیں کیا اور انہوں نے اسے مختلف تدبیروں سے دفع کردینا چاہا لیکن ناکام رہیں۔ طرح طرح کی سازشیں اور جوڑ توڑ اور میری اور ستار کی وجہ سے ناکامیاں۔ یہ بڑی لمبی داستان ہے لیکن گلنار کو اپنی ہر سازش اور جوڑ توڑ میں شرمندگی اٹھانا پڑی اور آخرکار انہوں نے حمدو کو اپنا شریک کار بنالیا۔ انہوں نے حمدو کو اس پر آمادہ کرلیا کہ وہ حویلی کے باہر کسی بھی طرح فیروز بخت کا کام تمام کردے۔ اس کے لیے انہوں نے فیروز بخت کو تنہا سیر و تفریح کے لیے باہر بھیجنا شروع کردیا پھر جب فیروز بخت ایک دن روشن چراغ دہلی کے مزار پر گیا تو چند آدمیوں نے فیروز بخت کو اغوا کرلیا۔ اغوا کی واردات کے وقت حمدو بھی وہیں موجود تھا۔"

داؤد نے آگ بگولا ہوتے ہوئے گلنار سے پوچھا۔"کیا یہ درست ہے؟"

گلنار خوف سے کانپ رہی تھی۔ داؤد نے اتالیق سے کہا۔"ہاں اور آگے...... پھر کیا ہوا؟"

اتالیق نے جواب دیا۔"اغوا کے وقت میں اور ستار دونوں ہی وہاں موجود تھے اور فیروز بخت کے اغوا کا منظر ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔"

داؤد نے گرج کر پوچھا۔"میں پوچھتا ہوں فیروز بخت کہاں ہے؟"

اتالیق نے جواب دیا۔"اس کا صحیح پتا یا تو حمدو کو ہوگا یا پھر محترم خاتون گلنار کے پاس۔"

گلنار نے جواب دیا۔"میں نہیں جانتی کہ فیروز بخت کہاں ہے۔ ہاں، اگر حمدو، فیروز بخت کے موجودہ پتے سے واقف ہے تو اس سے پوچھا جائے۔"

داؤد نے ایک خدمت گار سے کہا۔"جا، حمدو کو بلالا۔"

کچھ دیر بعد حمدو بھی آگیا۔ داؤد نے گرج دار آواز میں پوچھا۔"ہاں حمدو! اب تو بتا کہ فیروز بخت کو کن لوگوں نے اغوا کیا اور تجھے کس نے اغوا کرلیا تھا؟"

حمدو نے جواب دیا۔"اسے چند ایرانیوں نے اغوا کیا تھا۔ انہوں نے مجھے بھی اغوا کرلیا تھا لیکن میں بہ مشکل نکل بھاگا۔"

داؤد نے گلنار کے کمرے سے ملحق کمرے سے ملنے والے رومال کو دکھا کر پوچھا۔"اب یہ بتا کہ یہ رومال کس کا ہے؟"

حمدو نے رومال پہچان لیا، بولا۔"یہ میرا رومال ہے مگر یہ آپ کو کہاں سے ملا؟"

داؤد نے جواب دیا۔"جہاں تجھے اغوا کرکے قید کردیا گیا تھا۔"

گلنار کے لیے اب ہر بات ناقابل برداشت تھی۔ خوف زدہ آواز میں بولی۔"بھائی رحم...... بھائی ہمدردی۔"

حمدو نے کہا۔"میں نے جو کچھ بھی کیا، گلنار بی بی کے حکم پر کیا۔"

"مردود! یہ بتا، فیروز بخت کہاں ہے؟" داؤد نے چیخ کر سوال کیا۔

حمدو نے جواب دیا۔"مجھے نہیں معلوم۔"

داؤد نے طنزاً گلنار کو مخاطب کیا۔"تو اسی لیے حمدو سے شادی کرنا چاہتی تھی؟ بول؟"

"بھائی!" گلنار نیم دہری ہوکر گر گئی۔

داؤد نے حمرو سے پوچھا۔ "میں تجھ سے پوچھتا ہوں فیروز بخت کہاں چلا گیا؟"

حمرو نے جواب دیا۔ "میں نہیں جانتا۔"

اتالیق نے کہا۔ "داؤد! فیروز بخت کا پتا یہ کیا بتائے گا؟ اس کا پتا مجھ سے پوچھ۔" اس کے بعد ستار کو بلوا کر حکم دیا کہ فیروز بخت کو حاضر کیا جائے پھر داؤد سے کہا۔ "جناب والا! جب میں نے یہ بات محسوس کرلی کہ اب فیروز بخت کی خیر نہیں ہے تو میں نے ستار کی مدد سے حمرو کی سازش کے متوازی سازش تیار کی اور اس کی اور اس کے ساتھیوں کی موجودگی میں فیروز بخت کو اغوا کروالیا اور وہ ابھی تک میری تحویل میں ہے۔" پھر ستار کو حکم دیا۔ "فیروز بخت کو حاضر کیا جائے۔"

کچھ ہی دیر بعد ستار نے فیروز بخت کو حاضر کر دیا جو ان سب کے سامنے آتے ہی ہنسنے لگا۔ داؤد اپنی جگہ سے اٹھا اور فیروز بخت کو گلے لگالیا، پوچھا۔ "فیروز بخت! تو خیریت سے تو ہے؟"

فیروز بخت بہت خوش تھا، جواب دیا۔ "میرے آقا! میں خیریت سے بھی ہوں اور خوش بھی۔"

داؤد نے کہا۔ "میں تیرا آقا نہیں، باپ ہوں۔ میں نے تجھے متبنیٰ کرلیا ہے۔"

گلنار نیم مدہوشی میں فیروز بخت کو دیکھ رہی تھی اور لرز رہی تھی۔ حمرو ذرا بھی خوفزدہ نہیں تھا۔ گلنار سے پوچھا۔ "گلنار! جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ اب تو یہ بتا کہ تو اپنے وعدے پر کہاں تک قائم ہے؟"

داؤد نے جھڑک دیا۔ "حمرو! اپنی اوقات میں رہ اور مجھ سے بات کر۔ یہ تو کس وعدے کی بات کر رہا ہے؟"

حمرو نے جواب دیا۔ "گلنار نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا۔"

داؤد نے ستار سے کہا۔ "حمرو کو قید کردے، یہ دیوانہ ہو چکا ہے۔"

حمرو نے جواب دیا۔ "اب تو میں گلنار کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔"

ستار نے حمرو کو اپنے طاقتور بازوؤں کی گرفت میں لے لیا، اتنی دیر میں چند اور خدمت گار آگئے اور ان سب نے مل جل کر ستار کی مدد کی اور حمرو کو ایک کوٹھری میں قید کر دیا گیا۔

حمرو کے قید کیے جانے کے بعد داؤد نے گلنار سے پوچھا۔ "اب تو کیا کہتی ہے گلنار؟"

گلنار اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی، بولی۔ "بھائی!

سجدہ

کرایہ دار نے مالک مکان سے شکایت کی کہ "آپ کے مکان کی چھت کی لکڑیوں سے اکثر آوازیں نکلتی رہتی ہیں، مہربانی فرما کر اس کی مرمت کروا دیجیے۔"

مالک مکان نے جواب دیا۔ "پریشانی کی بات نہیں دراصل چھت کی لکڑیاں اپنے پروردگار کی یاد میں مشغول رہا کرتی ہیں۔"

کرایہ دار نے جواب دیا۔ "وہ تو ٹھیک ہے مگر میں ڈرتا ہوں کہ آپ کی چھت ذکر کرتے کرتے کسی دن سجدۂ الٰہی میں مصروف نہ ہو جائے۔"

مرسلہ: محمد صفدر معاویہ، خانیوال

مجھ پر رحم کیجیے۔ میں نہیں جانتی کہ میں کیا چاہتی ہوں۔"

داؤد نے اتالیق کی طرف دیکھا۔ "استاد محترم! آپ کیا فرماتے ہیں؟"

اتالیق نے جواب دیا۔ "میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ جب تک جلال الدین اکبر کے حرم سرا سے کوئی جواب نہ آجائے، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

داؤد نے گلنار کو سخت سست کہا، بولا۔ "میں تیرے خلاف کیا قدم اٹھاؤں لیکن تو نے جو کچھ کیا ہے اچھا نہیں کیا۔ کیا تو یہ نکتہ بھول گئی تھی کہ معلم الملکوت کو اس کے حسد نے ذلیل و خوار کر دیا تھا؟"

گلنار نے بے بسی سے جواب دیا۔ "بھائی! میں بہت شرمندہ ہوں، مجھے معاف کردیجیے۔"

داؤد نے فرطِ جوش میں گلنار کو سینے سے لگالیا، بولا۔ "تو نے جو کچھ کیا، میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ بہن اگر حرم سرا کی خواتین اس حویلی میں نہ آگئی ہوتیں تو میں تیرے کرتوتوں پر تجھے قتل کردیتا لیکن تو خوش قسمت ہے اور شاید لمبی عمر لے کر آئی ہے۔"

اتالیق نے سرگوشی میں کہا۔ "جو کچھ ہوا اسے بھلا دینا چاہیے۔"

داؤد نے جواب دیا۔ "میں خود بھی بھلا دینا چاہتا ہوں لیکن میرا دماغ جھنجھنا رہا ہے، اس کا میں کیا کروں؟"

"انتظار اور صرف انتظار۔ خدا جو کچھ کرے گا، بہتر ہی کرے گا۔ کیا تو اس پر ایمان نہیں رکھتا؟"

اتالیق کے سمجھانے بجھانے سے داؤد کو ہوش آ گیا اور اس نے مسائل درپیش سے اس طرح پیچھا چھڑایا کہ فیروز بخت سے باتیں شروع کر دیں۔ فیروز بخت اس کی توقع سے کہیں زیادہ باشعور اور پڑھا لکھا نکلا۔

☆☆☆

حمدو قید میں اول فول بک رہا تھا۔ داؤد نے اسے جس کوٹھری میں قید کیا تھا، وہ حویلی کے آخری سرے پر زنان خانے کی طرف تھی۔ اس احتیاط کی وجہ سے حمدو کی اول فول خدمت گاروں کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ داؤد کی خواہش پر اتالیق ابھی حویلی ہی میں رہنے لگا تھا۔ داؤد کی نظر میں اتالیق اور فیروز بخت کی بڑی عزت تھی۔ ستار کی وفاداری بھی خاص عزت کی مستحق قرار پائی تھی۔ وہ گلنار کی صورت سے بیزار تھا۔

شاہی مشاطہ اور خواجہ سرا، امراء اور شرفاء کے گھروں میں بادشاہ کے لیے لڑکیاں اور عورتیں تلاش کرتے پھر رہے تھے جس سے دہلی میں ہلچل مچ گئی تھی۔ داؤد نے اتالیق سے مشورہ لیا۔ ''استادِ محترم! گلنار میرے لیے دردِ سر بن گئی ہے۔ میں بار بار یہی کہوں گا کہ اگر شاہی مشاطہ اور خواجہ سرا گلنار کو دیکھ نہ گئے ہوتے تو میں اسے قتل کر کے لاش جمنا میں بہا دیتا۔ اب آپ مشورہ دیجیے کہ میں کیا کروں؟''

اتالیق نے جواب دیا۔ ''داؤد! میں نے تیرا نمک کھایا ہے اس لیے میں تجھے کوئی ایسا مشورہ نہیں دوں گا جو تیری تباہی اور بربادی پر منتج ہو۔ حالات پر نظریں رکھ اور وقت کا انتظار کر۔''

داؤد نے کہا۔ ''میں حمدو کو قتل کر سکتا ہوں لیکن یہ قتل مجھے تباہ و برباد بھی کر سکتا ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ میں معاشرتی مساوات کی پروا کیے بغیر گلنار کی شادی حمدو سے کر دوں اور حمدو کو اپنے کاروبار میں شریک کر لوں۔''

اتالیق نے داؤد کو نیچے سے اوپر تک دیکھا اور ایسا لگا گویا اسے داؤد کی دماغی صحت پر شبہ ہوا ہو، بولا۔ ''تو یہ کیسی باتیں کر رہا ہے؟ بادشاہ کے فیصلے کا انتظار کر، اس کے بعد اس قسم کی باتیں سوچی جا سکتی ہیں۔''

فیروز بخت نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ ''میں جانتا ہوں کہ اتنے بڑے اور نازک مسئلے پر میرا زبان کھولنا مناسب نہیں ہے لیکن میں خود کو اس خاندان کا ایک اہم فرد سمجھنے کی وجہ سے بولنے پر مجبور ہوں۔''

داؤد نے اجازت دی۔ ''نہیں، تو بول سکتا ہے آخر کو میرا جانشین ہے۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''میں گلنار کو اپنی پھوپی سمجھتا ہوں اور حویلی کے جس ماحول میں وہ رہ رہی ہیں، ان میں یہی کچھ ہو سکتا تھا۔ میں انہیں بے گناہ سمجھتا ہوں۔''

داؤد نے حیرت سے کہا۔ ''لیکن اس نے تیرے ساتھ زیادتیاں کی ہیں۔''

''بے شک۔'' فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''میں خاندان اور رشتوں سے محروم ہونے کی وجہ سے گلنار پھوپی کے رشتے کی قدر کرتا ہوں، جو مجھے خوش قسمتی سے میسر آ گیا ہے۔''

داؤد نے کہا۔ ''تو اپنا مافی الضمیر کھل کر بیان کر۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''گلنار پھوپی کو پشیمانی اور شرمندگی کی اذیت سے بچایا جائے۔''

داؤد نے فیروز بخت کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اٹھ کر زنان خانے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ''استادِ محترم! آپ میرا انتظار کیجیے۔ میں ابھی آتا ہوں۔'' فیروز بخت سے کہا۔ ''تو بھی یہیں رہ اور میرا انتظار کر۔''

داؤد سیدھا گلنار کے پاس پہنچا۔ وہ مسہری پر شال اوڑھے لیٹی ہوئی تھی۔ داؤد کے قدموں کی آہٹ سن نہیں سکی تھی، وہ کچھ دیر ساکت کھڑا گلنار کو دیکھتا رہا پھر آہستہ سے پکارا۔ ''گلنار!''

گلنار نے گھبرا کر اپنے چہرے سے شال ہٹائی اور بھائی کو سامنے کھڑا دیکھ کر بیٹھ گئی۔ آنسو پونچھتی ہوئی بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''بھائی! تشریف رکھیے۔''

داؤد مسہری پر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تو رو رہی تھی؟''

گلنار نے جواب دینے کے بجائے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی نظروں سے بھائی کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔

داؤد نے کہا۔ ''گلنار! میں تجھ پر سخت برہم تھا یہاں تک کہ میں تیرے قتل پر آمادہ ہو گیا تھا.....''

گلنار نے جواب دیا۔ ''بھائی! اگر آپ مجھے قتل کر دیں گے تو میں خوشی محسوس کروں گی کیونکہ میں جو اذیت جھیل رہی ہوں، وہ موت کی اذیت سے کہیں زیادہ ہے۔''

داؤد نے کہا۔ ''لیکن اب میں تجھے نہیں مار سکتا۔ ابھی ابھی فیروز بخت نے مجھ سے کہا ہے کہ میں رشتوں کا احترام کروں اور تجھے شرمندگی اور ندامت سے نجات دلاؤں۔''

گلنار نے ایک بار پھر بھائی کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔

داؤد نے کہا۔ ''اس لیے اب تجھے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر تو کہے تو میں تجھے حمدو سے وابستہ کر دوں۔''

گلنار نے جواب دیا۔ "بھائی! اس کا نام مت لیجیے۔ اس نے جو کچھ کیا اور جس قسم کی باتیں کر رہا ہے، وہ ایسی نہیں ہیں کہ کوئی شریف عورت اسے پسند کرے۔"

داؤد نے کہا۔ "لیکن اس کی زبان کس طرح بند کی جائے؟"

گلنار نے جواب دیا۔ "اسے میں قتل کر سکتی ہوں کیونکہ اس کمین کی زبان اس کی موت ہی بند کر سکتی ہے۔"

داؤد نے کہا۔ "اسے تو قتل کرے یا میں، بات ایک ہی ہے۔ حمرو کا قتل اس حویلی کے لیے عذاب بن سکتا ہے۔ اس وقت اور زیادہ رسوائیاں ہوں گی اور یہ باتیں بازاروں، گلیوں اور گھروں میں پھیل جائیں گی۔ اس لیے حمرو کا قتل اس سوہانِ روح مسئلے کا حل نہیں ہے۔"

گلنار نے داؤد کا ہاتھ پکڑ کر اپنے چہرے پر رکھ لیا۔ "بھائی! میں بہت پریشان ہوں۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟"

داؤد نے اسے تسلی دی۔ "مت رو گلنار، مت رو۔ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس وقت میں یہی جاننا چاہتا تھا کہ تو حمرو کو کس حد تک پسند کرتی ہے۔ اب جبکہ تو نے اسے مسترد کر دیا ہے تو میں اس مسئلے کو بہ آسانی حل کر سکوں گا۔"

گلنار سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔ داؤد نے اسے تسلی دی، کہا۔ "میں حمرو کے پاس جا رہا ہوں۔ تو انتظار کر دیکھ خدا کیا کرتا ہے۔"

داؤد، گلنار کو روتا ہوا چھوڑ کر حمرو کے پاس چلا گیا۔

حمرو کی کوٹھری میں بالکل خاموشی تھی۔ داؤد نے دستک دی اور کئی دستکوں کے بعد اندر سے حمرو کی آواز آئی۔ "کون؟"

داؤد نے جواب دیا۔ "میں ہوں اور تجھ سے ضروری باتیں کرنے آیا ہوں؟"

حمرو نے اکھڑ لہجے میں کہا۔ "ضروری باتیں؟ کون کرے گا؟ تو؟ کہاں کرے گا؟ باہر ہی سے یا اندر آ کر؟"

داؤد نے جواب دیا۔ "اگر تو چاہے تو میں اندر بھی آ سکتا ہوں۔"

حمرو نے بگڑے تیور سے کہا۔ "تجھے مجھ پر اعتبار ہے؟"

داؤد نے جواب دیا۔ "میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ گلنار کی شادی تجھ سے کردوں کیونکہ میں طبقاتی امتیاز اور معاشرتی اونچ نیچ کا قائل نہیں ہوں۔ میں تجھے آج ہی آزاد کردوں گا لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ کام عزت واحترام سے ہو اور اس کی یہی صورت ہے کہ تو اپنی زبان بند رکھے اور گلنار کو اپنی عزت و آبرو سمجھے۔"

حمرو خوشی سے پاگل ہو گیا، بے اختیار پوچھا۔ "سچ؟"

داؤد نے جواب دیا۔ "میں بہت سوچ سمجھ کر بات کرتا ہوں حمرو۔ میں نے غصے میں تجھے قید کر دیا تھا لیکن جب غصہ اتر گیا اور میں نے مسئلے کی نزاکت اور اہمیت پر غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچا، جس کا ابھی ابھی اظہار کیا ہے۔"

حمرو نے بے چینی سے کہا۔ "تو کیا فیصلہ کیا آپ نے؟"

داؤد نے قفل کھول دیا اور کوٹھری میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "آ، میرے سینے سے لگ جا کیونکہ اب میرا دل تجھ سے صاف ہو چکا ہے اور اس میں ذرا سی بھی کدورت باقی نہیں رہی۔"

حمرو کا خوشی سے برا حال ہو رہا تھا، پوچھا۔ "پھر میں کب تک امید کروں؟"

داؤد نے جواب دیا۔ "یہ کام بہت جلد ہو گا لیکن اس کی بنیادی شرط یہی ہے کہ تو اپنی زبان بند رکھے گا اور حویلی کے خدمت گاروں سے میل جول نہیں رکھے گا۔"

حمرو نے جواب دیا۔ "پھر میں کہاں رہوں گا؟ کیونکہ اگر میں خدمت گاروں میں اٹھوں بیٹھوں گا تو ان سے باتیں بھی کروں گا اور جب باتیں کروں گا تو معلوم نہیں کیسی کیسی باتیں زبان سے نکل جائیں۔"

داؤد نے جواب دیا۔ "میں تجھے اتالیق کے گھر بھیج دوں گا، وہ تجھے بڑی عزت سے رکھے گا۔"

حمرو اس عزت افزائی سے اور زیادہ خوش ہوا، بولا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

حمرو کے اس اندازِ بے نیازی اور شانِ استغنا سے داؤد کو غصہ تو بہت آیا لیکن ضبط سے کام لیا اور خاموش رہا۔

داؤد نے کہا۔ "استاد محترم سے میں اسی وقت بات کیے لیتا ہوں۔ وہاں رہنے کے سارے اخراجات میں برداشت کروں گا۔"

حمرو نے پوچھا۔ "کیا میں گلنار سے ملاقات کر سکتا ہوں؟"

داؤد نے جواب دیا۔ "نہیں کیونکہ جب ایک بات طے پا چکی ہے تو یہ بات شرافت اور اخلاق سے بعید ہے کہ ہونے والی دلہن کو اس کے شوہر سے شادی سے پہلے ہی ملا دیا جائے۔"

حمرو نے کہا۔ "چلیے یہی سہی۔ میں بھی ملاقات پر اصرار نہیں کروں گا۔"

داؤد حمرو کو لیے ہوئے اتالیق اور فیروز بخت کے پاس پہنچا اور فیروز بخت سے کہا۔ "فیروز بخت! میں نے

تیری بات مان لی اور اب میں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ حمرو کی شادی گلنار سے کر دوں۔"

اس اعلان نے فیروز بخت اور اتالیق دونوں ہی کو حیرت زدہ کر دیا۔ داؤد نے کہا۔"اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں، فیروز بخت نے مجھے رشتوں کے احترام کا درس دیا تھا۔ میں نے اس احترام میں یہ عجیب و غریب فیصلہ کر دیا ہے۔"

اتالیق نے کہا۔"بڑی خوشی کی بات ہے مگر......"

داؤد نے بات کاٹ دی، بولا۔"اب اگر مگر کی کوئی گنجائش نہیں اور یہ کہ میں نے جب ایک فیصلہ کر دیا تو کسی اور کو اس فیصلے میں دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ میرا اپنا مسئلہ تھا، اسے میں ہی حل کر سکتا تھا اس لیے میں نے حل کر دیا۔"

اب کسی کو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اتالیق نے عاجزی سے کہا۔"میرے لیے کوئی حکم؟"

داؤد نے جواب دیا۔"ہاں، حمرو چند ماہ آپ کے ساتھ رہے گا کیونکہ اس رشتے کی بات کے بعد وہ حویلی کے خدمت گاروں کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔"

اتالیق نے کہا۔"بسر و چشم مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

داؤد نے مزید کہا۔"حمرو آپ کے ساتھ شان و شوکت سے رہے گا اور شان و شوکت کے اخراجات میں برداشت کروں گا۔"

اتالیق نے بے اختیار کہا۔"سبحان اللہ، ماشاء اللہ۔"

حمرو اسی وقت اتالیق کے ساتھ کر دیا گیا اور وہ چپ چاپ حویلی سے رخصت ہو گیا۔ ستار اور دوسرے خدمت گار حمرو کو اتالیق کے ساتھ جاتے دیکھ کر تذبذب اور حیران رہ گئے۔ کچھ معلوم نہ ہونے کے باوجود ایک بات ان کی سمجھ میں آ گئی تھی، وہ یہ کہ حمرو کو بڑی عزت سے جاتے دیکھا گیا تھا۔

ان دونوں کے جاتے ہی فیروز بخت نے دبے لہجے میں کہا۔"گستاخی معاف، میں نے آپ سے کنایتاً رشتوں کے احترام کی بات کی تھی مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ آپ گلنار پھوپی کی شادی حمرو سے کر دیں۔"

داؤد نے جواب دیا۔"فیروز بخت! تو ابھی ناتجربہ کار ہے۔ افسوس کہ میں حمرو کی ناشائستہ زبان کو دو طریقوں سے بند کر سکتا تھا۔ ایک طریقہ تو یہ تھا کہ میں اسے قتل کر دوں اور دوسرا طریقہ یہ تھا کہ اس سے گلنار کی شادی کا وعدہ کر لوں۔ چنانچہ میں نے دوسرے طریقے پر عمل کیا اور میں بہت خوش ہوں کہ اس طرح میں حمرو کی زبان کو قفل لگانے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔"

فیروز بخت نے پوچھا۔"کیا گلنار پھوپی کی شادی حمرو سے کر دی جائے گی؟"

داؤد نے جواب دیا۔"کچھ پتا نہیں لیکن میں نے اس سے محض وعدہ کرلیا ہے۔"

فیروز بخت خاموش ہو گیا۔ داؤد نے اتالیق کو اتنی رقم پہنچا دی جس سے حمرو کی شان و شوکت قائم ہو سکے اور یہ سب کچھ دو دن کے اندر اندر ہو گیا۔ پانچویں دن بادشاہ کی دوسری کئی مشاطائیں اور دو خواجہ سرا حویلی میں داخل ہوئے اور داؤد سے کہا۔"ہمیں بادشاہ نے اس لیے بھیجا ہے کہ گلنار کو دیکھ کر فوراً ہی یہ فیصلہ کر دیں کہ وہ بادشاہ کے لائق ہے یا نہیں۔"

داؤد اسی انتظار میں تھا۔ وہ ان سب کو نہایت تپاک سے گلنار کے پاس لے گیا۔ ایک مشاطہ نے گلنار کو دیکھتے ہی صدائے آفرین بلند کی۔"سبحان اللہ، بادشاہ اسے ضرور پسند فرمائیں گے۔"

دوسری نے تائید کی۔"میں اتفاق کرتی ہوں۔"

تیسری نے کہا۔"یہ ایک بہترین اتفاق ہے کہ اس لڑکی کے انتخاب میں کسی کو بھی اختلاف نہیں۔" پھر دونوں خواجہ سراؤں سے پوچھا۔"تم دونوں کا کیا خیال ہے؟"

دونوں نے متفقہ طور پر کہا۔"ہم دونوں بھی تم تینوں سے اختلاف نہیں کر سکتے۔ یہ ایک بہترین انتخاب ہے اور اسے شاہی حرم سرا میں ہی ہونا چاہیے۔"

اس کے بعد داؤد سے کہا۔"ہم تیری بہن گلنار کو نوجوان بادشاہ جلال الدین اکبر کے حرم سرا میں لے جانا چاہتے ہیں۔"

داؤد نے جواب دیا۔"اس ملک میں جو کچھ بھی ہے، بادشاہ کا ہے۔ گلنار بھی بادشاہ کی ہے۔ آپ لوگ بصد شوق لے جائیں۔"

لیکن جب گلنار کو یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے داؤد سے دبی زبان میں کہا۔"بھائی! ظاہر ہے میں مجبور اور بے بس ہوں اور کوئی بھی فیصلہ اپنی مرضی سے نہیں کر سکتی۔ پہلے میں آپ کی ملکیت تھی اور اب بادشاہ کی تحویل میں جا رہی ہوں اور کس کی مجال ہے جو بادشاہ کے حکم کی خلاف ورزی کرے۔ آپ کی بھی ایک بلا ٹل جائے گی اور آپ اطمینان کی سانس لے سکیں گے۔"

داؤد نے جواب دیا۔"بہن! یہ بات نہیں ہے۔ پہلے بھی میں تیری مرضی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اب بھی مجھے تیری مرضی کا پورا پورا پاس و لحاظ ہے لیکن یہ بادشاہ کا حکم ہے اور ہم بادشاہ کے حکم کے خلاف شاید سوچ

بھی نہیں سکتے۔"

گلنار نے ڈبڈبائی آنکھوں سے پوچھا۔"میں حرم سرا میں چلی جاؤں گی...... پھر پھر...... کیا ہوگا؟ پھر میں آپ سے کس طرح ملوں گی؟ حویلی کیسے آسکوں گی؟"

داؤد نے جواب دیا۔"گلنار! میں کچھ بھی نہیں جانتا کہ تیرے حرم سرا میں چلے جانے کے بعد کیا ہوگا؟ شاید حویلی میں آنے جانے کی اجازت مل جائے یا شاید میں خود حرم سرا میں تجھ سے ملنے کے لیے داخل ہوسکوں۔ بہرحال میں کچھ نہیں جانتا کہ تیرے حرم سرا میں داخل ہوجانے کے بعد کیا ہوگا۔"

مشاطہ عورتیں اور خواجہ سرا جلدی کر رہے تھے۔ گلنار بھائی کے گلے لگ گئی اور زاروقطار رونے لگی۔ شاہی عورتوں اور خواجہ سراؤں نے گلنار کو داؤد کے سینے سے الگ کیا اور اسے لے کر شاہی حرم سرا روانہ ہوگئے۔

فیروز بخت بھی باچشم پرنم گلنار کو جاتے دیکھتا رہا اور خود بھی رو دیا۔ یہ خبر بڑی تیزی سے مشہور ہوگئی کہ گلنار کو بادشاہ کے حرم سرا میں داخل کردیا گیا ہے۔ اتالیق بھی بھاگا بھاگا آیا اور داؤد کو تسلیاں دینے لگا لیکن حمدو کا حال ان سب سے مختلف تھا۔ اس نے آتے ہی داؤد سے کہا۔"مجھ پر بڑا ظلم ہوا ہے۔ بھائی داؤد! آپ پر بھی اور مجھ پر بھی۔"

داؤد کو حمدو کے لب و لہجے اور بے تکلفی پر بہت غصہ آیا لیکن برداشت کرگیا۔

حمدو نے پھر زبان کھولی۔"آپ لوگ بادشاہ کے اس ظلم کو برداشت کرسکتے ہیں لیکن میں خاموش نہیں رہوں گا۔ میں اس کا بدلہ لوں گا، بادشاہ سے بدلہ لوں گا۔"

اتالیق اور داؤد نے ایک ساتھ حمدو کو دیکھا۔ بادشاہ سے انتقام حمدو لے گا۔ ان دونوں کو حمدو کے دماغی توازن بگڑ جانے کا شبہ ہونے لگا۔ حمدو بار بار ایک ہی بات کہہ رہا تھا۔ "میں اس ظلم کو برداشت نہیں کروں گا۔ میں بادشاہ سے انتقام لوں گا۔ بادشاہ کو اس کے ظلم اور زیادتی کی سزا دوں گا۔"

پھر داؤد سے درخواست کی۔"بھائی داؤد! مجھے کچھ رقم درکار ہے۔"

داؤد نے پوچھا۔"کتنی رقم؟"

"بس اتنی کہ میں چند دنوں تک آگرے میں رہ سکوں۔"

داؤد نے اسے خاصی رقم دے دی۔ وہ دل ہی دل میں خوش تھا کہ اب حمدو آگرے چلا جائے گا اور اس طرح اس کا پیچھا چھوٹ جائے گا۔

☆☆☆

حمدو حویلی سے نکل کر اسلحہ فروشوں کے بازار پہنچا۔ وہاں سے تیر کمان خرید کر ادھر ادھر مارا مارا پھرنے لگا پھر ویرانے میں جا کر تیر اندازی کی مشق کرنے لگا۔ وہ زمین سے فضا میں اڑتے ہوئے پرندوں کو نشانہ بناتا۔ دل کو لگی ہوئی تھی۔ انتہائے شوق میں یہ کام گھنٹوں کرتا رہا۔ وہ فضا میں چھوڑے ہوئے تیروں کو تلاش کرکے واپس لاتا اور پھر مشق جاری کردیتا۔ اس نے پورا دن اسی کام میں صرف کردیا اور رات گزار کر دوسرے دن پھر یہی کام شروع کردیا۔ اس نے یہ عمل پانچ دن جاری رکھا اور نشانہ لگانے میں مہارت حاصل کرلی۔

بازاروں میں یہ خبر گرم تھی کہ نوجوان بادشاہ، حضرت نظام الدین اولیا کے مزار کی زیارت کو جانے والا ہے۔ بادشاہ کی زیارت کرنے والے چھتوں اور اونچی اونچی جگہوں پر جمع ہونا شروع ہوگئے۔ حد یہ تھی کہ درختوں پر آدمی یوں نظر آتے تھے گویا شاخوں سے آدمی پیدا ہورہے تھے۔ اتالیق نے داؤد سے درخواست کی۔"کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھائیں اور بادشاہ کی زیارت کرلیں۔"

داؤد نے جواب دیا۔"استاد محترم! میں بادشاہ کے اس عمل سے خوش نہیں ہوں کہ وہ امراء اور شرفاء کی بہو، بیٹیوں کو اپنی مرضی سے حرم سرا میں داخل کرلے۔ گلنار میری بہن ہے اور وہ جس طرح اور جن حالات میں حرم سرا میں داخل کی گئی ہے، اس سے میری غیرت کو للکارا گیا ہے۔ اگر بات بادشاہ کی نہ ہوتی تو میں دیکھتا کہ اسے حویلی سے کون لے جاسکتا ہے۔"

اتالیق نے آہستہ سے کہا۔"داؤد! اپنے خیالات اور جذبات کا یوں برملا اظہار نہ کر۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ معاملہ بادشاہ کا ہے۔ اگر تیری یہ بات بادشاہ کے کانوں تک پہنچ گئی تو سوچ لے کہ اس کا کیا انجام ہوگا۔"

داؤد نے جواب دیا۔"اب میں دہلی میں نہیں رہوں گا کیونکہ اس واقعے کے بعد میں لوگوں سے نظریں ملانے کے لائق نہیں رہ گیا۔"

اتالیق کے چہرے پر شکنیں پڑ گئیں، پوچھا۔"داؤد! تو، تو گلنار کی شادی حمدو سے کردینے والا تھا۔ بادشاہ کی حرم سرا، حمدو سے تو اچھی ہی ہے۔"

داؤد نے جواب دیا۔"استاد محترم! آپ تو سمجھدار انسان ہیں، کیا آپ کو یہ یقین ہے کہ میں اپنی بہن گلنار کی شادی واقعی حمدو سے کردیتا؟"

اتالیق نے کہا۔ ”تو نے اعلان تو یہی کیا تھا ورنہ تیری نیت کا حال تو خود جانتا ہوگا یا خدا جانتا ہوگا۔“

داؤد نے کہا۔ ”میں نے حمرو کی زبان بندی کے سلسلے میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ پہلے تو شادی کا لالچ دے کر اسے آپ کے پاس رکھوں گا، اس کے بعد اسے اپنی تجارت میں شامل کر کے سفر پر بھیجوں گا اور راستے میں کرائے کے آدمیوں کے ذریعے قتل کروا دوں گا۔“

اتالیق حیران ہو کر داؤد کی صورت دیکھتا رہ گیا۔

ستار نے خبر دی کہ حمرو ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ داؤد نے ناگواری سے اجازت دی۔ ”اسے حاضر کر۔“

تھوڑی دیر بعد حمرو کو داؤد اور اتالیق کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ ترکش پشت پر تھی اور کمان کاندھے سے لٹک رہی تھی۔ حمرو کی صحت جواب دے گئی تھی اور حلقوں میں دھنسی ہوئی آنکھیں وحشت ناک لگ رہی تھیں۔

داؤد نے پوچھا۔ ”ہاں بھائی حمرو! کیسے آنا ہوا؟“

حمرو نے جواب دیا۔ ”بھائی داؤد! نئے نوجوان بادشاہ نے امراء اور شرفاء کی بہو، بیٹیوں کے ساتھ جو روش اختیار کی ہے، کیا وہ شریفوں اور غیرت مندوں کے لیے للکار سے کم ہے؟“

داؤد نے کہا۔ ”بھائی حمرو! وہ بادشاہ ہے اور اس ملک میں جو کچھ بھی ہے بادشاہ کی ملکیت ہے اور کسی کی یہ مجال نہیں کہ وہ بادشاہ کے کسی ایسے حکم پر ناک بھوں سکیڑ سے۔“

حمرو نے حیرت سے پوچھا۔ ”بھائی داؤد! یہ آپ کہہ رہے ہیں؟ حالانکہ آپ کی بہن گلنار شاہی حرم سرا میں زبردستی داخل کر دی گئی ہے۔ آپ برداشت کر سکتے ہیں لیکن میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔“

داؤد نے کہا۔ ”اگر تو برداشت نہیں کرے گا تو کیا کرے گا؟“

حمرو نے جواب دیا۔ ”میں کیا کروں گا، یہ تو میں ابھی نہیں بتاؤں گا لیکن شام تک پورے دہلی کو یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ میں نے کیا کر دیا۔ میں ایک خطرناک انسان ہوں اور یہ جانتا ہوں کہ کس سے کس طرح نمٹا جائے۔“

اتالیق اور داؤد اب دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔

حمرو نے ان دونوں کو دعوت دی۔ ”اگر آپ دونوں وہ تماشا دیکھنا چاہتے ہیں تو شاہی جلوس میں شامل ہو جائیں۔“

اتالیق نے پوچھا۔ ”تو کیا کرے گا؟ میرا خیال ہے اب تو چلا جا۔“ پھر داؤد کو مخاطب کیا۔ ”جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اس نوجوان کے ارادے اچھے نہیں ہیں اور مجھے اندیشہ ہے کہ یہ کوئی الٹا سیدھا قدم اٹھائے گا۔ اگر اس نے ایسا کیا اور بعد میں تحقیق اور تفتیش سے اس کا تعلق اس حویلی اور مجھ سے ثابت ہو گیا تو ہمارا کیا حشر ہوگا؟ کچھ اس پر بھی غور کیا؟“

حمرو نے جواب دیا۔ ”میں جو کچھ کروں گا، اس میں آپ لوگوں کا نام نہیں لیا جائے گا۔“

حمرو کی باتیں چھپ کر ستار نے بھی سن لیں، جب وہ باہر نکلا تو ستار نے اسے سمجھایا۔ ”حمرو! کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اس پر اچھی طرح غور ضرور کر لینا۔“

حمرو نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ”میری عقل تم سب سے زیادہ ہے اس لیے مجھے کسی کا مشورہ نہیں چاہیے۔“

حمرو نظام الدین اولیاؒ کے مزار کی طرف چل پڑا، ترکش شانے پر تھی اور کمان ہاتھ میں لے لی۔

حمرو کے چلے جانے کے تھوڑی دیر بعد داؤد، اتالیق اور فیروز بخت بھی بادشاہ کی زیارت کو چل کھڑے ہوئے۔ ان لوگوں نے پرانے قلعے کے پاس آدمیوں کا جنگل سا دیکھا۔ بادشاہ کو ایک نظر دیکھنے کے لیے وہ ایک دوسرے پر چڑھے جا رہے تھے۔ بادشاہ ہاتھی پر سوار تھا اور دور ہی سے نظر آ رہا تھا۔ حمرو ان سب سے الگ تھلگ اس مسجد کے زیرِ سایہ پہنچ گیا جسے ماہم بیگم نے تعمیر کرایا تھا۔ مسجد سے ملحق مدرسہ تھا اور مسجد اور مدرسے کے ساتھ ساتھ مکانات کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ یہاں بھی لوگوں کا ہجوم تھا۔ حمرو کو معلوم تھا کہ بادشاہ کی سواری یہیں سے گزرے گی۔ بادشاہ کے محافظوں نے شاہی ہاتھی کو اپنے بیچ میں لے رکھا تھا۔ حمرو نے بادشاہ کو دیکھا، ترکش میں سے تیر نکال کر چلے میں رکھا اور بادشاہ کا نشانہ لیا۔ چونکہ ہاتھی حرکت میں تھا اس لیے حمرو کو نشانے کا رخ آہستہ آہستہ تبدیل کرنا پڑا۔ ایک جگہ ہجوم کی وجہ سے شاہی سواری چند ثانیوں کے لیے رک گئی۔ حمرو کے چہرے پر خوشی اور فتح مندی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے بادشاہ کے سینے کا نشانہ لے کر تیر کو پوری قوت سے چھوڑ دیا۔ تیر سنسناتا ہوا سینے کے بجائے بادشاہ کے بازو میں پیوست ہو گیا۔ بادشاہ کی سسکی نکل گئی اور محافظین میں ہلچل مچ گئی۔ بادشاہ نے محفوظ ہاتھ سے زخمی شانہ پکڑ لیا، خون کی دھار بہہ نکلی اور سرخ سرخ خون سے لباس رنگین ہونے لگا۔ بادشاہ کے خدام نے ہاتھی کو بٹھایا اور بہ مشکل تیر کو شانے سے نکال دیا۔ اس کے بعد خون آلود لباس کو اتار کر روئی کی قبا پہنا دی گئی۔

حمرو کو مجمع نے پکڑ لیا تھا۔ اس ہلچل نے اتالیق اور

واؤد کو لرزا دیا۔ فیروز بخت الگ سہما ہوا تھا۔

بادشاہ کے ہم رکاب، امرا نے بادشاہ سے خیریت پوچھی اور حکیم عین الملک گیلانی بادشاہ کے زخم کو دھونے اور دوائیں لگانے لگا۔

ایک امیر نے بادشاہ کو مشورہ دیا۔ ''حضور والا! حکم دیں تاکہ مجرم سے سوالات کر کے سازش کا پتا چلایا جائے۔''

بادشاہ نے پوچھا۔ ''کیا قاتل پکڑا گیا؟''

امیر نے جواب دیا۔ ''حضور! اسے قاتل نہ کہیں، حملہ آور کہیں کیونکہ نصیبِ دشمناں وہ اپنے ناپاک ارادے میں ناکام رہا ہے۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''سوال و جواب کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اس وقت وہ جن لوگوں کے نام لے لے گا، اگر ان میں میرے خاص خاص امراء کا نام محض دشمنی کی وجہ سے لے لیا تو ان وفاداروں کے خلاف میں شک میں مبتلا ہو جاؤں گا۔''

ایک دوسرے امیر نے پوچھا۔ ''پھر اس کے لیے کیا حکم ہے؟''

بادشاہ نے جواب دیا۔ ''اسے کسی پرسش کے بغیر ہی قتل کر دیا جائے۔''

جن لوگوں نے حمرو کو پکڑ رکھا تھا، اتالیق، واؤد اور فیروز بخت بھی وہاں پہنچ گئے۔ حمرو نے ان کی طرف اس طرح دیکھا گویا انہیں جانتا ہی نہ ہو۔ امراء بادشاہ کا حکم لے کر حمرو کے پاس پہنچے اور ایک امیر نے اپنے طور پر سوال کیا۔ ''اے بدبخت نوجوان! یہ تو نے کیا کیا؟''

حمرو نے ہنس کر جواب دیا۔ ''میں نے جو کچھ کیا ہے جا، بادشاہ سے جا کر پوچھ۔ تیرے سوال کا صحیح جواب وہی دے سکتا ہے۔''

امیر نے پوچھا۔ ''لیکن تو نے یہ کیوں کیا؟''

حمرو نے جواب دیا۔ ''اس کا بہترین جواب ان امراء اور شرفاء سے ملے گا جن کی بہو، بیٹیوں بلکہ بیویاں تک زبردستی حرم سرا میں داخل کر دی گئیں۔''

واؤد گھبراہٹ میں یہ کہنے والا تھا کہ حمرو سے اس کا کوئی تعلق نہیں لیکن اتالیق نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور سرگوشی میں کہا۔ ''خبردار جو تو نے زبان کھولی، خاموشی ہی میں نجات ہے۔''

امیر نے پوچھا۔ ''تیرا نام کیا ہے؟''

حمرو نے جواب دیا۔ ''لوگ مجھے حمرو کہتے ہیں لیکن میرا اصل نام فولاد ہے کیونکہ میرے مزاج کی سختی فولاد سے کسی طرح کم نہیں۔''

ایک دوسرا امیر بولا۔ ''سوال جواب مت کر۔ بادشاہ کے حکم کی تعمیل ہونی چاہیے۔''

امیر نے اصرار سے پوچھا۔ ''میں تجھ سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اگر اس سازش میں کوئی بڑی شخصیت شامل ہے تو اس کا نام لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے بادشاہ تجھے معاف کر دے اور اس شخص کو سزا مل جائے۔''

بادشاہ نے جلاد بھیج دیا۔ اس نے آتے ہی امراء کو ہٹا دیا۔ ''حملہ آور کے علاوہ ہر شخص یہاں سے ہٹ جائے گا، ورنہ وہ بھی اس کا شریک سمجھا جائے گا۔''

حمرو کو گھیرے میں لینے والے کائی کی طرح چھٹ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے جلاد اور حمرو کے علاوہ وہاں کوئی بھی نہیں رہ گیا۔ اتالیق، واؤد اور فیروز بخت دور سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ جلاد نے حمرو سے پوچھا۔ ''اے بدبخت انسان! مجھے تیرے قتل پر مامور کیا گیا ہے۔ تجھ پر کوئی مقدمہ نہیں چلا۔ ہجوم نے تجھے بادشاہ کو تیر سے زخمی کر دینے کے جرم میں پکڑا ہے۔ ترکش اور تیر کمان تیرے پاس موجود ہے۔ ان حالات میں یہ میرا فرض ہے کہ تجھ سے یہ معلوم کروں، تو اقراری مجرم ہے یا نہیں؟''

حمرو نے حقارت سے جواب دیا۔ ''تیرے سپرد جو کام کیا گیا ہے، اسے انجام دے اور تفصیلات میں مت جا۔''

جلاد نے کہا۔ ''تیری ہاں یا نہیں سے میرا ضمیر مطمئن ہو جائے گا۔''

حمرو نے طنزاً پوچھا۔ ''تو ضمیر کی بات کر رہا ہے یعنی تو...... تیرے پاس اب بھی ضمیر ہے، کیا واقعی؟''

جلاد نے جواب دیا۔ ''اس میں طنز کی کیا بات ہے۔ ضمیر کس کے پاس نہیں ہے۔ میں بادشاہ کے حکم کی تعمیل کر دیتا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میرا ضمیر مجھے پریشان نہیں کرتا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں تجھ سے ایسا سوال ہرگز نہیں کرتا۔''

حمرو نے کہا۔ ''میں نے بادشاہ کو قتل کر دینا چاہا تھا لیکن افسوس کہ ناکام رہا یا یہ بھی ممکن ہے کہ میرے تیر کا زخم بادشاہ کو جہنم واصل کر دے کیونکہ میرا تیر زہر آلود تھا۔''

جلاد نے ڈر کر کہا۔ ''خبردار جو مزید کچھ کہا۔ تو بادشاہ کی شان میں ناگفتہ بہ الفاظ ادا کر رہا ہے۔''

حمرو نے اسی طرح درشت لہجے میں کہا۔ ''وہ تیرا بادشاہ ہوگا، میری نظر میں تو وہ ایک ظالم انسان ہے جو دوسروں کی بہو،

بیٹیوں اور بیویوں سے، اپنا حرم آباد کرتا ہے۔''

جلاد، بادشاہ کے خلاف باتیں سن کر کانپا جا رہا تھا، بولا۔ ''اچھا تو کلمہ پڑھ لے اور خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لے۔''

حمدو نے آسمان کی طرف دیکھا اور دعا مانگی۔ ''اے میرے اللہ! تو ظالم کو کیفرِ کردار تک پہنچا، بابِ عرش کو وا کر دے تاکہ مظلوموں کی آہیں کسی روک ٹوک کے بغیر تیرے عرش سے ٹکرائیں۔''

جلاد نے تلوار فضا میں لہرائی اور حمدو کی گردن پر رسید کر دی۔ وار اتنا بھرپور اور نپا تلا تھا کہ تلوار ایک طرف سے داخل ہو کر دوسری طرف نکل گئی اور حمدو کا سر لڑھک کر اس کے اپنے ہی قدموں میں آ گیا۔ بے سر کا لاشہ پھڑکنے تڑپنے لگا جس سے اس کا اپنا ہی سر ٹکرا ٹکرا کر ادھر ادھر ہونے لگا۔

فیروز بخت کی چیخ نکل گئی۔ اتالیق نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، بولا۔ ''لڑکے! یہ کیا غضب کر رہا ہے، ہوش وحواس میں رہ۔''

داؤد نے منہ پھیر لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اس کی موت کا مجھے افسوس ہے۔''

کچھ دیر بعد بادشاہ ہاتھی پر سوار ہو کر شاہی محل روانہ ہو گیا۔ مجمع بھی منتشر ہو گیا۔ داؤد، اتالیق اور فیروز بخت اپنی حویلی کی طرف چل دیے۔ راستے میں اتالیق نے کہا۔ ''حمدو آدمی کیسا ہی کیوں نہ رہا ہو لیکن اپنے آخری لمحات میں اس نے جس شرافت اور دیانت کا ثبوت دیا ہے، اس کی کوئی مثال نہیں ملے گی۔''

داؤد نے بھی تائید کی، بولا۔ ''ہاں اگر وہ چاہتا تو ہمارا نام لے سکتا تھا۔''

فیروز بخت نے کہا۔ ''اس سے ہمیں ایک بات معلوم ہوئی کہ جس طرح معلم الملکوت ایک ذرا سی غلطی پر شیطان بن سکتا ہے، اسی طرح ہمیشہ کا شیطان لمحاتی ایمان اور دیانت سے رشکِ ملائک اور فخرِ انسان بن سکتا ہے۔''

حویلی میں داخل ہوتے ہی داؤد نے اعلان کر دیا۔ ''اب میں دہلی میں نہیں رہوں گا۔ میں احمد آباد، گجرات یا سورت کہیں بھی منتقل ہو جاؤں گا اور دہلی کا کاروبار ختم کر دوں گا۔''

اتالیق نے پوچھا۔ ''یہاں رہنے میں کون سا امر مانع ہے؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''استادِ محترم! میرے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس سے آپ اچھی طرح واقف ہیں۔ اول تو میں اس رسوائی سے گھبرا رہا ہوں جو بہن گلنار کے حرم سرا میں داخلے سے ہوتی رہے گی۔ دوسرے اس خوف سے کہ کہیں کسی بھی طرح بادشاہ کو یہ بات معلوم ہو گئی کہ حمدو اس حویلی کا خدمت گار تھا اور اس نے گلنار کی وجہ سے اتنا بڑا جرم کیا تھا تو میرا کیا ہو گا؟''

اتالیق نے پوچھا۔ ''مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

داؤد نے جواب دیا۔ ''آپ بھی میرے ساتھ چل سکتے ہیں۔ میں آپ کو زندگی بھر کے لیے فکرِ معاش سے... بے فکر کر دوں گا۔''

اتالیق کسی سوچ میں پڑ گیا، کچھ دیر بعد بولا۔ ''افسوس کہ میں دہلی نہیں چھوڑ سکتا۔''

فیروز بخت نے خوشامد کی۔ ''استادِ محترم! آپ اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کر لیجیے۔''

اتالیق نے جواب دیا۔ ''میں اپنا وطن دہلی نہیں چھوڑ سکتا۔''

داؤد نے کہا۔ ''تب پھر اس حویلی میں آپ اپنے خاندان کے ساتھ رہیے۔''

اتالیق نے بجھی بجھی ہنسی سے جواب دیا۔ ''داؤد! میں ایک غریب آدمی ہوں، یہ حویلی میرے لیے ہاتھی ثابت ہو گی اور میں ہاتھی نہیں پال سکتا۔''

اتالیق نے وہ رات حویلی میں گزاری۔ بعد میں جن خدمت گاروں نے داؤد کے ساتھ جانا گوارا کیا، ان میں ستار تنہا تھا۔ بقیہ کو چھٹی دے دی گئی۔

جانے سے پہلے داؤد اور فیروز بخت گلنار سے ایک بار مل لینا چاہتے تھے لیکن جب رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی تو معلوم ہوا گلنار کو آگرے روانہ کر دیا گیا ہے اور وہ آگرے کے حرم سرا میں پہنچا دی گئی ہے۔ داؤد کے دل میں گلنار کی محبت تھی۔ ایک ماں کی کوکھ میں رہنے والے بھائی، بہن اچانک اس طرح بچھڑ گئے تھے کہ دوبارہ کہیں ملنے کا امکان ہی ختم ہو گیا تھا۔

(جاری ہے)

کہانی کے تاریخی ماخذ

تاریخ دعوت و عزیمت	الکامل	طبقاتِ ناصری	طبقات الکبریٰ	تاریخ الطبری	التنبیہ والاشراف
سید ابوالحسن ندوی	ابن اثیر	منہاج سراج	علامہ عبدالوہاب	ابی جعفر جریر الطبری	المسعودی

کامیاب مفتوح

طاہر جاوید مغل

عورت کی رضا اور ساتھ کے بغیر جنگیں تو جیتی جاسکتی ہیں مگر... دل نہیں۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ماجرا تھا جب ایک انار اور دو بیمار کے مصداق ایک ہی چہرہ ان دونوں کی آنکھوں میں خواب بن کر اتر گیا تھا لیکن ... کسی کو یہ خبر نہ تھی کہ اس خواب کی تعبیر کس کے حق میں سیدھی اور کس کے لیے الٹی ثابت ہونے والی تھی۔

پہیلی کی صورت الجھا دینے والی ایک

دوشیزہ کا قصہ

یہ ایک بالکل ویران جگہ تھی۔ یہ ایک چھوٹے سائز کا جزیرہ تھا۔ زمین ریتیلی اور نیم گرم تھی۔ چاروں طرف گھنا جھاڑ جھنکاڑ تھا۔ اس جھاڑ جھنکاڑ میں سے کہیں کہیں سمندر کے نیلگوں پانی کی جھلک بھی نظر آ جاتی تھی۔

جمی اور ناب ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ دونوں کی آنکھوں سے جیسے شعلے نکل رہے تھے۔ دونوں کے بالائی جسم عریاں تھے۔ دوپہر کی چمکیلی دھوپ میں دونوں کے بازوؤں کی مچھلیاں چمک رہی تھیں اور وہ



ایک دوسرے پر جھپٹنے کے لیے بالکل تیار تھے۔

جدید طرز کے، زرد خیمے میں بیٹھی ہوئی بابرہ نے...... بے چینی سے پہلو بدلا۔ اس کے ہونٹ خشک ہونے لگے تھے، اس نے منرل واٹر کی بوتل سے دو گھونٹ پانی پیا اور اپنی آنکھوں سے امڈتی ہوئی بے چینی کو چھپانے کے لیے گہرے رنگ کے سن گلاسز لگا لیے۔ وہ تیئس چوبیس سال کی ایک خوبرو لڑکی تھی۔ اس نے ایک لمبی کڑھائی دار قمیص اور جینز پہنی ہوئی تھی۔ جمی اور ناب دو بپھرے ہوئے سانڈوں کی طرح ایک دوسرے کے سامنے کھڑے رہے۔ دونوں جیسے نگاہوں ہی نگاہوں میں ایک دوسرے کو تول رہے تھے۔ دونوں نے بازو پھیلا رکھے تھے اور اپنے پاؤں کو بڑے محتاط انداز میں حرکت دے رہے تھے۔ پھر یکا یک لڑائی شروع ہو گئی۔ پہلا وار جمی نے ہی کیا۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے جھکا اور اس نے ناب کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر اسے پشت کے بل ریت پر گرانا چاہا مگر ناب نے اپنی ٹانگیں پھیلا کر اور زور لگا کر خود کو گرنے سے بچایا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے گھٹنے کا بھرپور وار جمی کی پسلیوں پر کیا اور پھر اس کے منہ پر جوگر کی ٹھوکر رسید کر کے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ جمی لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے چلا گیا۔ ایک سیکنڈ کے اندر اس کی ناک سے خون رسنا شروع ہو گیا۔ پہلے وار کی کامیابی کے بعد ناب نے پھرتی سے دوسرا وار کیا اور جمی کے منہ پر ٹانگ مارنا چاہی۔ اس مرتبہ جمی نے خود کو بچایا اور پھر ایک چنگھاڑ کے ساتھ اپنے حریف سے لپٹ گیا۔ اس نے ناب کی توانا گردن اپنے مضبوط بازو میں دبوچ لی تھی، دوسری طرف ناب نے اپنے بازوؤں کا شکنجہ جمی کی کمر کے گرد کس دیا۔ دونوں پوری طاقت سے ایک دوسرے کو دھکیلنے لگے، بالکل جیسے دو سانڈوں نے ایک دوسرے میں سینگ پھنسا لیے ہوں اور اب جسم و جاں کی پوری توانائی سے ایک دوسرے کو دھکیل کر کسی گہری کھائی میں گرانا چاہتے ہوں۔ بابرہ اب بے چینی کے عالم میں کھڑی ہو چکی تھی۔ وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی تھی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ ان دونوں میں سے کون یہ خونی مقابلہ جیتے گا اور اس خیمے میں اس کا "دولہا" بنے گا...... اس کے جسم و جاں کا مالک۔

شاید یہ وہی منظر تھا جو روئے زمین پر روزِ اول سے بار بار دہرایا جاتا رہا ہے۔ چرند پرند سے لے کر اشرف المخلوقات تک سب ذی نفس اس منظر کا حصہ رہے ہیں۔ اگر واضح الفاظ میں یہ بات کہی جائے تو شاید یوں ہو گی...... ایک مادہ کے لیے دو نروں کا ٹکراؤ...... جو ہمیشہ سے جاری ہے۔

اوقیانوس کے اس ویران جزیرے پر ایک تنہا خیمے کے سامنے دلکش بابرہ کے روبرو جو کچھ ہو رہا تھا، اس کے بارے میں جاننے کے لیے ہمیں تین چار ماہ پیچھے جانا پڑے گا۔ یہ کہانی جولائی کی اس حسین شام کو شروع ہوئی تھی جب جمی یعنی جمیل اور نبیل عرف ناب آئس کریم کھانے کے لیے ایک آئس کریم پارلر میں گئے تھے۔ یہ دونوں نوجوان دوست ہوانا کے ہی رہائشی تھے۔ دونوں کے آباء کا تعلق پاکستان سے تھا اور دونوں کی فیملیز قریباً ساٹھ برس سے کیوبا میں رہائش پذیر تھیں۔ دونوں کا تعلق یہاں کے خوش حال کاروباری گھرانوں سے تھا۔ دونوں غیر شادی شدہ تھے اور قریباً یکساں تعلیم یافتہ بھی تھے۔ شکل وصورت کے لحاظ سے بھی کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جا سکتی تھی۔ ہاں نبیل کے خدوخال میں سختی اور مردانہ پن نسبتاً زیادہ نظر آتا تھا۔ اس کی ٹھوڑی کے نیچے ایک پرانے زخم کا قوس نما نشان بھی تھا، تاہم یہ نشان اس کے چہرے کی دلکشی کو کسی طور متاثر نہیں کرتا تھا۔ جمیل کے چہرے کے نقوش نسبتاً تیکھے تھے۔ دونوں دراز قد اور نہایت ورزشی جسم کے مالک تھے اور یہ بھی اتفاق تھا کہ دونوں نے کالج کے زمانے میں ایک ہی انسٹی ٹیوٹ سے مارشل آرٹ کی ٹریننگ بھی حاصل کی تھی...... گلی کوچوں اور کلبوں وغیرہ میں ہونے والی لڑائیوں مار کٹائیوں کے لیے تربیت حاصل کرنا اکثر نوجوانوں کا شوق تھا۔ جمیل اور نبیل بھی ایسی مار ماری میں کافی طاق تھے۔ کئی مواقع پر وہ مقامی اور غیر مقامی پھڈے بازوں کے ساتھ نہایت کامیابی سے نمٹ چکے تھے۔

جولائی کی اس خوشگوار شام کو جب وہ دونوں اس آئس کریم پارلر میں داخل ہوئے تو انہیں ہرگز معلوم نہیں تھا کہ یہاں بھی ایک پھڈا ان کا منتظر ہے۔ بہر حال اس پھڈے کا تعلق لڑائی مار کٹائی سے نہیں، حسن و عشق سے تھا۔ جمی اور ناب نے پارلر کی ایک میز پر ایک حسین لڑکی کو اپنے میل اور فی میل دوستوں کے ساتھ بیٹھے اور باتیں کرتے دیکھا۔ وہ جب ہنستی تو ہر طرف پھول سے بکھرتے محسوس ہوتے تھے اور جب باتیں کرتے کرتے اپنے سیاہ ریشمی بالوں کو دائیں ہاتھ سے چہرے پر سے ہٹاتی تو یوں لگتا جیسے چاند بادلوں کے پیچھے چھپتا چھپتا پھر نمودار ہو گیا ہو۔ اس کی ہر ادا تیر کی طرح دیکھنے والے (حضرات) کے دل پر لگتی اور نیم بسمل کر دیتی تھی۔ جمی اور ناب بھی اس شام ایک ساتھ ہی بسمل ہوئے تھے اور دونوں نے اپنے سینے میں اس لڑکی کے لیے ایک آگ سی بھڑکتی محسوس کی تھی۔ یقینی بات تھی کہ وہ

پاکستانی یا انڈین ہے۔ بے شک وہ ایک مہنگے آئس کریم پارلر میں بیٹھی تھی تاہم اس کے لباس اور اس کے دوستوں وغیرہ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ یعنی وہ خوش پوش لوگ، جنھوں نے ابھی خوش حالی اور امارت کی سیڑھیوں پر قدم نہیں رکھے ہوتے۔

''کیا کیا جائے؟'' جی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

''کرنا کیا ہے پکڑ کر...... شادی کر لیتے ہیں۔'' ناب نے کہا۔

''شادی تو صرف ایک سے ہو سکتی ہے۔''

''تو بھی میں ہوں نا، اس نیک کام کے لیے۔'' ناب نے ترت جواب دیا۔

جی نے مکا تانا۔'' خبردار! اس قسم کے گندے ناپاک خیال ذہن میں نہ لانا...... اب یہ لڑکی تمہارے لیے عزت کی جگہ پر ہے کیونکہ تمہارا عزیز ترین دوست اسے اپنے لیے پسند کر چکا ہے۔''

''یہی بات میں تم سے کہنا چاہتا ہوں اور بالکل انہی لفظوں میں۔'' ناب نے کہا اور جی پر جوابی وار کرنے کے لیے ایش ٹرے اٹھالی۔

وہ دونوں نہیں جانتے تھے کہ ہنسی مذاق کی یہ صورتِ حال کتنی جلد تبدیل ہونے والی ہے۔ یہ لڑکی اس طرح دونوں کے اعصاب پر سوار ہونے والی ہے کہ وہ اچھے دوستوں سے بدترین دشمنوں میں بدل جائیں گے۔

وہاں آئس کریم پارلر میں بیٹھے بیٹھے ان دونوں نے فیصلہ کیا کہ لڑکی کے کوائف معلوم کیے جائیں اور دیکھا جائے کہ وہ کس باغ کی مولی ہے اور اس مولی کو کس طرح اکھاڑا اور اپنی دسترس میں لایا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک مادر پدر آزاد معاشرہ تھا۔ مرد و زن کا تعلق سماجی پابندیوں سے تقریباً آزاد تھا۔ جوڑوں کے، شادی کے بغیر اکٹھے رہنے کی بات تو اب بہت پرانی ہو چکی ہے۔ مغربی معاشرے میں تو اب معاملات اس سے بھی آگے جاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس ماحول کا اثر یقیناً ان غیر ملکیوں پر بھی پڑتا ہے جو مغرب کے بجائے مشرق سے تعلق رکھتے ہیں اور مغربی ممالک میں آباد ہو جاتے ہیں۔ جی اور ناب بھی انہی تارکینِ وطن میں شامل تھے اور غالباً وہ لڑکی بھی جو بولڈ لباس پہنے ہوئے، چند میزیں چھوڑ کر اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔

اگلے آٹھ دس روز میں جی اور ناب نے لڑکی کا سارا حدود اربعہ دریافت کر لیا۔ اس کے لیے انھوں نے اپنے ایک تیسرے دوست کی خدمات حاصل کی تھیں جو ایسے کاموں میں خاصا ماہر تھا۔ لڑکی کا نام بابرہ معلوم ہوا۔ وہ ان کے اندازوں کے عین مطابق پاکستانی تھی...... یعنی اس کے ''بڑے'' پاکستان سے تعلق رکھتے تھے۔ لڑکی کے والدین ایک ٹریفک حادثے میں انتقال کر چکے تھے۔ اس کی صرف ایک بہن تھی جو اپنے ''منہ بولے'' خاوند کے ساتھ امریکا میں رہتی تھی۔ بابرہ یہاں ہوانا میں اپنی دو بھارتی فرینڈز کے ساتھ رہائش پذیر تھی اور ایک اشتہاری فرم میں جاب کرتی تھی۔ اس کا تھوڑا بہت بینک بیلنس بھی تھا۔ ذاتی بائیک تھی جس پر وہ آفس آتی جاتی تھی۔ ایک حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ اس کی کہیں منگنی وغیرہ بھی نہیں ہوئی تھی، نہ ہی اس کے کسی سنجیدہ بوائے فرینڈ کا کھوج ملا۔ وہ جی اور ناب کے لیے ہر لحاظ سے ایک موزوں کیس تھی۔ وہ دونوں ہی اس قابل تھے کہ اپنی شخصیت اور اپنی مالی حیثیت کے بل بوتے پر بابرہ کو اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے سکتے تھے اور یہیں سے جی اور ناب کے درمیان ایک خاموش چپقلش شروع ہو گئی۔ دھیرے دھیرے یہ چپقلش ایک سرد جنگ میں بدل گئی۔ ان دونوں میں سے کوئی ابھی تک براہِ راست بابرہ سے ملا نہیں تھا لیکن وہ دونوں جان چکے تھے کہ وہ اسے حاصل کر سکتے ہیں۔ جو بھی اس کی طرف قدم بڑھاتا، وہ تھوڑی سی کوشش سے اس مڈل کلاس لڑکی کو اپنے تصرف میں لے آتا لیکن سوال یہ تھا کہ اس کی طرف قدم بڑھائے گا کون؟ جی یا ناب؟

ایک موقع پر جمیل عرف جی نے بغیر اپنا نام بتائے بابرہ سے فون پر تھوڑی سی بات کی۔ اس بات کا پتا نبیل یعنی ناب کو چل گیا۔ دونوں میں تلخ جملوں کا تبادلہ ہوا کیونکہ دونوں میں یہ طے ہوا تھا کہ وہ بابرہ کے سلسلے میں جو کچھ بھی کریں گے باہمی مشورے سے کریں گے۔ پھر ایک دن جی کو پتا چلا کہ ناب نے بے وجہ بابرہ کے آفس میں جا کر اس سے ملنے کی کوشش کی ہے۔ ایک بار پھر دونوں میں تلخ کلامی ہوئی۔ اس تلخ کلامی کے بعد دونوں کو اپنے اپنے کچھ پرانے زخم بھی یاد آگئے۔ یہ روزمرہ زندگی میں سامنے آنے والے چھوٹے چھوٹے اختلافات تھے جو اس نئے اختلاف کی وجہ سے اب بڑے اور سنگین دکھائی دینے لگے تھے۔ جی نے اپنی جو اسپورٹ کار ناب کو پچھلے کئی ماہ سے چلانے کے لیے دے رکھی تھی (اور جسے وہ نشے کی حالت میں ٹھونک بھی چکا تھا) اس سے واپس مانگ لی۔ دوسری طرف ناب نے اپنے ایک باکسنگ کلب میں سے جی کا شیئر یہ کہہ کر نکال دیا کہ کلب کا کاروبار گھاٹے میں جا رہا ہے۔ ایک تقریب میں ڈرنک کرتے ہوئے ناب نے جی کی ایک جرمن دوست

لڑکی سے بدتمیزی کی۔ جمی بھی نشے کی حالت میں تھا، اس نے ناب سے کہا۔ ”چوڑی ناک والے، اپنے ہاتھوں کو اس لڑکی سے دور رکھو۔“

دونوں ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے لیکن دوستوں نے بیچ بچاؤ کرادیا۔ بہرحال یہ سلسلہ رکا نہیں۔ دن بدن آگے بڑھتا رہا اور اس کی بنیادی وجہ وہی خوش ادا و خوش اندام بابرہ تھی۔ اس کو شاید پتا بھی نہیں تھا کہ اس کے اردگرد کیا ہو رہا ہے اور دو امیرزادے شکاریوں کا روپ دھار کر اس پر جھپٹنے کی تیاری کررہے ہیں۔

دونوں کے مشترکہ دوست حیران تھے کہ دونوں کو دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیا ہوگیا ہے۔ وہ ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے روادار نہیں رہے تھے بلکہ کسی وقت تو لگتا تھا جیسے ان کے حوالے سے کوئی سنگین واقعہ رونما ہوجائے گا۔ دونوں کے قریبی دوست ٹیڈی کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ یہ کوتاہ قد ٹیڈی وہی تھا جس نے کچھ عرصہ قبل ان دونوں کے لیے بابرہ کے کوائف اکٹھے کیے تھے اور پھر ایک دن یہ باہمی تناؤ اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ ناب دندناتا ہوا جمی کے آفس میں داخل ہوا اور اس سے کہا کہ وہ اکیلے میں اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔ جمی نے اپنے دو ملازموں کو آفس سے نکال دیا۔ ناب نے جمی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور پھنکارتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”فیصلہ کرلو۔“

”کیسا فیصلہ؟“

”راستے سے ہٹ جاؤ...... یا مجھے ہٹادو۔“

جمی چند لمحے تک اسے گھورنے والے انداز میں دیکھتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔ ”لڑنا چاہتے ہو؟“

”لڑے بغیر اگر کوئی طریقہ ہے تو مجھے بتادو۔“ ناب نے جوابی سوال کیا۔ اس کی آواز میں شعلے رقصاں تھے اور بازوؤں کی مچھلیاں جیسے پھڑک رہی تھیں۔

اس روز اس کمرے میں ان دونوں کے درمیان کچھ طے ہوگیا۔ یہ بہت انوکھا تھا لیکن جو کچھ بھی تھا، بہت سنجیدگی سے کہا اور سنا گیا تھا۔ ان دونوں نے آپس میں ایک طرح کا ”ڈوئل“ لڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہی طریقہ کار جو دو افراد اپنے ناقابلِ حل مسئلے کے حل کے لیے اختیار کرتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے ہیں، جو جیت جاتا ہے، وہ منزلِ مراد پاتا ہے، جو ہار جاتا ہے موت کا حق دار ٹھہرتا ہے۔ اس دن جمی اور ناب کے درمیان سب کچھ فائنل ہوگیا اور وہ طریقہ بھی طے ہوگیا جس پر عمل کرکے انہوں نے بابرہ سے رابطہ کرنا تھا اور اسے مقابلے کی جگہ پر اپنے ساتھ لے جانا تھا۔

وہ ایک ساتھ ہی اس سے ملے تھے اور اسے اپنے ساتھ ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں لنچ کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ وہ تینوں جب گاڑی میں ہوٹل کی طرف جارہے تھے، جمیل نے پروگرام کے مطابق اچانک ہی بابرہ کے چہرے کے سامنے بے ہوشی والا اسپرے کردیا تھا۔ وہ چکرا کر نشست پر گری اور چند سیکنڈ میں بے ہوش ہوگئی تھی۔

اور اب وہ تینوں ہوانا سے قریباً سو کلومیٹر دور اس چھوٹے سے گمنام جزیرے پر موجود تھے۔ یہ بالکل ... بے آباد جزیرہ تھا۔ یہاں دوسری جنگِ عظیم کی چند فوجی بیرکوں کے کھنڈروں کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ شاید ہی کبھی دو چار ماہ بعد کوئی مہم جو اس طرف آتا ہو۔ بہرحال جمی اور ناب یہاں تہی دست نہیں تھے۔ وہ اپنے ساتھ کھانے پینے اور رہنے سہنے کا وافر سامان لے کر آئے تھے جس میں ایک لگژری خیمہ بھی شامل تھا۔ اپنی موٹر بوٹ انہوں نے ساحل کے گھنے درختوں میں چھپا دی تھی۔ جسمانی طاقت کی اس جنگ میں دونوں میں سے جس نے بھی جیتنا تھا، اس نے یہاں بابرہ کے ساتھ اپنی فتح کا جشن منانا تھا۔ یہاں اتنا سامان موجود تھا کہ وہ کم از کم دو ماہ تک یہاں دادِ عیش دے سکتا تھا۔ اب یہ دادِ عیش کون دے گا، اس کا فیصلہ اس لڑائی کے بعد ہونا تھا۔ بابرہ نے اس سارے معاملے میں خود کو بالکل نیوٹرل ظاہر کردیا تھا۔ وہ یہ خونی لڑائی نہیں چاہتی تھی لیکن یہاں کچھ بھی اس کی مرضی کے مطابق نہیں ہو رہا تھا۔ ایک طویل بحث کے بعد اس نے اس بات پر آمادگی ظاہر کردی تھی کہ ان دونوں میں سے جو بھی جیت گیا، وہ یہاں اس کے ساتھ رہنا قبول کرلے گی۔

اب ہم ایک بار پھر خیمے کے سامنے کے منظر کی طرف آتے ہیں۔ جمی نے ناب کی توانا گردن اپنے بازو میں جکڑ رکھی تھی، ناب اس کے نیچے رکوع کے بل جھکا ہوا تھا تاہم اس طرح جھکے جھکے بھی اس نے جمی کی کمر کے گرد اپنے مضبوط بازوؤں کا شکنجہ کسا ہوا تھا۔ اگر جمی اس کی گردن پر دباؤ بڑھا کر اسے بے بس کرنے کی کوشش کرتا تو وہ نیچے سے اس کی کمر کو اس بری طرح جھٹکے دیتا کہ وہ گردن پر گرفت نرم کرنے پر مجبور ہوجاتا تھا۔ دونوں پسینے میں نہائے تھے اور بری طرح ہانپ رہے تھے۔ بابرہ خیمے میں بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔ وہ بالکل خالی ہاتھ تھی۔ فی الوقت خیمے میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں تھی جسے وہ کسی بھی طرح کسی پر حملہ کرنے کے لیے یا پھر اپنا دفاع کرنے کے لیے استعمال کرسکتی۔ وہ دونوں جو ساز و سامان بھی اپنے ساتھ لائے تھے، اس وقت

موٹر بوٹ میں پڑا تھا جو یہاں سے کافی فاصلے پر تھی۔ موٹر بوٹ پر فرار ہونے کا امکان بھی بعید از قیاس تھا۔ وہ موٹر بوٹ کی الف ب سے بھی واقف نہیں تھی۔ درحقیقت وہ یہاں مکمل طور پر ان دونوں کے رحم و کرم پر تھی...... وہ دونوں میں سے کسی کی طرف دار بھی نہیں تھی۔ دونوں جو کچھ کر رہے تھے، برا کر رہے تھے۔ وہ تو بس یہ چاہتی تھی کہ یہ لڑائی جلد از جلد ختم ہو جائے۔

اچانک ناب کا داؤ چل گیا۔ اس نے یکایک جمی کی کمر پر اتنا شدید دباؤ ڈالا کہ اس کی گردن پر جمی کی گرفت نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ ناب نے زور مارا اور کسی بھینسے کی طرح جمی کو دھکیلتا ہوا خیمے سے ٹکرایا۔ خیمہ زمیں بوس ہو گیا۔ بابرہ خوف سے چلاتی ہوئی باہر نکلی اور دور جا کھڑی ہوئی۔ اب جمی، ناب کے نیچے تھا اور وہ اپنے گھونسوں سے اس کے چہرے کا بھرتا بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد جمی نے تیزی سے پینترا بدلا اور ناب کی گرفت سے نکل گیا۔ دونوں ایک بار پھر کھڑے ہو گئے۔ دونوں کے چہرا خون سے لتھڑ گئے تھے۔ جمی کی ناک پر زیادہ چوٹ آئی تھی، تاہم کسی ضرب کی وجہ سے ناب کی ناک بھی سوج گئی تھی اور معمول سے زیادہ موٹی دکھائی دینے لگی تھی۔ اس کا جبڑا قدرے چوڑا تھا اور اس کے نقوش کی سختی کو نمایاں کرتا تھا۔ یہ جبڑا ابھی ٹھوڑی کے پاس سے زخمی ہو گیا تھا۔

دونوں نے ایک بار پھر اپنے بازو پھیلا لیے اور ایک دوسرے کے گرد نیم دائرے کی شکل میں گھومنے لگے۔ دونوں ہوانا کے گلی کوچوں سے جانے پہچانے فائٹر تھے۔ کوئی بھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ ان دونوں نے قریباً پانچ منٹ مزید فائٹ کی جس نے انہیں کچھ مزید زخمی اور نڈھال کیا۔ یہاں تو کوئی ریفری بھی نہیں تھا جو اس لڑائی میں وقفہ دیتا یا راؤنڈ ختم ہونے کا اعلان کرتا۔

انہوں نے اپنی مدد آپ کے تحت ہی ایک وقفہ لیا اور ایک دوسرے سے قریباً تیس فٹ کی دوری پر بیٹھ کر ہانپنے لگے۔ بالکل جیسے دو چوپائے اپنی مادہ کے لیے جنگ لڑتے لڑتے بالکل نڈھال ہو جائیں اور ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو کر ہانپنے لگیں۔

جمی کا بس نہیں چل رہا تھا، ورنہ وہ خالی ہاتھوں سے ہی ناب کا پیٹ پھاڑ ڈالتا اور اس کی انتڑیاں ہوا میں اچھال دیتا۔ لڑائی کے اصولوں کے مطابق وہ دونوں کوئی ہتھیار استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ ہتھیار ان دونوں کے پاس تھا ہی نہیں۔ وہ اپنے سامان میں بھی کسی طرح کا ہتھیار لے کر نہیں آئے

سنہری باتیں

☆ گناہ سے ہر وقت بچو، مگر تنہائی میں گناہ سے خاص طور پر بچو کیونکہ اس گناہ کا گواہ خود اللہ تعالیٰ ہوتا ہے۔

☆ اپنی زبان کی تیزی اس ماں پر مت آزماؤ جسے تمہیں بولنا سکھایا۔

☆ لفظ انسان کے غلام ہوتے ہیں مگر بولنے سے پہلے۔ بولنے کے بعد انسان اپنے لفظوں کا غلام بن جاتا ہے۔

☆ کوشش کرو کہ تم دنیا میں رہو، دنیا تم میں نہ رہے کیونکہ کشتی جب تک پانی میں رہتی ہے تیرتی رہتی ہے لیکن جب پانی کشتی میں آ جاتا ہے تو وہ ڈوب جاتی ہے۔

☆ اگر کوئی محبت کرنے والا انسان آپ پر غصہ کرنا چھوڑ دے۔ تو سمجھ لو کہ آپ اس کی نظر میں اپنی اہمیت کھو چکے ہیں۔

☆ اگر لوگ تم سے متاثر ہو رہے ہوں تو تکبر نہ کرو شکر ادا کرو، اپنے رب کا جس نے تمہارے عیب چھپا کر تمہیں لوگوں میں معزز بنا رکھا ہے۔

☆ ہم یہ کبھی نہیں جان پاتے کہ ہم کسی سے عام لوگوں کی نسبت زیادہ کس لیے وابستہ ہو جاتے ہیں بغیر کسی وجہ کے لوگوں سے کیوں پیار کرنے لگتے ہیں، ہم ان کی موجودگی میں خوش اور ان کی غیر حاضری میں اداس کیوں ہو جاتے ہیں۔ شاید کچھ رشتے وضاحت طلب نہیں ہوتے۔

مرسلہ: اختر شاہ عارف، ڈھوک جمعہ، جہلم

آپ کا نام کیا رکھوں؟

پھول رکھوں تو بکھر جاؤ گے، دل کہوں تو ٹوٹ جاؤ گے، جان کہوں تو نکل جاؤ گے، چلو تمہارا نام لوڈشیڈنگ رکھتے ہیں، جاؤ گے تو 2 گھنٹے بعد خود ہی واپس آ ؤ گے۔

مرسلہ رضوان تنولی کریڑوی، اورنگی ٹاؤن کراچی۔

تھے۔ یہ لڑائی انہوں نے UFC کے کھیل کی طرح خالی ہاتھ لڑنا تھی۔ آخر میں دونوں میں سے کسی ایک کو مکمل ناک آؤٹ ہو جانا تھا یا پھر کسی خطرناک داؤ میں پھنسنے کے بعد اس بات کا اشارہ دینا تھا کہ وہ اپنی جان بچانے کے لیے یہ مقابلہ ختم کرنا چاہتا ہے۔ یہ اشارہ ہاتھ وغیرہ ہلا کر یا پھر بول کر دیا جاسکتا تھا۔ ہارنے والے کو خاموشی کے ساتھ یہ جگہ چھوڑ جانا تھی اور پھر پلٹ کر اس طرف نہیں دیکھنا تھا۔ جیتنے والے کو یہاں بابرہ کے ساتھ عیش و آرام سے، چند ہفتے گزارنا تھے۔

سوچتے سوچتے جمی نے گرے ہوئے خیمے کی طرف دیکھا۔ وہاں بابرہ دوزانو بیٹھی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنے چہرے کے سامنے رکھے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ دعائیہ انداز میں کچھ بول رہی تھی۔ جمی نے سوچا، وہ کیا دعا مانگ رہی ہوگی۔ شاید یہ مانگ رہی ہوگی کہ لڑتے لڑتے وہ دونوں ہی مرجائیں یا نیم جان ہو جائیں اور وہ کسی طرح یہاں سے نکل جائے یا شاید وہ اس لڑائی میں خود اس کے جیتنے کی دعا مانگ رہی ہو۔ بے شک وہ اور ناب ہر لحاظ سے بالکل ایک جیسے تھے۔ حتیٰ کہ شکل و صورت کے اعتبار سے بھی وہ ہم پلّہ ہی تھے۔ بہرحال جمی کے نقوش تھوڑے سے تیکھے تھے۔ ناب کے نقوش قدرے موٹے اور سخت تھے اور ان میں مردانگی کی جھلک نسبتاً زیادہ تھی۔ ممکن تھا کہ اس حوالے سے بابرہ اسے ناب پر تھوڑی سی ترجیح دیتی اور ناب کے بجائے اس کے ساتھ رہنا پسند کرتی۔

دوسری طرف ناب بھی دیکھ رہا تھا کہ بابرہ نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں اور دعائیہ انداز میں بڑبڑا رہی ہے۔ وہ کیا دعا مانگ رہی تھی؟ شاید یہ کہ ان دونوں کے ہوش ٹھکانے آجائیں اور وہ اس خون خرابے سے رک جائیں یا شاید وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کے لیے کامیابی کی دعا مانگ رہی تھی۔ گاڑی میں جب انہوں نے بابرہ کو بے ہوش کیا تھا تو اسپرے کا لیف جمی نے ہی بابرہ کے منہ پر مارا تھا۔ یقینی بات تھی کہ بابرہ کو یہ واقعہ یاد ہوگا۔ یہ واقعہ اس کے لیے ناب کے انتخاب کا تھوڑا سا جواز پیدا کرسکتا تھا۔ بہرحال وہ یہ بھی جانتا تھا کہ بابرہ دونوں میں سے کسی کے ساتھ بھی یہاں رہنے کے لیے تیار ہے۔

چند منٹ بعد جمی اپنی جگہ سے اٹھا تو ناب نے بھی فوراً اٹھ جانا مناسب سمجھا۔ اگر وہ بیٹھا رہتا تو جمی کو یہی تاثر ملتا کہ وہ ابھی تک ہانپا ہوا ہے۔ جمی نے کھڑے ہونے کے بعد بڑی نفرت سے زمین پر تھوکا اور پھر اپنی دائیں ہتھیلی کو آسمان کی طرف اٹھا کر انگلیوں کے اشارے سے ناب کو اپنے قریب آنے کے لیے کہا۔ یہ تاؤ دلانے والا انداز تھا اور دوبارہ مقابلے کی دعوت تھی۔

ناب بھی اب قدرے تازہ دم ہو چکا تھا۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا جمی کی طرف آیا۔ ناب کو معلوم تھا کہ اسے جمی کو کہاں ضرب لگانی چاہیے۔ وہ جانتا تھا کہ ایک پرانی لڑائی میں جمی کے دائیں گھٹنے پر شدید چوٹ آئی تھی اور وہ اب بھی اس ٹانگ کا بھرپور استعمال نہیں کر پارہا۔ اگر وہ اس کے گھٹنے کو مزید نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو جاتا تو لڑائی کا نتیجہ اس کے حق میں نکل سکتا تھا۔ دوسری طرف جمی بھی جانتا تھا کہ اس نے ہر صورت ناب کے دائیں مکے سے بچنا ہے۔ یوں تو دونوں مارشل آرٹ کی شدبد رکھتے تھے، بہرحال ناب کو خاص طور سے باکسنگ سے دلچسپی تھی۔ اس نے اپنے دائیں ہاتھ کے طوفانی گھونسے سے ہوانا کے کئی غنڈوں کو خاک چٹوائی تھی......

ایک بار پھر دونوں میں زوردار لڑائی شروع ہوگئی۔

دو تین منٹ بعد ہی جمی نے اچانک اڑنگا لگا کر ناب کو پشت کے بل ریت پر گرالیا اور اس کو چھاپ لیا۔ ناب کے چوڑے جبڑے پر بے تحاشا گھونسے برساتے ہوئے وہ بولا۔ ”باسٹرڈ! ایک لاکھ لڑکیاں تھیں ہوانا میں۔ تجھے بس یہی نظر آتی رہی...... یہی نظر آتی رہی۔“

ناب نے اس زہریلی بات کا جواب عملی طور پر دیا۔ اس نے اچانک ہی پلٹی کھائی اور پھر زور لگا کر خود کو جمی کے نیچے سے نکال لیا۔ ایک چنگھاڑ کے ساتھ اس نے جمی کی ناف میں ٹانگ رسید کی اور یہیں پر اسے وہ موقع بھی مل گیا جسے وہ دیر سے تلاش کر رہا تھا۔ ناف پر ضرب کھا کر جیسل عرف جمی آگے جھکا اور اپنے چہرے کا دفاع بھول گیا۔ ناب کا نہایت خطرناک دایاں گھونسا اس کے منہ پر پڑا اور اس کی آنکھوں میں رنگ برنگے ستارے ناچ گئے۔ وہ سہارے کے لیے ہاتھ پاؤں چلاتا نیم گرم ریت پر گرا۔ اس کے کانوں میں اپنی ناک کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز آئی تھی۔ نبیل یعنی ناب جمپ کرنے والے انداز میں اس کی طرف آیا اور ایک اور گھونسا اس کے جبڑے پر مارا۔ اس گھونسے نے جمی کی رہی سہی مدافعت بھی ختم کردی۔ وہ بے ہوش ہوگیا لیکن ناب نے یہیں پر بس نہیں کیا۔ وہ مسلسل اس کے منہ پر اپنے گھونسوں کے ہتھوڑے برساتا رہا...... اور اپنی پوری تسلی کی کہ اب وہ قطعی طور پر مزاحمت کے قابل نہیں ہے۔

جمی کا چہرہ خون سے رنگین ہو چکا تھا۔ وہ بے سدھ پڑا تھا۔ بے شک، اس نے زبردست مقابلہ کیا تھا لیکن کچھ بھی تھا، دونوں میں سے کسی ایک نے ہی جیتنا تھا اور یہ جیت

ناب کے حصے میں آئی تھی۔ ناب نے نفرت سے جمی کے جسم پر تھوکا۔ پھر وہ ڈگمگاتا ہوا خیمے کی طرف آیا۔ سکتہ زدہ بابرہ کے قریب ہی نائلون کی ایک رسی پڑی تھی۔ وہ اسے لے کر دوبارہ جمی کی طرف بڑھا۔ اس نے احتیاط کے طور پر جمی کے بازو اور ٹانگیں رسی کی بندش میں جکڑ دیں۔

☆☆☆

یہ فتح کی شام تھی۔ اس شام سے آگے ایک پُرلطف رنگین شب ناب کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے بابرہ کے ساتھ مل کر گرا ہوا خیمہ دوبارہ کھڑا کر دیا تھا۔ وہ موٹر بوٹ میں سے کھانے پینے کے وافر سامان کے علاوہ مرہم پٹی کی اشیا بھی لے آیا تھا۔ اس نے اپنی چوٹوں پر خود ہی بینڈیج وغیرہ کی تھی۔ کسی دردکش دوا کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ تیز وھسکی نے اس کے رگ و پے میں سرور بھر دیا اور اس کی ہر جسمانی تکلیف کو پس منظر میں دھکیل دیا۔ ہوا نیم گرم اور خوشگوار تھی۔ خیمے سے پندرہ بیس میٹر کی دوری پر جمی ابھی تک بے سدھ پڑا تھا۔ اس کی گہری بے ہوشی اب نیم بے ہوشی میں بدل چکی تھی اور کبھی کبھی اس کی مدھم کراہ بھی سنائی دے جاتی تھی۔ اس کا چہرہ اسی طرح خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ ناب کو امید تھی کہ وہ صبح تک مکمل ہوش میں آجائے گا اور ...... پروگرام کے مطابق عمل کرتے ہوئے جزیرے سے نکل جائے گا۔ اگر وہ نہ بھی نکلتا تو ناب اب اس قابل تھا کہ اس کی ایک آدھ مزید ہڈی توڑ کر اسے یہاں سے چلتا کرتا۔

ناب ایک کشن سے ٹیک لگا کر خیمے میں نیم دراز ہو گیا۔ بابرہ نے اسے وھسکی کا گلاس پیش کیا۔ ناب کی ہدایت کے مطابق اب اس نے ایک مختصر لباس پہن لیا تھا۔ اس لباس میں وہ ہمیشہ سے زیادہ خوب صورت نظر آرہی تھی یا شاید اس کی وجہ وہ وھسکی تھی جو ناب کے اندر مسلسل آتش جگا رہی تھی۔ خوش اندام بابرہ کے علاوہ بھی اسے اردگرد کی ہر شے خوب صورت نظر آنے لگی تھی۔

''مجھے ایک بات بتاؤ ہنی۔'' ناب نے بابرہ کے بالوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔

''کیا؟'' اس نے ناب کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

''جب ہم لڑ رہے تھے، میں نے تمہیں دعا مانگتے ہوئے دیکھا تھا۔ مجھے سچ سچ بتانا ہنی ...... میں تمہیں ایک سو ایک فیصد گارنٹی دیتا ہوں کہ تمہارا جواب جو بھی ہوگا، میں اس پر کسی طرح کی ناراضی ظاہر نہیں کروں گا۔ نہ اب، نہ پھر بھی ...... مجھے بتاؤ کہ تم نے کیا ''پرے'' کی تھی؟''

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر براہِ راست ناب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا واقعی تم سچ سننا چاہتے ہو؟''

''ہاں، میں سچ سننا چاہتا ہوں۔''

وہ دھیرے سے مسکرائی اور گہری سانس لے کر بولی۔

''میں وہی کہہ رہی ہوں جو میرے دل میں تھا۔ میں نے وہ دعا تمہارے لیے مانگی تھی ...... تمہاری جیت کے لیے۔''

ناب کے سینے میں خوشگوار اور پُرجوش دھڑکنیں جاگ گئیں۔ وہ مسکرایا۔ ''کیوں ہنی؟''

بابرہ نے جوس کا گھونٹ بھر کر کہا۔ ''سچی بات یہ ہے کہ کوئی خاص وجہ تو نہیں تھی۔ تم دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا خاصا مشکل کام ہے۔ بس پتا نہیں کیوں میرے دل میں آئی اور میں نے تمہارے حق میں دعا مانگی۔ شاید ایسی کسی لڑائی کو دیکھتے ہوئے بالکل غیر جانبدار رہنا کافی مشکل ہوتا ہے۔ دیکھنے والے کا پلڑا کسی طرف تو تھوڑا بہت جھکتا ہی ہے۔''

''یعنی مجھے کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے۔''

وہ ہنسی اور ٹینٹ لیمپ کی روشنی میں اس کے دانت کلیوں کی طرح دمک اٹھے۔

ناب نے پُرجوش انداز میں اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ وہ اس کے حسین چہرے کے نشیب و فراز میں گم ہونے لگا۔ اگر وہ سچ کہہ رہی تھی، تو بھی بڑی بات تھی کہ کوئی خاص وجہ نہ ہونے کے باوجود اس نے اسے جمی پر ترجیح دی تھی۔

بابرہ کو اپنی بانہوں میں لے کر ناب بہت خوش تھا۔ وہ اس کی رگِ جاں میں اترتی جا رہی تھی۔ نشے نے اس کے قرب کے سرور کو دوآتشہ کر دیا۔ ان کی نزدیکی بڑھتی چلی گئی۔ بابرہ اس پر ہر طرح مہربان نظر آتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس کے سر کے پچھلے حصے پر کسی وزنی چیز سے اچانک شدید ضرب لگائی گئی تو وہ ششدر رہ گیا۔ یہ چوٹ بابرہ کے علاوہ اور کون لگا سکتا تھا۔

'یہ کیا ہوا؟' اس نے سوچا اور اس کا ذہن اتھاہ تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

اسے دوبارہ ہوش آیا تو وہ اسی خیمے میں چت پڑا تھا۔ اسے اندازہ ہوا کہ وہ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد ہوش میں آیا ہے۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو اسے پتا چلا کہ اس کے ہاتھ ہی نہیں دونوں پاؤں بھی نائلون کی رسی سے جکڑے ہوئے ہیں۔ وہ اٹھ نہیں سکا۔ تب اس نے جمی کو دیکھا۔ وہ بھی خیمے کے اندر ہی موجود تھا۔ وہ بھی لیٹا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اب آزاد تھے۔ غالباً جو رسی کھولی گئی تھی، اسی سے اب ناب

کے ہاتھ پاؤں باندھے گئے تھے۔ بابرہ اب پھر لمبی قمیص اور جینز میں نظر آرہی تھی۔ وہ جمی پر جھکی ہوئی تھی اور اس کی پیشانی اور ناک پر پٹی باندھ رہی تھی۔ جمی کے ہونٹ کافی سوج چکے تھے۔ اس کی ایک آنکھ بھی گہری نیلی نظر آرہی تھی۔ وہ خاموش لیٹا تھا۔

''یہ سب کیا ہے؟ مجھے کیوں باندھا ہے تم نے؟ یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ؟'' ناب چلایا۔

بابرہ اور جمی نے اس کی طرف مطلق توجہ نہیں دی۔ جمی کی پیشانی پر پٹی باندھنے کے بعد بابرہ نے اسے تھوڑا سا پانی پلایا اور کمبل اس کی پنڈلیوں سے اٹھا کر سینے تک کھینچ دیا۔

ناب نے اپنی بندشوں سے زور آزمائی کی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئیں۔ اسے بے حد مہارت اور مضبوطی سے باندھا گیا تھا۔

جمی سے فارغ ہونے کے بعد بابرہ، ناب کی طرف آئی اور اس کے قریب ہی آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ ناب نے دیکھا بابرہ کے پاس ہی وہ چھوٹی ہتھوڑی پڑی تھی جو خیمے کی میخیں وغیرہ ٹھونکنے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ یقیناً بابرہ نے اسی ہتھوڑی کی مدد سے ناب کے سر کے پچھلے حصے پر ضرب لگائی تھی۔ ایسا کیوں کیا اس نے......؟ یہ سوال ایک پُرہول گونج کی طرح اس کی سماعت میں چکرا رہا تھا۔ پھر یہ سوال اس کی زبان پر بھی آگیا۔ اس نے بابرہ سے پوچھا۔

''تم نے تو کچھ اور کہا تھا۔ تم نے کہا تھا، تم میری جیت چاہتی تھیں، تم نے میرے لیے دعا مانگی تھی۔''

وہ عجب انداز سے مسکرائی۔ ''میں نے جھوٹ نہیں بولا۔ میں نے تمہاری جیت کی ہی خواہش کی تھی۔''

''تو پھر جمی آزاد کیوں ہے اور اس کی جگہ میں یہاں کیوں بندھا ہوا ہوں؟''

''اس لیے کہ تم جیت گئے ہو۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''کیا نہیں سمجھے؟''

ناب نے ایک طویل سانس لی اور بولا۔ ''جب کسی عورت کے لیے دو مردوں کے درمیان لڑائی ہوتی ہے تو جیتنے والا ہی عورت کا حق دار ٹھہرتا ہے۔ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔''

''ہمیشہ سے ایسا ہوتا آیا ہوگا لیکن اب وقت بدل چکا ہے...... اور وقت کے ساتھ شاید عورت بھی بدل چکی ہے۔ یہ اکیسویں صدی ہے مسٹر ناب!'' بابرہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

ناب نے ایک بار پھر بندشوں سے آزاد ہونے کے لیے زور لگایا اور ناکام ہونے کے بعد پھنکارا۔ ''تم پہیلیاں نہ بجھواؤ۔ صاف بتاؤ کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میں اکیسویں صدی کی عورت ہوں۔ میں اس ''سوکالڈ'' سوئمبر میں جیتنے والے کو اپنا آپ نہیں سونپوں گی...... اور یہ فیصلہ میں نے تم دونوں کی لڑائی شروع ہونے سے پہلے ہی کر لیا تھا۔ میں گائے بکری نہیں ہوں۔ میں خود کو جیت کا تحفہ کیوں بناؤں؟ کیوں نہ میں خود کسی کو جیتوں اور میں اس لڑائی میں جیتنے والے کو تو جیت نہیں سکتی تھی کیونکہ اس نے تو پہلے ہی فاتح بن کر میرے پاس آنا تھا۔ میں ہارنے والے کو جیت سکتی تھی اور ہارنے والا جمی تھا۔ وہ تمہارے سامنے بے بس ہو چکا تھا اور میں نے وہی کیا جو میرے حق میں بہتر تھا۔ اب جو کچھ ہوگا، اس میں کم از کم میرا بھی ایک کردار ہوگا۔ میری بھی حیثیت ہوگی۔''

ناب کی آنکھوں میں حیرت کا دریا بہنے لگا...... وہ کچھ دیر گہری سوچ میں رہنے کے بعد شکستہ لہجے میں بولا۔ ''تو...... اس کا مطلب ہے، تم نے میرے لیے جیت کی خواہش اس لیے کی...... کیونکہ تم...... جمی کے ساتھ رہنا چاہ رہی تھیں؟''

''نہیں، یہ میرے لیے زیادہ اہم نہیں تھا۔ میں نے اب تک صاف گوئی سے کام لیا ہے، اب بھی صاف گوئی سے کام لوں گی۔ میرے لیے تم دونوں ایک جیسے ہی تھے۔ میں کسی کے ساتھ بھی رہ سکتی تھی۔ بس مجھے جمی، تم سے تھوڑا سا کم کرخت نظر آیا، اس لیے میں نے تمہاری جیت کے حق میں دعا مانگی۔''

ناب ہونقوں کی طرح منہ کھولے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اکیسویں صدی کی ناقابلِ فہم عورت اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے ہارنے والے کو فاتح بنایا تھا۔

اگلے روز دوپہر کے وقت جمی اور بابرہ جزیرے سے رخصت ہو رہے تھے۔ زیادہ خون بہہ جانے سے جمی بہت کمزور دکھائی دے رہا تھا۔ بابرہ نے اسے زخمی ٹانگ کی طرف سے سہارا دے رکھا تھا۔ وہ موٹر بوٹ کی طرف بڑھے تو بابرہ نے چند لمحے رک کر ناب کی طرف دیکھا۔ وہ پندرہ بیس قدم چل کر واپس ناب کی طرف آئی اور سرگوشی میں بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ دو تین گھنٹوں میں تم اپنی رسیاں کھولنے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ قریباً دو مہینے کا راشن ہے تمہارے پاس۔ یقینی بات ہے کہ اس دوران میں کوئی نہ کوئی سیلانی اس طرف آنکلے گا اور تمہیں یہاں سے نکال لے گا۔ ہم دونوں کیوبا سے جا رہے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ تم ہمیں ڈھونڈنے میں وقت برباد نہیں کرو گے...... خدا حافظ۔''

سودائے جنوں

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

تیسرا حصا

عرصۂ دراز سے صیہونی قوتیں امتِ مسلمہ کے عزم و حوصلے کو سبوتاژ کرنے کی سازشوں میں مصروفِ عمل ہیں۔ اس ربِّ کائنات کا بھی کیسا انوکھا انصاف ہے۔ ہر دور میں فرعون پیدا کرتا ہے اور ہر دور کا موسیٰ بھی الگ بناتا ہے جو انہی کے درمیان رہ کر پرورش پاتا ہے اور فرعونی طاقتوں سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ آج بین الاقوامی منظرنامہ جو داستان دل گیر سناتا ہے اس نے تمام عالمِ اسلام میں دکھ کی ایک لہر پیدا کی ہوئی ہے۔ حساس دلوں میں آج بھی ارضِ مقدس میں صیہونی یلغار ان کی چیرہ دستیوں کے خلاف نفرت و غیظ کی آگ بھری ہوئی ہے کیونکہ غاصب یہودیوں نے مسجد اقصیٰ کو نذرِ آتش کرکے ہیکلِ سلیمانی تعمیر کرنے کی مذموم اور ناپاک سازش تیار کی تھی... جسے روکنے کے جرم میں اسرائیلی فوجیوں نے نادار اور مجبور فلسطینی عوام کو اپنی چنگیزیت اور بربریت کا نشانہ بنانا شروع کیا اور فلسطینی بستیوں میں خون کی ہولی کھیلی۔ اسرائیلی سازشوں کے تانے بانے کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ آج بھی موت وہاں گلی گلی دروازوں پر دستک دیتی گھوم رہی ہے لیکن... آج بھی کچھ پاگل لوگ عصمتوں کے محافظ بنے ایک سودائے جنوں میں مبتلا ہیں...

اب اس بازی کا انجام...

اجلی رنگت اور مکروہ چہروں والی شیطانی قوتوں کی بربریت کا لرزہ خیز منظر





دو وردی پوش آفیسرز جن میں ایک خاتون بھی تھی، نائمہ سے مخاطب تھے۔ اس کا بیگ سائنر مشین پر چیک ہو رہا تھا۔ ادھر انکلوژر کے گیٹ کے عقب سے عابد شمشیری کی نظریں نائمہ پر لگی ہوئی تھیں۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ کسی بھی وقت کوئی اعصاب شکن صورت حال پیدا ہوسکتی تھی...... جس کے ''نہ ہونے'' کی عابد دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا۔

ذرا دیر بعد نائمہ کو بھی کلیئر کر کے آگے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ عابد کا دل یکبارگی مسرت سے دھڑکا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ نائمہ کو آگے جانے کی اجازت مل گئی تھی...... مگر پھر دوسرے ہی لمحے جیسے اس کی ساری مسرت غارت ہوگئی اور اس کا دل گھٹ کر رہ گیا۔ یہاں تک کہ اس کی سانسیں بھی سینے میں اٹک کر رہ گئیں۔

قریب کھڑے دو افراد میں سے ایک نے آگے انکلوژر کے گیٹ کی طرف بڑھتی نائمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خاتون آفیسر سے کچھ کہا تھا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس نے بلند آواز میں نائمہ کو رکنے کا کہا اور پھر اشارے سے اسے واپس پلٹنے کا حکم ملا۔ عابد کا دل جیسے یکلخت کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ واپسی کے بلاوے پر نائمہ کے چہرے پر جگمگاتی مسرت بھی تاریک پڑ گئی تھی۔ تاہم وہ پلٹی اور کاؤنٹر کی طرف دوبارہ آگئی۔

عابد شدید تذبذب کا شکار تھا۔ مذکورہ آدمی جس نے بلاوا دیا تھا، وہ یقیناً اسرائیلی سیکرٹ سروس سے تعلق رکھتا تھا۔ نائمہ کو اشارے سے اس نے ہی اپنی طرف بلایا تھا اور پھر وہ اسے اپنے ساتھ کہیں جانے کے لیے کہہ رہا تھا۔ نائمہ اس سے کسی بحث میں الجھ رہی تھی۔ صورت حال یکدم مخدوش ہوگئی تھی۔ عابد اگر اس نازک موقع پر نائمہ کی گلوخلاصی کے لیے آگے بڑھتا تو لامحالہ اس پر ''ساتھی'' ہونے کا شبہ کیا جاتا اور پھر کوئی بعید نہ تھا کہ وہ بھی دھرلیا جاتا۔

دونوں اہلکار نائمہ کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف بڑھے۔ ان کی مدد کو کوئی آگے نہیں بڑھا تھا جبکہ کپتان موسیٰ بھی ان کے لیے جتنا کرسکتا تھا، وہ اس نے کیا تھا۔ آگے یہ دونوں اپنی اپنی قسمت کے حوالے کردیے گئے تھے۔

• عابد کا رواں رواں مرتعش تھا۔ اس نے فوراً ایک فیصلہ کیا اور یونہی بظاہر بے پروائی سے دوبارہ چلتا ہوا کاؤنٹر کی طرف آیا۔ دونوں افسران اسے کچھ چبھتی ہوئی حیرت سے دیکھنے لگے۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

''ان خاتون کے پاس میرے کچھ ضروری کاغذات ہیں۔ وہ میں لینا چاہتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اس طرف اشارہ کیا تھا، جدھر وہ دونوں اسرائیلی اہلکار نائمہ کو لیے ایک کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔

''اس خاتون کو کسی شبے کی بنا پر انکوائری کے لیے لے جایا گیا ہے۔ تم اب اس سے نہیں مل سکتے۔''

مرد افسر نے قدرے گھور کر عابد سے کہا تو عابد لاابالی پن سے مسکرا کر بولا۔

''اس کی انکوائری ہوتی رہے، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ میں تو بس اس خاتون سے چند ضروری کاغذات لینا چاہتا ہوں...... جو بے ضرر ہیں ان کے لیے۔ مجھے یقین ہے انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ آپ سے میری ریکوئسٹ ہے...... پلیز۔''

''اپنی خیر مناؤ مسٹر! وہ دونوں معمولی آفیسر نہیں ہیں۔ انٹیلی جنس والے ہیں۔ تمہیں بھی دھرلیں گے۔'' کسٹم آفیسر نے طنزیہ لہجے میں کہا تو اس کی ساتھی عورت نے قدرے بیزاری سے اپنے ساتھی افسر سے کہا۔

''جوڈی! جانے دو اسے...... اگر وہ اسے دھرلیں گے تو ہمارا کیا جاتا ہے۔''

عابد کو اجازت مل گئی، وہ تیزی سے اس جانب بڑھا۔ کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اس نے اسے اندر دھکیلنا چاہا مگر وہ بند تھا۔ عابد نے ہولے سے دستک دی۔ اس نے اپنے دانت اس قدر زور سے بھینچ رکھے تھے کہ اس کے جبڑوں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں پھر جیسے ہی دروازہ کھلا، اسے انہی دو میں سے ایک آدمی نظر آیا۔ عابد نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اپنے دائیں ہاتھ کا گھونسا تان کر اس کی ناک پر جڑ دیا۔ وہ اس اچانک اور غیر متوقع حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ ''اوغ'' کی کراہ نما چیخ کے ساتھ وہ کئی قدم پیچھے کو لڑکھڑا کر اپنے دوسرے ساتھی سے ٹکرایا جو دوسری طرف منہ کیے نائمہ سے پوچھ تاچھ میں مصروف تھا۔ اپنے ساتھی کی ٹکر سے وہ بھی گڑبڑا گیا۔ عابد اسے بھی سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا اور جانتا تھا کہ یہ سب کچھ موثر انداز میں اور تیزی سے کرنے کا متقاضی تھا۔ لہٰذا اس نے دوسرے آدمی پر جھپٹا مارتے ہی پوری قوت سے اس کی پیشانی کمرے کی ٹھوس دیوار سے بجادی۔ دونوں آدمی نیم بے ہوش سے ہوگئے۔ نائمہ سراسیمہ تھی مگر عابد کو دیکھ کر اس کے چہرے پہ یکدم جوش کی سرخی عود کر آئی۔ عابد نے اسے رسی تلاش کرنے کو کہا اور خود بھی جلدی جلدی ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔ اسے تو

نہیں البتہ نائمہ کو ایک طرف پڑے تاروں کا گچھا نظر آ گیا۔ اس نے وہ اٹھایا اور عابد نے نائمہ کی مدد سے دونوں آدمیوں کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے باندھ دیے اور انہیں گھسیٹ کر واش روم میں لے جا کر بند کر دیا پھر نائمہ سے ہانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

''ہم دونوں ایک ساتھ باہر نکلیں گے تو کسی کو شبہ ہو جائے گا۔ پہلے میں نکلتا ہوں، اس کے چند منٹوں بعد ہی تم نکلنا۔'' نائمہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ عابد باہر نکلا اور... بہ ظاہر مطمئن انداز میں چلتا ہوا دوبارہ کاؤنٹر کی طرف آ گیا۔ دونوں کسٹم آفیسرز نے اسے روک لیا۔ عابد ایک آنکھ مار کر عامیانہ انداز میں بولا۔ ''میرا کام تو ہو گیا، اس لڑکی کا کام بھی ہو جائے گا۔ وہ اندر دونوں کو اپنے جسم کی رشوت دینے میں مصروف ہے۔''

دونوں افسر معنی خیز انداز میں مسکرائے اور اسے آگے جانے کی اجازت دے دی۔ عابد دھڑکتے دل کے ساتھ آگے بڑھ گیا اور نائمہ کے بھی جلد از جلد وہاں پہنچنے کی دعائیں مانگنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد نائمہ بھی اس کے ساتھ تھی، دونوں خوشی سے نہال تھے۔

چند لمحوں بعد دونوں کارگو شپ میں سوار ہو چکے تھے۔ شپ کے لنگرز اٹھائے جا چکے تھے۔ اس کے بھونپو نے سوگوار انداز میں بگل نے ایک بار ہنکارا...... اس کے بعد وہ کھلے پانیوں کی طرف بڑھنے لگا۔

کپتان موسیٰ نے ان دونوں کو اپنے کیبن میں ٹھہرایا تھا جس پر لگی گول شیشے والی کھڑکی سے دونوں حیفہ کی دور ہوتی بندرگاہ کی روشنیوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے دل اب بھی اس اندیشے پر دھڑک رہے تھے کہ اگر ان دونوں کسٹم آفیسرز نے کمرے میں جا کر دونوں اسرائیلی سیکرٹ سروسز کے اہلکاروں کو اس حالت میں دیکھ لیا تو معاملہ گڑبڑ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ بات انہوں نے جب کپتان موسیٰ کو بتائی تو اس کے چہرے پر بھی تشویش کے آثار نمودار ہو گئے۔ تاہم اس نے تسلی دی کہ اگر ایسا کچھ ہوا تو وہ صورتِ حال سے نمٹنے کی کوشش کرے گا.. وہ اب جہاز کی رفتار بڑھا رہا تھا۔

تاریک رات...... حدِ نگاہ تک پھیلے سمندر میں عجیب سی ہیبت ناکی طاری کیے ہوئے تھی۔ اندیشوں اور وسوسوں بھرا سفر جاری تھا کہ اچانک کپتان موسیٰ بوکھلایا ہوا۔ ان کے کیبن میں داخل ہوا اور بولا۔

''ایک ہیلی کاپٹر تیزی کے ساتھ ہمارے شپ کی طرف بڑھ رہا ہے اور ہمیں رکنے کا سگنل دے رہا ہے۔''

اس اطلاع پر عابد اور نائمہ دونوں کے چہرے دھواں دھواں ہو گئے۔

☆☆☆

مجاہدین کی طرف سے آنے والی نئی کمک شہید صادق الخیری اور شہید خلیل الوزیر کی حریت پسند تنظیموں غضب خدا اور پی فرنٹ سے تعلق رکھتی تھیں۔ ''غضب خدا'' کی کمانڈ اب یاسر العربی کے سپرد تھی جبکہ ''پی فرنٹ'' میں قائم مقام خالد بن جنید تھا۔ درحقیقت ''المجاہد'' کی زبیدہ قیصری نے اپنے گرینڈ پلان پر جانے سے پہلے بین التنظیمی قوانین کے مطابق ... غضب خدا اور پی فرنٹ کو اپنی مہم سے آگاہ کر دیا تھا۔

ارضِ فلسطین میں یوں تو بہت سی حریت پسند تنظیمیں ہیں، تاہم قابلِ ذکر پی فرنٹ، المجاہد اور پی ایل ایس او (فلسطین لبرل اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن) تھیں اور یہ کئی حوالوں اور ضابطوں کے تحت خلیل الوزیر ابو جہاد کی غضب خدا کے تابع تھیں اور وہیں سے انہیں اپنی اپنی آزادانہ کارروائیوں کے لیے متعین کر دیا گیا تھا اور مذکورہ حریت پسند تنظیموں کو اب یاسر العربی کے علم میں لائے بغیر یا اس سے اپنی آئندہ کی اسرائیل کے خلاف مجاہدانہ کارروائی کے لیے اجازت لینا پڑتی تھی۔ یوں تو یہ سب اپنی کارروائیوں کے لیے آزاد تھے مگر اس کا مقصد محض یہ ہوتا تھا کہ انہیں... بہ وقتِ ضرورت مدد چاہیے ہو تو وہ انہیں لبیک کہہ سکیں۔

بیت صفانہ میں بھی یہی ہوا تھا۔ غضب خدا اور پی فرنٹ کی کمک پہنچتے ہی اسرائیلی فوجیوں کو پسپا ہونا پڑا اور لیلیٰ آفندی زخمی باقر کو سہارا دیے بہ خیریت وسلامت...... المجاہد کے خفیہ ٹھکانے پہنچ گئی۔

وہاں باقر کی مرہم پٹی کی گئی۔ لیلیٰ نے باقر کی تیمارداری کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

انہیں اب اپنے ساتھیوں کی آمد کا انتظار تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ صحرائے نجف اور حیوتائی کی مہمات سے کتنے مجاہد ساتھی غازی بن کر کامیاب لوٹنے والے تھے اور کتنے جامِ شہادت نوش کر چکے تھے، وہ ان کی کامیابی کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی اور سلامتی کی بھی دعائیں مانگ رہے تھے جبکہ اپنے میزبان ساتھی عارف حبیبی کی موت کا انہیں دکھ ہوا تھا۔ بیتِ صفانہ پر اب پُرامن سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ یہاں مجاہدین نے دوبارہ اپنا قبضہ بھی جما لیا تھا۔ وقت گزرتا رہا اور جب زبیدہ لوٹی تو سب نے اس کا خیر مقدم کیا مگر زبیدہ کے چہرے پر مایوسی اور شکست خوردگی طاری رہی۔ لیلیٰ اور

باقر اس کی وجہ بھی سمجھتے تھے کہ باقی ساتھی کام آگئے تھے۔ محسن کے بارے میں باقر اور لیلیٰ نے سب سے پہلے پوچھا تھا جس پر زبیدہ نے یہی بتایا کہ وہ لاپتا تھا۔

اگلے چند گھنٹوں کے دوران زبیدہ ان کو اپنی تیونائی مہم کی ناکامی وغیرہ کے سلسلے میں تفصیلات بتا چکی تھی۔

''عزیزی زبیدہ! ہم نے آپ کے بنائے ہوئے گرینڈ پلان کے مطابق اپنا صحرائے نجف والا ہدف کامیابی سے پالیا تھا۔'' لیلیٰ نے زبیدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیونکہ ہم جانتے تھے کہ ہماری کامیاب مہم کا مطلب...... آپ کا تیونائی والا آپریشن کامیابی سے ہمکنار کرنا تھا۔''

''ہاں......'' زبیدہ نے ایک تھکی تھکی سی گہری سانس لے کر کہا۔ ''مجھے تمہاری مہم کی کامیابی پر خوشی ہوئی ہے لیکن افسوس کہ بدقسمتی سے ہماری متوقع مہم ناکامی سے دوچار ہوئی۔ اگرچہ اس میں ہمارے سارے مجاہد کام آگئے اور محسن بھی لاپتا ہے، جبکہ ڈیوڈ اسٹار کے ہیڈ کوارٹر میں ہمارا حملہ بھی ابتدائی مرحلے میں کامیاب رہا تھا، جس کے نتیجے میں ڈیوڈ اسٹار کے سربراہ جنرل آئزک فرناش کا نائب میجر ایہود شابک اور موساد کے ڈپٹی ایڈیشنل ڈائریکٹر اضحاق شامیر جہنم واصل ہو گئے تھے مگر ہم پھر بھی اپنے اہم ہدف کو کامیابی سے ہمکنار نہ کرسکے جس میں ہیڈ کوارٹر کی تباہی اور جنرل آئزک فرناش کے علاوہ موساد کا بارق شمعون شامل تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بروقت اسرائیلی فوجیوں کی کمک وہاں پہنچ گئی، وہ ہماری توقعات سے زیادہ مستعد ثابت ہوئے تھے یا پھر ہمارے اندر کوئی خامی رہ گئی تھی۔'' یہ بتاتے ہوئے زبیدہ کا چہرہ ایک بار پھر شکست خوردہ سا نظر آنے لگا۔ اس نے دیگر تفصیلات سے بھی PLSO کی لیلیٰ اور باقر کو آگاہ کردیا۔

ماحول میں چند لمحوں کے لیے افسردہ سی خاموشی طاری رہی اور پھر باقر نے ہی اس سکوت کو توڑا۔ ''مایوس ہونے کی ضرورت نہیں عزیزی زبیدہ! اس لیے کہ آپ کا مشن یوں بھی ہمارے مقابلے میں زیادہ خطرناک اور مشکل تھا۔ اسرائیل کے دو اہم یہودی شیطانوں ایہود شابک اور اضحاق شامیر کو جہنم واصل کرنا بھی معمولی بات نہیں۔ ہم اسرائیل کو اپنی اس تازہ مہمات سے کاری زخم لگا چکے ہیں جس کے باعث ہمارے حوصلے مزید بلند ہو گئے ہیں۔ انشاء اللہ جلد ہی ہم بڑے شیطان جنرل آئزک فرناش اور بارق شمعون کی شہ رگ تک بھی جا پہنچیں گے لیکن ہمیں اپنے ساتھی محسن کو ضرور تلاش کرنا چاہیے۔''

''مجھے باقر کی بات سے پورا اتفاق ہے...... عزیزی زبیدہ!'' لیلیٰ نے بھی فوراً اپنے ساتھی باقر کی تائید میں کہا۔ ''محسن ہمارے لیے ایک انتہائی تربیت یافتہ کمانڈر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی زندگی ہمارے لیے اسی طرح قیمتی ہے جس طرح آپ کی۔'' اس کی بات پر زبیدہ نے ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی، باقر پرجوش ہو کے بولا۔

''ہمیں فی الفور...... محسن کی تلاش کے لیے کوئی قدم اٹھانا ہوگا۔''

''اور میرا خیال ہے اس کے لیے جتنے کم افراد ہوں اتنا ہی بہتر ہوگا۔'' لیلیٰ بولی۔

زبیدہ نے دونوں دلیر مجاہدوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم دونوں محسن کی تلاش کا بیڑا اٹھاتے ہو؟''

دونوں نے فوراً مستعدی کے ساتھ اپنے سروں کو اثباتی جنبش دی۔ ٹھیک اسی وقت ایک نیم تاریک پتھریلے گوشے سے زبیدہ کا ایک ساتھی اپنے ہاتھ میں ریڈیو وائرلیس سیٹ لے کر نمودار ہوا۔ اس کے چہرے پر خاصی تشویش کے آثار تھے، وہ زبیدہ کو یہ تھماتے ہوئے جلدی سے مؤدبانہ بولا۔

''عزیزی زبیدہ! بی فرنٹ کے کمانڈر خالد بن جنید لائن پر ہیں اور آپ سے ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔''

اس کی بات پر زبیدہ چونکی۔ اس نے فوراً ہیڈ فون کانوں سے لگایا اور مائک پر رابطہ کیا۔ مختصراً اہلاً سہلاً کے بعد...... زبیدہ بڑے غور اور انہماک سے دوسری جانب کی باتیں سنتی رہی۔ لیلیٰ اور باقر کی نگاہیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ دونوں دیکھ رہے تھے کہ زبیدہ کا چہرہ جوش سے سرخ پڑتا جارہا تھا مگر ساتھ ہی اس کی کشادہ آنکھوں کی گہرائیوں میں کرب ناکی بھی ہلکورے لینے لگی تھی۔ کافی دیر تک دوسری جانب سے ساری گفتگو بغور سننے کے بعد جب اسے جواباً بولتے پایا تو اس کی آواز میں واضح طور پر ایک لرزش تھی۔

''از حد دکھ ہوا یہ سب سن کر...... یہ صیہونی اپنی ناکامی اور ہزیمت کا کوئی اظہار اس طرح بزدلانہ طریقے سے کرتے ہیں۔ اللہ پاک ارضِ فلسطین کے مظلوم عوام پر رحم فرمائے، آپ فکر نہ کریں عزیزم خالد! میں ابھی اور اسی وقت تل کرم پہنچتی ہوں...... اوور اینڈ آل۔''

بات ختم کرنے کے بعد باقر اور لیلیٰ نے مستفسرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ زبیدہ پُرتپش لہجے میں بولی۔

"ہماری مہمات کے جواب میں اسرائیلیوں نے غزہ اور دیگر فلسطینی عرب بستیوں میں قیامت ڈھا دی ہے۔ ساتھ ہی ایک... خفیہ میٹنگ یروشلم میں ہوئی ہے۔ مجھے ایک مہم پر قل کرم بلایا گیا ہے۔ جہاں غضب خدا کے یاسر العربی اور خالد بن جنید کے علاوہ دیگر اہم حریت پسند فلسطینی کمانڈر بھی موجود ہوں گے۔ مجھے قل کرم کے لیے اسی وقت نکلنا ہوگا۔"

"خدا غارت کرے ان یہودی ظالموں کو...... آپ اپنا خیال رکھیے گا، عزیزی زبیدہ! اور واپسی میں ہمیں آگاہ کیجیے گا کہ اس اہم کمانڈنگ میٹنگ میں مزید کیا ہدایات ملی ہیں؟" باقر نے زبیدہ سے کہا۔

"آپ اپنا خیال رکھیے گا عزیزی زبیدہ! یہودی کتے اس وقت ہم سب کی کونے کونے میں بو سونگھ رہے ہوں گے۔"

لیلیٰ نے بھی زبیدہ کے جوش سے تمتماتے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ پرعزم ہو کے بولی۔ "تم فکر نہ کرو، میں انشاء اللہ کامیابی کے ساتھ قل کرم پہنچ جاؤں گی۔ مجھے اسی وقت نکلنا ہے۔ عزیزی لیلیٰ! تمہیں PLSO کی لیڈر کی حیثیت سے میرے ساتھ چلنا ہوگا۔" اس کی بات پر لیلیٰ نے فوراً مستعدی کے ساتھ اثبات میں سر ہلا دیا۔

باقر کچھ بے چین سا نظر آنے لگا۔ اسے اپنے ساتھی محسن کی گمشدگی کی فکر ہو رہی تھی، بولا۔ "محسن کی تلاش کے سلسلے میں ہمیں اپنے کسی ساتھی کو تیونائی روانہ کرنا پڑے گا۔ کیا خبر وہ کسی مدد کا منتظر ہو؟"

اس کی بات پر زبیدہ نے اسے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔ "اللہ اسے اپنی امان میں رکھے۔ تمہاری اپنی طبیعت ٹھیک نہیں، تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ میں اور لیلیٰ قل کرم سے لوٹنے کے بعد اس بارے میں بھی سوچتے ہیں۔" محسن خاموش ہو گیا۔ زبیدہ اس کی بات کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ باقر خود محسن کی تلاش میں نکلنا چاہتا تھا مگر اس کی اپنی حالت اس قابل نہ تھی۔ اس لیے زبیدہ کو اسے یہ تسلی دینا پڑی تھی۔ لیلیٰ نے بھی حوصلہ افزا انداز میں مسکرا کر باقر کا کاندھا ہولے سے تھپتھپایا تھا۔

☆☆☆

ہوش آنے پر محسن کو ماحول میں نرماہٹ کا احساس ہوا۔ اس دلیر اور جری مجاہد نے اپنے عنفوانِ شباب سے لے کر اب تک اس قدر مصائب اور سخت کوشیاں جھیلی تھیں...... کہ اس کے لاشعور تک سے آرام اور سکون جیسے احساسات کا عادی ہونا کب کا رخصت ہو چکا تھا۔ یہی سبب تھا کہ نرم آرام دہ بستر اور پُرسکون خاموش ماحول نے اسے یکدم بے چین سا کر دیا۔ آنکھ کھلنے اور رفتہ رفتہ ذہنی طور پر بیدار ہونے تک وہ اپنی آنکھوں کو گردش دینے کے دوران اپنے قرب و جوار کا جائزہ لے چکا تھا۔

اس نے خود کو ایک پُرتزئین کمرے میں اور دیبا و حریر کے آرام دہ بستر پر پایا تھا۔ اس کے زخمی بازو اور ٹانگ پر مرہم پٹی بندھی ہوئی تھی۔ زخموں کی دکھن نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ جسمانی نقاہت بھی پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ مگر ان سب باتوں کے باوصف اس کے دل و دماغ کی بے چینی بجائے کم ہونے کے فزوں تر ہونے لگی۔ وہ کمرے میں اکیلا تھا۔ کھڑکیوں پر خوب صورت نقش و نگار والے حریری پردے جھول رہے تھے، باہر شاید دن کا اجالا پھیلا ہوا تھا مگر شاید دانستہ کھڑکیوں سے پردے نہیں سرکائے گئے تھے۔ البتہ کمرے میں ایک بلب روشن کر دیا گیا تھا جبکہ روزنوں سے سورج کی کرنیں اندر پہنچ رہی تھیں۔

محسن کچھ لمحے تو اسی طرح خالی الذہنی کی حالت میں پڑا رہا پھر اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ درد کا احساس ابھرا اور بے اختیار اس کے حلق سے کراہ خارج ہو گئی۔ وہ اسی طرح پڑا رہ گیا۔ اب اس میں دوبارہ اپنے مضروب وجود کو جنبش دینے کی سکت نہیں رہی تھی۔ اسے اب تک دھیرے دھیرے سب یاد آ گیا تھا۔ یہ بھی کہ آخر میں وہ...... بازغہ کے ہمراہ تھا، شدید زخمی ہونے کے باوجود وہ بازغہ سے ایک گن لانے کا کہہ رہا تھا جس سے وہ جنرل آئزک فرناش اور بارق شمعون کو موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا تھا۔ اسے کچھ پتا نہ تھا کہ مشن کا کیا بنا تھا۔ اسرائیلی فوجیوں کی تازہ کمک بھی ان پر ٹوٹ پڑی تھی۔ اسے اپنی ساتھیوں بالخصوص الجاہد کی لیڈر زبیدہ کی فکر و تشویش ہو رہی تھی۔ جانے ان کا کیا بنا تھا۔

"مجھے یہاں لایا کون ہے؟ کس نے میری مرہم پٹی کی ہے؟" وہ زیرلب بڑبڑایا۔ اسے حلق میں کانٹے چبھتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ جی چاہا کہ وہ کسی کو پکارے مگر کچھ سوچ کر وہ ایسا نہ کر سکا۔ آخری خیال اس کے ذہن میں یہی ابھرا تھا کہ اسے یہاں لانے والی شخصیت بازغہ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر ایسا تھا تو پھر وہ خود کہاں تھی اور یہ کون سی جگہ تھی؟ تب ہی اچانک اس کے پیروں کے رخ پر نظر آنے والے دروازے پر آہٹ ابھری اور پھر آہستگی کے ساتھ دروازہ کھلا۔ بازغہ اندر داخل ہوئی، وہ خاصی تھکی تھکی نظر آ رہی تھی مگر محسن کو ہوش میں آتے دیکھ کر اس کا کومل سا گلنار چہرہ یکدم کھل اٹھا۔

"ب...... بازغہ! یہاں آؤ...... میں کہاں ہوں؟ کون سی جگہ ہے یہ؟" محسن نے بے قراری سے پوچھا۔

بازغہ نرم مسکراہٹ کے ساتھ اس کے قریب آگئی اور سرہانے کے قریب بیٹھ کر ملائمت سے بولی۔

"تم یہاں ہو...... میرے گھر میں اور پریشان مت ہونا، تم یہاں محفوظ ہو۔ کیسی طبیعت ہے تمہاری اب؟" اس نے بڑے پیار سے اپنا نرم و نازک ہاتھ اس کی پیشانی پر پھیرتے ہوئے آخر میں پوچھا جبکہ اس کی بات پر محسن واقعی پریشان ہو گیا۔ یعنی وہ...... جس جگہ کو محفوظ کہہ رہی تھی، محسن کے لیے وہ اتنی ہی زیادہ خطرناک تھی۔ اس کے گھر سے مراد...... اس کے یہودی باپ...... کمشنر پیریز ناون کا گھر تھا جو اس کے خون کا پیاسا تھا۔

محسن نے بازغہ کے خود پر جھکے جھکے دلکش حسین چہرے کی طرف تکتے ہوئے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

"تت...... تم مجھے یہاں کیوں لائی ہو؟ یہ جاننے کے باوجود کہ تمہارا باپ، میرے خون کا کس قدر پیاسا ہو رہا ہے؟"

اس کی بات پر بازغہ حلاوت بھری محبت سے مسکرائی۔ "یہی تو میری چال تھی۔"

اس کی بات پر محسن دنگ کر رہ گیا مگر وہ اس کی بات کا اصل مطلب نہیں سمجھا۔ وہ اس کی پریشانی بھانپ کر ہولے سے ہنس پڑی۔ "مجھ پر بھروسا نہیں تمہیں کیا میں تمہاری دشمن ہوں؟" اس کے کہنے کی ادا بڑی دلفریب اور دل آرا تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو محسن اس نازک سی گڑیا جیسی دوشیزہ کی باتوں اور اداؤں سے شاید ضرور لطف اٹھاتا۔ وہ سرد مہری سے بولا۔

"مجھے بتاؤ جلدی...... آگے کیا ہوا تھا؟ میرے ساتھی کہاں ہیں؟ اور...... اور...... یہ مرہم پٹی......" حلق اور ہونٹ سوکھے پڑنے کے باعث وہ آگے بولنے سے قاصر ہی رہا۔ بازغہ نے اٹھ کر ایک ٹھنڈے پانی کا گلاس بھر کے اس کے خشک پڑتے ہونٹوں سے لگا دیا۔ ساتھ ہی دوسرے ہاتھ سے اسے سہارا بھی دیا۔ محسن نے غٹاغٹ گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

"تمہاری پٹی میں نے کی ہے۔ بڑی مشکلوں سے...... بازو کی گولی تو گوشت چیر کر نکل گئی ہے لیکن تمہاری ٹانگ بری طرح گھائل ہے۔ تمہاری ران میں شاید ابھی تک گولی پیوست ہے۔ مجھے تو پراپر ڈریسنگ نہیں آتی تھی بس اناڑیوں کی طرح کر دی ہے۔"

"ہاں...... تم صحیح کہہ رہی ہو۔ مجھے زیادہ درد بھی اسی ٹانگ میں ہو رہا ہے۔" محسن بولا۔

"لیکن میرا یہاں رہنا ٹھیک نہیں...... تمہارے لیے بھی یہ بات خطرناک ہوگی کہ تم نے ایک دشمن کو اپنے گھر میں پناہ دے رکھی ہے۔"

"میں نے کہا نا...... تم اس کی فکر نہ کرو۔" وہ تشفی آمیز لہجے میں بولی۔

"پاپا یہاں نہیں ہیں۔ تمہارے جانباز ساتھیوں نے سب کو خوب گھنی کا ناچ نچایا۔ وہ سب تل ابیب جا چکے ہیں۔"

"کیا مطلب؟ کون سب؟" محسن نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پرسوچ انداز میں بھویں سکیڑیں۔

"وہ قصائی نما انسان جنرل آئزک فرناش اور بارق شمعون۔ پاپا بھی ان کے ساتھ گئے ہیں۔ تل ابیب میں کوئی ہنگامی میٹنگ کال کی ہے۔"

"میرے ساتھیوں کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہو؟" محسن نے پوچھا۔

"مجھے افسوس ہے۔ اسرائیلیوں کی تازہ بھاری کمک آ جانے کے باعث تمہارے سارے ہی ساتھی مارے گئے ہیں۔ البتہ زبیدہ نامی مجاہدہ زندہ نکل جانے میں کامیاب ہو چکی ہے۔" بازغہ نے دکھی دل کے ساتھ اسے بتایا۔

بازغہ کی بات پر محسن کا دل بھی دکھ سے بھر گیا۔ تاہم اسے خوشی بھی تھی کہ ان کی اہم کمانڈر اور الجاہد کی سربراہ...... زبیدہ قیصری خونی اسرائیلیوں کے چنگل سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ پھر اسے...... اپنے دیگر ساتھی باقر اور لیلیٰ وغیرہ بھی یاد آنے لگے۔ وہ اپنے دل میں ان کی سلامتی کے لیے دعا ہی کر سکتا تھا۔

بازغہ نے ایک بڑا سا باؤل اور چمچ سنبھالا۔ اس نے محسن کے لیے غذائیت سے بھرپور رقیق خوراک بنا رکھی تھی۔ وہ چمچ کے ساتھ اسے کھلانے لگی۔ محسن کھانے کے دوران...... یہ نور بازغہ کا حسین اور معصوم چہرہ تکتا رہا اور اندر ہی اندر اس کے بارے میں سوچتا رہا کہ کیا یہ لڑکی پاگل ہے؟ یا پھر دیوانی...... ؟ ممکن ہے کہ محض انسانیت کے ناتے اور کچھ اپنی یہودی قوم کے کالے کرتوتوں کو دیکھتے ہوئے اس کا ان سے نہ صرف دل خراب ہو گیا ہو اور وہ فلسطینیوں کے ساتھ واقعی دلی طور پر ہمدردی رکھتی ہو۔ ایک خیال اور بھی اس کے ذہن میں آیا تھا۔ انسیت اور کسی چاہنے والے سے دلی طور پر لگاوٹ...... اگرچہ محسن ابھی اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ بعض مواقع پر اس نے بازغہ کی آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی کے جذبات کی

رمق ابھرتے دیکھی تھی مگر وہ اس بارے میں سوچنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ تاہم ایک حقیقت تو اپنی جگہ تھی، جو اسے بازغہ کی باتوں سے محسوس ہوئی تھی کہ بازغہ نے بہرحال اپنے لوگوں کے کالے چہرے اور سیاہ کرتوت اپنی آنکھوں سے دیکھ لیے تھے۔ مجاہدین کا رویہ بھی اس نے ملاحظہ کیا تھا کہ حملے کے وقت انہوں نے دشمن ہونے کے باوجود عورتوں اور معصوم بچوں کا کس طرح خیال کیا تھا جبکہ اسرائیلیوں نے عرب بستیوں پر گولہ باری کی تھی، جہاں عورتیں بھی تھیں اور معصوم بچے بھی۔ وہ اس معصوم سی گڑیا صورت دوشیزہ کو چند ثانیے تکتا رہا پھر بولا۔

"مجھے اب جانا ہوگا۔ میرا یہاں رہنا ٹھیک نہ ہوگا۔"

بازغہ ٹشو پیپر سے اس کا منہ پونچھنے لگی۔ ایسے میں اس کا خوب صورت اور گل چہرہ محسن کی سانسوں کے قریب تھا اور وہ اسے عجیب الجھی ہوئی نظروں سے سوالیہ انداز میں دیکھنے لگا تو بازغہ سیدھی ہو کے جواباً بولی۔

"باہر سخت پہرا ہے۔ تم ابھی تک ڈیوڈ اسٹار کے ہیڈ کوارٹر کی حدود کے اندر ہو۔ یہ رہائش گاہ ہے جہاں اس وقت تم موجود ہو۔ یہ ہیڈ کوارٹر کی عمارت کے قریب ہی ہے۔ اس کے گرد بھی وسیع و عریض باؤنڈری وال ہے۔ پھر تم زخمی بھی ہو، کیسے نکلو گے یہاں سے؟"

"میں نکل جاؤں گا کسی نہ کسی طرح......" محسن نے کہا۔

"ضد مت کرو۔" وہ بولی۔ "میں نے کہا نا کہ اس سلسلے میں تمہیں زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں یہ سب سنبھال لوں گی۔ میں نے پہلے ہی سے سب سوچ رکھا ہے۔ سب سے پہلے اسپتال میں تمہارا علاج ہوگا۔"

محسن اس کی بات سن کر بھونچکا رہ گیا۔ اسی لہجے میں بولا۔ "تم پاگل ہوئی ہو؟ میں یہاں کسی اسپتال میں ایڈمٹ نہیں ہو سکتا۔ میں اپنے ساتھیوں کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ تم بس ایک احسان اور مجھ پر کر دو۔ مجھے یہاں سے جانے دو۔"

اس کی بات پر بازغہ کے حسین اور صبیح چہرے پہ کرب کی رمق سی ابھری۔ جیسے اسے محسن کی کسی بات پر دکھ ہوا ہو، بولی۔

"محسن! میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ میں جانتی ہوں، تم کس راہ کے مسافر ہو۔ میں تو تمہاری صدقِ نیت اور ایک سچے اور مخلص دوست کی طرح مدد کرنا چاہتی ہوں۔ تم پر کوئی احسان نہیں کر رہی۔ رہی بات یہاں سے نکلنے کی تو مجھ پر بھروسا کرو۔ پلیز......! اول تو خود تمہاری حالت ایسی نہیں ہے کہ تم اپنے پیروں پر چل سکو، پھر باہر سخت پہرا ہے۔ مجھے اپنی پروا نہیں، مگر تم اہم ہو۔ اپنی قوم کے لیے اور اپنے نیک مقاصد کے لیے اور...... اور...... شاید میرے لیے بھی......"

ایک لمبے توقف کے بعد اس نے دوبارہ کہا۔

"یہ جگہ ایک اسٹیٹ کا درجہ رکھتی ہے۔ کسی بڑے اور جدید شہر کی طرح یہاں بھی ہر قسم کی سہولیات موجود ہیں۔" محسن کو بازغہ کی باتوں میں نادانی کی بو محسوس ہونے لگی۔ وہ بولا۔

"تم یہ کیا کہہ رہی ہو بازغہ! کیا تم نہیں جانتیں کہ میں اسرائیلیوں کا کس قدر مطلوب ہوں؟ وہ تو مجھے دیکھتے ہی گولی مار دیں گے اور پھر اس طرح میرے ساتھ تم بھی ایک بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گی۔" محسن کی بات پر بازغہ کے عنابی ہونٹوں پہ اسرار بھری مسکراہٹ نمودار ہوگئی، بولی۔

"تم بے فکر رہو...... ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ میں اس سلسلے میں ایک مربوط لائحہ عمل پہلے ہی تیار کر چکی ہوں۔" محسن کی تسلی نہیں ہوئی، وہ خود کو ابھی تک غیر محفوظ سمجھ رہا تھا۔ وہ ایک عملی آدمی تھا۔ ہر شے کو حقیقت کی عینک سے دیکھنے کا عادی۔ یہ باتیں اس کی تربیت کا حصہ تھیں کہ وہ کسی ایسے شخص پر کم ہی بھروسا کرتا تھا۔ بازغہ کی نیت پر اسے کوئی شبہ نہ تھا مگر بہرحال وہ اس کے لیے ان نازک اور خطرناک حالات میں مزید اور کیا کر سکتی تھی۔ اس بارے میں اسے تسلی نہیں ہو رہی تھی۔

"کیا سوچنے لگے تم......؟" اسے تفکر آمیز سوچ میں مستغرق پا کر بازغہ نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے ہولے سے پوچھا۔

"میں آخر یہاں کب تک ٹھہر سکتا ہوں؟ میری اپنی حالت بھی کچھ زیادہ تسلی بخش نہیں ہے۔"

یہ کہتے ہوئے محسن کے چہرے پر شدید تشویش اور تفکر کی پرچھائیاں اتر آئی تھیں۔ اسے اس قدر پریشان اور متفکر پا کے بازغہ کا اپنا دل بھی بھر آیا۔ وہ بڑی محبت اور چاہت سے محسن کے خوبرو چہرے کی طرف دیکھ کر تشفی آمیز لہجے میں بولی۔

"میرے ہوتے ہوئے تم کسی بات کی فکر نہ کرو۔ تمہاری حالت پر خود مجھے بھی تشویش ہے۔ میں اتنی بے وقوف نہیں ہوں کہ تمہیں یہاں کے اسپتال میں لے جاؤں۔ یہ محض میری ایک پلاننگ کا حصہ ہے لیکن میں اتنا ضرور کر سکتی ہوں کہ اس اسپتال کے ذریعے تمہیں فرار کروا سکوں؟"

"وہ کس طرح......؟" محسن نے اس بار قدرے چونک کر پوچھا تو وہ گہری متانت سے بولی۔

"ایک مریض کے بھیس میں...... ایمرجنسی کی صورت میں ایمبولینس کے ذریعے میں تمہیں تل ابیب یا یروشلم کے کسی بڑے اسپتال میں شفٹ کرنے کے بہانے...... میں

بھی تمہارے ساتھ ہوں گی۔ میری موجودگی میں سارے کام آسان ہو جائیں گے۔ کسی کو چیکنگ کی جرأت نہ ہوگی۔'' بازغہ کی بات پر محسن کو پہلی بار کچھ اطمینان محسوس ہوا۔ ساتھ ہی اسے حیرت بھی تھی کہ وہ جس نازک سی دوشیزہ کو نادان سمجھ رہا تھا، وہ کس قدر ذہانت اور چابک دستی کا مظاہرہ کر رہی تھی مگر ایک بات پر اسے اختلاف ہوا، بولا۔

''مجھے اس طرح یہاں سے فرار کروانے کے بعد تمہارا کیا ہوگا؟ بعد میں تمہارے لیے بھی مصیبت کھڑی ہو جائے گی اور میں اتنا خودغرض نہیں ہوں کہ اپنی محسنہ کے لیے بعد میں کسی مصیبت کا سبب بنوں۔''

اس کی بات پر بازغہ کے نودمیدہ کلی جیسے حسین چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ بولی۔ ''میں تمہارے ساتھ جا کر واپس نہیں پلٹوں گی۔'' محسن اس کی بات پر بری طرح چونکا، بولا۔

''بازغہ! تمہارا آگے میرے ساتھ جانا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ بہتر یہی ہوگا کہ تم ادھر سے ہی پلٹ جاؤ اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔''

اس کی بات سن کر بازغہ کی گہری آنکھوں میں ایک عجیب نودمیدہ جذباتی کلی چٹکی۔ نرم و گداز ہونٹوں پر ایک لمحے کو مزید ارتعاش ابھرا۔ جب وہ بولی تو جانے دل کے کسی عمیق ترین گوشے میں چپکے چپکے اور غیر محسوس طور پر پلنے والے کسی خفتہ و ناخفتہ جذبے کا اظہار اس کی آواز میں لرزنے لگا۔

''میں اب اپنوں کی نظروں میں مجرم بن ہی چکی ہوں۔ شاید تم ابھی تک ان باتوں کا اندازہ نہیں لگا پائے۔ سب سے پہلے تو مجھے میرا باپ گولی مارے گا۔ تم اسے نہیں جانتے شاید..... وہ ایک کٹر یہودی ہے جو فلسطینیوں اور بالخصوص مسلمانوں سے سخت نفرت کرتا ہے اور ان کا دشمن ہے۔ کیا میں تمہارے ساتھ نہیں چل سکتی ہمیشہ کے لیے......؟''

اس کی بات اور اس کے عجیب جذبے تلے لرزتی آواز نے...... اس کے لہجے نے...... محسن کو اب بہت کچھ سجھا دیا تھا۔ وہ بولا۔

''میرے ساتھ جا کے تم کیا کرو گی؟ میرے جلو میں ہر وقت موت ایک ''مسافر'' کی طرح ہم رکاب رہتی ہے۔ تمہیں میرے ساتھ ہر قدم پر موت کی سرگوشیوں کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔''

''مجھے صرف تمہارا ساتھ چاہیے محسن! پھر چاہے ہماری منزل کوئی بھی ہو۔'' بازغہ نے ڈوبے ڈوبے لہجے میں کہا۔

محسن بہ غور اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ بازغہ کی آنکھوں میں اسے اپنے لیے پسندیدگی کے ایسے دیپ جلتے محسوس ہوئے تھے جس نے اسے پریشان سا کر دیا تھا۔ لہٰذا وہ ایک گہری سانس لے کر اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

''بازغہ! تم جو چاہ رہی ہو ایسا ممکن نہیں۔ تم نے ایک غلط آدمی کا انتخاب کیا ہے۔ اس وقت میرا اہم مقصد...... میرا کاز ہے اور میرا عظیم مقصد اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ میں جذبہ حب الوطنی کے آدرش کے سوا دوسری طرف سوچوں۔''

''مجھے تمہاری یہ سب باتیں تسلیم ہیں محسن!'' بازغہ کی آواز لرز رہی تھی۔ ''میں تمہارے اس عظیم مقصد کے بیچ ہرگز حائل ہونے کی کوشش نہیں کر رہی ہوں۔ میں تو خود تمہاری ساتھی بن کر...... تمہارے کاز میں شامل ہونا چاہتی ہوں۔ تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں۔''

''تمہارا شکریہ بازغہ!...... تم نے واقعی ہماری اپنی استطاعت کے مطابق مدد کی، اس کے لیے میں تمہارا تہ دل سے شکرگزار ہوں۔''

''محسن!...... مجھے اپنے لوگوں سے، اپنی قوم سے نفرت ہو گئی ہے۔ میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باشعور لڑکی ہوں۔ افسوس تو یہ ہے کہ تم نے مجھے ایک عام سی لڑکی سمجھ لیا اور میری پسندیدگی کو...... میری چاہت کو...... نادانی خیال کر رہے ہو۔'' ایک لمحے کے توقف سے بولی۔

''تم شاید یہ سمجھ رہے ہو کہ میں تمہاری پسندیدگی میں ایسا کہہ رہی ہوں تو یہ تمہاری غلط سوچ ہے۔ تم سے ملاقات سے پہلے ہی میں اسلام اور اس کی تعلیمات سے متاثر رہی ہوں۔ امریکا کی جدید تعلیمی درس گاہوں میں طالب علمی کے دوران میں نے بہت سے مذاہب کا مطالعہ کیا تو مجھے ان میں سب سے زیادہ پائیدار، امن پسند اور مکمل دین...... دینِ اسلام ہی نظر آیا اور پھر جب میں نے عالمی تناظر و حالات پر نظر ڈالی تو خود مجھے اپنے آپ سے شرمندگی محسوس ہونے لگی کہ میری قوم، میرے مذہب کے لوگ مظلوم فلسطینیوں کے ساتھ ظلم و بربریت کا کس قدر گھناؤنا کھیل کھیل رہے ہیں۔ پھر جب یہاں آ کر خود میں نے اپنی آنکھوں سے یہ سب دیکھا تو میں کانپ گئی۔ لیکن محسن! تم سے میری پسندیدگی کی وجہ دلی وابستگی ہے...... میں تمہیں پسند کرنے لگی ہوں۔'' اتنا کہہ کر بازغہ نے اپنی مہین پلکیں جھکا دیں۔

محسن اس کی باتوں سے متاثر ہوا۔ ملائمت سے بولا۔

''بازغہ! سچائی اور حق کو سمجھنے اور پہچاننے والے لوگ عظیم

ہوتے ہیں۔ تم بھی ایک ایسی ہی لڑکی ہو۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے سچائی کو نہیں جھٹلایا۔ لیکن بازغہ!...... میرے ساتھ تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ سوائے آتش و آہن کی گھن گرج کے...... یقین کرو میرا۔ مجھے تمہارے خلوص اور تمہاری نیک نیتی پر کوئی شبہ نہیں ہے بلکہ میں تمہاری عظمت کو سلام پیش کرتا ہوں۔"

بازغہ اس کی بات سن کر بڑی محبت سے مسکرائی پھر بولی۔ "میں نے تمہارے یہاں سے فرار کا بندوبست کر دیا ہے۔ یہ کام آج رات میں ہی ممکن ہو سکے گا۔"

"مگر رات ہونے میں تو ابھی کئی گھنٹے ہیں؟" محسن نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تب تک یہاں مجھے دیکھ لیے جانے کا خطرہ بڑھ جائے گا۔"

"گھر میں میرے سوا اور کوئی نہیں۔ دو تین ملازم تھے، ان میں سے ایک تو طبیعت کی خرابی کی وجہ سے نہیں آیا۔ باقی دو کو میں نے...... باہر کے کسی کام میں مصروف کر دیا ہے۔ رات میں مزید تنہائی ہو جائے گی۔"

"تمہارا منصوبہ کیا ہے آخر...... مجھے بھی تو بتاؤ؟" محسن نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا تو وہ اس کی تفصیل بتانے لگی۔

☆☆☆

اسرائیلی خفیہ ملٹری انٹیلی جنس یونٹ "ہگانہ آرمی" کا چیف ڈائریکٹر آئزرمین بیری جونیئر...... اس وقت اپنی دو کاؤنٹر انٹیلی جنس تنظیموں "الیا بیتھ" اور "شن بیتھ" کے دو اعلیٰ عہدیداروں فوہاگ بنل اور مادام میڈوسا کے ساتھ بند کمرے میں ایک کارنر میٹنگ میں مصروف تھا۔ "ہگانہ آرمی" بیرونی معاملات سنبھالتی تھی اور اس کے لیے اس نے دو یونٹ بنا رکھے تھے۔ الیا بیتھ کے فوہاگ بنل کو امریکی عالمی معاملات کے، خارجی اور داخلی امور میں پارلیمنٹ سطح کی عمل داری حاصل تھی، جو درون خانہ سی آئی اے کے کامیاب گٹھ جوڑ کے ساتھ اپنی خفیہ سازشوں کو اسلامی ممالک میں پھلنے پھولنے کا موقع دیتی تھی۔ کویت پر عراق کے حملے کی سازش، بھی ہگانہ آرمی کے اس کاؤنٹر انٹیلی جنس یونٹ الیا بیتھ نے امریکی سی آئی اے کے ساتھ مل کر تیار کی تھی اور عراق کے عاقبت نااندیش بادشاہ نما صدر نے "کٹ آؤٹ" کا کردار سنبھالتے ہوئے کویت پر حملہ کر کے اسے بعض تاریخی حوالوں سے عراق کا حصہ قرار دیا تھا...... وہ شاید بھول گیا تھا کہ اگر تاریخی حد بندیوں کو جدید دور میں دہرایا جانے لگے تو دنیا میں بہت سے ممالک کا نام ہی نقشے پر باقی نہ رہے۔

کویت پر عراقی قبضے کی سب سے زیادہ اور سب سے پہلے اسلامی ممالک نے ہی تشویش ظاہر کی تھی اور بعد میں عراق کو سمجھانے بجھانے کا سلسلہ شروع کیا تھا اور عراق سے متعدد درخواستیں بھی کی تھیں کہ وہ کویت سے اپنا غاصبانہ قبضہ ختم کر کے کویت سے نکل جائے...... مگر عراقی صدر کے عاقبت نااندیش دماغ میں خفیہ یہودی سازش کا ایسا زعم بھرا تھا کہ اس نے اپنی بڑی بڑی توپوں، صحرائی فوجوں اور جراثیمی ہتھیاروں کا استعمال اور جانے کیا کیا پروپیگنڈا کر دیا تھا۔

لامحالہ جب یہ لڑائی جسے متفقہ امتِ مسلمہ کی رائے کے مطابق "گھر کی لڑائی" کہا جاتا تھا، باہر کے منصف اور عالمی چودھراہٹ کے در پر لے جائی گئی تو سازش کے اصل محرکات سامنے آنے لگے اور پھر بندر بانٹ انصاف کا عمل لایا گیا۔ اب یہ امت مسلمہ کی بدبختی تھی یا پھر بے حسی کہ صیہونی سازش کی اس بساط میں امریکا اور برطانیہ ہی نہیں بلکہ دوسرے یورپی ممالک کی افواج کویت کو عراق کے غاصبانہ قبضے سے چھڑانے کے لیے میدان میں اتر آئیں۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ سب مارِ آستین دشمنوں نے ہنستے ہوئے اور ہم نے روتے ہوئے دیکھا۔

عراقی صدر کی پچاس پچاس گز لمبی توپیں، صحرائی افواج اور بڑھکیں کیا رنگ لائیں وہ...... اتحادی افواج...... بدقسمتی سے بشمول مسلم ممالک کے سامنے نقش بر آب ثابت ہوئیں۔

اس کے بعد سے آج تک عراق کے عوام پر کیا بیت رہی ہے...... یہ ہم سب کے سامنے ہے۔ نصرانی سازشیں وہاں آج بھی اپنے جوبن پر ہیں۔

آئزرمین بیری جونیئر جسے اپنے دادا (آئزرمین بیری) کے یہودی قوم کے ہیرو کے حوالے سے فخر تھا، اس نے یہودیوں کو آنے والے وقتوں میں عظیم قوم اور عظیم طاقت کے حوالے سے جگایا تھا اور کہا تھا، فلسطین میں واقع ایک پہاڑی "صیہون" ان کے لیے مقدس نشان کی حیثیت رکھتی ہے اور اس نام سے اس نے صیہونی دہشت گرد تنظیموں کی بنیاد ڈالی۔ یہودیوں کے بڑے دانشوروں کے خفیہ اجلاس جو 1897ء سے 1905ء تک کے خفیہ اجلاسوں پر محیط تھے جن میں تمام عرب ملکوں پر قبضے کا منصوبہ تیار کیا جاتا رہا تھا۔ اس منصوبے کی بنیاد فیری میسن کی کامیابی پر رکھی گئی جبکہ خود فیری میسن کی بنیاد 1717ء میں یہودیوں نے مملکت انگلستان میں رکھی۔

فیری میسن اپنے اس عظیم منصوبے...... بہ الفاظ دیگر "گریٹر اسرائیل پلان" کو علامتی طور پر ایک سیاہ کالے رنگ اور

کالے سینگوں والے بیل نما انسانی چہرے سے تشبیہ دی ہے۔ جس نے تمام عالم اسلام کو اپنے گھیرے میں لیا ہوا ہے اور اس کا منہ یروشلم کی طرف ہے۔ کسی کالے ناگ ہی کی طرح گریٹر اسرائیل کا منصوبہ آگے کو بہ ظاہر خاموشی سے سرک رہا تھا کہ اچانک 1904ء میں روس کے ایک پادری پروفیسر اے نیلسن کے ہاتھ اس منصوبے کی ایک کاپی لگ گئی۔ حالانکہ تمام تر احتیاط کے باوجود یہ عالم اسلام خلاف منصوبہ اس خوبی سے پوشیدہ رکھا جاتا رہا تھا کہ اعلیٰ سطح کے یہودیوں کے سوا کسی دوسرے کو رسائی نہ تھی، یعنی خود عام یہودیوں تک کو نہ تھی۔

29 جولائی 1951ء میں اسرائیلی وزیراعظم ڈیوڈ بن گوریان نے اسرائیلی پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''ہمیں پورے جوش وخروش کے ساتھ یہ جنگ جاری رکھنا ہے۔ ہمیں ایک بار پھر حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے کی سلطنت قائم کرنا ہے۔ تحریک صیہونیت کا یہ اولین منشا ہونا چاہیے کہ بکھری ہوئی بھیڑوں کو جمع کرنا ہے۔''

بن گوریان کے اس خطاب نما تقریر کا واضح مطلب یہی تھا کہ 50 لاکھ یہودیوں کو دس سال میں اسرائیل میں جمع کرنا ہے۔ گرچہ اسرائیل کے وسائل اس کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ اس لیے ہمیں خارجہ پالیسی میں یہ بات پیش نظر رکھنا ہوگی کہ اسرائیل کی ساری زمین کو خالی کرایا جائے اور اسرائیل کی ''ساری زمین'' سے مراد دریائے نیل کے کنارے سے فرات تک پھیلا ہوا علاقہ تھا......

لہٰذا...... جب 13 اگست 1951ء کو یروشلم میں عالمی صیہونی کانفرنس منعقد ہوئی تو اس میں بھی سب سے اہم زیر بحث موضوع یہی تھا۔

پھر 1952ء میں وزیر جنگ موشے دایان نے قوم کے نام پیغام میں یہی کہا کہ ہر ایک یہودی کو میدان جنگ میں نکل آنا چاہیے اور میں نے فوج سے کہہ دیا ہے کہ وہ دن رات تیاری میں مصروف رہیں۔ چاہے اس کے لیے ہمیں کتنے ہی صیہونی خفیہ ادارے تشکیل دینے پڑ جائیں، مکڑی کے جال جتنے بھی......ت پروا نہیں۔ یہودی سلطنت کا قیام ہمارا نصب العین ہونا چاہیے اور ہم اسے حاصل کر کے ہی دم لیں گے۔

اور آج مکڑی کے جال ہی کی طرح اسرائیلی خفیہ ادارے اپنے اپنے خفیہ مذموم کاز میں مصروف کار ہیں۔ ہم تو صرف موساد یا زیادہ سے زیادہ ڈیوڈ اسٹار کو ہی جانتے ہوں گے۔ بہت کم لوگوں کے علم میں فیری میسن، ہگانہ آرمی، الیا بیتھ اور شن بیتھ وغیرہ ہوگا۔ مگر حیرت کی بات ہے۔ ان مذکرہ بالا خفیہ اسرائیلی اداروں کے مقاصد ایک...... مگر کام کرنے کا انداز یا لائن آف ایکشن ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہے۔ ان میں کوئی داخلی سطح پر متحرک ہے تو کوئی خارجی سطح پر گل کھلا رہا ہے۔ بہرطور...... 13 مارچ 1952ء کو یہودی ریاستوں کی سرحدوں کا تعین کرتے ہوئے لیبر پارٹی کے سربراہ ڈاکٹر عاری القمان نے شیطانی منصوبے کو فاش کر دیا جواب تک مخفی تھا۔ اس نے کہا۔

''عظیم تر اسرائیل...... عراق سے سویز تک پھیلا ہوا ہے۔ یہی وہ طاقتور ریاست ہوسکتی ہے جو مشرق وسطیٰ میں اندرونی وبیرونی امن واستحکام کی ضمانت دے سکے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم دنیا کو صاف اور واضح الفاظ میں بتادیں کہ فلسطین میں دنیا بھر کے یہودیوں کو جمع کر کے فوجی قوت بنانے کا مطلب اسرائیل کی نئی سرحدوں کا تعین کرنا ہے۔ جو عراق سے سویز تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کے بعد ہی اسرائیل مشرق وسطیٰ میں جمہوریت کا گہوارہ بن کر اپنے آپ کو تباہی سے بچاسکتا ہے۔''

اسرائیل میں آج بھی اپنی میراث کے ملک کی نشاندہی کرتے ہوئے پارلیمنٹ کی پیشانی پر یہ الفاظ کندہ کیے گئے ہیں۔ ''اے عظیم اسرائیل! تیری سرحدیں نیل سے فرات تک ہیں۔''

ایک یہودی مصنف نے تو یہاں تک لکھ مارا ہے کہ عظیم تر اسرائیل میں، شام، لبنان، اردن اور عراق کا بڑا حصہ صحرائے سینا بالائی مصر اور مدینہ منورہ تک کا علاقہ شامل ہے یہودیوں کے لیے الگ سلطنت کا قیام صیہونیت کا واحد مقصد نہیں بلکہ اسرائیل کے قیام کے بعد ہمارے لیے اپنی تحریکوں (سازشوں) کو آگے بڑھانا ضروری ہوگیا ہے۔ اسرائیل کی حکومت تو صرف ایک وسیلہ ہے ''منزل'' نہیں ہے۔ بجمن نامی ایک کٹر یہودی نے تو اسرائیلی پارلیمنٹ میں بہت پہلے بتادیا تھا کہ اسرائیل کے لوگوں اور خود اسرائیل کی اس وقت تک کوئی اہمیت نہ ہوگی، جب تک ہم اپنا پورا علاقہ صلح ناموں پر دستخط کیے بغیر آزاد نہ کرالیں۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہودی منصوبے کا ایک مرحلہ مکمل ہوچکا ہے۔ فلسطین اور جزیرہ نمائے سینائی پر اسے تسلط حاصل ہوگیا ہے۔ اب وہ اس منصوبے کے آخری مرحلے کی تکمیل کے لیے کام کر رہا ہے۔ جس کے دو اہم اجزا ہیں۔ ایک تو یہ کہ مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرا کو منہدم کر کے اس کی جگہ ہیکل سلیمانی تعمیر کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اسرائیل اپنی میراث کے ممالک پر قبضہ کرلے۔ اس سلسلے میں ہگانہ آرمی

کے دو یونٹ الیا ہیتہ اور شن بیتہ خفیہ طور پر فعال تھے اور اس کا ہمنوا امریکا پوری طرح اسرائیل کا ساتھ دے رہا تھا۔

اگر پوری دنیا کے مسلمان اب بھی نفاق پر لعنت بھیج کر خدا کی رسی کو مضبوطی سے تھام کر متحد نہ ہوئے اور...... اگر...... اب بھی ہوسِ اقتدار کے مارے جنہیں اپنے سنگھاسن کے ڈانواں ڈول ہونے کا خطرہ زیادہ عزیز رہتا ہے اور یہ سمجھتے رہیں کہ قوموں کی تقدیریں میدان جنگ کے بجائے ایوانوں میں بنتی ہیں تو پھر وہ دن دور نہیں جب گریٹر اسرائیل کا کالا ناگ سب کو لپیٹ میں لے لے گا......(خاکم بدہن)

آئزر مین بیری جونیئر نے الیا ہیتہ اور شن بیتہ کے دونوں اسٹیشن چیف فوہاگ بیل اور مادام میڈوسا کے سامنے اپنے دیرینہ اسرائیلی ناپاک منصوبے کی تکمیل کے خلافِ معمول حلف لیا۔ اس کے بعد فوہاگ بیل سے مخاطب ہو کے بولا۔

"اسرائیل کی موجودہ داخلی صورت حال اتنی تسلی بخش نہیں رہی۔ اس لیے ہمیں اپنی خارجہ پالیسی کو اس کے تابع کرنا پڑے گا کیونکہ پہلے کے مقابلے میں فلسطین کے معاملے پر امت مسلمہ کا شور دن بہ دن بڑھتا جا رہا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمیں اپنی خارجہ پالیسیوں کو آگے بڑھانا ہوگا۔ اسرائیل کو اس وقت سب سے بڑا خطرہ عراق سے ہے جو ایک ممکنہ ایٹمی اسلامی ملک ہے۔ ہمارے گریٹر اسرائیل پلان میں عراق سب سے بڑی رکاوٹ ہے اس وقت...... ادھر تمام اسلامی ممالک بشمول پاکستان، فلسطین کے معاملے پر ہم آواز ہو رہے ہیں۔ اگرچہ ابھی تک ان کی پذیرائی عرب ممالک تک رسائی حاصل نہیں کر سکی ہے لیکن...... عراق کو تباہی کے دہانے پر پہنچانا ضروری ہے۔"

اس کے جواب میں گھٹے ہوئے قد اور گول سر اور چہرے والے فوہاگ بیل نے ہولے سے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور بولا۔

"جناب!...... موجودہ حالات ایک بار پھر اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ اس بار عراق کو ختم ہونے والی تباہی سے دوچار کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں ہمارا یونٹ واشنگٹن میں بڑی سرعت سے کام کر رہا ہے۔ بین الاقوامی پریس میں موجود ہمارے یہودی گماشتے ایک بار پھر پہلے کی طرح عراقی فوج اور ایٹمی قوت کا پروپیگنڈا کرنے میں مصروف ہیں...... جس کے نتیجے میں غیر یہودی اور عیسائی مغربی طاقتیں گمراہ ہو رہی ہیں۔ اور ایک بار پھر عراق پر امریکا کی اتحادی بن کر چڑھ دوڑنے کے لیے بے چین نظر آرہی ہیں۔"

"گڈ" آئزر مین بیری کی چندی چندی آنکھوں میں سانپ جیسی چمک لپک گئی۔ وہ پھنکار سے مشابہ آواز میں بولا۔ "سب کچھ بالکل اسی طرح ہونا چاہیے لیکن ہر بار ایک ہی 'حربہ' نہیں چلے گا۔ سازش جس قدر خفیہ اور رنگ آمیز ہوگی اسی قدر زود اثر ہوگی۔" آئزر مین نے الیا ہیتہ کے فوہاگ بیل کی طرف ٹھنڈی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ مکارانہ مسکراہٹ سے بولا۔

"جناب!...... اس بار حربہ مختلف ہی استعمال کیا گیا ہے۔ ایک دیرینہ منصوبے کے تحت ہماری یہودی قوم کا ہر آدمی امریکا کے اہم محکموں اور پوسٹ پر متمکن ہے اور ہمارے کاز کو آسان بناتا رہتا ہے۔ عراق میں امریکی قونصلیٹ میں بھی امریکی یہودی ہیں...... انہی کی بھیجی جانے والی خفیہ رپورٹ کے تحت ہم نے...... عراقی صدر کی کابینہ میں اور باہر ایسے کچھ جرنیل کا پتا چلایا ہے جو بظاہر عراقی صدر کے دوست ہیں مگر اندر سے وہ کچھ اور عزائم رکھتے ہیں...... ان کے ساتھ مل کر ہم عراق پر دوبارہ امریکی اور اس کے اتحادیوں کی یلغار کا کامیاب منصوبہ بنا رہے ہیں۔"

فوہاگ بیل کی اس بات پر...... آئزر مین بیری کا مکروہ چہرہ خوشی و مسرت کے تاثرات سے مزید گھناؤنا نظر آنے لگا۔ توصیفی لہجے میں بولا۔

"گڈ......! اس بار ہمارا عراق پر دوسرا اور کارگر وار ہونا چاہیے جس کے بعد عراق دوبارہ نہ سنبھل پائے۔ اس کے بعد شام، لیبیا اور مصر ہماری سازشوں کی ہانڈی بنیں گے، مگر یہ تب ہی ممکن ہوتا رہے گا جب تک ہمارے ہمدرد اور سپورٹرز امریکا کے ہر اہم محکمے اور پوسٹ پر موجود رہیں گے، ان سے حاصل کردہ خفیہ رپورٹس کی ترسیل بھی یقینی بنائی جائے یہ "لیک آؤٹ" نہ ہونے پائے۔"

"جی جناب! بالکل...... ایسی تمام رپورٹس موساد کے ہیڈ کوارٹر میں "ای سی ایم" (الیکٹرونک کاؤنٹر میٹرز سسٹم) کے ذریعے حاصل کی جاتی ہیں جو محفوظ ترین اور لیک پروف ہوتی ہیں۔" فوہاگ بیل نے جواب دیا۔

اس کے بعد ہگانہ کے بانی کا ہم نام اور صیہونیوں کے موروثی ہیرو...... آئزر مین بیری جونیئر نے اپنا روئے سخن...... شن بیتہ کی چیف مادام میڈوسا کی طرف موڑا۔

"تم برطانیہ میں کیا گل کھلا رہی ہو، یہودیوں کی حسین ملکہ...... میڈوسا؟"

عورت...... بلکہ حسین، طرح دار اور پرشباب عورت...... آئزر مین کی بڑی پرانی کمزوری تھی۔ اس کا

گرینڈ پا بھی حسن و شباب کا شیدائی تھی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس نے اپنے محل میں جو یروشلم کے جنوب میں "یعودم" نامی گنجان پہاڑی مقام پر واقع تھا، مغربی حسیناؤں کا جمگھٹا جمع کر رکھا تھا اور یہ حسینائیں گاڑی کے آئل کی طرح تھوڑے عرصے بعد بدل دی جاتی تھیں۔ اسّی سال کی عمر تک ہگانہ کے بانی گرینڈ پا آئزر مین کا یہی مشغلہ تھا۔

شن بیتھ کی مادام میڈوسا بھی کم حسین نہ تھی۔ وہ پکی یہودن اور حسین اپسرا شکل عورت تھی۔ ایک حسین ناگن...... جس کے حسن کا ہی نہیں بلکہ امڈتے شباب کا جادو بھی سر چڑھ کر بولتا تھا۔ اپنے حسن کی دلربائی اور پرشباب جسم کی ہوشربائی کو مزید قیامت خیز بنانے کے لیے وہ لباس بھی چست پہنتی تھی۔ وہ اپنے حسن اور دل آرا اداؤں کو دشمنوں کے خلاف ایک خطرناک بلکہ تباہ کن ہتھیار کے طور پر استعمال کرتی تھی اور خاصی کامیاب رہتی تھی۔

شن بیتھ کی مادام میڈوسا اپنی حسن آرا تعریفوں سے قطع نظر ایک خطرناک اور زہریلی ناگن کی طرح تھی، اتنی ہی ذہین و فطین بھی اور سفاک بھی۔ اس کے مذکورہ یونٹ کی ذمے داری امریکا اور برطانیہ کی جدید تعلیمی درسگاہوں میں مختلف اسلامی ممالک سے آئے ہوئے مسلم اسکالرز پر نہ صرف کڑی نگاہ رکھنا تھی، بلکہ انہیں بہکانے اور اپنے اصل مقصد سے ہٹانے کے علاوہ ان کی سرگرمیوں کو جانچنے کا بھی کام کرتی تھی اور انہی میں سے وہ ایسے اعلیٰ دماغ ذہین طالب علموں کی "کریم" کو بڑی بڑی آفرز کی صورت میں اپنے ملک لوٹنے کے بجائے وہیں امریکا کے مختلف محکموں میں اعلیٰ پوسٹ پر تعیناتیاں کرواتی تھی جہاں پہلے ہی امریکی نژاد یہودی لابی جو خفیہ طور پر گریٹر اسرائیل کے ایجنڈے پر مصروف کار ہوتی تھی، وہ انہیں اپنے اشاروں پر ناچنے پر مجبور کرتے تھے اور جو ایسا نہ کرتا...... اسے کسی غیر قانونی سرگرمی میں پھنسا کر اس بے چارے کا مستقبل ہی نہیں حال بھی بربادی سے دوچار کر دیا جاتا تھا۔ مکروہ صورت آئزر مین ہیری کے پرشکوہ انداز میں مخاطب ہونے پر مادام میڈوسا نے بڑی دل لبھانے والی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا پھر کھنکتی آواز میں جواب دیتے ہوئے بولی۔

"ہمارا یونٹ امریکا اور برطانیہ کی اعلیٰ درسگاہوں میں بڑی کامیابی کے ساتھ عمل پیرا ہے جس کے نتیجے میں کئی آئی ٹی اینڈ کمپیوٹر ایکسپرٹ، جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی اور ہیومن سائنس کی بڑی کھیپ ہمارے لیے مخصوص ہو چکی ہے۔ اگرچہ معدودے چند لوگوں نے بیچ میں دامن چھڑانے کی کوشش چاہی تھی مگر ان پر مختلف جھوٹے الزامات لگوا کر انہیں امریکی جیل خانوں میں ساری عمر سڑنے کے لیے ڈال دیا گیا اور ان کے ملک کے خلاف پروپیگنڈا بھی عمل میں لایا گیا۔"

"ہمیں سائنس کے شعبے علم الجراثیم کے لیے کچھ اعلیٰ دماغ درکار ہیں۔ یہ مائیکروبیالوجسٹ ہماری اس کمی کو دور کرنے میں معاون ثابت ہوں گے جن کی ایک عرصے سے اسرائیل کی ایٹمی لیبارٹریوں کو ضرورت ہے۔" آئزر مین نے اس بار کھنڈی ہوئی سنجیدگی کے ساتھ مادام میڈوسا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ اثبات میں دھیرے سے اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے بولی۔

"یہ بات ہمارے علم میں ہے۔ اس سلسلے میں تین بہترین اسکالرز ہماری نگاہ میں ہیں۔ ان میں سے دو کا تعلق عراق اور شام سے ہے جبکہ تیسرا ایک پاکستانی ڈاکٹر ہے......"

"گڈ......! ان تینوں کو فوکس کرو...... اس کے علاوہ...... کسی قسم کی فلسطین موومنٹ کی خبر؟"

"یس سر!" مادام میڈوسا نے کہتے ہوئے فوراً اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اور آئزر مین نے اس کی طرف گھورتے ہوئے یکلخت مستفسرانہ انداز میں اپنی بھویں سکیڑ لیں۔ میڈوسا بتانے لگی۔

"برطانیہ میں سرگرم ہمارے ایک سیکرٹ کاؤنٹر یونٹ نے رپورٹ دی ہے کہ وہاں فلسطینی اور ان کے ہمدرد سورس کے...... آئی آر اے (آئرش ری پبلک آرمی) سے تعلقات ہیں۔ ان کا خفیہ گٹھ جوڑ ایک باقاعدہ نیٹ ورک کی صورت اختیار کر چکا ہے۔"

مادام میڈوسا کی بات پر مکروہ صورت کٹر یہودی آئزر مین کا چہرہ یکدم غصے سے لال پیلا ہو گیا۔ "یہ کیوں اور کیسے ہوا...... مادام؟ وہ بھی شن بیتھ کی موجودگی میں؟ اور تم نے ان کا یہ نیٹ ورک توڑنے میں کیا کیا اب تک؟"

آئزر مین طیش کا بھی پکا آدمی تھا۔ اس سلسلے میں وہ کسی اپنے سے بھی رعایت برتنے کا قائل نہ تھا۔ اس نے باؤلے کتے کی طرح چلاتے ہوئے دہاڑ کر کہا تھا اور ساتھ ہی اس نے...... اپنے لباس سے ایک لمبی نال والا خوفناک پستول نکال لیا اور اس کا رخ مادام میڈوسا کی طرف کر دیا۔ میڈوسا کی سانسیں سینے میں اٹکنے لگیں۔ موت کے خوف سے حلق یکدم سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ وہ پیلے پڑتے چہرے اور پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔

"یس...... سر......! ہم اس نیٹ ورک کا پتا چلا چکے

ہیں...... اور اسے سبوتاژ کرنے کی منصوبہ بندی بھی مکمل ہوچکی ہے...... امید ہے اسے زیادہ پھلنے پھولنے کا موقع نہیں ملے گا۔"

"تو......تو......نیور...... ویٹس ناٹ انف...... مادام......!" آئزرمین اپنا پستول والا ہاتھ قدرے بلند کرتے ہوئے اس کی نال کا رخ مادام میڈوسا کی سپید و ملائم جلد والی پیشانی کی طرف کرتے ہوئے چیخا۔

"مجھے بہلانے کی کوشش مت کرو مادام......! یہ سب کافی نہیں، اب دوبارہ امید جیسا لفظ استعمال نہ کرنا میرے آگے۔ یقین کی بات کرو، عمل کی...... ڈو آر ڈائی...... ویٹس اٹ۔ اوکے......؟"

شن بیٹہ کی میڈوسا کی پیشانی عرق آلود ہوگئی، خوف سے اس کا حسین چہرہ دھواں دھواں ہوگیا تھا۔ تاہم اس نے اپنے سینے سے پھنسی پھنسی سانس خارج کی اور بہ مشکل بولی۔ "یس سر!...... ایسا ہوجائے گا، بہت جلد ہوجائے گا۔"

"اٹس اوکے......" آئزرمین کے چہرے اور لہجے کے تناؤ کا بھرا پن قدرے کم ہوا اور پستول اس نے واپس اپنے لباس میں چھپالیا۔ مادام میڈوسا کی ہی نہیں...... بلکہ سامنے بیٹھے الیاہیتہ کے فوہاگ بتل کی بھی جان میں جان آئی تھی کیونکہ آئزرمین اپنوں میں بھی ایک سفاک اور سنگدل باس کے نام سے مشہور تھا۔ اس منحوس میٹنگ پر کئی اسرائیلی خفیہ ایجنسیوں اور یونٹ ...... کے افسروں نے...... اپنے باس کے ہاتھوں چشم زدن میں اپنے ساتھیوں کو گولی کھا کر مرتے دیکھا تھا۔ پھر بالخصوص فوہاگ بتل کو تو کم از کم مادام میڈوسا جیسی حسین ساتھی کا اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے دیکھنا بہت درد ناکی کا باعث ہوتا۔ اس لیے کہ فوہاگ بتل اور مادام میڈوسا کے درمیان آپس میں ساتھی کے علاوہ گہرے، دوستوں جیسے مراسم تھے۔ اس وقت بھی اس اہم میٹنگ سے فارغ ہونے کے بعد دونوں نے یروشلم کے ایک لگژری ہوم میں رات اکٹھے گزارنے اور پینے پلانے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔

"میں فلسطینی حریت پسندوں کے کسی بھی بیرونی سرگرم نیٹ ورک کو برداشت نہیں کرسکتا...... ویٹس آل۔"

چند ثانیوں کی دھڑکتی خاموشی کے بعد آئزرمین نے تحکمانہ لہجے میں کہا اور پھر مخصوص انداز میں اپنے سر کو ایک جانب جھٹکا۔ یہ اشارہ تھا میٹنگ کے برخاست اور ان کی رخصتی کا۔

تھوڑی دیر بعد آئزرمین تنہا بیٹھا رہ گیا۔ پھر اس نے میز کے نچلے حصے کا بٹن دبا دیا۔ بازو والے کمرے میں ایک چھوٹا گرین بلب جلنے بجھنے لگا اور ساتھ ہی ہلکی بپ کی آواز ابھری۔ وہاں دو افراد آرام دہ صوفوں پر پہلے سے موجود تھے، ایک اسرائیلی انٹروگیشن کا چیف انچارج شمیر گویان تھا اور دوسرا...... کمشنر پیریز نادن تھا۔ اشارہ پاتے ہی وہ کانفرنس ہال کی طرف بڑھ گئے، جدھر آئزرمین بیری ان کا منتظر تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر کمال احمد سے زیادہ جنیفر نویٹر پریشان تھی، بلکہ وہی سب سے زیادہ کمال کے لیے فکرمند ہو رہی تھی۔ اگرچہ کالے امریکی یہودی اسکالر ڈی کارلو کو اس روز ڈاکٹر کمال نے سینٹرل کینٹین میں جو منہ توڑ جواب دیا تھا، تو اپنی ہرزہ سرائی کے جواب میں وہ ڈاکٹر کمال احمد کی مدلل اور شعلہ بیاں جوابی کارروائی کے آگے ذرا بھی نہ ٹھہر پایا تھا اور رخصت ہوتے سمے اس کی آنکھوں اور چہرے سے ڈاکٹر کمال کے لیے کینہ اور بغض کے علاوہ ذاتی عناد کی چنگاریاں بھی پھوٹتے وہاں موجود تقریباً سبھی طالب علموں نے بھانپ لی تھیں، کچھ مسلم اسٹوڈنٹس نے بعد میں ڈاکٹر کمال کو ازراہِ ہمدردی یہ مشورہ بھی دینے کی کوشش کی تھی کہ وہ اس کٹر یہودی کے منہ لگنے کی کوشش نہ کرے۔ مگر ڈاکٹر کمال کو اس کی پروا کب تھی۔ وہ بڑے جوش کے ساتھ اپنے ہم مذہب ہمدردوں سے کہتا۔

"کوئی میرے سامنے کھڑا ہوکے...... مجھے متوجہ کرکے...... میرے مذہب، میری قوم اور میرے وطن کے خلاف اس طرح کا زہر اگلے...... میں اسے اسی طرح منہ توڑ جواب دیتا رہوں گا۔ چاہے میرے سامنے...... لندن کا میئر یا یونیورسٹی کا چانسلر ہی کیوں نہ کھڑا ہو۔ میں ایسی مصلحت آمیز خاموشی اور ایسی ڈگری پر ہزار بار لعنت بھیجوں گا، جس کی خاطر مجھے یہ بکواس سننا پڑے۔" ان ہمدرد مسلم طلبا...... میں ایک عراقی اسکالر حماد اندال بھی شامل تھا۔ اس نے **Metallurgy** میں انجینئرنگ کی تھی اور اب سبجیکٹ اسپیشلائزیشن کی غرض سے یہاں آیا ہوا تھا۔ یہ اسکالر تو نہیں تھا اور اپنے خرچے پر یہاں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا تھا تاہم اس کا خاندانی بیک گراؤنڈ خاصا مضبوط تھا۔ جو عراق کے شہر بغداد کے مشہور اور پوش علاقے "المنصور" میں رہائش پذیر تھا اور اس خاندان کا شمار بغداد کے متمول اور معزز گھرانوں میں ہوتا تھا۔ اس کا باپ شمائل اندال...... بغداد میں ایک اعلیٰ اور کلیدی اہمیت کے حامل عہدے پر فائز تھا۔ اس کی

والدہ ام کلثومہ بھی ''موصل'' کے ایک معزز قبائلی سردار خاندان سے تعلق رکھتی تھی، جو ایک اچھی وفاشعار بیوی اور ماں تھی۔ حماد سے ایک سال چھوٹی جوان بہن حبیبہ تھی۔ حماد کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا، وہ خاصا ذہین اور پُرجوش نوجوان تھا۔

سرخ وسفید رنگت اور وجیہہ شخصیت کا مالک حماد اندال..... بھی ڈاکٹر کمال احمد کا ہم عمر تھا۔ دونوں میں ایک قدر اور بھی مشترک تھی، دونوں ہی لیے دیے رہنے والے اور مرنجان مرنج انسان تھے مگر سینٹرل کینٹین والے اس روز کے واقعے کے بعد۔ حماد کو ڈاکٹر کمال نے از حد متاثر کیا تھا اور پھر جب اسے ڈاکٹر کمال کے احساسات وجذبات کا اندازہ ہوا تو بے اختیار اس نے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حماد خود بھی ایک ایسے بہادر اور جری باپ کا بیٹا تھا جو اپنے وطن اور قوم کا وفادار اور ہمدرد تھا۔ یہی خصوصیات حماد میں بھی بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں۔

اس طرح کے دو آدمیوں میں دوستی بھی بہت گہری ہوتی ہے۔ لہٰذا ان کی دوستی بھی خوب جمنے لگی۔

''یار! میرا بڑا دل کرتا ہے تمہیں اپنا وطن دکھاؤں..... اپنا شہر بغداد گھماؤں، اپنے گھر والوں سے ملواؤں۔''

ایک روز دونوں دوست کمرے میں موجود تھے تو حماد نے بڑے خلوص واشتیاق کے ساتھ ڈاکٹر کمال سے کہا۔

اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے لندن بارش سے بھیگا ہوا تھا۔ ٹھنڈ بھی پڑ رہی تھی مگر اس سردی کا احساس بڑا دلفریب اور خوشگوار تھا۔ کیمپس کی وسیع وعریض عمارت خوب صورت محسوس ہو رہی تھی ایسے میں حماد نے کمال کو اپنے روم میں آنے اور گرما گرم کافی کی دعوت دے ڈالی تھی جو وہ رد نہیں کر سکا تھا۔ حماد نے رین کوٹ پہنا ہوا تھا جبکہ کمال نے کالے رنگ کا جیسٹر چڑھایا ہوا تھا۔

دونوں دوست اب کمرے میں بیٹھے کافی پیتے ہوئے باتیں بھی کر رہے تھے۔ روم سینٹرلی ہیٹڈ تھا۔ کھڑکی کے پٹ کھلے ہوئے تھے اور شفاف شیشے کے پار سبز اور اودے رنگوں کی خوشنما پھولوں سے لدی کیاریاں بارش کے پانی سے بھیگ رہی تھیں، اور نکھر رہی تھیں۔ کمرا کشادہ اور آرام دہ تھا۔ کمرے میں بیڈ، صوفے، دو کرسیاں ایک کونے میں رائٹنگ ٹیبل تھی اور ایک ڈبل دیوار گیر الماری تھی۔

حماد کی بات پر ڈاکٹر کمال نے صوفے سے سر ٹکایا تھا پھر کافی کا....... ایک گھونٹ لینے کے بعد بولا۔

''دوست اگر سچ پوچھو تو مجھے بھی بغداد جیسا قدیم اور تاریخی شہر گھومنے اور دیکھنے کا بڑا شوق ہے۔ اس کی ایک وجہ ہے بچپن میں ہم بغداد کی کہانیاں پڑھتے اور سنتے آئے ہیں۔ چاہے وہ پریوں، جنوں اور شہزادوں کی داستان ہو یا پھر الف لیلیٰ۔''

''ہاں دوست! بغداد واقعی بہت خوب صورت ہے لیکن میں نے تمہارے وطن پاکستان کی بھی بہت تعریفیں سنی ہیں۔ وہاں کے لوگ بہت اچھے، محبت کرنے والے، مہمان نواز اور پُرخلوص ہوتے ہیں۔'' حماد نے بھی مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''اس میں تو کوئی شک نہیں۔ میرا وطن پاکستان پانچ خوب صورت دریاؤں کی سرزمین ہے۔ سارے موسموں کی فصلیں اترتی ہیں۔ مرغزار ہیں برف پوش پہاڑیاں ہیں۔ صحرا ہیں اور سب سے بڑی خوبی بارہ مہینے ٹھاٹھیں مارنے والا سمندر ہے۔''

ڈاکٹر کمال احمد بڑی محبت اور بڑے جذبہ حب الوطنی میں ڈوب کر اپنے پیارے وطن پاکستان کے بارے میں بتا رہا تھا اور حماد اندال بڑے پُرشوق انداز میں اس کی بات سن رہا تھا پھر بولا۔

''بے شک کمال! اتنی خوبیوں والا وطن خوب صورت ہی ہونا چاہیے۔ ہر انسان کو اپنے وطن سے اتنی ہی محبت ہوتی ہے اور ہونی بھی چاہیے۔'' پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''مگر دوست! یہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہی ہے کہ جب اپنے وطن پر ذرا بھی آنچ آتی ہے تو ہر محب وطن کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ میرے وطن عراق پر بھی ایک ایسی بری گھڑی خلیجی جنگ کی صورت میں آئی تھی۔ کچھ عاقبت نا اندیش جرنیلوں کی اندرونی سیاست کے باعث عراق کا یہ ایک بڑا نقصان ہوا۔ اس وقت وہ پہلی اسلامی ایٹمی قوت بن کر ورلڈ اسلامک نیشن کے نقشے میں ابھرنے والا تھا مگر اغیار کو اسلامی ملک کی متوقع ایٹمی طاقت ایک آنکھ نہ بھائی اور اسے سبوتاژ کر دیا گیا۔''

یہ بتاتے ہوئے حماد اندال کا چہرہ اداسی کا مظہر نظر آتا تھا۔ ڈاکٹر کمال کو ہمیشہ کرنٹ افیئرز پر اتھارٹی رہا کرتی تھی۔ وہ آج سے کئی سال پہلے کے تناظر میں عراق پر امریکا اور اس کے اتحادیوں کی لشکر کشی کے حوالے سے اس گفتگو کا اشارہ سمجھ رہا تھا۔ گہری متانت سے بولا۔

''ہاں ہر اسلامی ملک بالخصوص میرے پاکستان کے اہلِ دل میں اس کا دکھ اب بھی تازہ ہے جب امریکا کے اتحادیوں میں اسرائیل بھی پیش پیش تھا اور اس نے ہی سب سے پہلے عراق کے ایٹمی پلانٹ کو نشانہ بنایا تھا۔ اس سازش

کا ماسٹر مائنڈ بھی اسرائیل تھا اور اسے شروع سے ہی متوقع ایٹمی قوت والا عراق آنکھوں میں کھٹک رہا تھا۔''

''وہ تو ہوا سو ہوا مگر افسوس تو اس بات کا ہے کہ آخر اغیار کی سیازش کو اپنے ملک میں پھلنے پھولنے کا اور اندرونی سیاست کا موقع ہی کیوں دیا گیا؟'' حماد افسردگی سے بولا۔ تاہم اس کی آواز میں جوش کا ارتعاش بھی تھا۔'' آج ایک بار پھر وہی صورتِ حال ہے عراق نے گلف وار کے بعد جس تیزی سے خود کو دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا کیا تو ایک بار پھر اغیار کی سازشوں اور اندرونی سیاست کی ہانڈی پکنا شروع ہو چکی ہے۔ جو اسرائیلی خفیہ ہتھکنڈوں کے لیے راہیں ہموار کرنے لگی ہیں۔ میرے دوست کمال! میرا وطن عراق مجھے ایک بار پھر ڈانواں ڈول ہوتا نظر آرہا ہے۔ میرے والد شائل اس سلسلے میں بہت پریشان رہنے لگے ہیں۔ وہ ہم بچوں سے (حماد اور اس کی بہن حبیبہ) اپنی پریشانی چھپاتے ہیں مگر والدہ، (ام کلثومہ) سے ہر معاملے پر اظہار خیال کرتے رہتے ہیں۔ اس بار جب میں چند روز کے لیے بغداد گیا تو والد نے ہی مجھے یہ سب بتایا تھا کہ چند ایسے عراقی جرنیل، جنھوں نے جانے کتنے ہتھکنڈوں سے انقلابی کونسل میں اکثریت حاصل کرلی ہے وہ اب والد سمیت پارٹی کے ایسے اعلیٰ عہدیداروں کو کسی ایسی اندرونی سیاست کی سازش کا نشانہ بنانا چاہتے ہیں جن سے ان کی وطن سے وفاداری اور پارٹی سے غداری پر تشکیک کی مہر ثبت کی جاسکے۔ حالانکہ میرے والد اور ہمارے خاندان کی وطن اور پارٹی سے وفاداری کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے لیکن دوست، سازش اسی کو تو کہتے ہیں کہ اچھے بھلے آدمی کے چہرے پر کالک مل دی جائے۔''

حماد اتنا بتا کر خاموش ہو گیا۔ اس کا چہرہ اترا اترا تھا۔ آنکھوں میں غمگینی تھی اور اپنے وطن کو ایک بار پھر عالمی اور صیہونی سازش تلے تختۂ مشق بنتے دیکھنے کا دکھ ایک کرب مسلسل کی طرح اس کے ستے ہوئے چہرے سے مترشح تھا۔ ڈاکٹر کمال، حماد اپنے دوست کو اس قدر... آزردہ خاطر پا کر فوراً اٹھ کر اس کے پاس آیا، کافی کا کپ تپائی پر رکھا اور بڑی دوستانہ محبت کے ساتھ اپنا ایک ہاتھ اس کے کاندھے پر رکھتے ہوئے بولا۔

''حماد بھائی! افسردہ اور پریشان ہونے سے خطرات ٹل نہیں جاتے۔ بیرونی سازشیں تب ہی کامیاب ہوتی ہیں جب ایک ملک اور قوم کا باہمی اتحاد کمزور پڑنے لگے جبکہ اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ امتِ مسلمہ متحد ہو کر ایک ایسی زنجیر بن جائے کہ پھر اغیار کی سازشوں کو پھلنے پھولنے کا موقع ہی نہ ملے۔ اس کے ساتھ ہی ہم مسلمانوں کو اللہ کی رسی بھی مضبوطی سے تھامنا ہوگی۔''

حماد نے اپنے کاندھے پر دھرے ڈاکٹر کمال کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور ہولے سے تھپتھپایا۔ ان دونوں دوستوں کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے برادر اسلامی ملکوں کی باہمی اتحاد کی داغ بیل کا ادھر ہی سے آغاز ہونے لگا ہو۔

حماد تو ڈاکٹر کمال کی باتوں سے اس قدر متاثر ہوا کہ اٹھ کر اسے گلے سے لگالیا۔

''ہاں دوست! تم صحیح کہتے ہو۔ اغیار کی سازشوں کا توڑ قوموں اور امت مسلمہ کا باہمی اتحاد ہے۔''

اگلے دن کی صبح رات بھر کی بارش سے دھلی دھلی اور نکھری نکھری تھی۔ لندن کو بارشوں کا شہر بھی کہتے ہیں۔ اس قدر بارشوں کے باوجود مجال ہے جو سڑک پر یا کسی گھر کے آگے ذرا بھی پانی... جمع نظر آتا ہو۔ اس کی وجہ نکاسی کا بہترین نظام تھا۔ کیا مجال جو بجلی بھی جاتی ہو۔ بجلی جانا تو درکنار ایک ذرا سا جھٹکا بھی نہیں آتا تھا۔ شنید ہے کہ ایک بار لندن میں بجلی نے ہلکا سا جھٹکا لیا تھا تو الیکٹرک سٹی ڈیپارٹمنٹ کے چیف انجینئر کو معطل کر دیا گیا تھا۔

کارلو ڈاکٹر کمال کی موثر جوابی کارروائی کے بعد غائب رہنے لگا تھا۔ یہی نہیں اب ان مسلم اسکالرز طلبا نے بھی سکھ کا سانس لیا تھا۔ جو بے چارے اس امریکی نژاد کالے یہودی ڈی کارلو کی تضحیک و تشنیع کا نشانہ بنتے رہتے تھے مگر اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ کارلو بالکل ہی منظر سے غائب ہو گیا تھا۔ وہ نظر آتا رہتا تھا مگر پھر دوبارہ اس نے کسی سے الجھنے کی جرأت نہیں کی تھی البتہ ڈاکٹر کمال کے لیے وہ اپنے دل میں کینہ اور بغض رکھنے لگا تھا۔ کبھی کبھار ان کا سامنا بھی ہو جاتا تو ڈی کارلو اسے محض مخاصمانہ نظروں سے گھور کے رہ جاتا۔

اس روز ہالی ڈے تھا۔ ڈاکٹر کمال نے اپنے بھائی ظہیر احمد کے ہاں جانے کا پروگرام بتایا۔ ظہیر سینٹرل سٹی کے نواحی علاقے میں بالفاظ دیگر لندن کے مضافات میں ایک درمیانے درجے کے علاقے میں رہتا تھا۔ جدھر چھوٹے بڑے فلیٹوں کی بھرمار تھی۔ سینٹرل لندن میں کوئی فلیٹ سسٹم نہ تھا چند لگژری ہائی فائی اسٹینڈرڈ کے اپارٹمنٹ نظر آتے تھے۔ زیادہ تر لوگوں کے خوب صورت کشادہ مکان تھے۔ ایک منزلہ دو منزلہ...... یہاں ہر گھر میں بیس منٹ ضرور ہوتی تھی۔ یہاں بھی رہائش ہوتی تھی۔ عموماً لینڈ لارڈز اپنی بیسمنٹ کرائے پر دیا کرتے تھے۔ مکان بہترین اور بیش قیمت

عمارتیں لکڑیوں کے بنے ہوتے تھے۔ انگریزوں کا اپنا ایک پراپر لیونگ اسٹائل ہے۔ چاہے ساٹھ گز کا مکان ہی کیوں نہ ہو، وہ اپنے مکان کے آگے، پیچھے باغیچہ ضرور بناتے ہیں۔

لیڈز (Leeds) لندن کا ایک جدید علاقہ تھا۔

ڈاکٹر کمال اپنے کیمپس سے نکل کر بس اسٹاپ پر آگیا جو یونیورسٹی کیمپس کے گیٹ سے واکنگ ڈسٹینس پر تھا۔ سردی زوروں پر پڑ رہی تھی۔ گوروں نے موسم کی مناسبت سے بڑے موٹے اونی لباس پہنے ہوئے تھے۔ کمال نے بھی اپنی دراز قامت پر لمبا چسٹر پہن رکھا تھا۔ جس کے کالر کھڑے کر رکھے تھے۔ پیروں میں لانگ بوٹ تھے۔

ظہیر احمد لیڈز کے جس نواحی علاقے میں رہتا تھا، وہ زیادہ دور نہ تھا۔ وہ ٹیوب میں سوار ہوا اور لگ بھگ کوئی پندرہ منٹ میں ٹنل پہنچ گیا۔ علاقے کا نام غیر ملکیوں اور مقامی دونوں کے لیے عجیب و غریب تھا مگر اس کی ایک تاریخی وجہ تھی۔ بہت پہلے جنگِ عظیم دوم میں اتحادیوں نے یہاں جرمن قیدیوں کو رکھا ہوا تھا۔ یہ عام قیدی نہ تھے وہ گسٹاپو کے اعلیٰ افسر تھے۔ چند جاپانی قیدی بھی تھے۔ یہ لوگ یہیں سے کوئی ڈیڑھ سو فٹ لمبی سرنگ بنا کے فرار ہوئے تھے۔ وہ سرنگ آج بھی قائم تھی اگرچہ یہاں اب نکاسی کے موٹے موٹے سیلن زدہ زنگ آلود پائپ بچھا دیے گئے تھے۔

''ٹنل'' ہماری اصطلاح میں ایک گاؤں ہے مگر لندن کے گاؤں بھی کسی خوب صورت شہر کا ہی منظر پیش کرتے تھے۔ سرسبز فارم یہاں بھی بنے نظر آتے تھے۔ بڑے بڑے طویل گھاس کے میدانوں پر پن چکیاں گھومتی رہتی تھیں۔ اوپر کھلا نیلا آسمان ہوتا۔ سکون اور خاموشی رہتی تھی۔

ڈاکٹر کمال اپنے بھائی اور بھابی پروین اور اپنے دونوں بھتیجوں کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لے کر جاتا تھا۔ اس دن بھائی بھی گھر پر ہوتا تھا۔ فون پر ان کی بات ہو جاتی تھی۔ ایک سگے بھائی کے مقابلے میں بھابی پروین کا رویہ ڈاکٹر کمال یعنی دیورجی کے ساتھ اچھا ہوتا تھا پھر دونوں بچے بھی کمال سے بے حد مانوس تھے۔ وہ ان کے ساتھ کھیلتا بھی تو بچوں کی طرح تھا۔ ظہیر عام سے انداز میں بھائی سے ملتا تھا لیکن اس بار کمال کو ظہیر کچھ الجھا الجھا سا دکھائی دیا۔ بھابی بھی خاموش خاموش سی نظر آئیں۔ کمال کو اچنبھا تو ہوا تاہم چپ رہا۔ بھابی پروین اسے زبردستی دوپہر کے کھانے پر روک لیا کرتی تھیں یوں وہ سہ پہر کو ہی واپس وہاں سے کیمپس لوٹتا تھا۔

جلد ہی بات کھل گئی۔ جب دونوں بھائی کھانے کے بعد اکٹھے ایک کمرے میں چائے پینے لگے تو ظہیر احمد نے ایک لفافہ کمال کی طرف بڑھا دیا۔ یہ پوسٹل لفافہ تھا یعنی خط تھا جو بہاولپور (پاکستان) سے ظہیر احمد کے نام آیا تھا۔

''یہ کیا ہے بھائی جان؟'' ڈاکٹر کمال نے اپنے چہرے کی عینک درست کرتے ہوئے بڑے بھائی سے پوچھا، ساتھ ہی لفافہ تھام لیا۔

''تم خود ہی پڑھ لو، اب تمہیں کیا بتاؤں؟ تم تو ایسے لندن آئے ہو کہ پیچھے پلٹ کر بھی دیکھنا گوارا نہ کیا۔'' ظہیر کڑوے سے لہجے میں بولا۔ ''کہ وہاں ہماری دو بہنیں بھی رہتی ہیں۔''

کمال کے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ تھا مگر وہ بڑے بھائی کی عزت کرتا تھا اس لیے خاموش ہی رہتا تھا۔ اس نے لفافہ کھول کر خط نکالا۔ یہ خط ان کی بہن راشدہ کا تھا۔ بڑا ہی دکھ بھرا خط تھا۔ راشدہ کے مقابلے میں ثمینہ خوش نصیب بہن تھی جو اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی بہاولپور کے نواحی گاؤں میں زندگی بتا رہی تھی مگر بے چاری راشدہ کا نصیب خراب نکلا تھا۔ اس کا شوہر لالچی اور بد دماغ تھا۔ ابتدا میں تو سب ٹھیک ٹھاک تھا۔ تین بچوں کی ولادت بھی ہوئی مگر پھر جانے کیا ہوا کہ راشدہ کے شوہر شمس کا رویہ اپنی بیوی سے خراب رہنے لگا۔ ایسا تب سے ہونے لگا جب اس کی نوکری چھوٹی تھی۔ پھر دوبارہ اسے کہیں ملی بھی نہیں۔ وہ مایوس اور چڑچڑا رہنے لگا۔ بیوی کو مارتا پیٹتا اور معصوم بچوں کو بھی ذرا ذرا سی بات پر دھن کے رکھ دیتا۔ خط کے متن کے مطابق راشدہ نے ظہیر احمد اور کمال احمد اپنے دونوں بھائیوں کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ شمس نے اس کی اور بچوں کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ آئے روز طعنے دیتا رہتا ہے۔ تیرے دو دو بھائی لندن میں ہیں اور تجھے کوئی پوچھتا تک نہیں۔ کہہ دے ان کو تجھے میں آج طلاق دے کر گھر سے نکال باہر کروں تو، تو کدھر جائے گی۔ اس کا اصل مقصد محض یہ ہوتا تھا کہ انہیں بھی لندن بلا لیا جائے۔ دماغ اس کے گھر والوں اور دوستوں نے خراب کیا تھا۔ راشدہ نے یہ بھی لکھا تھا کہ وہ اپنے شوہر کے کہنے پر اپنے بھائیوں کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی مگر شمس کی طرف سے دن بہ دن دباؤ اور بڑھتے ہوئے ظلم کے نتیجے میں وہ ایسا خط... بھائیوں کو انتہائی مجبور ہو کر لکھ رہی ہے، ہو سکے تو اس بدنصیب بہن کو معاف کر دینا۔

بہن کے خط کا لب لباب یہی تھا جسے پڑھ کر ڈاکٹر کمال کو دکھ بھی ہوا اور اپنے لالچی بہنوئی پر غصہ بھی آیا۔

''ٹھیک ہی تو لکھا ہے بہن نے۔ اس وقت خاندان میں سب سے زیادہ آزاد، بے فکری اور خوش حال زندگی تم ہی گزار رہے ہو۔ کمال! کم از کم تم ہی راشدہ بے چاری کا خیال کرلیا کرو۔'' بڑے بھائی نے حسب عادت اس پر طنز کرنا شروع کردیا۔ کمال بڑے بھائی کی تلخ بات کو پی گیا اور بردباری سے بولا۔

''بھائی جان! مجھے تو لندن آئے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں اور انشاء اللہ جلد سے جلد اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس اپنے وطن لوٹ ہی جاؤں گا لیکن باوجود اس کے میں راشدہ کا ہی نہیں، ثمینہ بہن کا بھی خیال رکھتا ہوں۔ ماموں جب زندہ تھے تو ان کے بوڑھے کاندھوں پر جوان بیٹیوں کا بوجھ آن پڑا تھا۔۔ وہ بھی میں نے ہی بانٹا تھا ابا کے ساتھ۔ لندن آ کے اپنی تعلیمی مصروفیات کے باوجود میں راشدہ کو پیسے بھیجتا رہتا ہوں اب آپ اپنے بارے میں بتائیں ذرا'' آپ کو تو ایک عرصہ ہوا لندن میں سیٹل ہوئے۔ آپ نے چھوٹے بہن بھائیوں اور بوڑھے ماں باپ کے لیے کیا کیا تھا؟''

''اب تم گڑے مردے اکھاڑو گے۔ اس وقت میرے ساتھ مجبوریاں تھیں۔ اتنی آسانی سے میں یہاں سیٹل نہیں ہوا۔'' ظہیر احمد لاجواب ہونے لگتا تو بات کا رخ دوسری طرف موڑنا شروع کردیتا تھا۔

''بھائی جان! ماشاء اللہ آپ تو شادی کے بعد سے ہی یہاں اچھا خاصا سیٹ ہو چکے تھے۔'' کمال تحمل سے بولا۔

''اور میں کہاں سے خوشحال ہوں؟ جو کچھ میں نے پاکستان میں رہتے ہوئے نوکری میں کمایا، وہ بوڑھے ماں باپ کی بیماری اور پھر دونوں بہنوں کی شادیوں پر خرچ کر ڈالا۔ اعلیٰ تعلیم کا چانس ملا تو یہاں آ گیا مگر مجھے اب بھی جو تنخواہ ملتی ہے، وہ پاؤنڈ یا ڈالر کے حساب سے نہیں پاکستانی کرنسی کے حساب سے ملتی ہے۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ پاکستانی روپے کی پاؤنڈ اور ڈالر کے سامنے کیا حیثیت ہے؟ جو یہاں کی کرنسی میں تبدیل کر کے اونٹ کے منہ میں زیرے کی مثال بن جاتی ہے۔۔ لندن جیسے مہنگے ترین شہر میں پاکستانی آمدنی کے سہارے گزارنا کس قدر مشکل ہے۔ یہ میں ہی نہیں، آپ بھی جانتے ہوں گے بھائی جان...... پھر ہمیں نوکری کرنے کی بھی اجازت نہیں ہوتی۔ اگر چوری چھپے اس کی کوشش کی بھی جائے تو فوراً انکوائری ہو جاتی ہے اور ایسے اسکالر کو فوراً نان گریٹا پرسن کا لیبل لگا کر لندن بدر کردیا جاتا ہے۔''

''مجھے یہ علمی بجھارتیں نہ سمجھاؤ۔'' ظہیر ناگواری سے بولا۔ ''بھلا تمہارے اکیلے آدمی کا کیا خرچہ ہے۔ اسکالر شپ پر آئے ہو، تمہارا تعلیمی خرچہ تو پاکستان اٹھا رہا ہے۔''

''ہاں بھائی جان! اس لیے محض گزارہ ہی ہو رہا ہے اور اپنی استطاعت کے مطابق میں پاکستان بہنوں کے لیے کچھ نہ کچھ بھیجتا رہتا ہوں۔ آپ بتائیں آپ نے ان دس پندرہ سالوں میں کیا بھیجا؟''

ظہیر لاجواب ہونے لگا اور آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ کمال کا مقصد بڑے بھائی کو منہ توڑ جواب دینا ہرگز نہیں ہوتا تھا مگر اسے بھائی کی اس بات پر دکھ ہوتا تھا کہ وہ اپنی کمزوریوں اور بے حس خودغرضیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے بلاوجہ اسے نشانہ بناتا رہتا تھا۔

بھابی پروین کسی قریبی چوکھٹ کے پار سے دونوں بھائیوں کی تلخ کلامی کو سن رہی تھی۔ اندر آ کر شوہر سے بولی۔

''کمال بھائی سچ کہہ رہے ہیں ظہیر...... یہ بے چارے تو خود لندن میں رہتے ہوئے پاکستانی تنخواہ پر گزارہ کر رہے ہیں۔ یہاں تنخواہ لے رہے ہوتے تو الگ بات تھی۔ آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ راشدہ بہن کے شوہر کو اسپانسر شپ پر یہاں بلالیں اور اپنے ساتھ کام پر لگالیں۔ آپ کو تو یہاں کی نیشنلٹی بھی مل چکی ہے۔''

بیوی کی بات پر ظہیر نے کڑی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور جل کر بولا۔ ''تو میں یہاں کیا درختوں سے روپے توڑ رہا ہوں؟ ایک چھوٹا سا ڈپارٹمنٹل اسٹور ہی چلا رہا ہوں۔ تم اپنا کام کرو، اندر جاؤ یہ ہم بھائیوں کا آپس کا معاملہ ہے۔''

پروین واقعی نیک پروین تھی، وہ روایتی بھابیوں کی طرح نہیں تھی کہ اپنے دیور اور اپنی نندوں کے خلاف شوہر کے کان بھرتی ہو بلکہ وہ ایک سلیقہ شعار، سگھڑ اور نیک فطرت عورت تھی۔ ڈاکٹر کمال کی طرح وہ بھی جانتی تھی کہ ظہیر احمد کس قدر خوش حال اور آسودہ حال زندگی بسر کر رہا تھا اور اگر چاہتا تو اپنی نصیبوں جلی بہن راشدہ کی مدد کرسکتا تھا۔

''آپ لوگ پلیز میری وجہ سے اپنے گھر کا ماحول خراب نہ کریں۔'' ڈاکٹر کمال دونوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''میں ٹیلی فون پر شمس بھائی سے بات کر کے انہیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں مگر بھائی جان پلیز! آپ میری مجبوریوں کو بھی سمجھیں۔ میں نے وطن میں رہتے ہوئے اماں ابا اور بہنوں کے لیے جو کرسکا، وہ کیا۔ یہاں میں اپنی تعلیم مکمل کرنے آیا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے بعد پاکستان جا کر میں راشدہ بہن کے لیے ہی نہیں بلکہ ثمینہ بہن

کا بھی خیال رکھتا رہوں گا لیکن ابھی آپ سے جو کچھ ہو سکے، وہ کم از کم راشدہ بہن کے لیے ضرور کریں۔ دیکھیں بھائی جان! بھائی بہنوں کے رشتے دنیا میں ایک بار ملتے ہیں۔ وہ بہت مقدس اور محترم ہوتے ہیں......" یہ کہہ کر وہ بڑے دلگیر انداز میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔

واپسی میں اسے شام ہونے لگی۔ بھائی کے گھر سے اداس اداس سا نکل کے وہ سڑک پر آ گیا۔ نثل پر سوگواری خاموشی چھانے لگی تھی۔ قریب گھاس کے میدان کے ساتھ ساتھ لائن سے آٹھ دس پن چکیاں ہوا کے دوش پر گردش کر رہی تھیں۔ اسے ٹیوب، کا انتظار تھا جو تھوڑی دیر میں آ گئی دروازے سلائڈ ہوئے اور کمال اس میں سوار ہو گیا۔

لیڈز کے مین اسٹاپ پر اتر کر وہ کیمپس کی طرف قدرے تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ بہن کے حالات جاننے کے بعد اس کا دل و دماغ بجھا بجھا سا تھا۔ وہ بہت افسردہ ہو رہا تھا۔ اسے اپنی دونوں بہنوں سے شدید محبت تھی۔ ثمینہ تو بڑی بہن تھی جبکہ راشدہ اس سے دو تین سال چھوٹی ہی تھی۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد پاکستان میں جب تک کمال رہا، وہ اپنی دونوں بہنوں کی خبر گیری رکھتا تھا۔ دیارِ مغرب میں رہنے کا اسے نہ شوق تھا، نہ ہی آگے اس کا ایسا کوئی ارادہ تھا۔ وہ تو محض ایک محدود عرصے کے لیے یہاں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے آیا تھا اور اس کے بعد اس نے واپس وطن لوٹ جانا تھا۔ اپنے وطن کی خدمت کرنا تھی جس نے اس کا اتنا خرچہ اٹھا رکھا تھا۔ وہ اپنے ملک کے غریب عوام کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ اس کا ارادہ اپنے آبائی شہر بہاولپور میں ایک چیریٹی میڈیکل سینٹر قائم کرنے کا تھا۔ جو ہر غریب کا مفت علاج کرتا۔ کئی لوگ ایسے تھے جو دیارِ غیر میں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے آتے اور پھر یہاں سے ملنے والی بڑی بڑی آفرز قبول کر کے ادھر کے ہی ہو کر رہ جاتے تھے مگر ڈاکٹر کمال احمد کا ایسا قطعاً کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اسے اپنے وطن سے، اپنی مٹی سے محبت تھی۔ وہ خود کو اب پہلے سے زیادہ اس عظیم مٹی کا مقروض سمجھنے لگا تھا۔

انہی خیالات میں کھویا ہوا وہ فٹ پاتھ پر چلا جا رہا تھا اور جب یونیورسٹی کیمپس کے گیٹ کی طرف بڑھنے کے لیے وہ سڑک کراس کرنے لگا تو اچانک اسے عقب میں کسی گاڑی کے پہیوں کی تیز چرچراہٹ کی آواز سنائی دی۔ لگتا ایسا ہی تھا جیسے کہیں قریب ہی کھڑی کوئی گاڑی گرج دار آواز کے ساتھ اچانک دوڑتی ہوئی اس کے تعاقب میں بڑھی ہو۔ وہ بری طرح چونک کر رکا اور پلٹ کر دیکھا تو لرز گیا۔

ایک شیورلٹ کار تیزی کے ساتھ اسے روندنے کے لیے اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ کار اور اس کے درمیان کا فاصلہ بہت کم رہ گیا تھا۔ کمال کے اعصاب تن گئے۔ اس نے خود کو کار کی خوفناک ٹکر سے بچانے کی بھرپور کوشش کرنا چاہی۔ کافی حد تک وہ کامیاب بھی رہا مگر بدقسمتی سے بچتے بچتے وہ کار کے سائڈ ویو سے ٹکرا ہی گیا۔ اس کے حلق سے غیر ارادی طور پر ایک چیخ خارج ہوئی۔ کار کی سائڈ ٹکر لگنے سے وہ اچھل کر فٹ پاتھ پر آ رہا اور وہاں ایستادہ ایک لیمپ پول سے ٹکرا کر سڑک پر گرا۔ گرتے وقت اس کی نظریں کار پر

افسانچہ

زندگی میں پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ وہ میرے لیے کیا تھی۔ اس سے جدا ہونے کے بعد زندگی کا ہر رنگ بے رونق ہے جیسے دل کسی ویرانے میں پہنچ گیا ہو۔ میرے ہونٹ مسکرانا تک بھول گئے ہیں زندگی کا یہ میرا پہلا فیصلہ ہے جس پر میں پشیمان ہوں۔

آج میں سوچتا ہوں کہ میں نے اسے چھوڑنے کا فیصلہ کیوں کیا؟ مجھے کیا خبر تھی کہ اس سے جدا ہو کر میں تمام خوشیوں سے دور ہو جاؤں گا۔ مجھ سے میری مسکراہٹ اور زندگی کے تمام رنگ روٹھ جائیں گے، تمام خوشیوں سے دور ہو جاؤں گا۔ مجھ سے میری مسکراہٹ اور زندگی کے تمام رنگ روٹھ جائیں گے۔ اس سے جدا ہوتے وقت مجھے یقین تھا کہ میں کسی بھی مشکل کا مردانہ وار مقابلہ کروں گا لیکن میں تو بے حد کمزور نکلا۔ اب میں اسے دیکھ کر سوچتا ہوں کہ وہ کتنا خوش نصیب ہوگا جو اس کے قریب ہوگا۔ وہ میرے دل میں ایک خوب صورت یاد کی طرح ہے۔ ایک خزانے کی طرح میرے دل میں بند ہے۔

اے میری پیاری ''نظر کی عینک'' میں تم سے جدا ہو کر بے حد پچھتا رہا ہوں، تم جلد از جلد دوبارہ میرے پاس آ جاؤ۔

مرسلہ۔ محمد محسن فاروقی،
ہائی سیکیورٹی زون، نیو سینٹرل جیل ملتان

پڑیں تھیں جو یونیورسٹی کیمپس کے گیٹ کے سامنے سے تیزی سے گزرتی چلی گئی۔ اس نے گیٹ سے کسی کو باہر دوڑتے ہوئے، نکلتے بھی دیکھا تھا پھر اس کے بعد اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

"فکر نہ کرو، میرے پاس اس کا حل موجود ہے۔" ان دونوں کے دھواں دھواں پڑتے چہروں کو دیکھتے ہوئے کپتان موسیٰ نے فوراً کہا۔ اس کا انداز تسلی آمیز تھا۔

"میں شپ کو روکنے کا حکم دیتا ہوں۔ جب تک تم دونوں آکسیجن سلنڈر چڑھا کر فوراً پانی میں اتر جاؤ۔ آؤ جلدی میرے ساتھ۔"

کپتان موسیٰ نے ایک طرف سمندر میں اینکر ڈالنے کا حکم دیا اور دوسری طرف نائمہ اور عابد کو غوطہ خوری کا لباس پہنا کر دونوں کو مقناطیسی پلیٹس بھی تھما دیں کپتان موسیٰ نے انہیں ہدایت کردی کہ پانی میں اترتے ہی اپنے آپ کو جہاز کے فریم کے ساتھ چپکا دینا۔ آخری ہدایت کے مطابق اس نے یہ بھی کہا۔ "خبردار! شپ کے دنبالے کی طرف مت جانا ورنہ دیوہیکل پروپیلر تمہارے جسموں کا ایک لمحے میں قیمہ بنا دیں گے۔"

دونوں نے ایک دوسرے کو اسی کے ذریعے سے باندھے رکھا تھا تاکہ ایک۔۔۔۔ دوسرے سے جدا نہ ہوں۔

عابد اور نائمہ آکسیجن سلنڈر لگائے پانی میں اتر گئے۔ ہلکورے کھاتے تاریک سمندر کے پانیوں میں دونوں کافی دیر تک رہے اور دونوں نے ایک دوسرے کو بازوؤں سے تھامے رکھا اور دل ہی دل میں خدا سے خطرہ ٹل جانے کی دعائیں بھی مانگتے رہے۔ کافی دیر گزر گئی۔ اچانک، انہیں جہاز کی باڈی میں مخصوص قسم کی تھرتھراہٹ میں اضافہ ہوتا محسوس ہوا۔ یکبارگی مسرت سے عابد کا دل زور سے دھڑکا گویا جہاز نے سفر شروع کر دیا تھا۔ ان کے تھکے دلوں میں مسرت جاگی مگر دوسرے ہی لمحے ایک زبردست گڑگڑاہٹ کی آواز ابھری اور پانی کے اندر جہاز کے فولادی فریم میں ہیبت ناک لرزش پیدا ہوئی اور ان کی مقناطیسی پلیٹس اس قدر گرم ہوگئیں کہ ان کی حدت سے دونوں کے ہاتھ جلتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ پانی کے اندر اور تاریکی میں انہیں کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ اوپر کیا ہو رہا تھا؟ مگر عابد شکیمری کو کسی خوفناک گڑبڑ کا احساس ضرور ہو گیا تھا۔ جہاز کی دہکتی باڈی سے انہوں نے خود کو پہلے ہی علیحدہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد پانی میں زبردست ہلچل اور جوار بھاٹا کی سی کیفیت پیدا ہونا شروع ہو گئی۔ عابد دہل کر رہ گیا۔ شاید اسے کچھ متوقع خوفناک حقیقت کا اندازہ ہو چلا تھا۔ اس نے نائمہ کو ساتھ لیا اور پیروں میں موجود لمبے لمبے فلپرز کی مدد سے پاؤں چلاتے ہوئے جہنم زدہ بنتے جہاز سے جتنی دور جا سکتے تھے، دور ہو گئے تاہم ان کی کوشش یہ بھی تھی کہ وہ سطح آب پر ابھرنے نہ پائیں۔ نائمہ کو بھی کسی خوفناک گڑبڑ کا ادراک ہو چکا تھا۔ اس نے خود کو مکمل طور پر پانی کے اندر عابد کے حوالے کر دیا تھا۔

تاریکی اور پانی کی دھندلاہٹ کے باوجود عابد کو آتشیں سرخی کا بھی احساس ہونے لگا تھا۔ لگتا ایسا ہی تھا کہ اسرائیل جنگی ہیلی کاپٹر نے ذرا سے شبہے کی بنیاد پر اپنی فطری بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جہاز پر میزائل داغ کر اسے تباہ کر ڈالا تھا اور اب غالباً تباہ حال جہاز جلتے سلگتے ملبے کی صورت میں غرقاب ہونے لگا تھا۔ عابد کی ایک زندگی سمندر گردی میں گزری تھی لہٰذا وہ اس خوفناک حقیقت سے اچھی طرح واقف تھا کہ جہاز ڈوبنے کی صورت میں وہ اپنے اوپر اور تقریباً کئی سو فٹ کے دائرے کی صورت میں ایک خوفناک بھنور پیدا کرتا ہے اور اس دائرے کی حدود کی زد میں جو بھی آتا ہے اسے بھی تباہ شدہ جہاز کے ساتھ ہی ڈوبنا پڑتا ہے۔ یہی سبب تھا کہ عابد کی حتی الامکان کوشش تھی کہ وہ اور نائمہ یہ موت کا بھنور بننے سے پہلے ہی اس قاتل دائرے سے دور ہو جائیں مگر ان کی یہ کوشش بھی نقش برآب ثابت ہوئی۔ جہاز پورا غرق ہونے لگا اور پانی کے اندر ہاتھوں پیروں کو چپوؤں کی صورت چلاتے ہوئے اس کا جسم بھی شل ہونے لگا تھا کہ اچانک انہیں احساس ہوا کہ ان کے پانی کے اندر آگے بڑھنے کی رفتار صفر ہو چکی تھی۔ حیفہ کی بندرگاہ سے کئی ناٹیکل میل دور بحیرۂ روم کے گہرے سمندر میں بنتے اس خوفناک بھنور میں دو گوشت پوست کے انسان بغیر کسی آبی وسائل کے اپنی بقا کی جنگ لڑنے میں مصروف کار تھے اور سوائے اللہ کی طرف سے غیبی مدد کے ان دونوں کو اور کسی کا آسرا نہیں تھا مگر جان تو ایک چیونٹی کو بھی پیاری ہوتی ہے جسے بچانے کے لیے وہ بھی تڑپتی ہے، وہ دونوں بھی رات کی پرہیبت تاریکی میں گہرے پانیوں میں تڑپ رہے تھے۔ اپنی جان بچانے کے لیے کوشاں تھے اور سر دھڑ کی بازی لگا رہے تھے مگر لگتا اب یہی تھا کہ جیسے خوفناک بھنور ایک آبی عفریت کی طرح اپنا دہانہ کھولے انہیں ہڑپ کرنے کے لیے تیار تھا۔

دونوں کی رفتار صفر کے درجے پر تھی، وہ جیسے پانی میں

نہیں گویا ہوا میں بے سود ہی ہاتھ پاؤں مار رہے تھے جبکہ موت سامنے نظر آرہی تھی۔ایک پانی اور دوسری آگ کی موت بڑی دردناک ہوتی ہے۔اچانک یہ دونوں بھی بھنور کی زد میں آگئے، گول گھومنے لگے تیزی سے تہہ آب ہونے لگے۔انہیں اپنی جاں گسل موت سامنے نظر آرہی تھی۔شاید انہیں اپنی یقینی موت کا اندازہ بھی ہو چلا تھا عابد نے نائمہ کو اپنے آپ سے لپٹا لیا تھا۔جان بچانے کی ہر کوشش ناکام ثابت ہوتے ہی انہوں نے بھی اپنے ہاتھ پاؤں چھوڑ دیے تھے۔۔بھنور تیزی سے گردش کرتا انہیں اپنی گود میں لیے موت کی اتھاہ تاریک وادی میں لیے جارہا تھا۔عابد اور نائمہ ایک دوسرے کے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کرسکتے تھے۔ گہرے پانیوں میں بننے والے بلبلوں کی وحشت ناک آوازیں انہیں اپنی سماعتوں میں جیسے یقینی موت کی سرگوشیاں محسوس ہو رہی تھی۔

آکسیجن سلینڈر اب زیادہ دیر تک مستعار سانسیں نہیں فراہم کرسکتے تھے۔تاہم ٹینک میں جتنی آکسیجن باقی بچی تھی وہ گویا ان کی مستعار سانسیں ہی تھیں۔ عابد نے نائمہ کو خود سے لگا رکھا تھا اور نائمہ اس سے یوں چمٹ گئی تھی جیسے اس نے بھی عابد شیکھری کے ساتھ ہی مرنے کا ارادہ کرلیا ہو۔

عابد شیکھری کی آنکھیں ماسک کے شیشے کے اندر سے تیزی کے ساتھ گردش کررہی تھیں۔ اسے ہر طرف پانی کے بلبلوں اور ہیبت ناک شور کے سوا کچھ دکھائی اور سنائی نہیں دے رہا تھا کہ اچانک اس کی نیم مردہ آنکھوں میں امید کی ایک چمک اتھاہ تاریکیوں میں ٹمٹماتی جوت کی طرح جاگی۔

ایک لمبی بیضوی فولادی سی دیوہیکل شے کی جھلک اسے خود سے ذرا فاصلے پر نظر آئی تھی وہ شے بیرونی طرف سے بالکل سپاٹ دکھائی دیتی تھی، البتہ اوپری سطح پر مخصوص قسم کی دھاتی پٹیاں ابھری ہوئی نظر آرہی تھیں۔

''آب دوز۔''

معاً عابد شیکھری کے ذہن میں ابھرا پھر اس نے نائمہ کو آہستگی کے ساتھ خود سے جدا کیا اور اشارہ کیا اور اس کا ہاتھ تھاما۔بھنور کی گردش ہی کے سہارے وہ دونوں اس آب دوز کی سطح سے جا ٹکرائے اور پھر لپک کر عابد نے آب دوز کی سطح پر ابھری دھاتی پٹی پر اپنے ایک ہاتھ کی گرفت جما دی۔تب تک نائمہ بھی بہت کچھ سمجھ اور جان چکی تھی۔ اس

سسرال

دوزخ میں کچھ عورتیں بہت خوش تھیں۔

شیطان نے فرشتے سے پوچھا۔''یہ کون عورتیں ہیں جو یہاں بھی اتنی زیادہ خوش ہیں؟''

فرشتہ ''سب کی سب بیوہ عورتیں ہیں، کمبخت آتے ہی ایڈجسٹ ہوگئیں، کہتی ہیں، بالکل سسرال والا ماحول ہے۔''

مرسلہ: رضوان تنولی کریزدی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

نے عابد کو اپنے بوجھ سے الگ کیا۔اس کی تقلید میں وہ بھی آب دوز کی سطح کے ساتھ چمٹ گئی۔آب دوز کی سطح سے چمٹتے ہی انہیں ارتعاش کا احساس ہوا، آبدوز...... اب بھنور کے حصار کو تیزی سے کاٹتی ہوئی اپنے نامعلوم سفر کی طرف گامزن تھی، زندگی بچنے کی کیا سبیل نظر آئی تھی کہ ان دونوں کے حوصلے بھی پھر سے بلند ہوگئے۔ عابد کا ذہن تیزی سے کام کررہا تھا، آب دوز کے سہارے وہ اس قاتل بھنور سے نکل تو آئے تھے مگر انہیں معلوم نہیں تھا کہ یہ آب دوز کس ملک کی تھی؟ اگر اسرائیل کی تھی تو پھر یقیناً ان کے لیے آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والی بات ہوجاتی لیکن یقینی موت کے فوری خطرے سے بچنے کے لیے اور دوسری کوئی راہ بھی نہ تھی۔ دونوں آب دوز کی سطح سے چپکے ہوئے تھے اور آب دوز کس منزل کی طرف گامزن تھی؟ یہ وہ نہیں جانتے تھے، عابد کو ایک بات کا اور خدشہ بھی تھا۔اگر یہ دشمنوں کی یا کسی اور ملک کی آب دوز تھی، تو...... کوئی بعید نہ تھا کہ ...انہیں آب دوز کے اندر بیٹھ کر بھی اپنے طاقتور ریڈار اینڈ اپی اسکوپ سسٹم کے ذریعے دیکھا تو جاسکتا ہے تاہم اس میں ایک احتمال بھی تھا کہ مذکورہ سسٹم metallic کی حد تک ہی دیکھنے کا محتاج ہوتا ہے۔بہر حال اب جو بھی تھا، تقدیر پر بھروسے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

آب دوز، کسی دیوہیکل وہیل مچھلی کی طرح ان دونوں کو اپنی پشت پر لیے انجانی منزل کی طرف گامزن تھی۔فکر کی بات اب یہ تھی کہ یہ دونوں زیادہ دیر سمندر کے اندر آب دوز کے سہارے بھی نہیں رہ سکتے تھے، ان کے سلینڈرز میں آکسیجن کی مقدار محدود تھی، ایک بار عابد کے جی میں آئی تھی کہ اب چونکہ وہ آبدوز کی وجہ سے قاتل بھنور کی زد سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئے تھے لہٰذا آب دوز کی گرفت چھوڑ کر سطح آب پر چلے جاتے، مگر بات پھر وہی ہوتی وسیع وعریض حدنگاہ تک پھیلے ہوئے سمندر میں آخر کب تک کسی

مدد کے سہارے ہلکورے لیتے رہتے؟

دفعتاً آب دوز کی سطح پر کچھ عجیب سی ہیبت ناک آوازیں ابھریں۔ یوں لگا جیسے وہ اپنا رخ بدل رہی ہو۔ عابد کو اتنا تو معلوم تھا کہ اکثر و بیشتر آبدوز کو آکسیجن کا ذخیرہ کرنے کے لیے گاہے بگاہے سطح آب پر آنا ہی پڑتا ہے...... ممکن تھا ایسی کسی امید افزا صورتِ حال میں مفر کی راہ میسر آجاتی۔

آبدوز سے اچانک ابھرنے والی یہ آواز ''غرارے'' کرنے سے مشابہ تھی۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ عابد شکھری ایک طویل عرصے سے جہاز رانی کے شعبے سے وابستہ تھا تاہم آبدوز ایک الگ شعبہ تھا مگر پھر بھی وہ اتنی جانکاری تو رکھتا تھا کہ آب دوز کی اس مخصوص آواز پر خوشی سے چونک نہ پڑے۔ غرارے کرنے جیسی اس مخصوص آواز کا مطلب تھا کہ آبدوز سطح آب پر آنے والی تھی۔ اس نے نائمہ کو ایک مخصوص اشارہ کیا اور پھر دھیرے دھیرے آبدوز کی پھسلواں سطح میں آہنی رنگوں اور دھاتی پٹیوں کے سہارے وہ اس کی پشت کے ایسے حصے کی طرف آگیا جدھر آبدوز کے ''بفر زون'' ہونے چاہیے تھے۔ اس کے محتاط اندازے کے مطابق آبدوز کے سطح آب پر آتے ہی سب سے پہلے ایک خود کار نظام کے تحت یہی دروازے کھلتے تھے، ان کے ساتھ ہی ایمرجنسی ڈورز بھی بنے ہوتے تھے۔

آبدوز دھیرے دھیرے غرارے کرتی ہوئی سطح آب پر آگئی تو نائمہ نے آکسیجن ماسک اپنے چہرے سے ہٹا کر کھلی کھلی تازہ فضا میں گہرے گہرے سانس لیے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے سلنڈر میں آکسیجن کی مقدار ختم ہونے والی تھی۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ مارے دہشت کے لرز اٹھی تھی۔

☆☆☆

زبیدہ اور لیلیٰ...... اپنے ایک ساتھی کے ساتھ تل کرم پہنچ چکی تھی۔ یہاں ایک تاجر کے مکان کے تہ خانے میں ان کی خفیہ میٹنگ تھی۔ غضب خدا اور پی فرنٹ کے کمانڈرز بھی وہاں موجود تھے۔ یاسر العربی، شہید خلیل الوزیر کا نائب تھا۔ اب اس نے ہی غضب خدا کی کمان سنبھالی ہوئی تھی، وہ ایک پختہ العمر اور لمبے قد کا فلسطینی مجاہد تھا جبکہ پی فرنٹ کا خالد بن جنید پچیس چھبیس سالہ جوان اور خوبرو مرد تھا۔ ان کے علاوہ دیگر اہم ساتھی بھی موجود تھے، تازہ صورت حال کے مدنظر اس خفیہ میٹنگ کا دورانیہ بہت مختصر رکھا گیا تھا، اسی لیے رسمی گفتگو سے اجتناب ہی برتا گیا اور فوراً ہی کارروائی شروع کر دی گئی۔

لیلیٰ کو مذکورہ مجاہد کمانڈرز نے نجف میں واقع اسرائیلی ڈیمون نیوکلیئر پاور پر کامیاب حملے کی مبارکباد دی۔ اس کی اور اس کی مجاہدانہ کاوشوں کو سراہا تھا، اسی طرح الجاہد کی زبیدہ کو بھی خراج تحسین پیش کیا تھا کہ اس نے تیونان میں واقع ڈیوڈ اسٹار کے ہیڈ کوارٹر میں جزوی کامیابی حاصل کی تھی اور اسرائیل کے دو بڑے شیطان دماغ سربرآوردہ یہودیوں ایہود شابک اور اضحاق شامیر کو جہنم واصل کیا تھا۔

''ہمیں اپنے عزیز اور دلیر ساتھیوں کی شہادت کا بھی رنج ہے، مگر خوشی بھی ہے کہ انہوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے، اسرائیلیوں کی کمر توڑ دی۔'' غضب خدا کے یاسر العربی نے میٹنگ کی کارروائی کے آغاز میں کہا تو پی فرنٹ کے خالد بن جنید نے کہا۔

''محترم!...... اس کے ردعمل میں اسرائیل نے ہمیشہ کی طرح اپنی بزدلانہ بھڑاس نکالنے کی خاطر شہری عرب بستیوں میں گزشتہ روز جو وحشیانہ بمباری کی ہے، ہمارا دل اس اندوہناک اور صیہونی چنگیزیت پر خون کے آنسو رو رہا ہے۔ ہمیں نئے حملے کی منصوبہ بندی سے پہلے اس کے سدباب کا بھی سوچنا پڑے گا۔''

''ہماری اس میٹنگ کا اہم ایجنڈا یہی ہے...... عزیزی خالد!'' یاسر نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں کچھ اہم خفیہ اطلاعات بھی ملی ہیں۔ جن کے مطابق ہماری تازہ سرفروشانہ کارروائی کے بعد اسرائیلی ہیڈ کوارٹر اتھارٹیز نے اپنی تمام انٹیلی جنس ایجنسیوں کو حرکت میں لانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اگرچہ وہ پہلے بھی فعال تھیں مگر ماسوائے ڈیوڈ اسٹار اور موساد کے باقی بیرونی معاملات پر اپنے اسپیشل ٹاسک میں مصروف کار تھیں اور اب ان میں ہگانہ اور فری میسن کارفرما ہیں۔ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے ہگانہ نے اپنی دو کاؤنٹر انٹیلی جنس الیاہیتہ اور شن بیتہ کو عالمی سطح پر اپنے گریٹر اسرائیل کے وسیع تر مفادات میں مصروف کار رکھا ہوا ہے۔ جس کے تحت الیاہیتہ واشنگٹن اور وہائٹ ہاؤس میں گھس بیٹھی ہے اور شن بیتہ تعلیمی درسگاہوں میں...... جبکہ فری میسن کے پیروکار مشرق وسطیٰ اور روم کے کناروں میں واقع اسلامی ممالک میں مسلمانوں کے بھیس میں ان کے ساتھ گھل مل کر بیٹھی ان کے درمیان نفاق کا بیج بو رہی ہے......'' اتنا بتا کر یاسر العربی کچھ ثانیے کے لیے تھما تو زبیدہ بولی۔

محبتوں کے حسین رنگ فروری 2105ء کے پاکیزہ کے سنگ

ماہنامہ **پاکیزہ** کراچی

نگہت سیما اور **رفاقت جاوید** کے قلمی ہنر کے شاہکار ناول نئی اقساط کے ہمراہ

نایاب جیلانی کے فن کا عروج...... **ترکِ وفا** کا بھرپور اختتام

زاھدہ پروین کے قلم سے محبتوں سے گندھا منی ناول...... **جنگل کا پھول**

اسماقادری کی متاثر کن آمد......ایک بھرپور مکمل ناول کے ساتھ

عظمیٰ آفاق سعید کے پُرلطف **سفر نامے** کا مزید احوال

شمعِ ھدایت کے سلسلے میں
اخترشجاعت کا لکھا پُرعقیدت اور
روح پرور مضمون **ذکر...... قربِ الٰھی**

اس کے علاوہ

ان مایہ ناز قلم کاروں کی تازہ ترین تحریریں پڑھیے جن میں **ناھید سلطانہ اختر، عالیہ حرا، سیما سراج، رضوانہ پرنس، غزالہ جلیل راؤ** و دیگر شامل ہیں

اس کے ساتھ ساتھ مستقل متنوع سلسلوں کا دلکش اور دلربا امتزاج صرف آپ کی اعلیٰ ذوقی کی نذر

''محترم یاسر! ضرورت ابھی اس امر کی ہے کہ اسرائیل کے یہ خفیہ ادارے مکڑی کے جال کی طرح پوری دنیا میں اپنے ٹارگٹڈ کنٹریز میں پھیلے ہوئے ہیں جبکہ یہاں فلسطین میں ان کے دو ادارے موساد اور ڈوڈ اسٹار ہمارے سامنے ہیں جنہیں بالخصوص ہمارے لیے فعال رکھا گیا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان کی چیرہ دستیوں کا تب ہی صحیح معنوں میں مقابلہ کرسکتے ہیں جب ہم بھی مختلف شاخوں میں بٹ کر ان کے مذموم عزائم کو ناکام بناتے رہیں۔''

زبیدہ اتنا کہہ کر رکی تھی۔ پی فرنٹ کے خالد بن جنید نے اپنی ساتھی مجاہدہ کی بات کا مطلب اچکتے ہوئے اس کی تائید میں یاسر سے کہا۔

''عزیزی زبیدہ کا کہنا ٹھیک ہے محترم العربی!...... یہ اسرائیل پر کاری ضرب لگنے کے مترادف ہوگا، کیونکہ اسرائیل کے یہ ادارے بہرحال کسی نہ کسی مضبوط حوالے سے ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہی نہیں بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ منسلک بھی ہیں۔ ہگانہ، فیری میسن، الیا بیتھ اور شن بیتھ اس کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ہمیں خوش قسمتی سے ان کے آئندہ کے مذموم عزائم کا بھی پتا چل چکا ہے۔ ہمیں بھی مختلف گروپوں میں بٹ کر ان کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک وائیڈ ایکشن پلان (wide action plan) ترتیب دینا ہوگا۔ ورنہ اسرائیلی ادارے، ایک دوسرے کے غبارے میں ہوا بھرنے کا ذریعہ بنتے رہیں گے اور ہم اپنے ساتھی ایک ہی طاقت کے آگے زیاں کرتے رہیں گے۔''

اس کی بات پر غضب خدا کے یاسر العربی نے خاصے پُرخیال انداز میں، اپنے سر کو جنبش دی، پھر گویا ان کی باتوں کے نچوڑ میں جواب اخذ کرتے ہوئے بولا۔

''تم لوگوں کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں الگ الگ گروپ ترتیب دے کر انہیں پھیلانا چاہیے۔ اگر یہ بات ہے تو...... پھر میں ایسا ایک پلان اپنے تئیں پہلے ہی ترتیب دے چکا ہوں۔''

''یقیناً۔'' زبیدہ اور خالد بن جنید نے بیک وقت کہا تھا۔

''کلیئر......'' یاسر نے کہا۔ پھر ایک ''اسٹول اٹلس'' درمیان میں رکھتے ہوئے بولا۔ ''سب سے پہلے میں اپنے مجاہد ساتھی مخبروں کی رپورٹ کے مطابق آپ سب کو کچھ خاص آگاہی دینا چاہوں گا...... آپ ذرا آگے آجائیے۔''

یاسر نے باریک نوک دار پنسل سے تل ابیب اور یروشلم پر دو گول دائرے بنائے اور پھر تل ابیب سے ایک لکیر حیفہ کی بندرگاہ تک پہنچی اور پھر بحیرۂ روم تک نشاندہی کرتے ہوئے لیبیا کی دو بڑی بندرگاہوں پر گول دائرہ بنا دیا۔ ان میں ایک دارالحکومت طرابلس تھا اور دوسرا خلیج سورہ میں واقع شہر بن غازی تھا۔ یہاں تک نشان لگانے کے بعد یاسر قدرے سیدھا ہو کے بولا۔ ''سب سے پہلے ایک اہم بات سن لو! ایک یہودی...... ایک عام یہودی بھی خواہ وہ دنیا کے کسی کونے میں چھپا بیٹھا ہو، وہ اپنی ذات میں مجسم ایک اسرائیلی خفیہ ادارہ...... ایک اسرائیلی ایجنٹ ہے...... یہ لوگ سب سے پہلے اسی کو تلاش کرکے اپنے خفیہ مشن کا آغاز کرتے ہیں۔''

وہ پھر اسٹول اٹلس پر جھکا اور آگے بولا۔

''میں نے یہاں لیبیا کی جن دو بڑی بندرگاہوں طرابلس اور بن غازی پر نشان لگائے ہیں۔ اسرائیلی نیوی کی نہ صرف کشتیاں بلکہ آب دوز بھی لیبیائی نیوی کی نقل وحرکت پر کڑی نظر رکھتی ہیں۔ ایک پرانے تنازع کے تحت اسرائیل عنقریب ان دونوں بندرگاہوں پر اٹیک کرنا چاہتا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ لیبیا میں ہمارے کئی سربرآوردہ لوگ ہمدرد موجود ہیں۔ ہمیں سب سے زیادہ مدد اور سپورٹ ادھر سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ ہمارے حریت پسندوں کے بڑے بڑے گروپس ادھر ہی تشکیل پاتے ہیں اور اس بحیرۂ روم کے ایک مخصوص خفیہ ''سی چینل'' کے ذریعے ہمیں بھاری مقدار میں اسلحہ بھی پہنچتا ہے...... نئی تشویش ناک اطلاع کے مطابق اسرائیلی نیوی کو اس کی بھنک پڑ چکی ہے، اس وجہ سے اسرائیلی دو خطرناک ''یو بوٹس'' آبدوزیں ہر وقت یہاں گشت کرنے لگی ہیں۔ یہ خطرناک اور تباہ کن میزائلوں اور تارپیڈو سے لیس ہیں۔ ہمیں ان دو اسرائیلی آبدوزوں کو تباہ کرنا ہوگا تاکہ لیبیا میں مقیم ہمارے ہمدردوں اور سورس کو ہمارے لیے رسد سپلائی کرنا ممکن ہوسکے، جو ان کی وجہ سے ایک عرصے سے تعطل کا شکار ہے۔ اس مشن کا بیڑا کون اٹھائے گا؟''

یاسر اپنی بات مکمل کرکے سیدھا ہو گیا۔

''یہ کام میرا گروپ کرسکتا ہے۔'' پی فرنٹ کے خالد بن جنید نے کہا تو یاسر العربی کے چہرے پر اسرار بھری مسکراہٹ نمودار ہوگئی اور پھر وہ اس لہجے میں بولا۔

''میرے عزیز! شاید تم اس لیے اس ناممکن حد تک مشکل کام کا بیڑا اٹھانا چاہ رہے ہو کہ انہی دونوں ''یو بوٹس'' (U-Boats) کی مدد سے گزشتہ دنوں اسرائیلی سمات ...نیکل فورس نے تمہارے عظیم لیڈر خلیل الوزیر کو شہید کیا تھا

جس کا دائرہ تیونس تک وسیع تھا، اگر تم محض ایک ''انتقامی جوش'' کے باعث اس خطرناک مشن کی حامی بھر رہے ہو تو میرا خیال ہے تمہیں ایک بار پھر اپنے اس فیصلے پر نظرثانی کی ضرورت ہے میرے عزیز۔''

یاسر کی بات ٹھیک ثابت ہوئی تھی کیونکہ اس نے ہی نہیں بلکہ لیلیٰ اور زبیدہ نے بھی خالد بن جنید کے چہرے سے جوش بھری تمازت کے آثار امڈتے بھانپ لیے تھے، اس پر خالد بن جنید کو بھی صاف گوئی اختیار کرنا پڑی۔ بولا۔

''شاید آپ کا خیال درست ہے جناب یاسر! اس لیے کہ ہم ابھی تک موساد اور ڈیوڈ اسٹار کی تیونس آپریشن کی خونی کارروائی کو نہیں بھولے۔ میں نے اس لیے ہی حامی بھری تھی کہ ہم اس کا خاطر خواہ انتقام لینا چاہتے ہیں۔ اس امید کے ساتھ کہ آپ ہماری یہ درخواست رد نہیں کریں گے کیونکہ انہی اسرائیلیوں نے آپ کو بھی ایک عظیم مجاہد اور دلیر کمانڈر سے محروم کیا تھا۔''

''تمہاری بات بھی ٹھیک ہے عزیزی خالد بن جنید!.....مگر PLSO اور الجاہد کی اسرائیل کے خلاف تازہ کارروائی کسی حد تک اس کا بدلہ چکا چکی ہے مگر ہمیں اس پر بس نہیں کرنا ہے۔ ہمیں اسرائیل کے وسیع تر مفادات پر بھی کاری ضرب لگانا ہوگی ''لیبیا مشن'' اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے اور اہم بھی...... مجھے تمہاری درخواست پر اور تمہارے حامی بھرنے پر بالکل اعتراض نہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ ...... اس اہم مشن میں جسے ہم ''لیبیا مشن'' کا نام دیں گے، مجاہدوں کے دو گروپس اکٹھے اسے پورا کریں۔ اس پر پہلے متفقہ طور پر بات طے ہو جائے تو ہم آگے بڑھیں۔''

الجاہد کی زبیدہ نے اس اہم مشن کے لیے اپنے گروپ کا نام پیش کر دیا۔ جسے تھوڑی بحث کے بعد قبول کر لیا گیا۔

''ڈیوڈ اسٹار کے جنرل فرناش کی سرکوبی کے لیے ناکام ''تیونائی آپریشن'' کو میرے سپرد کر دیا جائے تو اس سے بہتر کوئی آپشن نہیں ہوگا۔'' PLSO کی لیلیٰ نے فوراً یاسر العربی کی طرف دیکھتے ہوئے بھرپور جوش سے کہا تو یاسر بولا۔

''عزیزی لیلیٰ!..... اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہارے گروپ نے صحرائے نجف میں واقع اسرائیلیوں کے ڈیمون نیوکلیئر پلانٹ کو خاصا نقصان پہنچایا ہے اور عزیزی زبیدہ نے تیونائی میں واقع ڈیوڈ اسٹار اور موساد کے دو اہم شیطانوں کو جہنم واصل کیا۔ یہ مشن بدقسمتی سے اگرچہ ادھورا بھی رہا مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کا جذبہ قابل قدر ہے کہ آپ نے خطرناک اور اہم مشن کا بیڑا اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ ہمیں قبول ہے۔'' یاسر کی بات پر لیلیٰ کی کشادہ آنکھوں میں جوش کی چمک لہرانے لگی۔

تھوڑے توقف کے بعد یاسر العربی نے ایک گہری سانس لے کر خالد بن جنید اور زبیدہ سے بیک وقت مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے ''لیبیا مشن'' کا آغاز سب سے پہلے سسلی کے جزیرہ ''کوانٹڈو'' سے ہونا چاہیے۔ جدھر اسرائیل نے اٹلی کے اشتراک سے اپنا ایک خفیہ ''اسپائی اسٹیشن'' قائم کیا ہوا ہے۔ اس کی تباہی کے بعد ہی اسرائیل کا لیبیا کے خلاف خفیہ نقل و حرکت کا ''کٹ آؤٹ سسٹم'' بوگس ہو کر رہ جائے گا اور ہمارے مجاہدین گروپ کے لیے وہاں سے آنے والی رسد اور مدد کی سپلائی دوبارہ بحال ہو جائے گی۔'' اس کی بات پر جنید اور لیلیٰ دونوں نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیے۔

''اب میں میٹنگ کے آخری ایجنڈے پر بات کروں گا۔'' یاسر نے اپنی بات ختم کرنے کے بعد کہا اور سب بہ غور مستفسرانہ نظروں سے اس کا چہرہ تکنے لگے۔

''میرا گروپ ...... دو حصوں میں بٹ کر بیک وقت امریکا اور برطانیہ میں کارفرما...... ہگانہ کے دو کاؤنٹر انٹیلی جنس گروپس الیا بیتھ اور شن بیتھ کی اسلام دشمن کارروائیوں اور فلسطین سمیت اسرائیل کے اس ناپاک ارادوں کو سبوتاژ کرے گا جس کے تحت وہ فلسطین اور دیگر عرب ممالک پر اپنے متوقع غاصبانہ قبضے کو یقینی بناتا ہے۔ ایک اور اطلاع کے تحت الیا بیتھ امریکا کی اہم پوسٹوں اور محکموں میں گھسی بیٹھی عراق اور ایران کے خلاف پروپیگنڈہ کارروائیوں میں مصروف ہے۔ اس سلسلے میں الیا بیتھ عراق کی تباہی کے لیے اپنا پلان اے مکمل کر چکی ہے جبکہ شن بیتھ برطانیہ اور ہائر اسٹڈی کے لیے آئے مسلم ممالک کے ہونہار اسکالرز کے خلاف مصروف عمل ہے۔ ہگانہ کے چیف اور موروثی بانی آئرمین بیری جونیئر نے اپنے الیا بیتھ اور شن بیتھ کے دونوں چیف انچارج اور ٹاپ ایجنٹوں فوہاگ نیل اور مادام میڈوسا کو امریکا، برطانیہ روانہ کر دیا....... ان دونوں کو جہنم واصل کرنے کا ذمہ میں لیتا ہوں۔''

تہ خانے میں چند ثانیے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ ایسے میں پی فرنٹ کے ایک لبنانی مجاہد شیخ دانیال نے کہا۔ ''ہم اپنے دو عظیم ہمدردوں کو فراموش کر رہے ہیں جنہوں نے شاید اب ہماری طرح اپنے طور پر اپنی بساط بھر اور

اپنے محدود وسائل میں رہتے ہوئے ہمارے عظیم مقصد کی برآوری کے لیے اپنے سر سے کفن باندھ رکھا ہے۔"

"تمہارا اشارہ اس قبرص لیڈی رپورٹر نائمہ اور جہاز راں کمپنی "البحر" کے عابد شکمری کی طرف تو نہیں؟" زبیدہ نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا تو یاسر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے شیخ دانیال کی حمایت میں کہا۔

"ہم بھلا اپنے ایسے گمنام ہمدردوں کو کیسے فراموش کر سکتے ہیں۔ ان دونوں نے تو خونِ مسلم کا جیسے حق ادا کر دیا اور اپنے طور پر ان دونوں نے ہمارے لیے جو عظیم قربانیاں دیں اور ابھی تک دے رہے ہیں وہ لائق تحسین ہیں اور ہم نے بھی انہیں جدہ کی بندرگاہ سے لے کر ہوٹل پورٹ لینڈ تک مکمل سیکیورٹی فراہم کی تھی لیکن بدقسمتی سے ہمیں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی مگر ہمیں باخبر ذرائع سے پتا چلا ہے کہ وہ دونوں عظیم گمنام مجاہد جدہ سے زندہ سلامت نکلنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔"

وہاں موجود سارے مجاہدین نے ہم آواز ہو کے نائمہ اور عابد شکمری کی کامیابی کے لیے دعائیہ کلمات ادا کیے۔

☆☆☆

اسرائیلی ہائی کمان کی کال کی گئی چار بڑوں کی اس میٹنگ، جس کی صدارت ہگانہ کے آئزرمین بیری جونیئر نے کی تھی، کے بعد جنرل آئزک فرناش نے ایک الگ ون ٹو ون خفیہ نشست موساد کے بارق شمعون کے ساتھ بھی جمانے کا سوچا مگر بعد میں، کچھ سوچ کر اس نے اپنا یہ ارادہ بدل ڈالا، کیونکہ اسے خدشہ تھا کہ وہ جس کڑے فیصلے پر بڑی سرعت کے ساتھ عمل کرنے والا ہے، اس سے ہوسکتا ہے بارق شمعون متفق نہ ہو اور یہ حساس معاملہ لیک آؤٹ ہو جائے مگر یہ اس کی مجبوری تھی کہ اپنے اس "کڑے فیصلے" پر عمل پیرا ہونے کے لیے کسی "بڑے" کی بھی "حمایت" ضروری تھی، بہ صورت دیگر خود اس کا اپنا کورٹ مارشل بھی ہوسکتا تھا، لہٰذا اس کے لیے اس نے یہودیوں کے "باپ" یعنی مائی باپ اور موروثی ہیرو ہگانہ کے آئزرمین بیری جونیئر سے خفیہ ملاقات کی ٹھانی، وہی اسے اپنے مطلب کا آدمی محسوس ہوا تھا۔ اس نے سیکریٹری کے ذریعے اس تک اپنا یہ پیغام پہنچایا۔ چار گھنٹے بعد کا اسے ٹائم ملا۔ وہ آئزرمین بیری سے اس طرح کی "ملاقات" کرنے کے لیے چوبیس گھنٹے بھی انتظار کر سکتا تھا۔

مگر تین گھنٹے بعد ہی جنرل فرناش کی ون ٹو ون ملاقات آئزرمین بیری سے کرادی گئی۔

آئزرمین بیری نے سب سے پہلے جنرل فرناش کو توصیفی نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کے اب تک کے خونریز ... کارناموں کی تعریف کی مگر تازہ تیونائی حملے پر تنقید وہ پہلے کر چکا تھا۔

بہرطور...... جنرل فرناش نے اسے بتایا کہ وہ اپنے ایک اہم اور کڑے فیصلے پر اس کی توثیق چاہتا تھا۔ لہٰذا جب آئزرمین بیری جونیئر نے جنرل فرناش کی زبانی یہ سنا تو فرناش کی توقع کے عین مطابق آئزرمین بیری نے فوراً اس کے فیصلے کی توثیق کر دی اور نہایت بے رحمانہ لہجے میں بولا۔

"یہودی قوم کا ہر فرد ہمارے لیے اہم ترین ہے لیکن جس پر غداری اور حریت پسندوں (فلسطینی مجاہد) کی مدد کرنے کا الزام ثابت ہو جائے تو ایسے غدار کی سزا صرف موت کے سوا اور کوئی نہیں کیونکہ یہی غدار ہمیں دشمنوں سے زیادہ نقصان پہنچانے کا سبب بن سکتے ہیں۔"

اپنے مائی باپ کی بات پر جنرل فرناش کی آنکھوں میں ایک سفاکانہ مسرت چمکی۔ پھر نہایت خوشی اور احترام سے بولا۔ "مقدم...... مقدم...... تھینکس گریٹ فادر!...... مجھے اب تسلی ہو گئی، میری مشکل یہی تھی میں اپنے اس کڑے فیصلے کے باعث کہیں معتوب یا سزاوار نہ ٹھہروں لیکن آپ کی اجازت سے مجھے تسلی ہو گئی۔"

آئزرمین نے اس اہم مگر قلیل ترین نشست کو برخاست کرتے ہوئے گمبھیر اور سرد لہجے میں کہا۔

"ہماری طرف سے تمہیں مہر بند اجازت نامہ تھوڑی دیر میں مل جائے گا۔ تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ اپنے فیصلے پر فوراً عمل پیرا ہو جاؤ۔ وِش آل۔"

ان دونوں مہاشیطانوں کے بیچ کمشنر ہیریز ناون کی لاڈلی اور اکلوتی بیٹی بازغہ کو اپنی قوم اور مہلک اسرائیل سے غداری کے الزام تلے سزائے موت دینے کے فیصلے پر اتفاق ہوا تھا۔ اس روز تیونائی حملے میں بازغہ کی فلسطینی مجاہدوں کی مدد اور ہمدردی جیسے سلوک کو دیکھتے ہوئے جنرل فرناش نے یہ کڑا فیصلہ کیا تھا۔

فرناش ایک مکار آدمی تھا۔ وہ جانتا تھا بازغہ کمشنر ہیریز ناون کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی ہے...... قوم اور ملک کے وسیع تر مفادات میں اس کی بیٹی کی سزائے موت کو کسی صورت آشکار نہیں کیا جاتا، اس طرح بددلی پھیلنے اور اپنی ہی بدنامی اور ایسے رویے کو فروغ دینے کا باعث بنتا۔ اس لیے دونوں یہودی شیطانوں آئزرمین اور جنرل فرناش نے باہمی طور پر یہی فیصلہ کیا تھا کہ بازغہ کو انتہائی رازداری

کے ساتھ موت سے ہمکنار کرنے کے بعد اس کے باپ پیریز ناون کو آگاہ کر دیا جائے گا، نیز اس سے حلف بھی اٹھوایا جائے گا کہ ملک اور قوم کی وفاداری اور مفادات کی خاطر اسے اپنی غدار بیٹی کی سزائے موت کو نہ صرف کھلے دل سے قبول کرنا پڑے گا بلکہ اس سلسلے میں خاموشی بھی اختیار کرنا ہوگی۔

☆☆☆

ادھر کمشنر پیریز ناون کو پہلے ہی سے یہی تشویش لاحق تھی کہ اور کوئی تو کہیں مگر جنرل فرناش اس کی لاڈلی بیٹی بازغہ کو ہرگز زندہ نہیں چھوڑے گا۔ کمشنر پیریز ناون کی آنکھوں کے سامنے بار بار وہ منظر رقصاں ہونے لگتا تھا، جب اس نے جنرل فرناش کو اس کی بیٹی بازغہ پر گولی چلاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس وقت تیونائی حملے یعنی ڈیوڈ اسٹار کے ہیڈ کوارٹر میں فلسطینی حریت پسندوں کی چھاپا مار کارروائی کے دوران...... بازغہ فلسطینی مجاہدوں کی حمایت اور ہمدردی میں بول رہی تھی تو جنرل فرناش نے نہایت سفاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے.... بے دریغ بازغہ پر گولی چلادی تھی مگر عین وقت پر ایک مجاہد نے اپنی جان پہ کھیل کر بازغہ کی جان بچائی تھی۔

پیریز ناون بھی بلا کا مکار اور درندہ صفت انسان تھا۔ بے گناہ فلسطینیوں کے خونِ ناحق سے اس کے ہاتھ بھی رنگے ہوئے تھے۔۔ وہ بھی ایک کٹر یہودی تھا اور اپنے ملک اسرائیل کا وفادار بھی مگر اپنی اکلوتی اولاد پر ایسا وقت آنے پر وہ بھی پریشان ہونے لگا تھا۔ اسے سخت گیر اور سفاک جنرل آئزک فرناش سے خیر کی کوئی امید نظر نہیں آرہی تھی۔ لہٰذا کمشنر پیریز ناون نے اپنی بیٹی بازغہ کو جنرل فرناش جیسے سفاک انسان کی متوقع درندگی اور سفاکیت سے بچانے کی خاطر اسرائیلی مقتدرہ میں معافی تلافی کے لیے بھاگ دوڑ شروع کردی تھی۔

اس نے سب سے پہلے موساد کے میجر بارق شمعون سے ایک ملاقات کی۔ اس کے ساتھ پیریز ناون کے اچھے تعلقات بھی تھے، جب اس سلسلے میں ناون نے بارق شمعون کو اپنے ''خدشات'' سے آگاہ کیا تو وہ پُرخیال لہجے میں بولا۔

''اس بات کی توقع رکھی جاسکتی ہے۔ مسٹر پیریز! تمہاری لاڈلی بیٹی بازغہ نے بہت خطرناک اور غلط حرکت کی ہے۔'' ناون اس کی بات پر اندر سے لرز گیا۔ اس کی تشویش بے جا نہ تھی۔ شمعون کی بات سے یہی محسوس ہوتا تھا جیسے اسے بھی اس کی ''مخدوش توقع'' تھی۔ وہ فوراً لجاجت آمیز لہجے میں میجر شمعون سے بولا۔

''سر!...... وہ بچی ہے ناسمجھ اور نادان ہے۔ میں اسے سمجھادوں گا۔ آپ اس سلسلے میں میری کچھ مدد کریں، میری اسرائیل کے لیے خدمات کو ہی مدنظر رکھ کر مجھے جنرل صاحب سے معافی دلوادیں۔''

''دل کو بہلانے والی باتیں مت کرو کمشنر!'' میجر بارق شمعون نے ایک کالے رنگ کا موٹا سگار سلگاتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔

''وہ تمہاری بیٹی بازغہ امریکا کی اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہے اور اس کی باتیں اور نظریات ہمارے بارے میں خطرناک حد تک میچورڈ اور اسٹیبلشڈ ہیں۔ ان سے غداری کی بو آتی ہے۔ رہی بات جنرل فرناش سے معافی نامہ طلب کرنے کی تو یہ ناممکن سی بات ہے، مجھے تو ڈر ہے کہیں وہ تمہیں نذرانہ کروادے۔''

ناون پریشان ہوگیا۔ اپنی شکل پہ لجاجت اور بے چارگی سموتے ہوئے بولا۔ ''سر! آپ اس سلسلے میں کچھ کیجیے نا......! میرے ماضی کی خدمات کو ہی مدنظر رکھتے ہوئے میری مدد کریں۔ آپ بھی موساد کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں اور اس وقت قائم مقام چیف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کوئی اچھا مشورہ بھی دیں۔''

''ایک ہی صورت مجھے نظر آتی ہے۔'' شمعون نے موٹے سگار کا ایک گہرا کش لے کر کثیف دھوئیں کے پیچ دار مرغولے فضا میں بکھیرتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پہ سوچ کی گہری لکیریں امڈ آئی تھیں۔

''مقدم...... مقدم...... خداوند کے لیے...... مجھے اس کا حل بتائیں کہ کسی طرح میری پھول سی بیٹی بازغہ کی جان بچ جائے، میرا وعدہ ہے، میں آپ کی مدد کو...... مرتے دم تک راز رکھوں گا۔'' ناون خوش ہو کے امید بھرے لہجے میں اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''جتنی جلد ممکن ہوسکے اپنی بیٹی بازغہ کو خاموشی اور رازداری کے ساتھ اسرائیل بدر کردو۔'' شمعون نے مشورہ دیا۔ پیریز ناون کا چہرہ بجھ کے رہ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ موساد کا چیف اس کی کوئی حوصلہ افزا مدد کرے گا لیکن اسے یہ سن کر سخت مایوسی ہوئی تھی کہ ڈیوڈ اسٹار کے سربراہ جنرل آئزک فرناش کے سامنے موساد کا میجر بارق شمعون کس قدر بے بس اور بے اختیار تھا۔ بالآخر پیہم سوچ و بچار کے بعد پیریز ناون کو بھی اس میں مفر کی راہ دکھائی دی کہ جنرل فرناش کی بربریت کا شکار ہونے سے پہلے اپنی بیٹی کو فوراً

ملک سے نکال دے، یا امریکا واپس بھیج دے۔

☆☆☆

ٹھٹھرتی ہوئی رات اپنے جوبن پر تھی۔ بازغہ نے رات ہونے سے پہلے محسن کو بہ خیروعافیت یہاں سے نکالنے کا بندوبست بڑے، خفیہ طریقے اور نہایت ہوشیاری سے کیا تھا۔ اسٹیٹ ہی کے سپتال میں اس نے ایک دورہ بھی کیا تھا جس کے بعد ہی اسے معلوم ہوا تھا کہ آج رات دو ایسے مریضوں کو تل ابیب کے ایک بڑے اسپتال میں شفٹ کرنا تھا۔ بازغہ نے ایک تیسرے مریض کی بھی "ایمرجنسی شفٹنگ لسٹ" میں شمولیت کروادی۔ جو بیڈ نمبر اس نے لسٹ میں درج کروایا تھا، اس پر ایک نیم پاگل یہودی مریض تھا۔ بازغہ چونکہ کمشنر پیریز ناون کی بیٹی تھی لہٰذا اسپتال کے جنرل ایڈمنسٹریشن کو انکار کرنے کی جرأت نہ ہوسکی تھی۔

ابھی اصل مرحلہ باقی تھا۔

شفٹنگ سے محض تھوڑی دیر پہلے جب ایمبولینس میں مریضوں کو سوار کروایا جارہا تھا، ان میں اسٹاف کے دو افراد اور ایک ڈرائیور شامل تھے جبکہ سپرویژن جی اے کا ایک نائب کررہا تھا۔ یہ اسٹیٹ کا ایک جنرل اسپتال تھا، کسی قید خانے کا نہیں، اس لیے زیادہ چیکنگ کی سختی نہ تھی، محسن کو سہارا دے کر بازغہ نے اسے ایمبولینس میں خود سوار کروایا تھا۔ اس موقع پر نائب کسی کام کے سلسلے میں اندر چلا گیا تھا جبکہ اسٹاف کے دو آدمیوں کو بازغہ نے خود کسی بہانے سے ادھر ادھر کھسکا دیا تھا۔

اسٹیٹ کے اندر آنے والوں کی معمول کے مطابق تو چیکنگ ہوتی ہی تھی، خواہ وہ "انٹری" اسپتال کے لیے کیوں نہ ہو، مگر نکلنے والوں کو درگزر کردیا جاتا تھا۔

ایمبولینس خاصی بڑی تھی، تینوں مریضوں کو اندر بیڈ نما اسٹریچر میں لٹا دیا گیا تھا۔ بازغہ بھی ڈرائیور کے ساتھ اس کے برابر کی سیٹ کا دروازہ کھولے سوار ہونے لگی تو اچانک سامنے سے احاطے کے گیٹ سے ایک بند جیپ تیزی سے اندر داخل ہوئی، اس جیپ کو دیکھ کر بازغہ کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا تھا۔ وہ اپنے باپ کی جیپ کو پہچان چکی تھی، مگر اسے حیرت تھی کہ اس کے باپ نے تو رخصت ہوتے وقت کہا تھا کہ ہنگامی حالات کے پیشِ نظر وہ ابھی دو تین روز تل ابیب میں ہی گزارے گا مگر یہ تو دوسرے دن ہی آن پہنچے۔ پھر اپنی رہائش گاہ کا رخ کرنے کے بجائے یہاں! یقیناً وہاں کسی نے بتایا ہوگا کہ ان کی بیٹی یہاں اسپتال آئی ہوئی ہے۔

بازغہ کے دل میں یہ خیال بھی آیا کہ کیا اس کے پاپا اس سے کوئی ضروری اور اہم بات تو نہیں کرنا چاہتے تھے؟ ورنہ تو بازغہ کا ارادہ تھا کہ ان سے ملے بغیر ہی نکل جائے۔

وہ رک گئی۔ جیپ پیریز ناون ہی کی تھی۔ بازغہ نے ایمبولینس کے ڈرائیور کو ذرا ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔ ناون کی دور سے ہی بیٹی پر نگاہ پڑی اور اس نے جیپ اس کے قریب ہی آکر ایک جھٹکے سے روک دی تھی۔ وہ اکیلا تھا اور خود ہی جیپ ڈرائیو کرتا ہوا تل ابیب سے یہاں پہنچا تھا۔ وہ اس وقت بیٹی کو ڈیوڈ اسٹار کی اسٹیٹ تیونائی سے ہی نہیں بلکہ تل ابیب اور اسرائیل سے بھی باہر نکال دینا چاہتا تھا۔ ادھر ایمبولینس کے اندر مخصوص ساخت کے اسٹریچر بیڈ پر لیٹا ہوا... محسن بھی اپنے گردوپیش سے بے خبر نہ تھا۔ وہ اپنے گردوپیش پر نظر ڈالے ہوئے تھا۔ یہی سبب تھا کہ وہ گاہے بہ گاہے ایمبولینس کی کھڑکی سے باہر جھانک لیتا تھا۔ ایک بار دیکھنے پر وہ چونک پڑا۔ اس کی محسنہ بازغہ کو اس نے کھڑکی کے قریب باپ سے الجھتے ہوئے پایا۔

"تت... تم... کہاں جارہی ہو بیٹی؟" ناون نے جیپ سے اتر کر اس کے قریب آکر کہا۔ وہ خاصا بوکھلایا ہوا اور تشویش زدہ نظر آرہا تھا۔

"پاپا! میں کچھ سیریس مریضوں کو تل ابیب کے بڑے سپتال پہنچانا چاہتی ہوں۔" بازغہ اسے جواب دے رہی تھی۔ "گھر پر بیٹھے بیٹھے بور ہوجاتی ہوں۔ سوچا بھلائی کے کام کرلوں۔ اس لیے ادھر آگئی۔" وہ بڑی خوب صورتی سے بہانہ تراش رہی تھی اور بالکل بھی گھبرائی ہوئی نظر نہیں آرہی تھی بلکہ اس کے برعکس وہ خاصی پراعتماد نظر آرہی تھی۔

محسن نے دھڑکتے دل سے کھڑکی سے دیکھا۔ اس نے یہودی کمشنر پیریز ناون کو پہلے ادھر ادھر گردن گھما کر اطراف میں نظریں دوڑاتے دیکھا اس کے بعد وہ نہایت مخدوش انداز میں اور دھیمے لہجے میں بیٹی سے بولا۔

"بیٹی!... تمہاری جان اس وقت سخت خطرے میں ہے۔ مجاہدوں سے تمہارے ہمدردانہ رویے نے جنرل فرناش کو آگ بگولا کردیا ہے۔ وہ تمہیں کسی وقت بھی گرفتار کرنے اور بعد میں گولی مار دینے کا حکم دے سکتا ہے۔ اس سفاک آدمی سے کچھ بھی بعید نہیں، تت... تم... فوراً آج کی فلائٹ پکڑو اور امریکا روانہ ہوجاؤ، چلو میرے ساتھ... میں تمہیں تل ابیب سے باہر نکال دوں۔"

یہ سن کر محسن کے کان کھڑے ہوگئے۔ بازغہ کو بھی اس نے کسی قدر پریشان ہوتے دیکھا مگر وہ اپنے لیے نہیں بلکہ محسن کے لیے فکرمند اور متوحش سی ہوگئی تھی۔ باپ سے بولی۔

’’مجھے اس کا اندازہ ہے پاپا!......مگر آپ میری فکر نہ کریں...... میں ٹل اییب ہی جارہی ہوں۔ پلیز! زیادہ شورمت مچایئے گا۔ ورنہ میری جان مزید خطرے میں پڑ جائے گی۔‘‘

بیٹی کی بات سن کر کمشنر پیریز ناون کا ماتھا ٹھنکا۔ غیرارادی طور پر اس نے قریب کھڑی ایمبولینس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا اور بیٹی کی طرف دیکھ کر مشکوک لہجے میں مستفسر ہوا۔

’’اس ایمبولینس میں تم کون سے مریض لے جارہی ہو بیٹی؟‘‘

بازغہ نے سرد لہجے میں کہا۔ ’’دو تین مریضوں کی حالت بہت خراب ہے۔ انہیں لے جارہی ہوں۔ بائی پاپا۔‘‘ یہ کہہ کر وہ ایمبولینس کی طرف لپکی اور دروازہ کھول کر ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر براجمان ہوگئی۔ ڈرائیور نے ایمبولینس اسٹارٹ کر کے آگے بڑھادی۔

ناون ہکا بکا سا رہ گیا۔ بیٹی کی باتیں اس کے دماغ میں گردش کرنے لگیں۔ ’’پلیز پاپا! شورمت مچایئے گا۔ ورنہ میری جان مزید خطرے میں پڑ جائے گی۔‘‘ اس بات نے اسے گم صم کردیا تھا، صاف مطلب تھا کہ اس کی لاڈلی ضرور کوئی ایسا کام کرنے جارہی تھی، جو اسٹیٹ کے اصولوں کے سخت منافی تھا۔ وہ بیٹی کی جان بچانے ہی کے لیے تو یہاں آیا تھا پھر بھلا کیسے اس کی جان کو خطرے میں ڈالنے کا سبب بنتا؟ تاہم اسے تشویش نے ضرور آن گھیرا تھا۔ بیٹی کی محبت نے اسے جیسے مہر بہ لب کردیا تھا۔ لہٰذا دور جاتی ایمبولینس کو دیکھتا رہ گیا۔

ادھر ایمبولینس کے اندر موجود محسن نے بھی دونوں باپ بیٹی کی باتیں سن لی تھیں، اسے اپنی اور بازغہ کی فکر ہونے لگی۔ اتنا تو اسے بھی اندازہ ہو چلا تھا کہ کم از کم کمشنر ناون ان کا راستہ کھوٹا کرنے کی کوشش نہیں کرے گا لیکن اسے سب سے زیادہ اس بات کی تشویش ہورہی تھی کہ بقول کمشنر پیریز ناون کے بازغہ کو جنرل فرناش جیسے چنگیز صفت آدمی سے جان کا خطرہ تھا جو کسی وقت بھی بازغہ کو گرفتاری اور بعد میں گولی مارنے کے احکامات صادر کرسکتا تھا اور بازغہ کے باپ پیریز ناون نے بیٹی کو فی الفور امریکا یا کسی اور ملک نکل جانے کی تاکید کی تھی۔

ادھر آئزر مین سے ’’اجازت‘‘ لینے کے بعد جنرل فرناش نے فوراً ہیڈ کوارٹر کا رخ کیا اور جب اسے یہ پتا چلا کہ بازغہ اسٹیٹ کے جنرل اسپتال سے چند مریضوں و

بذاتِ خود اپنے ساتھ ایمبولینس میں لے کر تل ابیب روانہ ہوئی ہے تو اس کی تنگ پیشانی پر شکنوں کا جال سا پھیل گیا۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آسکی کہ...... بھلا ایک کمشنر کی بیٹی بازغہ کو ایسی کیا ضرورت پیش آگئی تھی کہ وہ راتوں رات ایسا فریضہ انجام دے رہی ہے؟ اس نے یہ پتا چلانے کے لیے فوراً اپنی اسٹیٹ کے جنرل اسپتال کے میڈیکل جنرل ایڈمن کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔ اس کے ذریعے معلوم ہوا کہ جب دو مریضوں کو ایمرجنسی کے پیش نظر راتوں رات تل ابیب کے ایک بڑے اسپتال میں شفٹ کیا جارہا تھا تو...... بازغہ نے ایک تیسرے مریض کو بھی یہاں سے شفٹ کروایا تھا۔ یہ سن کر جنرل فرناش کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے بڑے کرخت لہجے میں دریافت کیا۔

''وہ مریض کون تھا؟...... اس کی میڈیکل ہسٹری کیا ہے، مجھے اسی وقت آگاہ کرو؟''

جنرل ایڈمن گھبرایا ہوا تھا اور اب تو جیسے باقاعدہ تشویش زدہ بھی نظر آنے لگا تھا۔ اسے کچھ کچھ اندازہ ہورہا تھا کہ کہیں کوئی بڑی گڑبڑ ہوچکی ہے۔ اس نے تھوڑی دیر میں تفصیل حاصل کرلی تو اس کی حالت مزید غیر ہوگئی کیونکہ بازغہ نے جس بیڈ نمبر کے مریض کو شفٹ کرنے کے لیے ایمبولینس میں سوار کروایا تھا وہ اب بھی اپنی جگہ موجود تھا۔

جنرل آئزک فرناش کو جب یہ پتا چلا تو اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا اور اس نے مارے طیش کے دانت پیس کر جی اے کے چہرے پہ زوردار تھپڑ رسید کردیا اور دہاڑ کر بولا۔ ''اگر...... اصل مریض ابھی تک اپنے بیڈ پر موجود ہے تو پھر بازغہ کون سے تیسرے مریض کو ایمبولینس میں اپنے ساتھ لے کر گئی ہے؟''

جی اے کی حالت غیر ہورہی تھی، وہ کیا جواب دیتا۔ فقط اپنی صفائی میں اتنا ہی بول سکا۔

''مم...... مجھے نن...... نہیں معلوم...... مم...... میڈم (بازغہ) نے کہاں...... کونسا...... مریض شفٹ کیا ہے؟''

''یہ سب کچھ تمہاری سپرویژن میں کیوں نہیں ہوا اور بازغہ تم پر حکم چلانے والی کون تھی؟'' جنرل فرناش نے اسے خشمگیں نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

''سس...... سر...... وہ...... کک...... کمشنر کی بیٹی تھی...... اس لیے ہم نے بھی زیادہ توجہ نہ دی۔'' جی اے نے لرزتے ہوئے جواب دیا اور جنرل فرناش نے آگے بڑھ کر اسے گریبان سے دبوچ لیا۔

''کان کھول کر سن لو...... اس اسٹیٹ کا مالک صرف میں ہوں...... میں...... جنرل آئزک فرناش...... میرے حکم کے بغیر یہاں ایک پتا بھی نہیں ہلنا چاہیے۔ اب دفع ہوجاؤ یہاں سے، ورنہ میں ایک لمحے کی دیر کیے بغیر تمہیں گولی مار دوں گا۔''

جی اے کی حالت پتلی ہورہی تھی وہ معافیاں مانگتا ہوا وہاں سے کھسک گیا۔

جنرل فرناش کا چہرہ مسخ ہوکے مزید مکروہ نظر آنے لگا تھا۔ اسے یقین کی حد تک شبہ تھا کہ بازغہ ضرور کسی زخمی حریت پسند کو یہاں سے نکال کرلے گئی ہوگی، یہ یقیناً اس روز تیونائی حملے میں یہاں کہیں زخمی ہوکے پھنس گیا ہوگا۔

اس نے فوراً سات لڑاکا اور انتہائی تربیت یافتہ کمانڈوز کو بازغہ کے تعاقب میں روانہ کردیا اور ساتھ ہی تل ابیب میں واقع چوکیوں پر ناکابندی کرنے کا حکم صادر کردیا۔ اسے اپنے نائب ایہود شابک کی یاد آنے لگی۔ ایسے مواقع پر میں وہ اس کا سچا دستِ راست تھا مگر اب وہ اس سے بچھڑ چکا تھا۔ جنرل فرناش اسے اپنا بڑا نقصان سمجھتا تھا اور وہ انتقام میں اندھا ہورہا تھا۔ اس نے مزید کچھ اور احکامات صادر کیے، اس کے بعد اس نے کمشنر پیریز ناون سے رابطہ کیا اور اسے فی الفور اپنے آفس میں حاضر ہونے کا حکم دے ڈالا۔

☆☆☆

آنکھ کھلنے پر اس نے دو مہربان چہروں کو خود پر جھکے ہوئے پایا۔ ایک تو اس کا عراقی دوست حماد تھا دوسری جینفر نسو یٹر یعنی جینی تھی۔

''تھینکس گاڈ! تمہیں ہوش آگیا۔'' ڈاکٹر کمال احمد کو ہوش میں آتے دیکھ کر جینی کے نرم وگداز ہونٹوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

''اب کیسی طبیعت ہے دوست؟'' حماد نے مسکرا کر پوچھا۔

کمال چند ثانیے تک تو خالی الذہنی کی حالت میں رہا۔ پھر اسے یاد آنے لگا کہ اسے ایک کار نے ٹکر ماردی تھی۔ اس نے خود کو کسی اسپتال کے بیڈ پر پایا تھا۔ اس کی ٹانگ اور پیشانی پر بینڈیج بندھی ہوئی تھی۔ ایک بازو میں کینولا نصب تھا، جس کے ذریعے ڈرپ لگائی گئی تھی، کمال کو سب یاد آچکا تھا۔ یہ بھی کہ ایک شیورلیٹ سیاہ رنگ کی کار نے عقب سے اسے تیز رفتاری سے روندنے کی کوشش چاہی تھی۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ بروقت اس کی خوف ناک ٹکر سے بچ تو گیا تھا، مگر فٹ پاتھ پر چڑھتے ہوئے اس کا سر لیمپ پوسٹ کے پول سے جاٹکرایا تھا اور پھر اسے کچھ ہوش

نہ رہا تھا، کار زناٹے کے ساتھ اس کے قریب سے گزرتی چلی گئی تھی، نیز ایک شخص کو بھی اس نے یونیورسٹی کے گیٹ سے نکل کر اس کی طرف دوڑتے دیکھا تھا، وہ شاید اسے بچانے کے لیے ہی اس کی طرف دوڑا تھا۔

''میں کافی بہتر ہوں دوست!'' کمال نے جواباً دوستانہ مسکراہٹ سے حماد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

جینی زیادہ فکر مند اور تشویش زدہ دکھائی دے رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی کچھ اور فیلوز بھی وہاں کمال کی خیریت دریافت کرنے آن پہنچے۔ یہ مسلم طلبا کا گروپ تھا جن میں کمال فیس تھا۔

کچھ کا خیال تھا یہ محض اتفاقی حادثہ تھا۔ تاہم تھوڑی دیر بعد جب وہ گروپ نیک خواہشات کے ساتھ واپس لوٹ گیا اور کمرے میں صرف حماد اور جینی رہ گئے تو حماد نے کمال سے عجیب لہجے میں پوچھا۔

''تمہارا کیا خیال ہے کمال......! یہ ایک اتفاقی حادثہ تھا؟''

''شاید......'' ڈاکٹر کمال نے گومگو کے انداز میں کہا۔

''نہیں۔'' حماد نے پرزور انداز میں اس کی بات کی نفی میں اپنا سر جھٹکا۔ ''میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ڈی کارلو اور اس کے تین دوستوں کو سیاہ رنگ کی شیورلیٹ کار میں......''

اس کی بات پر نہ صرف ڈاکٹر کمال بلکہ جینی نے بھی چونک کر اس کی طرف دیکھا اور یہ بتاتے ہوئے حماد نے بھی جانے کیوں ایک دزدیدہ سی نظر جینی کے چہرے پر بھی ڈالی تھی۔ حماد نے آگے بتایا۔

''میں اس وقت...... ونگسٹن ویڈیو پبلک لائبریری جانے کے لیے نکلا تھا۔''

''اوہ...... تو تم ہی تھے وہ...... جب میں نے گرتے ہوئے آخری بار تمہیں دوڑتے ہوئے اپنی طرف آتے دیکھا تھا؟'' کمال کو جیسے یاد آ گیا۔

''ہاں، دوست......! وہ میں ہی تھا۔ اس چشم دید واردات کا گواہ......'' حماد نے سنجیدگی سے کہا۔ ڈاکٹر کمال نے ایک بار پھر محسوس کیا کہ حماد نے کوئی دوسری تیسری بار جینی کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا تھا...... اسے نہ جانے کیوں حماد کی یہ حرکت عجیب سی محسوس ہونے لگی۔ اس درمیان...... جینی نے حماد سے مخاطب ہو کے کہا۔

''کیا واقعی تم اس واردات کے چشم دید گواہ ہو؟ مم...... میرا مطلب ہے...... ڈی کارلو...... اپنے تین دوستوں کے ہمراہ سیاہ شیورلیٹ میں موجود تھا؟''

''آف کورس۔'' حماد نے پورے یقین سے کہا۔

''ڈی کارلو کار ڈرائیو کر رہا تھا اور کیا تم اس کار میں موجود اس کے تینوں ساتھیوں کو پہچان رہے تھے؟'' جینی نے حماد کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا اور نہ جانے کیوں...... ڈاکٹر کمال کو جینی کے حماد سے اس انداز میں پوچھنے پر عجیب سا لگا اور اسے نامعلوم سی حیرت بھی محسوس ہوئی۔

وہ اپنے بیڈ پر تقریباً نیم دراز تھا۔ اس کی حالت اب کافی بہتر تھی، ڈاکٹر کے مطابق ٹانگ اور سر میں معمولی چوٹیں آئی تھیں اور دو گھنٹوں بعد اسے اسپتال سے ڈسچارج بھی کیا جانے والا تھا۔

''جی ہاں......! مس جینفر نسویٹر......! میں نے بہت اچھی طرح یہ سب دیکھا تھا۔'' حماد نے ایک بار پھر ایک عجیب سی نظر جینی پہ ڈالتے ہوئے کہا تو نہ جانے کیوں ڈاکٹر کمال کو حماد کے لہجے میں ہلکی سی چبھن کا احساس ہوا۔

''یقیناً پھر تم نے ان کی کار کا نمبر بھی نوٹ کیا ہوگا؟''

''ہاں۔''

''تو پھر آپ اب تک خاموش کیوں بیٹھے ہیں مسٹر حماد؟ آپ کو تو فوراً کسی پولیس شیرف سے رابطہ کرنا چاہیے تھا۔'' جینی نے کہا۔ ساتھ ہی ڈاکٹر کمال نے جینی کے سرخ و سپید اور حسین چہرے کو بہ غور دیکھا۔ وہ بار بار اپنا نچلا ہونٹ کاٹے جا رہی تھی، جو اس کے اندر ایک مضطربانہ بے چینی کو ظاہر کر رہی تھی۔ حماد اس کی بات پر قدرے چونکا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے کمال نے سنا۔ حماد خاصے طنزیہ انداز میں ایک کڑوی سی مسکراہٹ تلے جینی سے مخاطب ہو کے کہہ رہا تھا۔

''میں نے بھی سوچا تھا مگر شاید...... اس کیس کی شنوائی ہی نہ ہو سکے؟''

''کیا مطلب؟'' جینی نے الجھن آمیز نگاہوں سے اس کی طرف تکتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں! مس جینی!...... اس لیے کہ...... اس کار میں امریکی پارلیمانی ممبر کا بیٹا...... ڈی کارلو ہی نہیں بلکہ سٹی پولیس ڈیپارٹمنٹ کے شیرف جان نسویٹر کا جواں سال بیٹا اور تمہارا بھائی ایان نسویٹر بھی موجود تھا۔'' یہ سنسنی خیز انکشاف...... ڈاکٹر کمال احمد کے لیے خاصا چونکا دینے والا تھا۔ یہ سنتے ہی اس نے بے اختیار جینی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہلدی کا سا رنگ ابھرا تھا۔ وہ چند ثانیے تک تو قریب موجود حماد کے چہرے کو تکتی رہ گئی۔

''لل...... لیکن...... یہ...... یہ...... کیسے ہو سکتا

ہے؟......ڈی کارلو کی اس کار میں موجودگی کا سبب تو سمجھ میں آتا ہے...... حماد! مگر جینی کا بھائی......؟'' ڈاکٹر کمال جیسے باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے غیر یقینی لہجے میں بولا۔

''ہاں ڈاکٹر کمال......! اس بات پر تو مجھے بھی حیرت ہوئی تھی۔'' حماد نے اس بار چبھتی ہوئی نظر فق چہرے کے ساتھ بیٹھی جینی پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''نن...... نو...... نیور...... ایسا نہیں ہوسکتا...... نو...... نیور...... بھلا...... جینی کے بھائی ایان کو مجھ سے کیا پرخاش ہوسکتی ہے؟''

''حماد بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے...... ڈاکٹر کمال......!''

دفعتاً جینی نے جمے ہوئے لہجے میں کہا اور نہ صرف ڈاکٹر کمال...... بلکہ اس بار حماد اندال نے بھی قدرے چونک کر جینی کی طرف دیکھا تھا۔ اب پہلی بار اس کے چہرے پہ حیرت چمکی تھی۔ شاید اسے جینی سے امید نہ تھی کہ وہ کار میں اپنے بھائی ایان کی موجودگی پر اس قدر اعتماد کا اظہار کرے گی۔ ورنہ تو وہ یہی سمجھا تھا کہ بہن ہونے کے ناتے اپنے بھائی کو بچانے کی کوشش کرے گی۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم...... جینی؟ بھلا تمہارے بھائی کو مجھ سے کیوں کر دشمنی ہونے لگی؟'' ڈاکٹر کمال کا ہنوز یقین کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

''اس کالے لمبے تڑنگے امریکی نژاد یہودی ڈی کارلو سے تو تمہاری اس دن سے ہی دشمنی کی ابتدا ہوچکی تھی جب سینٹرل کینٹین میں تم نے اس کی ہرزہ سرائی کا منہ توڑ جواب دیا تھا۔''

حماد نے کمال کی طرف دیکھ کر کہا۔

''اس لیے تو کہہ رہا ہوں کہ ڈی کارلو کی وجہ تو سمجھ میں آتی ہے، مگر ایان......؟''

''ایان اس کالے یہودی کا دوست ہے۔''

''مگر...... پھر بھی دوست! یہ کیسے ممکن ہے؟'' ڈاکٹر کمال کا یقین کرنے کو جی ہی نہیں مان رہا تھا۔

''ڈی کارلو...... ایک پوسٹ گریجویٹ ہے جبکہ ایان اس کے بالکل الٹ......'' کمال اتنا کہہ کر چپ ہوگیا۔ شاید جینی کی موجودگی میں وہ اس کے بھائی ایان کو کم پڑھا لکھا اور آوارہ منش نہیں کہنا چاہتا تھا۔

''کیا آپ بتا سکتی ہیں مس جینی! کہ آخر...... آپ کو اس حقیقت کا کیسے پتا چلا اور معلوم ہونے کے باوجود بھی آپ نے اب تک...... پولیس ڈیکو یا شیرف سے ذکر نہیں کیا؟'' حماد نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو جینی نے بے اختیار اپنے سینے سے ایک ہنکاری خارج کی۔ اس کی کیفیات اب خاصی معتدل محسوس ہو رہی تھیں، بولی۔

''جس وقت ڈاکٹر کمال کو ڈی کارلو کی شیورلیٹ نے ٹکر مارنا چاہی تھی۔ اس کے صرف...۔ ایک گھنٹے بعد ہی میں نے اپنے بھائی ایان کو ڈی کارلو کی کار سے اترتے ہوئے گھر کی طرف آتے دیکھا تھا۔ اس وقت میں اپنے کمرے کی کھڑکی کی بالکونی سے باہر دیکھ رہی تھی جب اس نمبر پلیٹ کی کار سے میرا بھائی ایان اترا تھا، وہ چہرے مہرے سے خاصا پریشان نظر آرہا تھا...... لیکن بائی گاڈ! مجھے بالکل بھی یہ نہیں معلوم تھا کہ اس وقت یہ چاروں کس خونی واردات کی ناکامی کے بعد لوٹے ہیں...... میں نے اپنی سی کوشش تو چاہی تھی کہ...... اپنے بھائی ایان سے اس کی پریشانی کا سبب پوچھوں اور یہ بھی کہ آخر ڈی کارلو جیسے شرپسند انسان کے ساتھ اس کا اٹھنا بیٹھنا کب سے رہنے لگا ہے...... مگر میں نہ جانے کیوں ایسا نہ کرسکی؟'' جینی نے بالآخر صاف گوئی سے بتایا۔ ڈاکٹر کمال کو اب اپنے دوست...... حماد اندال...... کی چبھتی ہوئی طنزیہ نظروں کا مطلب سمجھ میں آگیا تھا جو وہ وقفے وقفے سے جینی پر ڈالے جا رہا تھا مگر اب جینی کی صاف گوئی نے اسے بھی کچھ سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔ ڈاکٹر کمال تو کچھ نہ بولا۔ البتہ...... جینی نے ہی ایک جوش تلے انداز میں ڈاکٹر کمال اور حماد کی طرف باری باری دیکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، اگر یہ بات ہے تو پھر مجھے بھی اس گواہی میں اپنے ساتھ شامل سمجھو...... اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد ہم تینوں پولیس میں اس کی رپورٹ لکھوائیں گے...... چاہے میرا بھائی ہی کیوں نہ مجرم ہو...... ڈاکٹر کمال کو انصاف ملنا چاہیے۔''

اس کی فیصلہ کن گفتگو پر ڈاکٹر کمال اور حماد اندال...... قدرے چونک کر جینی کا چہرہ تکنے لگے۔

ٹھیک اسی وقت ایک خوب صورت سی نازک اندام نرس نے آکر بتایا کہ پولیس شیرف جان نسویٹر ڈاکٹر کمال کا بیان قلم بند کرنا چاہتے ہیں۔''

تینوں کے لیے یہ خبر اچانک تھی۔ تینوں ہی یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھے کہ اس وقت شیرف کا کیا ردعمل ہوگا جب اسے یہ معلوم ہوگا کہ اس کے اپنے بیٹے ایان کے خلاف بھی ان تین چشم دید گواہان میں خود اس کی اپنی بیٹی جینی بھی شامل ہے۔

(جاری ہے)

مہمان

بابر نعیم

کچھ مہمان ایسے ہوتے ہیں جو بلائے جان کی طرح چمٹ جاتے ہیں۔ جس گھر کے دروازے اجنبی دستک پر بنا پڑتال کے باآسانی کُھل جاتے ہیں وہاں اپنایت کا ہر انداز پھیکا پڑ جاتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی مہمان تھا جس کے آنے پر نہ مکان اپنا رہا تھا اور نہ مکین... اس جادو پر دنیا حیران تھی۔

دوسروں کی مملکت میں دخل اندازی کرنے والے ایک ساحر کی فنکاری



دروازے پر مسلسل دستک ہورہی تھی لیکن اسمتھ نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ شاید وہ دروازہ کھولنا ہی نہیں چاہ رہا تھا لیکن دستک دینے والا بھی پیچھے ہٹنے پر تیار نہیں تھا۔ اس نے اپنی کوشش جاری رکھی اور التجائیہ انداز میں بولا۔ ''مسٹر اسمتھ! دروازہ کھول دیں۔ میں آپ کے فائدے کے لیے ہی یہاں آیا ہوں۔''

''تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سنی۔'' اسمتھ نے جھلا کر ہاتھ میں پکڑی ہوئی تیزاب کی بوتل دیوار پر دے ماری۔ پلاسٹک کی بوتل دیوار سے ٹکرا کر

فرش پر گری اور لڑھکتی ہوئی ایک کونے میں چلی گئی جہاں پہلے سے وسکی کی خالی بوتلوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم کیا کر رہے ہو مسٹر اسمتھ!'' دروازے کے باہر سے آواز آئی۔

اسمتھ اپنے بستر پر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں سے سر تھامتے ہوئے بولا۔ ''یہاں سے دور چلے جاؤ۔''

''ٹھیک ہے۔ تم نے میرے لیے کوئی راستہ نہیں چھوڑا۔'' باہر کھڑے ہوئے شخص نے بے بسی سے کہا پھر اس نے اپنی جیب سے ایک مخصوص اوزار نکالا اور تالا کھولنے میں کامیاب ہوگیا۔ دروازہ کھلنے پر ایک شخص کاروباری سوٹ میں ملبوس چشمہ لگائے اندر داخل ہوا اور اپنا تعارف کرواتے ہوئے بولا۔

''گڈ آفٹر نون۔ میرا نام تھارپ ہے۔ کیا میں اندر آسکتا ہوں؟''

''نہیں۔'' اسمتھ نے بے رخی سے کہا۔

تھارپ نے اس کی بات سنی ان سنی کردی اور کمرے میں داخل ہونے کے بعد دروازہ بند کردیا پھر اس نے ایک تنقیدی نگاہ ہوٹل کے کمرے پر ڈالی اور بولا۔ ''یہاں تو کافی گھٹن ہے۔ اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو کھڑکی کھول دوں۔''

''جو تمہارا جی چاہے وہ کرو۔'' اسمتھ بستر کے ناہموار گدے پر لیٹتے ہوئے بولا جس پر سفید چادر پڑی ہوئی تھی پہلی بار اس کی نظر چھت پر لگے ہوئے دھبوں کی طرف گئی جنہیں دیکھ کر افریقا کا نقشہ ذہن میں ابھرنے لگا۔ کھڑکی کھولنے کے بعد تھارپ نے تیزاب کی بوتل اٹھائی اور اس پر لگے ہوئے لیبل کو پڑھنے لگا۔ وہ پائپ کی صفائی کرنے والا محلول تھا۔ اس نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے اپنا نشہ پورا کرنے کے لیے اس کا انتخاب کیا۔ تم نہیں جانتے کہ یہ کتنا مہلک ہے۔ اگر ذرا سی زیادہ مقدار لے لی تو کوئی آواز نکالے بغیر ہی مر جاؤ گے۔''

''مجھے اس کی پروا نہیں۔'' اسمتھ نے بے زاری سے کہا۔

''ہاں میں جانتا ہوں اور اسی لیے یہاں آیا ہوں۔''

اسمتھ اٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''تم کون ہو؟ کہیں تمہارا تعلق پولیس سے تو نہیں۔''

''نہیں۔''

''پھر تمہیں میری بیوی نے بھیجا ہوگا۔ ٹھیک ہے تم اپنی کارروائی پوری کرو اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔''

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے مسٹر اسمتھ۔'' تھارپ نے اندرونی جیب سے ایک کارڈ نکال کر اسے پکڑا دیا۔ اسمتھ نے اس پر ایک نظر ڈالی اور لکھی ہوئی عبارت دیکھ کر چونک گیا۔

''لیسن تھارپ...... ''مشیر زندگی۔''

اسمتھ نے کارڈ کو پلٹ کر دیکھا لیکن پشت پر کچھ نہیں لکھا تھا۔ وہ بولا۔ ''مشیر زندگی۔ اس کا کیا مطلب ہے؟''

''میں تم جیسے لوگوں کی مدد کرتا ہوں۔ جن کی زندگی برباد ہو جاتی ہے جو اداس، مایوس اور تنہا نظر آتے ہیں اور وہ اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگتے ہیں۔''

''تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔ میرے پاس تمہاری فیس دینے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ تم کوئی اور گاہک تلاش کرو۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں ہے۔''

''کیا واقعی؟'' یہ کہہ کر تھارپ نے اپنی جیکٹ کی جیب سے وسکی کی ایک چھوٹی بوتل نکالی اور بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ اس محلول کے مقابلے میں تمہیں اس کا ذائقہ بہتر لگے گا۔''

اسمتھ کو واقعی اس وقت شدت سے وسکی کی طلب ہو رہی تھی اور اگر بھوک کی وجہ سے وہ کمزوری محسوس نہ کر رہا ہوتا تو شاید جھپٹ کر اس سے وہ بوتل چھین لیتا۔

تھارپ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔ ''یہ بوتل تمہیں مل سکتی ہے۔ اس کے علاوہ میری جیب میں ایک اور بوتل بھی ہے۔ میں وہ بھی تمہیں دے دوں گا بشرطیکہ تم مجھے تفصیل سے بتا دو کہ اس سستے سے ہوٹل میں کیوں آئے اور یہاں بیٹھ کر کاسٹک سوڈا کے ذریعے اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے کی پلاننگ کیوں کر رہے ہو؟''

تھارپ نے وسکی کی بوتل گدے پر رکھی پھر اس نے کمرے میں رکھی واحد کرسی پر سے وسکی کی تین خالی بوتلیں اٹھائیں اور انہیں ڈسٹ بن میں پھینک دیا پھر کرسی گھسیٹ کر اس پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''اب تم مجھے اپنی کہانی سناؤ۔ تم اچھی بھلی زندگی بسر کر رہے تھے پھر یہ تباہی کس طرح ہوئی؟''

اسمتھ نے بوتل اٹھائی اور اس کا ڈھکنا کھول کر دو گھونٹ حلق میں انڈیل لیے اور سرشاری کے عالم میں بولا۔ ''میں ہمیشہ سے ہی ایسا نہیں تھا۔''

تھارپ نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''جانتا ہوں مسٹر اسمتھ سب کچھ جانتا ہوں۔ اب تم مجھے بتاؤ گے کہ اس حال تک کیسے پہنچے؟''

''میرا بھی ایک اچھا گھر، فیملی اور عمدہ ملازمت تھی جہاں مزید ترقی کرنے کے مواقع بھی تھے۔ میں ایک اچھی

بھی متوسط طبقے کی زندگی گزار رہا تھا لیکن صرف ایک ماہ پہلے وہ سب کچھ ہو گیا جس کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ وہ بدھ کا دن تھا۔ میں معمول کے مطابق صبح بیدار ہوا تو نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہوا کہ دن اچھا نہیں گزرے گا۔ میں نے اسے اپنا واہمہ سمجھ کر سر جھٹک دیا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اس دن کیا تباہی آنے والی ہے تو کبھی بستر سے باہر نہ آتا۔''

''میں نے انڈا تلنے کی خوشبو محسوس کی اور اندازہ ہو گیا کہ سب کچھ معمول کے مطابق نہیں ہے۔ اس وقت صبح کے سات بجے تھے اور میری بیوی ہیلری شاید ہی کبھی آٹھ بجے سے پہلے اٹھی ہو وہ اس وقت کچن میں کھڑی ناشتا بنا رہی تھی۔''

☆☆☆

اسمتھ بستر سے اٹھا اور سیڑھیاں اتر کر نیچے کچن میں آ گیا۔ جہاں سے مختلف آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے جیسے ہی دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا، اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی آنے والی ہو۔ اس نے ایک بار پھر یہ کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دی کہ پریشانی کی کیا بات ہے۔ یہ اس کا گھر ہے۔ یہاں کیا غیر معمولی بات ہو سکتی ہے۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ کچن میں داخل ہوا۔ اس وقت ہیلری فرائنگ پین میں انڈا تل رہی تھی اور اس کے بچے اینڈریو اور جیسیکا اسکول یونیفارم میں ملبوس ناشتے کی میز پر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے ساتھ ایک اجنبی بھی نظر آ رہا تھا جس کے لیے ناشتے کا خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔ وہ اجنبی تقریباً اسمتھ ہی کی عمر کا تھا۔ اس نے عمدہ لباس پہن رکھا تھا۔ صبح سات بجے اسمتھ کے گھر ناشتے کی میز پر اس کی موجودگی ایک غیر معمولی بات تھی جسے آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسمتھ نے اس اجنبی سے پوچھ گچھ کرنا مناسب نہ سمجھا اور نہ ہی اسے یہ جتانے کی کوشش کی کہ وہ اس کی کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ مہمان بہرحال مہمان ہوتا ہے۔

''صبح بخیر!'' اسمتھ نے کہا۔

''صبح بخیر!'' بچوں نے جواب دیا۔

اجنبی اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''تم یقیناً اسمتھ ہو۔ مجھے ٹونی کہتے ہیں۔''

اسمتھ نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم کیسے ہو؟''

''بالکل ٹھیک۔'' یہ کہہ کر وہ دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''تمہارا گھر بہت اچھا ہے۔''

ہیلری نے گیس کا چولہا بند کیا اور فرائنگ پین لے کر میز پر چلی آئی اور اس نے تلا ہوا انڈا ٹونی کی پلیٹ میں ڈال دیا جو پہلے ہی مختلف چیزوں سے بھری ہوئی تھی۔

''تمہاری بیوی بہت اچھا کھانا بناتی ہے۔'' ٹونی نے کہا۔

''شکریہ۔'' ہیلری نے کہا، پھر وہ اسمتھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں اپنا ناشتا خود بنانا ہوگا۔ مجھے ابھی گھر کی صفائی بھی کرنی ہے۔ تم سے تو اس سلسلے میں کسی مدد کی توقع رکھنا بے کار ہے۔''

اسمتھ اس کی بات سن کر حیران رہ گیا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ ''تمہیں اتنی جلدی کیوں ہو رہی ہے؟ گھر کی صفائی بعد میں بھی ہو سکتی ہے۔''

''شاید تم نے غور نہیں کیا کہ ہمارے گھر میں ایک مہمان موجود ہے۔''

''اوہ پلیز۔'' ٹونی بولا۔ ''میری وجہ سے جھگڑا مت کرو۔''

''اس میں لڑائی والی کوئی بات نہیں ہے۔'' ہیلری اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی پھر اس کا رخ اسمتھ کی طرف ہو گیا۔ ''تمہیں کم از کم نیچے آتے وقت ڈھنگ کا لباس تو پہن لینا چاہیے تھا۔ ہمارا مہمان کیا سوچے گا۔''

دل گرفتہ اسمتھ واپس جانے کے لیے مڑا جب وہ اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو اسے اپنی بیٹی کی آواز سنائی دی۔ وہ اجنبی سے کہہ رہی تھی۔ ''ممی کہتی ہیں کہ تم آرمی میں تھے انکل ٹونی! کیا تم نے کسی کو مارا؟''

اسمتھ نے غسل کیا۔ شیو بنایا اور دانت صاف کر کے جب بیڈروم میں آیا تو ہیلری قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی اپنا میک اپ درست کر رہی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اور اسمتھ کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ''اگر تم برا نہ مانو تو کمرے سے باہر چلے جاؤ۔ میں لباس تبدیل کرنا چاہ رہی ہوں۔''

اسمتھ اپنی اسٹڈی میں جا کر ان رپورٹوں کی ورق گردانی کرنے لگا جنہیں اس نے ابھی تک نہیں پڑھا تھا۔ آداب کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ اپنے مہمان کی خاطر مدارت کرتا لیکن ہیلری کے طرزِ عمل سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اسے مہمان سے دور رکھنا چاہتی ہے۔ شاید وہ کسی وجہ سے خوفزدہ تھی۔

اگلا مرحلہ بچوں کو اسکول لے جانے اور خود کام پر جانے کا تھا۔ جب وہ نیچے آیا تو اس نے دیکھا کہ ہیلری پہلے ہی بچوں کو بیرونی دروازے سے باہر لے جا رہی تھی اور ٹونی برآمدے میں کھڑا اس کی کار کی چابیاں اپنی انگلی میں گھما

رہا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" اسمتھ نے پوچھا۔

ہیلیری نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "ٹونی کی مہربانی ہے کہ وہ بچوں کو اسکول چھوڑنے جا رہا ہے۔"

"لیکن میں بھی یہ کام بخوبی کر سکتا ہوں۔"

"نہیں، تمہیں ہمیشہ شکایت رہتی ہے کہ بچوں کو اسکول چھوڑنے کی وجہ سے دفتر پہنچنے میں دیر ہو جاتی ہے۔"

"میں نے کبھی ایسا نہیں کہا۔" وہ احتجاج کرتے ہوئے بولا۔

"ہمیں مہمان کے سامنے بحث نہیں کرنی چاہیے۔"

"میں کوئی بحث نہیں کر رہا۔"

"بس تو پھر طے ہو گیا کہ بچے، ٹونی کے ساتھ ہی جائیں گے۔"

ٹونی ایک قدم آگے بڑھا اور اسمتھ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی اور مجھے یہ کہنے کی اجازت دو کہ تمہاری ایک بہت ہی خوب صورت فیملی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ہیلیری کے گال پر بوسہ دیا اور بولا۔

"میں جلد ہی واپس آ جاؤں گا۔"

اس کے جانے کے بعد اسمتھ نے ہیلیری سے پوچھا۔ "کیا تم بتانا پسند کرو گی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

ہیلیری نے باکس میں سے ڈاک نکالی اور بولی۔ "ٹونی کچھ عرصہ یہاں ٹھہرے گا۔ تم نے دیکھا نہیں کہ بچے اس سے کس قدر مانوس ہو گئے ہیں۔"

"لیکن یہ کون ہے اور یہاں کیوں آیا ہے؟"

"میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ اس کا نام ٹونی ہے۔"

"میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مجھے یہ شخص بالکل پسند نہیں آیا۔"

"وہ تمہیں کیوں اچھا لگنے لگا۔" ہیلیری طنزیہ انداز میں بولی۔ "وہ پُرجوش اور حاضر دماغ ہے اور تم جیسا ڈل نہیں ہے۔ تم میرا پیچھا چھوڑو اور کام پر جاؤ۔ مجھے بھی بہت سارے کام نمٹانے ہیں۔"

"وہ میرے گھر میں نہیں رہے گا۔" اسمتھ نے تیز لہجے میں کہا۔

"یہ ہمارا گھر ہے اور میں کسی بھی شخص کو یہاں بلا سکتی ہوں۔ اگر تم مجھ سے اونچی آواز میں بات نہ کرو تو میں تمہاری شکر گزار ہوں گی۔"

"میں نے اونچی آواز میں بات نہیں کی۔"

"اس سے پہلے کہ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے اسمتھ تم یہاں سے چلے جاؤ۔"

اسمتھ یہ سوچ کر چلا گیا کہ شاید گھر واپس آنے تک ہیلیری کا موڈ ٹھیک ہو جائے اور وہ زیادہ بہتر انداز میں اس مسئلے پر گفتگو کر سکیں لیکن یہ محض اس کا خیال تھا۔

☆☆☆

اسمتھ کی عادت تھی کہ جب اسے کوئی گھریلو مسئلہ درپیش ہوتا تو وہ پوری طرح دفتر کے کام میں مشغول ہو جاتا۔ اس روز بھی یہی ہوا۔ اس نے دفتر میں بیٹھے بیٹھے وہ تمام رپورٹیں پڑھ ڈالیں جنہیں دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ مختلف فائلوں میں سر دیے بیٹھا تھا کہ دوپہر کے قریب اس کی سیکریٹری مسز گلیڈ اسٹون نے انٹرکام پر دو آدمیوں کے آنے کی اطلاع دی۔

"کون لوگ ہیں؟" اس نے اپنی ڈائری پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ سیکریٹری کوئی جواب دیتی، وہ دونوں آدمی اس کے کمرے میں چلے آئے۔ انہوں نے برساتی اور ہیٹ پہن رکھے تھے۔ ان میں سے ایک بولا۔ "اسمتھ براؤن؟"

"ہاں۔"

"ہمارے پاس تمہارے لیے ایک عدالتی حکم ہے۔"

دوسرے آدمی نے ایک لفافہ اسمتھ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تم اپنے گھر، بیوی اور بچوں سے کم از کم ایک میل کے فاصلے پر رہو گے اور اپنی بیوی کے وکیل کے علاوہ ان سے کوئی رابطہ نہیں رکھو گے۔ اس حکم کی خلاف ورزی پر تمہیں جیل بھی بھیجا جا سکتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ دونوں آدمی چلے گئے اور اسمتھ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا رہ گیا۔ اس کی سیکریٹری بوکھلائی ہوئی اندر داخل ہوئی اور بولی۔ "مجھے افسوس ہے مسٹر اسمتھ۔ میرے منع کرنے کے باوجود وہ دونوں اندر چلے آئے۔"

"اس میں تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے۔" اسمتھ نے سرد مہری سے کہا پھر لرزتے ہاتھوں سے اس نے وہ لفافہ کھولا تو اس میں سے تین کاغذ برآمد ہوئے۔ اس نے ان پر ایک نظر ڈالی اور سیکریٹری سے کہا۔

"کیا تم یہ معلوم کر کے بتا سکتی ہو کہ ہماری کمپنی کا وکیل چارلس وارن دفتر میں موجود ہے؟"

"میں نے اسے دس منٹ پہلے دیکھا تھا۔"

"کیا تم اس سے میری ملاقات کروا سکتی ہو؟ اس

سے کہنا کہ یہ بہت ضروری ہے۔''

☆☆☆

چارلس وارن ایک خوش شکل اور خوش مزاج شخص تھا۔ اس نے وہ کاغذات پڑھے اور انہیں واپس لفافے میں رکھتے ہوئے بولا۔ ''کسی نے تمہارا اچھا کام کیا ہے۔ میں نے اپنی ساری زندگی میں اس سے زیادہ خطرناک بے دخلی کا حکم نامہ نہیں دیکھا۔ تم اپنی بیوی کے ساتھ کیسا سلوک کرتے رہے ہو؟''

''کچھ نہیں۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔''

''کیا تم نے اسے دھمکایا یا مارا؟''

''میں کوئی عفریت نہیں بلکہ ایک عام سا شخص ہوں جو اپنی بیوی اور بچوں سے محبت کرتا ہے۔''

''اوہ سمجھا۔'' وارن کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے وہ قائل نہیں ہو سکا۔ پھر اس نے کہا۔ ''کیا تم نے الیکویر، نامی تنظیم کا نام سنا ہے۔''

''نہیں، کیا میرے لیے یہ جاننا ضروری ہے؟''

''شاید نہیں۔'' وارن نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

''تم مجھے اس عدالتی حکم کے بارے میں کیا مشورہ دو گے؟''

''تم اس پر حرف بہ حرف عمل کرو گے۔'' وارن نے کہا۔ ''اپنی فیملی سے دور رہو اور کسی اچھے وکیل کا بندوبست کرو۔ اس عدالتی حکم پر عمل نہ کرنے کے نتیجے میں تم جیل جا سکتے ہو۔''

☆☆☆

اس روز وہ وقت سے پہلے ہی دفتر سے اٹھ گیا جس پر بہت سے لوگوں کو حیرت ہوئی کیونکہ وہ عموماً دیر تک کام کرتا تھا۔ اس کی واپسی سات بجے کے بعد ہوتی تھی۔ اس بار اسے ترقی ملنے کی پوری امید تھی جس کے لیے وہ کافی عرصے سے جدوجہد کر رہا تھا۔ کار پارکنگ کی طرف جاتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ حریفوں کی نظریں اس کے تعاقب میں ہے اور وہ اس کی جلد روانگی کو اپنی فتح سمجھ رہے تھے۔ اس نے سوچا کہ انہیں انگوٹھا دکھا کر اس تاثر کی نفی کر دے لیکن اس مرحلے پر وہ کسی سے الجھنا نہیں چاہ رہا تھا۔

اس کی کار کے قریب وہی دونوں افراد منڈلا رہے تھے جو اسے وہ کاغذات دینے کے لیے آئے تھے۔ ان میں سے ایک کار کے پچھلے دروازے کے شیشے سے اندر جھانک رہا تھا جبکہ دوسرا ایک نوٹ بک میں کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ انہیں دیکھتے ہی اسمتھ کو غصہ آ گیا اور وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ کیا کر رہے ہو؟''

لمبے قد والا بولا۔ ''ہم تمہارے سامان کی فہرست بنا رہے ہیں۔ عدالت کو تمہارے اثاثوں کی تفصیل درکار ہے۔''

''اے مسٹر! یہ پرائیویٹ کار پارکنگ ہے۔ تمہیں یہاں آنے اور تانک جھانک کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ پھر ہمیں کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔'' لمبے قد والا بولا۔

''تم جو چاہو کرتے رہو۔'' اسمتھ نے بیزاری سے کہا۔ ''فی الحال میں اپنے وکیل سے ملنے جا رہا ہوں۔''

☆☆☆

وکیل مارکوس کیننگ نے ان کاغذات پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور اسمتھ کو واپس کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اس معاملے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا، البتہ میرا مشورہ ہے کہ اس عدالتی حکم کی من وعن تعمیل کی جائے۔''

اسمتھ کو چوٹی کے وکیل سے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ اس نے بجھے دل سے کہا۔ ''کیا میں اس کے خلاف اپیل دائر نہیں کر سکتا؟''

''تم اس کے اخراجات برداشت نہیں کر سکو گے۔''

''وہ کیوں؟'' اسمتھ نے تعجب سے پوچھا۔ ''میرے بینک اکاؤنٹ میں اچھی خاصی رقم موجود ہے۔''

''یہ محض تمہاری خوش فہمی ہے۔'' وکیل نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

کیننگ اپنی کرسی سے اٹھا اور ٹہلتے ہوئے کھڑکی تک گیا۔ ''یہ نیلے رنگ کی سیلون کار تمہاری ہی ہے نا؟'' اس نے کھڑکی سے نیچے جھانکتے ہوئے کہا۔

اسمتھ مردہ قدموں سے چلتا ہوا کھڑکی تک آیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کی کار کو موبائل کرین کے ذریعے اٹھا کر ایک ٹرک میں رکھا جا رہا تھا اور وہی دونوں آدمی اس عمل کی نگرانی کر رہے تھے۔ وہ احتجاج کرتے ہوئے بولا۔

''یہ لوگ ایسا نہیں کر سکتے۔''

''میرا خیال ہے کہ وہ ایسا کر سکتے ہیں۔'' وکیل نے کہا۔ ''میں دیکھ رہا ہوں کہ انہوں نے تمہارے معاملے میں بیٹ مین اور ریڈ منڈ کی خدمات حاصل کی ہیں اور یہ کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔''

''یہ کون لوگ ہیں؟ کیا تم انہیں جانتے ہو؟''

''چھوٹے قد والے کا نام بیٹ مین ہے۔ یہ ایک

انتہائی خطرناک مجرم ہے اور مختلف جرائم میں چار مرتبہ سزا بھگت چکا ہے۔ دوسرے شخص ریڈ منڈ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا تھا گو کہ اس پر یہ جرم ثابت نہیں ہوسکا۔ مجھے امید ہے کہ تم ان دونوں سے الجھنے کی کوشش نہیں کرو گے۔"

☆☆☆

کیٹنگ نے اس سے مشورہ فیس نہیں مانگی بلکہ اس کے برعکس اپنی جیب سے بیس پاؤنڈز کا ایک نوٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ "یہ رکھ لو۔ شاید تمہیں اس کی ضرورت پڑ جائے۔"

اسمتھ وہاں سے سیدھا اپنے بینک گیا اور اے ٹی ایم مشین سے رقم نکالنے کے لیے اس نے اپنا کارڈ ڈال دیا۔ پن نمبر ڈائل کرنے کے کافی دیر بعد اسکرین پر پیغام نمودار ہوا۔ "اس ٹرانزیکشن کے لیے آپ کے اکاؤنٹ کی رقم ناکافی ہے تفصیلات کے لیے اپنی برانچ سے رابطہ کریں۔ مشین استعمال کرنے کا شکریہ۔"

وہ بوتھ سے باہر آیا تو اس نے بیٹ مین اور ریڈ منڈ کو بینک کے مرکزی دروازے پر کھڑا پایا۔ مجبوراً اسے لابی میں سے ہو کر اندر جانا پڑا۔ بینک منیجر نے اسے دو ہوش ربا خبریں سنائیں۔ پہلی یہ کہ اس کی بیوی نے جوائنٹ اکاؤنٹ سے تیس ہزار پاؤنڈز نکال لیے ہیں اور دوسری یہ کہ عدالتی حکم پر اس کے تمام اثاثے منجمد کر دیے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کریڈٹ کارڈز کی واپسی کا مطالبہ بھی کر دیا۔

اسمتھ تھکے تھکے قدموں سے چلتا ہوا سڑک پر آ گیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کا تعاقب کیا جا رہا تھا۔ وہ ایک سپر مارکیٹ میں داخل ہو گیا اور رسالوں کی الماری کے پیچھے چھپ گیا۔ بیٹ مین اور ریڈ منڈ اس سے کافی فاصلے پر تھے۔ وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک فٹ پاتھ پر کھڑے، اسے تلاش کرتے رہے پھر مایوس ہو کر وہاں سے چل دیے۔

ان کے جانے کے بعد وہ بھی سپر مارکیٹ سے باہر آ گیا اور تیز تیز قدموں سے سڑک پر چلنے لگا۔ اس نے انہیں چکمہ دینے کے لیے بلا ارادہ دو تین موڑ کاٹے اور جب اسے یقین ہو گیا کہ اس کا تعاقب نہیں کیا جا رہا تو اس نے ایک مکان کے دروازے پر کھڑے ہو کر اپنی سانسیں درست کیں۔ جیب سے اپنا فون نکالا اور گھر کا نمبر ملایا۔ تین بار گھنٹی بجنے کے بعد ٹونی نے فون اٹھایا۔ "ہیلو۔"

اس کی آواز سنتے ہی اسمتھ کا خون کھول اٹھا۔ وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔ "میں ہیلیری سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"وہ اس وقت گھر پر نہیں ہے۔ کیا میں جان سکتا ہوں کہ تم کون ہو؟"

"اس کا شوہر۔"

"تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اب تم اس سے فون پر بھی بات نہیں کر سکتے۔ اس بار تو میں رپورٹ نہیں کروں گا لیکن آئندہ ایسی کوشش مت کرنا۔"

"میں صرف اپنا ذاتی سامان لینا چاہتا ہوں۔"

"میں نے اس کے بھیجنے کا انتظام کر دیا ہے۔ خدا حافظ مسٹر اسمتھ۔" یہ کہہ کر ٹونی نے فون بند کر دیا۔

☆☆☆

وہ رات اس نے وائی ایم سی اے ہاسٹل میں گزاری۔ اسے ایک ایسا کمرا دیا گیا جس میں چار بستر تھے۔ ہاسٹل میں زیادہ رش نہیں تھا۔ اس لیے بقیہ تینوں بستر خالی تھے۔ البتہ بکنگ کلرک نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ رات میں کسی بھی وقت یہ بستر آباد ہو سکتے ہیں۔ اس نے بستر پر لیٹے لیٹے کئی بار ٹونی کو قتل کرنے کے بارے میں سوچا جس نے نہ صرف بڑی عیاری سے اسے قلاش کر دیا تھا بلکہ عدالتی حکم کے ذریعے بیوی کو بھی اس سے دور کر دیا۔ اس نے ہیلیری کو اس کے خلاف ورغلایا تھا۔

یہ کون شخص تھا جس نے اسے اپنے ہی گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ کیا ہیلیری کے اس کے ساتھ تعلقات تھے لیکن اس نے کبھی اس کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ بہرحال اب وہ اس کے ساتھ تعلق قائم کر چکی تھی۔ اس نے تصور میں ہیلیری اور ٹونی کو اکٹھے دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ دونوں اس کے بستر پر دراز تھے جبکہ بچے برابر والے کمرے میں سو رہے تھے پھر اس نے دیکھا کہ ٹونی کے سر میں گولی لگی ہے اور وہ اپنا پستول لیے پاس کھڑا ہوا ہے۔

اس نے دوسرے دن اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ ایک ریوالور خریدنے کے لیے کہیں نہ کہیں سے پیسوں کا انتظام کرے گا اور کورٹ آرڈر کی پروا کیے بغیر اپنے گھر جائے گا تاکہ وہ سب کچھ حاصل کر سکے جو اس کا اپنا ہے۔ اگر وہ ریوالور کا انتظام نہ کر سکا تو ٹونی کو مارنے کے لیے کوئی دوسری چیز استعمال کرے گا۔ مثلاً باغ میں رکھی کلہاڑی یا گیراج میں پڑا ہوا وزنی ہتھوڑا۔ اگر کچھ بھی نہ ملا تو

وہ اپنے ہاتھوں سے ہی ٹونی کا گلا گھونٹ دے گا۔
یہی سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی لیکن تھوڑی دیر بعد ہی کھٹ پٹ کی آواز سن کر وہ جاگ گیا۔ کمرے کی لائٹ جل رہی تھی اور ایک شخص فرش پر ٹہل رہا تھا۔ اس کا لباس شکن آلود تھا اور صاف نظر آرہا تھا کہ وہ مشکل حالات سے گزر رہا ہے۔
''اگر تمہیں ناگوار نہ ہو تو براہِ کرم روشنی گل کر کے اپنے بستر پر لیٹ جاؤ مجھے بھی نیند آرہی ہے۔'' اسمتھ نے تحمل سے کہا۔
''ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔'' اس آدمی نے بددلی سے کہا اور بستر پر بیٹھ کر جیب سے ایک چھوٹی سی برانڈی کی بوتل نکالی۔ ''گویا تم کپڑوں اور جوتوں سمیت ہی سونے کی کوشش کر رہے ہو؟''
''میرا خیال ہے کہ اس سے تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہونی چاہیے۔''
''یہ محض میرا مشاہدہ ہے اور میں تم پر کوئی تنقید نہیں کر رہا۔ میرا حال بھی تم سے مختلف نہیں ہے۔ میں تین دن سے یہی کپڑے پہنے ہوئے ہوں۔ یقیناً تم اس کی وجہ جاننا چاہو گے۔''
''نہیں۔'' اسمتھ نے کہا۔ ''مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''
اس شخص نے برانڈی کی بوتل کھولی اور ایک بڑا سا گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔ ''میں اپنی ہر چیز سے محروم ہو چکا ہوں۔ بیوی، بچے، مکان اور ملازمت سب کچھ چلا گیا۔''
''میں تمہارے جذبات کو سمجھ رہا ہوں۔ اب تم خاموش ہو جاؤ اور مجھے سونے دو۔''
جواب میں اسے ایک دردناک کراہ سنائی دی اور اس شخص نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔ ''سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ میں اپنی قسطیں باقاعدگی سے ادا کرتا اور روزانہ شام کو اسکواش کھیلتا۔ میری ترقی ہونے والی تھی اور میں سال میں دو مرتبہ فیملی کے ساتھ چھٹیاں گزارنے جاتا تھا۔ میرے پاس وہ سب کچھ تھا جس کا خواب ایک متوسط طبقے کا شخص دیکھ سکتا ہے۔ ایک دن میں سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا تو میری جگہ میز پر ایک اجنبی شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنا نام گورڈن بتایا۔ میں نے پہلے کبھی اسے نہیں دیکھا تھا لیکن میری بیوی ایک پرانے دوست کی طرح اس کی خاطر مدارات کر رہی تھی۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے اور میرے گھر میں کیا کر رہا ہے تو وہ ناراض ہو گئی

ازدواجیات

میاں بیوی میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا، شوہر بیوی سے بات نہیں کر رہا تھا۔
بیوی۔ ''اب میں 10 تک گنتی گنوں گی اگر تم نہ بولے تو میں زہر کھا لوں گی۔''
''1۔ بولو......'' شوہر خاموش۔
''2۔ بولو نا پلیز......'' شوہر خاموش۔
بیوی۔ ''بولو نا پلیز......'' بیوی رونا اسٹارٹ۔
شوہر۔ ''گنتی گن...... گنتی۔''
بیوی۔ ''شکر ہے آپ بولے تو سہی......''

٭٭٭

کولمبس نے شادی نہیں کی۔ اسی لیے تو امریکا ڈھونڈ لیا۔
کیونکہ اس سے کسی نے نہیں پوچھا۔
1۔ کہاں جا رہے ہو؟
2۔ کس لیے؟
3۔ کس کے ساتھ؟
4۔ واپس کب آؤ گے؟
5۔ مجھے امی کی طرف چھوڑ دو۔
6۔ گھر رہ کر ہی ڈھونڈ لو امریکا۔
7۔ آپ رہنے دو کوئی اور ڈھونڈ لے گا۔
8۔ میں اکیلی گھر میں کیا کروں گی۔
9۔ اچھا بچوں کو ہی لے جاؤ۔
10۔ میرے لیے کیا لاؤ گے؟
11۔ کوئی اور چکر تو نہیں؟
12۔ اور واپسی پہ دہی لیتے آنا۔

مرسلہ۔ امان اللہ، حیدرآباد

٭٭٭

مجھے اپنی بیوی پر حیرت ہے کہ وہ دس بچوں کو کس طرح سنبھالتی ہے۔ ایک بار وہ کسی کام سے باہر گئی اور مجھے دو گھنٹے تک بچوں کو سنبھالنا پڑا۔ واپس آ کر اس نے مجھ سے پوچھا۔
''کوئی مشکل تو نہیں پڑی؟''
میں نے کہا۔ ''بس وہ جو سامنے لڑکا کھڑا ہے، وہی ذرا شرارت کر رہا تھا مگر میں نے ایک زوردار طمانچہ ایسا لگایا کہ......'' ''ہائیں۔'' وہ گھبرا کر بولی۔ ''لیکن وہ لڑکا تو ہمارا نہیں پڑوس کا ہے۔''

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

اور کہنے لگی کہ مجھے مہمانوں کے بارے میں اس طرح پوچھ گچھ نہیں کرنی چاہیے۔ اسی روز میرے دفتر میں دو آدمی آئے اور انہوں نے مجھے ایک عدالتی حکم پکڑا دیا جس میں کہا گیا تھا کہ میں اپنے بیوی اور بچوں سے دور رہوں۔ کیا تم نے کبھی ایسی کوئی بات سنی ہے؟''

''نہیں۔'' اسمتھ نے کہا۔ وہ بستر پر سیدھا لیٹ گیا اور آنکھیں بند کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے کبھی ایسی کوئی بات نہیں سنی۔''

☆☆☆

دوسرے دن صبح وہ سو کر اٹھا اور معمول کے مطابق نہانے چلا گیا گو کہ اسے ایک دن پہلے کے کپڑے دوبارہ پہننے میں الجھن ہو رہی تھی لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس کے پاس بہت تھوڑے پیسے باقی رہ گئے تھے اور اس کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ وہ دفتر کس طرح جائے گا۔ ڈائننگ روم میں جا کر اس نے اپنی پلیٹ میں کچھ سلائس، گوشت کے ٹکڑے اور پنیر رکھا پھر چپکے سے کچھ چیزیں اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھ لیں۔ ابھی وہ ناشتا کر ہی رہا تھا کہ اسے ایک آواز سنائی دی۔

''کیا میں تمہارے ساتھ شامل ہو سکتا ہوں؟''

یہ اس کا روم میٹ تھا جس نے اپنی پلیٹ کو پوری طرح بھر لیا تھا۔ وہ اس کے برابر میں بیٹھ گیا اور چکن کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے بولا۔ ''ہوں مزے کا ہے۔'' پھر جھینپتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہیں اپنا نام بتانا تو بھول ہی گیا۔ مجھے بین بیری کہتے ہیں۔ فیلیکس بین بیری۔''

''سمتھ!'' اس نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا لیکن اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ بیٹھنے یا اس سے باتیں کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

''چند منٹ پہلے ہی مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ تم بھی ہم میں سے ہو؟''

''ہم؟'' اسمتھ نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''ہم سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''جو اپنے گھروں سے بے دخل کر دیے گئے ہوں۔ کم از کم تمہارے لباس سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے میری یہاں ایک اور شخص سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس کا نام طلر تھا۔ وہ پرانی کاروں کا بزنس کرتا تھا اور اچھی بھلی زندگی گزار رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سب کچھ بیچ کر وہ جلد اسپین چلا جائے گا اور بقیہ زندگی وہیں گزار دے گا لیکن تم سمجھ سکتے ہو کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہوگا۔ وہ بھی ایک روز ناشتا کرنے کے لیے اپنے کمرے سے نیچے اترا تو اس نے اپنی کرسی پر ایک اجنبی شخص کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کیسے ممکن ہے؟ کیا اس طرح فطری انصاف اور سماجی حقوق کی خلاف ورزی نہیں ہو رہی؟''

بین بیری آگے کی طرف جھکا اور سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ ''الیکویرا!''

چارلس وارن نے بھی یہی نام لیا تھا۔ اسمتھ کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی اور وہ بولا۔ ''الیکویرا!''

''یہ ایک خفیہ تنظیم ہے جو بیویوں کو ان کے شوہروں سے چھٹکارا دلوانے کے لیے غیر واضح قوانین کا سہارا لیتی ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ واقعی ایسی کسی تنظیم کا وجود ہے؟''

''کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ مافیا بلکہ فری میسن کی طرح طاقتور ہے۔''

''اور یہ سب کچھ وہ گھروں کو برباد کرنے کے لیے کرتے ہیں۔''

''انہیں اس سے غرض نہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ وہ صرف غیر مطمئن بیویوں میں خوشیاں بانٹتے ہیں اور ان کی زندگی میں نئے رنگ بکھیرتے ہیں۔''

''لیکن میری بیوی تو غیر مطمئن نہیں تھی۔'' اسمتھ نے فخریہ انداز میں کہا۔ ''میں نے اسے دنیا کی ہر آسائش مہیا کر رکھی ہے۔''

''اگر ایسا ہوتا تو وہ تمہیں گھر سے نکال کر ایک اجنبی کو مہمان نہ بناتی۔'' بین بیری نے تلخی سے کہا۔ ''صرف مادی آسائشیں ہی کافی نہیں ہوتیں۔ اس کے علاوہ بھی عورت بہت کچھ چاہتی ہے۔''

بین بیری کا جملہ اس کے سر پر ہتھوڑے کی طرح لگا۔ اس نے مزید بات چیت نہ کرنے کا فیصلہ کیا لیکن اس سے پہلے ایک سوال کرنا ضروری سمجھا۔

''وہ اس خدمت کے عوض کیا معاوضہ طلب کرتے ہیں؟''

''شوہر سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے بیس ہزار اور اس کا متبادل فراہم کرنے کے لیے تیس ہزار پاؤنڈز مانگتے ہیں۔''

اسمتھ کو یاد آ گیا کہ ہیلیری نے بھی مشترکہ اکاؤنٹ سے اتنی ہی رقم نکلوائی تھی۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھنے ہی والا تھا کہ دو پولیس والے وہاں آئے اور ان میں سے ایک بین بیری کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ”میں تمہیں عدالتی احکامات کی خلاف ورزی کرنے کے الزام میں گرفتار کر رہا ہوں۔ تمہیں اپنی بیوی سے ایک میل دور رہنے کے لیے کہا گیا تھا مگر تم ایسا کرنے میں ناکام رہے۔“

بین بیری کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ وہ کانپتے ہوئے بولا۔ ”لیکن میں تو اس کے قریب بھی نہیں گیا۔“

”دو منٹ پہلے ہم نے خود اپنی آنکھوں سے اس کی گاڑی کو یہاں سے گزرتے ہوئے دیکھا۔“

”اس کے لیے مجھے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔“

”ہمیں شک ہے کہ تم نے اسے فون کر کے یہاں آنے پر مجبور کیا ہوگا۔ تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ بہتر ہوگا کہ کوئی ہنگامہ کھڑا نہ کرو۔“

”نہیں، میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔“

”تم اپنے لیے مشکلات پیدا کر رہے ہو۔“

”اس سے زیادہ مشکل اور کیا ہوگی۔“ بین بیری اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی کرسی اوپر اٹھا کر دونوں آدمیوں کو ایک جانب ہٹنے پر مجبور کیا اور دوڑتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔

ان دونوں نے اسے پکڑنے کی کوشش نہیں کی۔ بس اپنی جگہ کھڑے افسوس سے سر ہلاتے رہے۔ ان میں سے ایک بولا۔ ”اس شخص نے واقعی اپنے لیے بہت بڑی مشکل کھڑی کر دی ہے۔“

دوسرے نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”احمق انسان۔“

☆☆☆

اسمتھ دفتر کے لیے روانہ ہو گیا۔ تمام راستے وہ اپنے بچوں کے بارے میں ہی سوچتا رہا کہ وہ کس طرح اپنی زندگی میں ہونے والی اتنی بڑی تبدیلی کا سامنا کر پائیں گے۔ اسے امید تھی کہ وہ بھی اسے یاد کر رہے ہوں گے۔ شاید وہی ہیلری کو سمجھانے میں کامیاب ہو جائیں اور اسے یہ احساس ہو جائے کہ بچوں کو ہمیشہ اپنے حقیقی باپ کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کی کمی کوئی راہ چلتا شخص پوری نہیں کر سکتا۔ ٹونی بھی ایسا ہی ایک بندہ تھا جس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔

وہ آدھ گھنٹا تاخیر سے دفتر پہنچا۔ مسز گلیڈ اسٹون سے ہائے ہیلو کرنے کے بعد جب وہ اپنے کمرے میں پہنچا تو اسے دیوار کے ساتھ چار سوٹ کیس ایک قطار میں رکھے ہوئے نظر آئے۔ سیکریٹری تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اس کے کمرے میں آئی اور بولی۔ ”یہ سوٹ کیس آج صبح ہی پہنچائے گئے ہیں لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کس نے بھیجے ہیں اور ان میں کیا ہے۔“

”ٹھیک ہے مسز گلیڈ اسٹون! میں جانتا ہوں کہ ان میں کیا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آدھ گھنٹے تک مجھے بالکل ڈسٹرب نہ کیا جائے؟“

”پانچ منٹ بعد مسٹر ولز کے ساتھ تمہاری میٹنگ ہے۔“ سیکریٹری نے اسے یاد دلایا۔

”اسے کینسل کر دو۔“

”لیکن یہ بہت اہم میٹنگ ہے۔“

”انہیں سہ پہر کا وقت دے دو۔“

”مسٹر ولز شاید یہ پسند نہ کریں۔“

”میں اس کے باپ کا نوکر نہیں ہوں۔ بہتر ہوگا کہ تم مجھے کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دو۔“

”ٹھیک ہے۔“ سیکریٹری بے دلی سے بولی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

توقع کے مطابق ان سوٹ کیسوں میں اس کے کپڑے اور ذاتی استعمال کی اشیا شامل تھیں۔ اس کے علاوہ گھر کی سب چیزیں اب ہیلری کے قبضے میں چلی گئی تھیں۔ اس نے سوٹ کیس سے کپڑے اور الیکٹرک شیور نکالا۔ کم از کم وہ بین بیری کی طرح نہیں رہ سکتا تھا۔ کپڑے بدل کر اسے اپنے اندر ایک نئی طاقت کا احساس ہوا اور وہ بہ آوازِ بلند بولا۔ ”میں ان سے لڑ سکتا ہوں۔ وہ مجھے شکست نہیں دے سکتے۔“

☆☆☆

اب وہ شہر کے ایک گھٹیا ہوٹل میں پڑا ہوا تھا۔ اس کی ملازمت ختم ہو گئی تھی۔ جیب بالکل خالی تھی اور مستقبل مخدوش نظر آ رہا تھا۔ اس کی مدد کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ خود کلامی کے انداز میں بول رہا تھا۔

”ایک ایک کر کے میں نے اپنا سامان اور سوٹ کیس تک بیچ دیے۔ البتہ الیکٹرک شیور اس وقت تک اپنے پاس رکھا جب تک میرے پاس بیچنے کے لیے دوسری چیزیں تھیں۔ اس الیکٹرک شیور کو بیچ کر مجھے اتنے پیسے ملے کہ ان سے بہ مشکل ایک سینڈوچ اور سستی شراب کی ایک بوتل خرید سکتا۔ سوشل سروس سے جو تھوڑی بہت رقم ملی وہ ہوٹل کے

کرانے میں چلی گئی۔ میں نے کئی دن سے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔"

"جانتا ہوں۔ یہ تمہارے لیے بہت مشکل ہے۔" تھارپ نے ہمدردی سے کہا۔

"میں یقین بیری کی طرح فرار نہیں چاہتا۔"

"تم نے کبھی سوچا کہ تمہاری بیوی کیوں چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی؟"

"تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔" اسمتھ نے وہسکی کا آخری گھونٹ لیا اور بوتل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گری۔ اس نے کہا۔"اب تم وعدے کے مطابق مجھے دوسری بوتل دو۔"

تھارپ نے دوسری بوتل بھی اسے پکڑا دی اور اس کے بستر پر برابر میں بیٹھتے ہوئے بولا۔"اب تم پہلے کے مقابلے میں بہتر نظر آرہے ہو۔ میں تمہاری کہانی کا بقیہ حصہ بھی سننا چاہوں گا۔"

اسمتھ نے بوتل کا ڈھکنا کھولا اور ایک لمبا گھونٹ لینے کے بعد بولا۔"کوئی شخص میری بات سننے کے لیے تیار نہیں تھا جیسے ہی میرے دفتر کے ساتھیوں کو ان حالات کا علم ہوا تو میرے بارے میں یہ افواہ پھیلا دی گئی کہ میں گھریلو تشدد میں ملوث ہوں۔ وائی ایم سی اے والوں نے بھی اسی بنیاد پر مجھے وہاں سے نکال دیا کہ وہ مجھ جیسے آدمی کو وہاں رہنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ میری نوکری چلی گئی اور مجھے واجبات بھی ادا نہیں کیے گئے کیونکہ ان کے خیال میں، میں نے خود اپنی برطرفی کا سامان کیا تھا۔ یہاں تک کہ چرچ میں بھی میرے ساتھ اچھوتوں جیسا سلوک کیا گیا۔ مجھے سب سے الگ نشست پر بٹھایا گیا اور فادر نولس جو مجھے بچپن سے جانتے ہیں، انہوں نے بھی مجھے اعتراف کا موقع نہیں دیا جب تک میں بیوی کو مارنے کا جرم تسلیم نہیں کر لیتا۔

"میں نے اس بارے میں بہت سوچا کہ ہیلیری مجھ سے دور کیوں چلی گئی۔ پہلے تو مجھے اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ میں ایک اچھا شوہر اور باپ تھا۔ ہماری میز مختلف قسم کے کھانوں سے بھری رہتی تھی۔ میرے بچوں کے پاس جدید قسم کا پلے اسٹیشن تھا۔ میں نے کبھی زندگی میں کوئی برا کام نہیں کیا۔ میں نے اپنی بیوی کو وہ سب کچھ دیا جس کی وہ توقع کر سکتی تھی۔ سوائے اس کے کہ میں ایک سادہ لوح شخص تھا۔ وفادار اور محبت کرنے والا اور اس پر مکمل بھروسا کرتا تھا۔"

"اب ہم آگے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔" تھارپ نے کہا۔"کسی بھی مسئلے کا حل تلاش کرنے سے پہلے اسے جاننا ضروری ہے۔ مسٹر اسمتھ۔ یہ وہسکی بھی پی لو اور تھوڑی دیر کے لیے سو جاؤ۔ کل صبح ہم تمہارے اثاثوں کو غیر منجمد کروانے اور نئی ملازمت حاصل کرنے کے بارے میں سوچیں گے۔ اگر تم میرے کہنے پر عمل کرتے رہے تو بہت جلد اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ گے۔"

"کیا میں ایک سوال پوچھ سکتا ہوں؟" اسمتھ نے کہا۔

"ہاں۔ ہاں۔ کیوں نہیں۔"

"کیا تم انگلز لیر کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟"

تھارپ پراسرار انداز میں مسکرایا اور بولا۔"مسٹر اسمتھ! میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس بارے میں جانتا ہوں۔"

☆☆☆

وہ صبح بہت خوشگوار تھی۔ ایک طویل اور گہری نیند لینے کے بعد جری ایش ورتھ بیدار ہوا تو کمرے کی کھڑکی سے سورج کی روشنی اس کے کمرے میں اجالا بکھیر رہی تھی۔ وہ بستر سے اترا۔ نیچے کچن سے انڈے تلنے اور کافی کی خوشبو آرہی تھی۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی کہ اس کی پیاری بیوی مارتھا اتنی جلدی بیدار ہو جائے۔ شاید وہ اسے بچوں کو اسکول لے جانے سے پہلے ناشتا دے کر حیران کرنا چاہتی تھی۔ اس نے ڈریسنگ گاؤن پہنا اور سیڑھیاں اتر کر نیچے آگیا۔ اس کے دونوں بچے ناشتا کر رہے تھے جبکہ مارتھا گنگناتے ہوئے فرائنگ پین میں کچھ تل رہی تھی۔

"صبح بخیر!" جری نے اس کے قریب جا کر کہا۔

مارتھا چونک پڑی۔"تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔" اس نے اپنے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔"اگر تمہیں ناشتا چاہیے تو خود بنا لو۔ میرے پاس سانس لینے کی بھی فرصت نہیں ہے۔"

جری نے میز کے اس حصے پر نظر ڈالی جہاں اس کی مخصوص کرسی رکھی ہوئی تھی۔ وہاں ایک پلیٹ میں تلے ہوئے انڈے، بھنی ہوئی پھلیاں اور ٹماٹر کا ساس رکھا ہوا تھا۔ وہ پوچھنے ہی والا تھا کہ یہ تیسرا ناشتا کس کے لیے ہے کہ ایک اجنبی شخص کاروباری سوٹ میں ملبوس اندر داخل ہوا۔

"ہیلو!" وہ میز کی طرف بڑھا اور چھری کانٹا اٹھاتے ہوئے بولا۔"تم یقیناً جری ہو۔ میرا نام اسمتھ ہے اور میں کچھ عرصہ یہاں قیام کروں گا۔"

کاش

ملک صفدر حیات

لفظ "کاش" ہمیشہ ناقابل تلافی غلطیوں پر پچھتاوے کی عکاسی کرتا ہے... مگر ان پچھتاؤوں سے ازالے ممکن نہیں ہوتے۔ نقصان ہر حال میں اٹھانا پڑتا ہے۔ ملک صاحب کی کاوشیں ہر بار کی طرح اس مرتبہ بھی کاش پر ختم ہونے والی نہیں تھیں... تفتیشی مراحل سے گزرتے ہوئے نتیجے میں جو چہرہ سامنے آیا اسے دیکھ کر ہر رشتے سے اعتبار ختم ہونے لگا تھا... اور پھر وہ نازک تعلق اس فریب کی زد میں آگیا جسے وہ دوسروں کو دینے کی کوشش کررہی تھی۔ عشق اندھا ہوتا ہے لیکن غرض اندھی کے ساتھ ساتھ شاید بہری بھی ہوتی ہے... جسے کچھ دکھائی دیتا ہے نہ سنائی دیتا ہے۔

مکافات کی لپیٹ میں آنے والے عقلمندوں کی منڈی

عقل کی روداد

کاش...... ایک ایسا لفظ ہے جو ہزاروں امنگوں اور ارمانوں کا خون کرتے ہوئے ایک سرد آہ کے ساتھ زبان سے خارج ہوتا ہے مگر یہ انسان کی زندگی کا ایک ناگزیر جزو بھی ہے۔ انسانی زندگی خوشی اور غم کی ملی جلی کیفیات کا مرقع ہے اور ہر انسان کو اپنی زندگی کے کسی نہ کسی حصے میں اس لفظ "کاش" سے ضرور واسطہ پڑتا ہے۔

اس تمہید کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔

ان دنوں میں ضلع گوجرانوالہ کے ایک تھانے میں تعینات تھا۔ ایک روز میں حسب معمول تیار ہو کر تھانے پہنچا تو ایک بری خبر میری منتظر تھی۔ میری رہائش تھانے کی عمارت کے پچھواڑے واقع سرکاری کوارٹر میں تھی اور میں نے بڑے واضح الفاظ میں اپنے تھانے کے عملے سے کہہ رکھا تھا کہ رات کے کسی بھی حصے میں کوئی بھی ایمرجنسی پیش آجائے تو وہ لوگ بلاتکلف اور بلادریغ مجھے سوتے سے اٹھا سکتے ہیں۔ پتا نہیں، اس معاملے میں انہوں نے مجھے زحمت دینے کی ضرورت کیوں نہیں محسوس کی تھی۔ بہرحال، اطلاع یہ تھی کہ ایک قریبی گاؤں "قلعہ دیدار سنگھ" میں کوئی بندہ قتل ہوگیا تھا۔

میں نے حوالدار جمن شاہ کو اپنے ساتھ لیا اور ایک تانگے میں بیٹھ کر جائے وقوعہ کی جانب روانہ ہوگیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم لوگ موضع قلعہ دیدار سنگھ کے اندر تھے۔

وہ ماہ اکتوبر کے اختتامی ایام تھے۔ موسم سرما اپنے ہاتھ پاؤں سیدھے کررہا تھا۔ یوں سمجھیں کہ گلابی جاڑے کا سماں تھا اور رات اچھی خاصی ٹھنڈی ہوجاتی تھی۔ کچھ نہ کچھ اوڑھ کر سونے کو دل چاہتا تھا۔

قتل ہونے والے شخص کا نام لالی معلوم ہوا۔ لالی کا اصل نام قادر بخش تھا، تاہم وہ پورے علاقے میں "لالی" ہی کے نام سے جانا جاتا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر اٹھارہ اور بیس سال کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ ایک خوبرو اور دلکش جوان تھا۔ "تھا" کا صیغہ میں اس لیے استعمال کررہا ہوں کہ لالی کو دیکھتے ہی مجھے یقین ہوگیا تھا کہ اس کا شمار کسی بھی قیمت پر زندہ انسانوں میں نہیں کیا جاسکتا تھا۔

لالی کی لاش بھینسوں والے باڑے میں، ایک کمرے میں چارپائی پر رکھی تھی۔ اس کے سینے اور پسلیوں میں کسی تیز



دھار آلے سے متعدد وار کر کے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اغلب امکان یہی تھا کہ آلۂ قتل کوئی خنجر یا خطرناک چھری ہوگا۔ اس المناک بے کسی کی موت نے لالی کی ساری رعنائی اور تندرستی کی ایسی کم تیسی کر کے اس کی جوانی کو خاک میں ملا دیا تھا۔

مویشیوں والا وہ باڑا جس کے اکلوتے کمرے میں لالی کی لاش پائی گئی تھی، وہ نیچی چار دیواری والا ایک عام سا باڑا تھا جس کے ایک کونے میں باڑے کا واحد کمرا بنا ہوا تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق مذکورہ کمرے کا سائز بارہ بائی پندرہ فٹ رہا ہوگا۔ کمرے کے اندر کاشت کاری سے متعلق مختلف زرعی آلات بھی رکھے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ چند بھینسیں اپنی کھرلیوں (کنڈلیوں) پر بندھی دکھائی دے رہی تھیں۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق مقتول لالی کو سوتے میں قتل کیا گیا تھا۔ آلۂ قتل کی تلاش کے لیے میں نے اس کمرے کے علاوہ باڑے کا بھی ایک ایک حصہ دیکھ لیا لیکن مجھے اس مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوسکی تھی۔

ابتدائی پوچھ گچھ کے بعد پتا چلا کہ مقتول قادر بخش عرف لالی کا گھر اس باڑے سے جڑا ہوا تھا یعنی مذکورہ باڑا گھر کے پچھواڑے واقع تھا۔ جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کرنے کے بعد میں نے لالی کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے ضلعی اسپتال بھجوا دیا اور خود مقتول کے باپ خدا بخش کے ہمراہ اس کے گھر کی طرف آگیا۔

میرے استفسار پر خدا بخش نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا۔ ''تھانے دار صاحب! پچھلے کچھ دنوں سے ادھر قلعے (قلعہ دیدار سنگھ) میں ڈنگروں کی چوری کی وارداتوں میں اچھا خاصا اضافہ ہوگیا ہے، اسی لیے لالی رات کو باڑے کے اندر ہی سوجاتا تھا۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ وہ یوں بے موت مارا جائے گا تو میں ڈنگروں (مویشیوں) کو بچانے کے لیے اسے کبھی باڑے میں سونے کے لیے نہ کہتا۔''

''تو وہ تمہارے کہنے پر باڑے میں سویا کرتا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''جی سرکار......!''

''خدا بخش! تمہیں کب پتا چلا کہ لالی کو یہ اندوہناک جان لیوا واقعہ پیش آچکا ہے؟''

''صبح فجر کے وقت جی!''

اس کے جواب پر میں چونکا۔ ''فجر کے وقت، کیا مطلب......!'' میں نے پوچھا۔ ''اتنی صبح تم باڑے میں کیا لینے گئے تھے؟''

''میں باڑے میں نہیں گیا تھا، تھانے دار صاحب۔'' وہ بے بسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں تو اس وقت گہری نیند سو رہا تھا۔''

''پھر...... پھر تمہیں کیسے پتا چلا؟'' میں نے سوال کیا۔

''قاضی صاحب سے۔'' اس نے بتایا۔

''یہ قاضی صاحب کون ہیں؟''

''قاضی صاحب کا نام قاضی کبیر ہے جناب۔'' اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اسی علاقے میں رہتے ہیں۔ بہت ہی نیک اور پرہیزگار آدمی ہیں۔ ہمارے علاقے کی مسجد میں اذان بھی قاضی صاحب ہی دیتے ہیں۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''قاضی صاحب نے مسجد کی طرف جاتے ہوئے مجھے سوتے سے جگا کر اس واقعے کے بارے میں بتایا تھا۔''

خدا بخش کی بات آسانی سے مجھے ہضم نہ ہوئی تو میں نے پوچھ لیا۔ ''قاضی کبیر کو کیسے پتا چلا کہ باڑے میں، کمرے کے اندر سوئے ہوئے لالی کو کسی نے قتل کر دیا ہے......؟''

''قاضی صاحب نے مجھے لالی کے قتل کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔''

''پھر......؟'' میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''انہوں نے باڑے کے اندر سے کسی چھوٹے قد کے بندے کو نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔'' خدا بخش وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے دیکھا ہے، میرے لالی کا قد اونچا لمبا ہے۔ قاضی صاحب اس ٹھگنے آدمی کو باڑے سے نکلتے دیکھ کر حیران ہوئے اور انہوں نے اسے آواز دے کر روکنے کی کوشش کی مگر وہ کسی چھلاوے کی طرح تاریکی میں غائب ہوگیا۔ باڑے سے آگے کھیتوں کا سلسلہ ہے جناب۔ وہ دوڑ کر ادھر ہی گیا تھا۔ قاضی صاحب نے سمجھا، شاید وہ کوئی چور آچکا ہے۔ وہ مجھے اس پراسرار بندے کے بارے ہی میں بتانے آئے تھے۔ انہوں نے مجھے جگا کر کہا تھا کہ مجھے فوری طور پر باڑے کا جائزہ لے کر اس بات کی تسلی کرنا چاہیے کہ اندر مال مویشی پورے ہیں یا نہیں۔''

''تو تم نے قاضی کبیر کے کہنے پر باڑے کا جائزہ لیا تھا؟''

''جی تھانے دار صاحب!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''قاضی جی مجھے اس ٹھگنے بندے کے بارے میں بتا کر مسجد کی طرف چلے گئے تھے اور میں نے گھر سے لالٹین اٹھائی اور باڑے کی سمت بڑھ گیا۔ میں نے جمیلہ اور

بلی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔''

''یہ جمیلہ اور بلی کون ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''جمیلہ میری بیوی اور بلی بیٹی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''بلی کا اصل نام عارفہ ہے۔ بلی، لالی سے چھوٹی ہے۔ ہماری یہی دو اولادیں تھیں لیکن اب......'' بولتے بولتے اس کی آواز رندھ گئی۔

میں نے لحاتی توقف کے بعد سوال کیا۔ ''جب تم باڑے میں پہنچے تو کیا باڑے کا دروازہ کھلا ہوا تھا؟''

''نہیں جناب۔'' خدا بخش نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''دروازہ اندر سے بند تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے، آج کل ڈنگروں کی چوری بہت عام ہوگئی ہے اس لیے میں نے لالی کو سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ رات کو سونے سے پہلے وہ دروازے کو اندر سے بند کر لیا کرے۔''

''اگر باڑے کا دروازہ اندر سے بند تھا تو پھر تم اندر کیسے پہنچے؟''

''جناب! پہلے تو میں نے دروازہ کھٹکھٹایا اور زور زور سے لالی کو آوازدی۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اس صورتِ حال نے مجھے پریشان کر دیا۔ اسی لیے مسجد میں فجر کی اذان ہونے لگی تو میرے ذہن میں ایک نئی بات آئی۔''

''کون سی نئی بات؟'' وہ ذرا دیر کو رکا تو میں نے پوچھا۔

''دیوار کود کر اندر جانے کا خیال......'' اس نے جواب دیا۔ ''آپ نے دیکھا ہے کہ باڑے کی چار دیواری زیادہ اونچی نہیں۔ میں نے لالٹین کو تین فٹ جلتی ہوئی اونچی دیوار پر رکھا اور چھڑاپی مار کر (اچھل کر) دیوار کے اوپر چڑھ گیا۔ اگلے ہی لمحے میں باڑے کے اندر کود گیا......'' لمحاتی توقف کرکے، اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''سب سے پہلے میں نے دیوار کے اوپر سے لالٹین اٹھائی، پھر دروازے کی کنڈی کھول دی۔ اس کے بعد میں لالٹین تھامے لالی والے کمرے کی جانب بڑھا۔ مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ میں نے اتنی زور سے دروازہ بجایا تھا لیکن لالی اس کے باوجود بھی سویا رہا تھا۔ راستے میں ایک دیوار کے ساتھ مال مویشی بھی بندھے ہوئے تھے۔ ان کی تعداد پوری تھی جس کا مطلب یہی تھا کہ قاضی صاحب نے جس تھگنے بندے کو باڑے سے نکل کر کھیتوں کی طرف جاتے دیکھا وہ کوئی ڈنگر چور نہیں تھا۔''

''ایک منٹ خدا بخش!'' میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے مزید بولنے سے روک دیا اور کہا۔ ''ابھی تم نے بتایا ہے کہ باڑے کا دروازہ اندر سے بند تھا پھر قاضی کبیر نے اس تھگنے بندے کو باڑے میں سے نکلتے ہوئے کیسے دیکھ لیا تھا؟''

''یہ تو میں نے ان سے نہیں پوچھا تھا، تھانے دار صاحب!'' وہ الجھن زدہ انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے، تم نے نہیں پوچھا تو میں پوچھ لوں گا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''ہاں تو تم بتا رہے تھے کہ مال مویشیوں کو پورا پاکر تم مطمئن ہوگئے اور لالٹین تھامے لالی والے کمرے کی طرف گئے تھے......؟''

''جی......!'' وہ دکھ بھرے لہجے میں بولا۔ ''کمرے میں پہنچ کر مجھ پر ایک قیامت سی ٹوٹ پڑی تھی۔ لالٹین کی روشنی میں، میں نے لالی کی خون خون لاش دیکھی تو میرا دماغ گھومنے لگا۔ میرے جوان جہان لالی کو کسی نے بڑی بےدردی سے قتل کر دیا تھا۔'' اس نے گلوگیر آواز میں اپنی بات مکمل کی پھر آنکھوں میں اترنے والے آنسوؤں کو پونچھنے لگا۔

میں نے لالی کی لاش کا بغور جائزہ لیا تھا اور مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی تھی کہ اس بدنصیب کو سوتے میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اگر حالتِ بیداری میں اس پر قاتلانہ حملہ ہوا ہوتا تو وہ یقیناً اپنے بچاؤ کے لیے مزاحمت پیش کرتا اور اگر بالفرض قاتل اسے زیر کرنے میں کامیاب ہو بھی جاتا تو پھر اس خونیں واردات کے نتیجے میں جائے وقوعہ پر ایک خاص نوعیت کی افراتفری دکھائی دینا چاہیے تھی جو مجھے نظر نہیں آئی تھی۔ خدا بخش نے اپنے مال مویشی کو باڑے میں پورا اور صحیح سلامت پایا تھا۔ اس بات سے یہ بھی ثابت ہوا کہ لالی کا قاتل ہرگز کوئی ڈنگر چور نہیں تھا۔

خدا بخش آنسو صاف کر چکا تو میں نے پوچھا۔ ''لالی کی کسی سے دشمنی وغیرہ بھی تھی؟''

''نہ جی......'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''لالی اپنے کام سے کام رکھنے والا بچہ تھا جناب۔ آج تک کسی سے اس کا معمولی سا جھگڑا بھی نہیں ہوا تھا۔''

''خدا بخش!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''مجھے لالی کی اندوہناک موت کا گہرا دکھ ہے۔ میں تمہارے بیٹے کو تو واپس نہیں لاسکتا۔ البتہ یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ لالی کے قاتل کو جلد از جلد گرفتار کرکے قرار واقعی سزا ضرور دلوادوں گا لیکن......!''

میں نے سانس ہموار کرنے کے لیے ذرا توقف کیا تو اس نے پوچھا۔ ''لیکن کیا؟''

''لیکن یہ کہ اس کام کے لیے مجھے تمہارے بھرپور تعاون کی ضرورت ہوگی۔''

''میں کیوں نہیں تعاون کروں گا جناب۔'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میرا جوان بیٹا قتل ہوا ہے۔ میں تو یہی چاہتا ہوں کہ اس کے قاتل کو عبرت ناک سزا ملے۔''

''تو پھر تمہیں بتانا ہوگا کہ لالی سے کس کی عداوت تھی ؟'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ کام کسی دوست کا تو ہو نہیں سکتا؟''

وہ مجھے بڑی مشکل میں نظر آیا۔ لمحاتی توقف کے بعد اس نے بے بسی سے کہا۔ ''تھانے دار صاحب! آپ چاہیں تو مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے لیں مگر یہ حقیقت ہے کہ میں لالی کے قاتل کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اسے پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا اور دوستانہ انداز میں کہا۔ ''کیا تم لوگوں نے لالی کی شادی کردی تھی؟''

''نہیں جی......'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''شادی کا پروگرام اگلے سال تھا۔ ابھی صرف ہم نے اس کی منگنی کررکھی تھی۔''

میں نے ایک خاص زاویے سے سوال کیا۔ ''کیا لالی کی منگیتر کا تعلق بھی قلعہ دیدار سنگھ ہی سے ہے؟''

''نہیں جناب! وہ محلہ گوندلاں والا میں رہتی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

محلہ گوندلاں والا بھی ضلع گوجرانوالہ ہی میں تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا لالی کی منگیتر کو اس واقعے کی اطلاع دے دی گئی ہے؟''

''نہیں سرکار! ابھی ان لوگوں کو نہیں بتایا گیا۔''

میں خدابخش سے سوال وجواب کررہا تھا کہ اس کی بیوی اور مقتول کی ماں جمیلہ بی بی اپنے بیٹے کی المناک موت کا ماتم کرتے ہوئے بیٹھک میں داخل ہوئی۔

جوان بیٹے کی موت نے جمیلہ کی ذہنی کیفیت پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔ وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر اور جھولی پھیلا پھیلا کر لالی کے قاتل کو بددعائیں دے رہی تھی۔ میں نے اس کے زخمی دل پر تسلی اور دلاسے کا پھایا رکھا تو تھوڑی دیر کے بعد وہ قدرے نارمل ہوگئی۔ میں نے جمیلہ بی بی سے بھی گھما پھرا کر مختلف سوالات کیے مگر مجھے اپنے مقصد میں خاطرخواہ کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔

میں نے ابھی تک باڑے کے اندر جو بھی تفتیش کی تھی وہ چونکہ بے نتیجہ رہی تھی اس لیے میں اپنی کارکردگی سے قطعی غیر مطمئن تھا لہٰذا میں نے باڑے کا ایک اور راؤنڈ لگانے کا فیصلہ کیا اور اپنے سامنے بیٹھے خدابخش کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''خدابخش! تمہیں فوری طور پر دو کام کرنا ہیں۔''

''جی حکم کریں......'' وہ سوالیہ انداز میں مجھے تکنے لگا۔

''نمبر ایک...... کسی کو بھیج کر قاضی کبیر کو باڑے میں بلا لو۔'' میں نے کہا۔ ''میں اس سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں۔''

''باڑے میں کیوں جناب؟''

''اس لیے کہ میں یہاں سے اٹھنے کے بعد سیدھا باڑے میں جاؤں گا۔'' میں نے بتایا۔ ''ابھی وہاں تفتیش کا کچھ کام باقی ہے اور نمبر دو......'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''فوری طور پر ایک بندے کو محلہ گوندلاں والا روانہ کردو تاکہ لالی کی منگیتر اور اس کے گھر والوں کو خبر ہوجائے کہ یہاں کون سی قیامت ٹوٹ چکی ہے......''

''جی، بہت اچھا'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

میں خدابخش کے گھر سے اٹھا اور باڑے کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

حوالدار جمن شاہ کو میں نے لالی کی لاش کے ساتھ سرکاری اسپتال روانہ کردیا تھا لہٰذا اب مجھے اکیلے ہی سب کچھ کرنا تھا۔ میں نے پوری توجہ سے باڑے کے اندرونی اور بیرونی ''ماحول'' کا جائزہ لیا اور بالآخر ایک سراغ میرے ہاتھ لگ گیا۔

وہ گرگابی ٹائپ کا چمڑے کا ایک بند جوتا تھا۔ رنگ سیاہ اور نمبر لگ بھگ چھ۔ اس نمبر کا جوتا عموماً دس سے بارہ سال کی عمر کے لڑکوں کے لیے موزوں رہتا ہے۔ میں نے ابھی جس جوتے کا ذکر کیا ہے یہ مکمل جوتے کی جوڑی نہیں تھی بلکہ محض مذکورہ جوتے کا دایاں پاؤں تھا۔ یہ اکیلا پاؤں مجھے باڑے کی اندرونی جانب جنوبی دیوار کے ساتھ پڑا ملا تھا۔ میں نے اس چمڑے کے جوتے کے پاؤں کو اٹھالیا اور بہ غور اس کا جائزہ لینے لگا۔

اتنی دیر میں مقتول لالی کا باپ خدابخش بھی میرے پاس آگیا اور اطلاع دینے والے انداز میں بتانے لگا۔

"تھانے دار صاحب! میں نے ایک بندہ قاضی صاحب کی طرف بھیج دیا ہے۔ وہ قاضی صاحب کو یہاں آنے کا کہہ کر سیدھا محلہ کونڈلاں والا جائے گا اور لالی کی منگیتر خالدہ کو اس سانحے کے بارے میں بتائے گا......" پھر اس کی نظر میرے ہاتھوں پر پڑی تو وہ چونک اٹھا۔

"یہ آپ نے کس کا جوتا پکڑا ہوا ہے؟"

"یہی سوال میں تم سے پوچھنے والا تھا خدا بخش!"

"میں...... میں کیا بتاؤں جی۔" وہ الجھن زدہ نظر سے کبھی مجھے اور کبھی اس جوتے کے پاؤں کو تکنے لگا۔ "مجھے تو یہ کسی دس بارہ سال کے لڑکے کا جوتا لگتا ہے۔"

"مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے خدا بخش۔" میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "یہ جوتے کا پاؤں مجھے تمہارے باڑے کی جنوبی دیوار کے پاس پڑا ہوا ملا ہے اس لیے تمہی بتاؤ گے کہ یہ کس کا جوتا ہو سکتا ہے......؟"

"کیا واقعی آپ کو یہ جوتا باڑے کے اندر سے ملا ہے؟" وہ بے یقینی سے مجھے تکنے لگا۔

"تو کیا میں تم سے غلط بیانی کر رہا ہوں خدا بخش؟" میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "جوتے کا یہ پاؤں تمہارے باڑے کے اندر جنوبی دیوار کے ساتھ پڑا ہوا تھا۔"

"آپ غلط بیانی نہیں کر رہے ہوں گے سرکار۔" وہ جلدی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "دراصل میرے گھر میں اس عمر کا کوئی لڑکا نہیں ہے نا اس لیے مجھے بہت حیرانی ہو رہی ہے مگر......!"

اس نے اچانک جملہ ادھورا چھوڑا تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ "مگر کیا خدا بخش؟"

"وہ......قاضی صاحب نے بتایا تھا کہ انہوں نے......" وہ ٹھہر ٹھہر کر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "کہ انہوں نے کسی چھوٹے قد کے آدمی کو باڑے سے نکل کر کھیتوں کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ ہو سکتا ہے، یہ جوتا اسی کا ہو......"

"ہاں...... یہ ہو سکتا ہے۔" میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلا دی پھر پوچھا۔ "کیا یہاں باڑے میں بچوں اور لڑکوں وغیرہ کا بھی آنا جانا لگا رہتا ہے؟"

"نہیں جناب...... ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ میری بات کی تہ میں اترتے ہوئے بولا۔ "یہ باڑا ہے، کوئی کھیل کود کا میدان نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔ "میں خود پتا لگا لیتا ہوں کہ یہ جوتا کس لڑکے کا ہے۔ تم قلعہ دیدار سنگھ سے تعلق رکھنے والے تین چار بچوں کو میرے پاس لے آؤ......وہ ایسے بچے ہونا چاہئیں جن کی عمریں دس اور پندرہ سال کے درمیان ہوں۔"

"اچھا جی، میں ابھی بچوں کو بلاتا ہوں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ بات ختم کرتے ہی وہ باڑے سے باہر نکل گیا۔

میں کھوجی نظر سے ایک بار پھر مذکورہ جوتے کے دائیں پاؤں کا جائزہ لینے لگا۔ وہ جوتا نہ تو نیا نکور تھا اور نہ ہی اسے گھسا پٹا کہا جا سکتا تھا۔ وہ کم از کم چھ ماہ اور زیادہ سے زیادہ ایک سال کا استعمال شدہ تھا۔ میں جوتے کے معائنے میں مصروف ہی تھا کہ خدا بخش نصف درجن سے زیادہ بچوں کو گھیر کر باڑے میں لے آیا۔ ان میں ہر عمر اور قد کاٹھ کے بچے شامل تھے۔ میں نے وہ جوتا سب کو دکھانے کے بعد پوچھا۔

"تم میں سے یہ جوتا کس کا ہے؟"

مجھے امید تھی کہ ان میں سے کوئی نہ کوئی لڑکا اس جوتے کو ضرور پہچان لے گا مگر اس وقت مجھے سخت مایوسی ہوئی جب ان لڑکوں نے اس جوتے کی شناخت سے انکار کر دیا۔ وہ جوتے کا دایاں پاؤں نہ تو ان میں سے کسی کا تھا اور نہ ہی وہ اس کے بارے میں کچھ جانتے تھے۔

"اس گاؤں میں کتنے موچی ہیں؟" میں نے خدا بخش سے سوال کیا۔

"ہمارے چھوٹے سے گاؤں میں صرف ایک ہی موچی ہے، سرکار۔" خدا بخش نے جواب دیا۔ "فضل دین نام ہے اس کا۔"

یہ جس زمانے کا واقعہ ہے اس وقت قلعہ دیدار سنگھ ایک چھوٹا سا گاؤں ہی ہوا کرتا تھا۔ آج کل تو یہ اچھا خاصا پھیل کر ایک قصبے کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ میں نے خدا بخش کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"فضل دین کو یہاں بلا لو۔"

خدا بخش نے ایک سمجھدار لڑکے کو فضل دین موچی کی طرف روانہ کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں قاضی کبیر باڑے میں پہنچ گیا۔

قاضی کبیر کی عمر چالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہو گی۔ وہ ایک فربہ، باریش شخص تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اس سے کہا۔

"قاضی جی! مجھے پتا چلا ہے کہ آج صبح آپ نے کسی پستہ قامت بندے کو باڑے سے نکل کر کھیتوں کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ یہ تو آپ کو پتا چل گیا ہو گا کہ خدا بخش کے بیٹے کو کسی نے بڑی بے دردی سے پچھلی رات قتل کر دیا ہے......؟"

"جی تھانے دار صاحب!" وہ افسوسناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "مجھے بہت ہی دکھ ہے اس واقعے کا۔"

"آپ نے لگ بھگ کتنے بجے اس بندے کو دیکھا تھا؟"

"وقت کا تو مجھے صحیح اندازہ نہیں جناب۔" اس نے بتایا۔ "بس، یہ سمجھ لیں کہ میں فجر کی اذان دینے مسجد کی طرف جارہا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے، اس وقت ابھی اندھیرا ہی تھا؟"

"جی بالکل۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"پھر تو آپ اس بندے کی شکل نہیں دیکھ پائے ہوں گے؟"

"اگر اندھیرا نہ بھی ہوتا تو شاید میں اس کی شکل نہ دیکھ سکتا۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "کیونکہ اس نے اپنے چہرے پر ڈھاٹا اٹکا رکھا تھا۔"

"اوہ.....!" میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

اس دوران میں قلعہ دیدار سنگھ کے اور لوگ بھی باڑے میں جمع ہو چکے تھے۔ خدا بخش نے اپنے گھر سے ایک دو چارپائیاں لا کر باڑے میں بچھا دی تھیں۔ ویسے بھی یہ انسانی نفسیات ہے کہ جس علاقے میں پولیس آئے، لوگ سن گن لینے کے لیے وہاں اکٹھا ہو جاتے ہیں۔ یہاں پر تو ایک جوان جہان آدمی قتل ہو گیا تھا۔ لوگوں کا اس جانب متوجہ ہونا عین فطری امر تھا۔

"قاضی صاحب!" میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ "آپ نے اس ڈھاٹے والے ٹھگنے بندے کو روکنے کی کوشش نہیں کی تھی؟"

"وہ مجھے دیکھ کر اتنی تیزی سے بھاگا تھا کہ میں اگر چاہتا بھی تو اس کا پیچھا نہیں کر سکتا تھا۔ مجھ میں اتنی پھرتی نہیں ہے۔" وہ اپنے ڈیل ڈول پر ایک خفت آمیز نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔ "ویسے میں نے اسے آواز دے کر رکنے کو کہا تھا مگر وہ رکا نہیں۔ گولی کی رفتار سے وہ کھیتوں کی طرف چلا گیا تھا۔"

"کیا وہ ننگے پاؤں تھا؟" میں نے اچانک پوچھ لیا۔

"پتا نہیں جناب.....!" وہ عجیب سے انداز میں مجھے تکنے لگا۔

"آپ نے اسے باڑے کے اندر سے نکل کر باہر آتے دیکھا تھا یا وہ باڑے کی دیوار پھلانگ کر باہر آیا تھا۔" میں نے قاضی کبیر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "خدا بخش نے مجھے بتایا ہے کہ جب وہ آپ کی اطلاع پر باڑے کی جانب گیا تو باڑے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔"

"جی..... بس، میں نے اس چھلاوے کو باڑے کی دیوار کے پاس سے بھاگ کر کھیتوں کی طرف جاتے دیکھا تھا۔" وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔ "اگر باڑے کا دروازہ واقعی بند تھا تو پھر وہ دیوار کود کر ہی باہر نکلا ہوگا۔"

"اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پراسرار بندہ باڑے سے نکلا ہی نہ ہو۔" میں نے ایک مضبوط امکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی ممکن ہے، وہ باڑے کے پاس کسی بری نیت سے چکرا رہا ہو اور آپ کو دیکھ کر وہاں سے فرار ہو گیا ہو۔ آپ نے اسے اپنی آنکھوں سے تو باڑے سے نکلتے ہوئے نہیں دیکھا نا.....؟"

"جی ہاں..... یہ بھی ہو سکتا ہے۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "مجھے جتنا علم تھا وہ میں نے آپ کو بتا دیا۔ اس کے علاوہ مجھے اور کچھ پتا نہیں جناب۔"

میں نے مزید دو چار سوالات کے بعد قاضی کبیر کو فارغ کر دیا پھر وہاں پر موجود افراد کو جوتے کا وہ پاؤں دکھایا جو مجھے باڑے کے اندرونی حصے میں، جنوبی دیوار کے ساتھ پڑا ملا تھا۔ سب نے باری باری غور سے اس جوتے کو دیکھا اور نفی میں گردن ہلاتے ہوئے اس سے اپنی ناواقفیت کا اعلان کر دیا۔

میں مزید تفتیش کے لیے باڑے سے باہر نکل آیا۔ قاضی کبیر، خدا بخش کے علاوہ دوسرے لوگ بھی میری تقلید میں باہر آ گئے۔ میں نے قاضی کبیر سے پوچھا۔

"قاضی صاحب! آپ نے کس مقام سے اس بندے کو بھاگ کر کھیتوں کی جانب جاتے دیکھا تھا؟"

وہ باڑے کی ایک دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتانے لگا۔ "جناب! جب میری اس بندے پر نظر پڑی تو وہ وہاں دکھائی دیا تھا اور مجھے دیکھتے ہی وہ تیزی سے کھیتوں کی جانب ریس ہو گیا تھا۔"

قاضی کبیر نے اس چھلاوے کے دیکھنے کے حوالے سے جس جگہ کی نشاندہی کی تھی وہ مقام باڑے کی جنوبی دیوار کے نہایت ہی قریب تھا اور دیوار کی دوسری جانب باڑے کے اندر اسی سمت سے مجھے جوتے کا وہ پاؤں ملا تھا جو اس وقت ایک معما بنا ہوا تھا۔ ان حالات و واقعات کی روشنی میں کہا جا سکتا تھا کہ وہ بندہ دیوار پھلانگ کر باڑے سے باہر آیا ہوگا اور اسی دوران میں اس کے دائیں پاؤں کا جوتا باڑے کے اندر گر گیا ہوگا۔

یہ "ہوگا، ہوگا" ایک دلچسپ سوال کو جنم دیتا تھا کہ جب وہ بندہ باڑے کا دروازہ کھول کر باہر نکل سکتا تھا تو پھر کن ہنگامی حالات میں اسے دیوار پھلانگنے پر مجبور ہونا

پڑا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ وہ ڈھاٹا لگا کر باڑے کے اندر کیا کر رہا تھا؟ اگر وہ کوئی مویشی چور تھا تو پھر خدا بخش کے مویشی باڑے کے اندر صحیح وسلامت کیوں موجود تھے؟ کچھ بھی تھا لیکن میری نگاہ میں وہ ڈھاٹا پوش بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ اگر وہ میرے ہتھے چڑھ جاتا تو لالی کے قتل کا معما آسانی سے حل کیا جا سکتا تھا۔

میں اس پراسرار ڈھاٹا پوش کی ''تلاش'' میں کھیتوں کی سمت قدم اٹھانے لگا۔ مذکورہ کھیت باڑے کے جنوبی سمت میں تاحدِ نگاہ پھیلے ہوئے تھے۔ دراصل، وہ باڑا قلعہ دیدار سنگھ کے آخری کنارے پر واقع تھا۔ اس سے چند گز آگے سرسبز کھیتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا۔ قاضی کبیر نے نکٹے ڈھاٹا پوش کو اسی طرف بھاگ کر جاتے دیکھا تھا۔

چند منٹ میں، میں کھیتوں تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ فطری تجسس مجھے کھیتوں کے اندر لے گیا۔ کھیتوں میں چاول کی تیار فصل کھڑی تھی۔ میری عقابی نگاہ نے جلد ہی وہ مقام تلاش کر لیا جہاں فصل کے ساتھ کچھ افراتفری نظر آ رہی تھی۔ لگتا تھا، کسی بدمست ہاتھی نے کھیتوں کے اس حصے کو بری طرح روند ڈالا ہو۔ یقیناً وہ ڈھاٹا پوش اسی جانب سے کھیتوں میں داخل ہوا ہوگا۔

تھوڑا آگے جانے پر مجھے جوتے کا دوسرا پاؤں بھی مل گیا۔ یہ ایک جزوی کامیابی تھی اور اس امر کا ثبوت بھی کہ خدا بخش کے باڑے سے دیوار پھلانگ کر فرار ہونے والا بندہ اسی سمت سے کھیتوں میں داخل ہو کر کہیں آگے نکل گیا تھا۔ میں نے اس بندے کی تلاش کو فوری اور آسان بنانے کے لیے کھوجی نور محمد کو فی الفور جائے وقوعہ پر بلا لیا۔ نور محمد ایک تجربہ کار اور قابلِ بھروسا کھوجی تھا۔ یہ کام وہ میری بہ نسبت زیادہ اچھے انداز میں کر سکتا تھا۔ میں پہلے بھی دو تین کیسز میں نور محمد کی مدد حاصل کر چکا تھا اور اس نے مجھے مایوس نہیں کیا تھا۔ چونکہ نامعلوم پراسرار ڈھاٹا پوش کے پاؤں کے دونوں جوتے مل چکے تھے لہٰذا مجھے امید تھی کہ کھوجی نور محمد کو اس بندے کا کھرا تلاش کرنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں ہو سکتا تھا۔

میں کھیتوں سے نکل کر دوبارہ باڑے میں آ گیا۔ اگرچہ آسمان پر سورج موجود تھا مگر اکتوبر کے آخری ایام میں دھوپ اپنی تپش کھو بیٹھی تھی اور کھلے آسمان کے نیچے نقل وحرکت خاصی خوشگوار محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے باڑے کے اندر اور باہر کھیتوں میں بھی آلۂ قتل کو تلاش کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی تاہم اس سعی میں مجھے کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی۔

کسی بھی قتل کے کیس میں آلۂ قتل کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اگرچہ اس زمانے میں فنگر پرنٹس وغیرہ اٹھانے کا رواج نہیں تھا اور نہ ہی عدالتیں فنگر پرنٹس رپورٹس کو کوئی اہمیت دیتی تھیں تاہم آلۂ قتل کی بازیابی پھر بھی تفتیشی امور میں بہت ہی مفید اور معاون ثابت ہوتی تھی لیکن افسوس کہ چھری یا خنجر جس کی مدد سے قادر بخش عرف لالی کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا وہ ابھی تک میرے ہتھے نہیں چڑھ سکا تھا اور اس کے ساتھ ہی ابھی تک کیس کا ایک اور پہلو بھی تشنہ تھا۔ میں لالی کے قتل کے محرک تک رسائی حاصل نہیں کر سکا تھا۔ خدا بخش کا دعویٰ تھا کہ لالی کی کسی سے کوئی عداوت یا دشمنی وغیرہ نہیں تھی اور یہ بات ہضم ہونے والی نہیں تھی۔ مجھے اس سبب کا بھی سراغ لگانا تھا جو لالی کی زندگی کا چراغ گل کرنے کا موجب بنا تھا۔

تھوڑی دیر بعد فضل دین موچی باڑے میں پہنچ گیا۔ اس نے مجھے نہایت ہی ادب سے سلام کیا اور عاجزانہ انداز میں بولا۔

''مائی باپ...... مجھ سے کیا خطا ہو گئی......!''

فضل دین کی عمر پچپن اور ساٹھ کے درمیان رہی ہو گی۔ وہ سانولی رنگت کا ایک دبلا پتلا انسان تھا۔ فضل دین عرف فضلو چاچا کی کمر قدرے جھکی ہوئی تھی۔ میں نے بہ غور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''خطا بھی بتا دوں گا چاچا۔ پہلے تم سے کام کی بات ہو گی۔''

''کام کی بات......!'' اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''آپ مجھ سے اپنے لیے کوئی چپل یا جوتا بنوانا چاہتے ہیں۔ یہ تو میرے لیے بڑے فخر کی بات ہو گی۔ آپ حکم کریں سرکار...... میں ابھی آپ کے پاؤں کا ناپ لے لیتا ہوں۔ ویسے تو میں پہلی نظر ہی میں جان گیا ہوں کہ آپ کو آٹھ نمبر کا جوتا بہت مناسب فٹ آئے گا پھر بھی سائز لینا ضروری ہے......''

بات ختم کرتے ہی وہ میری جانب بڑھا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔

''ایک منٹ فضلو چاچا......!''

وہ یکدم رک گیا اور الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ فضل دین عرف فضلو ایک باتونی اور جھکی آدمی ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''چاچا! تم ہر وقت جوتے بنانے کے بارے ہی میں

سوچتے رہتے ہو یا اس کے علاوہ تمہارے ذہن میں کوئی اور خیال بھی آتا ہے؟"

"جناب! میں ذات کا موچی ہوں اور پتا نہیں، کتنی پیڑھیوں سے میرا خاندان یہی کام کرتا چلا آرہا ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "چم (چمڑے) سے ہمارا پرانا ساتھ ہے اور جوتے بنانا ہمارا روزگار ہے۔ یہی ہماری روزی روٹی ہے سرکار۔"

"تمہارے علاوہ قلعہ دیدار سنگھ میں اور کتنے موچی جوتے بنانے کا کام کررہے ہیں؟" میں نے اپنے اطمینان کی خاطر پوچھ لیا۔

"کوئی نہیں جناب۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "صرف ایک میں ہوں۔ میرے بیٹے بھی اس کام میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔ قلعہ دیدار سنگھ میں رہنے والوں کے پاؤں میں آپ کو میرے ہی تیار کیے ہوئے جوتے نظر آئیں گے۔"

"تم صرف جوتے ہی تیار کرتے ہو یا ان کی پہچان بھی ہے تمہیں؟"

"میں کچھ سمجھا نہیں سرکار......!" وہ متاملانہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا تم اپنے ہاتھ کے بنے ہوئے جوتوں کو دیکھ کر پہچان سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں جناب۔" وہ فخر سے بولا۔ "مجھے اپنے ہاتھ سے بنے ہوئے جوتوں کے ایک ایک تروپے (سلائی) کی خوب پہچان ہے اور میں انہیں ایک نظر دیکھ کر ہی پہچان سکتا ہوں......" لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ تو ایسی ہی بات ہے جناب جیسے کوئی، کسی ماں سے پوچھے کہ کیا تم اپنی اولاد کو پہچان سکتی ہو......"

اولاد اور جوتوں میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ کوئی ماں بیس پچیس سال میں دو چار یا زیادہ سے زیادہ دس پندرہ بچے پیدا کرلے گی لیکن اسی عرصے میں کوئی موچی دس بیس ہزار جوتے بھی تیار کرسکتا ہے جنہیں یاد رکھنا یقیناً ایک ناممکن سی بات ہے لیکن میں نے فضلو چاچا سے کسی قسم کی بحث مناسب نہ جانی اور گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"کیا تمہیں یہ بھی یاد رہ جاتا ہے کہ تم نے کون سا جوتا کس بندے کے لیے تیار کیا تھا؟"

"میں یہ بات دعوے سے تو نہیں کہہ سکتا سرکار لیکن اگر وہ جوتا پچھلے چھ آٹھ ماہ میں تیار ہوا ہو تو میں بڑی آسانی سے اس شخص کا نام بھی بتا سکتا ہوں جس نے مجھ سے وہ جوتا بنوایا ہو......"

"بس اتنا ہی کافی ہے۔" میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ "ابھی تمہاری یادداشت کا امتحان ہو جاتا ہے۔"

میں نے نامعلوم ٹھگنے ڈھاٹا پوش کے متوقع جوتے ایک تھیلے میں ڈال رکھے تھے۔ مذکورہ جوتے میں نے تھیلے میں سے نکال کر فضلو موچی کے حوالے کردیے اور کہا۔

"ان جوتوں کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد اپنی عالمانہ رائے دو......"

فضلو موچی پورے دو منٹ تک ان جوتوں کو گھما پھرا کر دیکھتا رہا پھر نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "نہیں سرکار...... یہ جوتے میرے ہاتھ کے نہیں بنے ہوئے۔ میں نے ایک ایک جوڑ دیکھ کر اچھی طرح تسلی کرلی ہے۔ یہ کسی دس بارہ سال کے لڑکے کے لگتے ہیں...... کس کے ہیں یہ جوتے؟"

بات ختم کرکے اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا تو میں نے کہا۔ "یہ اس شخص کے جوتے ہیں جو ممکنہ طور پر لالی کا قاتل ہوسکتا ہے۔ وہ کوئی بچہ نہیں بلکہ پورا آدمی ہے، بس قد کاٹھ اور جثے میں مار کھا گیا ہے۔ ایک جوتا مجھے باڑے کے اندر سے اور دوسرا ادھر کھیتوں میں سے ملا ہے اور قاضی کبیر نے آج علی الصباح ایک ٹھگنے بندے کو باڑے کی جانب سے بھاگ کر کھیتوں کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق وہی ٹھگنا شخص قادر بخش عرف لالی کا قاتل ہے۔ تم سے ان جوتوں کی شناخت اسی سلسلے میں کرائی جارہی ہے لیکن تم تو ان جوتوں کو پہچاننے سے صاف انکاری ہو......" میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر بدستور فضلو کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنی بات مکمل کردی۔

"کیا تم اپنے تجربے کی روشنی میں یہ بتا سکتے ہو کہ یہ جوتے کس موچی نے بنائے ہوں گے؟"

"جناب! پورے گوجرانوالہ ضلع میں دس ہزار موچی ہوں گے۔" وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ "اس سلسلے میں میرا تجربہ آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکے گا۔ میں نہیں بتا سکتا کہ یہ جوتے کس موچی کے ہاتھوں نے تیار کیے ہیں......"

"تم نے تیار نہیں کیے اس کا یہی مطلب ہے کہ اس ٹھگنے ڈھاٹا پوش کا تعلق دیدار سنگھ سے نہیں ہوسکتا۔" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مجھے اپنی تفتیش کا دائرہ قلعہ دیدار سنگھ سے باہر دور تک وسیع کرنا ہوگا۔"

ادھر میری بات ختم ہوئی ادھر پتا چلا کہ کھوجی بابا نور محمد وہاں پہنچ گیا ہے۔ میں نے فوراً اسے اپنے پاس بلالیا۔ نور محمد

نہایت ہی تجربے کار اور سمجھ دار کھوجی تھا۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر بولا۔

''ملک صاحب! اگر آپ کا حکم ہو تو بسم اللہ کریں؟''

''بسم اللہ اگر کسی نیک کام کی ہو تو اس کے لیے حکم کی ضرورت نہیں ہوتی نور محمد۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ قاتل کا کھرا نکالنے کے یے سو بار ''بسم اللہ'' کر سکتے ہیں۔''

''تو پھر میں اپنے کام کو وہاں سے شروع کروں گا جہاں قتل کی واردات ہوئی ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''ٹھگنے ڈھاٹا پوش اور چھ نمبر کے جوتے کو میں بعد میں دیکھ لوں گا۔ ویسے یہ جوتے آپ میرے حوالے کر دیں۔''

میں نے اس کی فرمائش پوری کر دی۔

نور محمد کھوجی نے باڑے کے ایک کونے میں تعمیر شدہ اکلوتے کمرے سے اپنے کام کا آغاز کیا اور اس آغاز سے پہلے اس نے مجھ سے کہا تھا۔

''ملک صاحب! کام تو آپ نے شروع کرا دیا ہے لیکن آپ کو یہ تو پتا ہو گا......''

''ہاں...... اچھی طرح پتا ہے۔'' میں نے کھوجی کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ''اس اسپیشل کام کے لیے تمہیں کوئی انعام شام بھی چاہیے ہو گا۔''

''اللہ آپ کا بھلا کرے ملک صاحب!'' وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ''آپ بڑے سمجھدار اور ذہین پولیس افسر ہیں۔''

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں انعام وغیرہ تو ضرور دوں گا مگر اس وقت جب تم مجھے کوئی خوشخبری سناؤ گے۔ ایسی خوشخبری جو مجھے لالی کے قاتل تک پہنچا دے۔''

''جی، ضرور...... ضرور......!'' اس نے بڑے توانا انداز میں سر کو اثباتی جنبش دی اور اپنے کام میں جت گیا۔

ایک محاورہ بہت عام ہے کہ ''تجربہ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔'' یا...... ''تجربہ بولتا ہے۔'' میں اس محاورے کی روح سے اتفاق کرتا ہوں کیونکہ میں نے اسے بار ہا درست پایا ہے۔ نور محمد کے کام کا تجربہ بھی مجھے نظر آ رہا تھا۔ اس نے بڑی مہارت اور تکنیک کے ساتھ ''جوتے'' کا استعمال کرتے ہوئے آدھے گھنٹے کے اندر باڑے والے کمرے سے کھیتوں تک کا سفر طے کیا تھا اور اپنی اس ماہرانہ کارکردگی کے نتیجے میں اس نے ایک فتویٰ صادر کر دیا تھا۔

''ملک صاحب......!'' وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میں نے دو کھرے تلاش کر لیے ہیں۔''

''دو کھرے؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''جی ہاں!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''دونوں کھرے باڑے کے اندر سے شروع ہو کر باہر آئے ہیں لیکن دونوں میں ایک خاص فرق بھی پایا جاتا ہے۔''

''کیا فرق؟'' میں نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

''ایک کھرا تو اسی ٹھگنے بندے کے پاؤں کا ہے جس کا جوتا آپ نے مجھے دیا ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ بندہ مقتول والے کمرے تک گیا تھا مگر کمرے کے اندر داخل نہیں ہوا اور واپس پلٹ گیا۔ باڑے کی جنوبی دیوار تک اس کے دونوں پاؤں کا کھرا بڑا واضح ملتا ہے۔ دیوار پھلانگنے کے بعد جب یہ بندہ باہر پہنچا تو اس کے کھرے میں بھی تبدیلی آ گئی۔ اب یہاں سے کھیتوں تک ایک پاؤں کا جوتے کے ساتھ اور دوسرے پاؤں کا بغیر جوتے کے کھرا ملتا ہے۔''

''اس کے دائیں پاؤں کا جوتا، دیوار پھلانگتے ہوئے باڑے کے اندر گر گیا تھا۔'' وہ سانس لینے کے لیے متوقف ہوا تو میں نے کہا۔ ''ظاہر ہے، اس کے بعد وہ ایک جوتے کے ساتھ ہی بھاگا ہو گا۔ اس کا دوسرا جوتا مجھے کھیتوں کے اندر سے ملا ہے۔ اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ وہ ٹھگنا بندہ کھیتوں سے نکل کر کس طرف گیا ہے؟''

''سر دست میں نے جہاں تک اس کے کھرے پر کام کیا ہے اس کے مطابق، وہ قلعہ دیدار سنگھ سے نکل کر گکھڑ منڈی کی جانب بڑھتا محسوس ہوتا ہے لیکن کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے کے لیے مجھے اس کا...... یعنی اس کے کھرے کا باقاعدہ تعاقب کرنا پڑے گا۔''

''تمہیں تعاقب کرنے سے کس نے روکا ہے؟'' میں نے اضطراری انداز میں کہا۔ ''لیکن کھرے کے پیچھے جانے سے پہلے یہ ضرور بتا دو کہ دوسرا کھرا کیا کہتا ہے؟''

''دوسرا کھرا......!'' اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔ ''دوسرا کھرا مقتول والے کمرے کے اندر سے نکلتا ہے اور باڑے کی مشرقی دیوار پھلانگ کر باہر آ جاتا ہے۔ اس بندے نے پاؤں میں جوتے پہنے ہوئے ہیں۔ وہ مشرقی سمت میں سفر کرتے ہوئے ٹیلی کے اس درخت کی طرف جاتا ہے......''

یہاں تک بتانے کے بعد کھوجی نور محمد نے ٹیلی کے ایک

درخت کی جانب اشارہ کیا۔

مذکورہ درخت، کھیتوں کے پہلو میں ایستادہ تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''اور ٹبلی کے درخت سے آگے کی کیا صورتِ حال ہے؟''

''ٹبلی کے درخت کے نیچے وہ کھرا غائب ہوجاتا ہے۔'' وہ انکشاف انگیز انداز میں بولا۔

''کیا مطلب، نور محمد؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''مطلب یہ جناب کہ......'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس کے بعد اس بندے کے پاؤں کا کھرا نہیں ملتا البتہ......'' اس نے لحاتی توقف کرکے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''البتہ، ٹبلی والے درخت کے نیچے سے کسی گھوڑے کا بڑا واضح کھرا مجھے ملا ہے۔ لگتا ہے، وہ بندہ گھوڑے پر سوار ہوکر کہیں نکل گیا ہے۔''

''کہاں نکل گیا ہے نور محمد؟'' میں نے پوچھا۔

''میں پتا لگانے کی کوشش کرتا ہوں ملک صاحب!'' وہ پراعتماد انداز میں بولا۔ ''آپ مجھے شام تک کا وقت دے دیں۔ میں اپنی ماہرانہ تحقیق سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کردوں گا۔''

''ٹھیک ہے نور محمد! میں تمہیں کل دوپہر تک کا وقت دیتا ہوں۔'' میں نے پرسوچ انداز میں کہا۔ ''چوبیس گھنٹے میں تم اپنے تجربے کے سارے گھوڑے دوڑا ڈالو لیکن کل دوپہر تک مجھے ان دونوں بندوں کے بارے میں مکمل معلومات چاہئیں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہونا......''

''چنگی طراں سمجھ رہا ہوں ملک صاحب۔'' وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ بالکل بے فکر ہوجائیں۔ میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔''

''ٹھیک ہے، تم اپنا کام شروع کردو۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

اس کے بعد میں تھوڑی دیر تک مزید قلعہ دیدار سنگھ میں رکا پھر واپس تھانے کی جانب روانہ ہوگیا۔ میں جیسے ہی تھانے پہنچا، حوالدار جمن شاہ بھی لالی کی لاش کو سرکاری اسپتال پہنچا کر لوٹ آیا تھا پھر ہمارے درمیان قادر بخش عرف لالی کے بارے میں گفتگو ہونے لگی۔

☆☆☆

میں نے کھوجی بابا نور محمد کو چوبیس گھنٹے کا وقت دیا تھا تاکہ وہ کسی حتمی نتیجے پر پہنچ جائے لیکن اگلے روز جب میں تیار ہوکر تھانے پہنچا تو وہ پہلے سے وہاں میرے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا اور فوری طور پر میرا دھیان ایک خاص زاویے کی طرف چلا گیا۔

گزشتہ رات ہلکی پھلکی بارش ہوئی تھی۔ اسے موسلا دھار بارش تو نہیں کہا جاسکتا تاہم اس کا شمار بوندا باندی میں بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہ ایک باقاعدہ بارش تھی جس نے زمین کے سینے کو تربتر کردیا تھا اور ظاہر ہے، زمین کے اس طرح نم ہونے سے کھرا وغیرہ بھی غائب ہوگیا ہوگا۔ مجھے تشویش ہوئی کہ شاید نور محمد اسی پریشانی کے باعث صبح ہی صبح تھانے پہنچ گیا ہے۔ میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلالیا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اس سے کہا۔ ''نور محمد! پچھلی رات ہونے والی بارش نے تمہاری محنت کا تو ستیاناس مار دیا ہوگا؟''

''نہ جی...... بالکل نہیں۔'' وہ بڑے اطمینان سے بولا۔ ''بارش تو جی آدھی رات کے بعد کسی وقت ہوئی ہے۔''

''ہاں...... اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔'' میں نے نور محمد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں رفع حاجت کے لیے اٹھا تھا تو وقت بھی دیکھ لیا تھا۔''

''ملک صاحب! آپ نے مجھے ان دونوں بندوں کے کمرے کی تلاش کے لیے چوبیس گھنٹے کا وقت دیا تھا۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ ''لیکن میں نے کل کا سورج غروب ہونے سے پہلے ہی اپنا کام مکمل کرلیا تھا لہٰذا رات کو ہونے والی بارش سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''یہ تو تم بہت بڑی خوشخبری سنا رہے ہو نور محمد......!'' میں سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔ ''بتاؤ، تمہاری تحقیق سے کیا نتائج برآمد ہوئے ہیں؟''

''بہت ہی سنسنی خیز انکشافات ہوئے ہیں سرکار......'' وہ معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''سنسنی ہی پھیلاتے جاؤ گے یا کچھ بتاؤ گے بھی؟'' میں نے قدرے سخت مگر اضطراری لہجے میں کہا۔

''سنیں ملک صاحب!'' وہ بے حد گمبھیر انداز میں بولا۔ ''جیسا کہ میں نے آپ سے کل ہی عرض کردیا تھا کہ چھوٹے پاؤں والے ٹھگنے بندے کا کھرا گکھڑ منڈی کی جانب جانے کا اشارہ کررہا ہے۔ میں اس کھرے کے تعاقب میں گکھڑ منڈی تک گیا ہوں اور وہ گھر بھی دیکھ لیا ہے جہاں تک اس کھرے نے میری راہنمائی کی ہے۔''

''شاباش نور محمد!'' میں نے بے ساختہ سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''یہ تو تمہاری بہت بڑی کامیابی ہے۔ اب ذرا

دوسرے آدمی کے کھرے کا احوال بھی سناڈالو......؟''

''اس کے کھرے کا احوال دلچسپ ہونے کے ساتھ ہی الجھن آمیز بھی ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں گھوڑے کے سموں کے تعاقب میں جی ٹی روڈ تک پہنچا اور پھر کچھ آگے جا کر میں نے یہ کھرا کھو دیا۔ باوجود کوشش کے میں اس بندے کے پاؤں کے نشانات کو ڈھونڈ نہ سکا لیکن میں نے ہمت نہ ہاری اور نہ ہی کوشش ترک کی، بالآخر مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوگئی۔ میں نے دوبارہ اسی گھوڑے کے سموں کا کھرا پا لیا مگر اس مرتبہ ایک عجیب بات یہ دیکھنے میں آئی کہ وہ کھرا قلعہ دیدار سنگھ کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے اس کھرے کا تعاقب کیا اور قلعہ دیدار سنگھ کے ایک گھر تک پہنچ گیا۔ مجھے تو یہی لگتا ہے ملک صاحب...... کہ اس بندے کا تعلق دیدار سنگھ ہی سے ہے۔ وہ باڑے سے نکلا اور ایک لمبا چکر لگانے کے بعد واپس قلعہ دیدار سنگھ آ گیا۔''

میں نے نور محمد کی بات پوری توجہ سے سنی اور اس کے خاموش ہونے پر سوال کیا۔ ''جی ٹی روڈ پر جہاں تم نے جاتے ہوئے گھوڑے کا کھرا کھویا اور پھر کچھ فاصلے پر اسی گھوڑے کا قلعہ دیدار سنگھ کی طرف آتا ہوا کھرا پکڑا...... وہاں تمہیں اور بھی کوئی خاص کھرا ملا تھا؟''

''جناب! سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے کسی اور کھرے پر توجہ ہی نہیں دی تھی۔'' وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ''میرے لیے دلچسپی کا پہلو یہی تھا کہ میرے مطلوبہ گھوڑے کے سموں کے نشانات کس طرف جا رہے ہیں۔ اس کھرے کو کھو دینا عقل مندی نہ ہوتی۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو نور محمد۔'' میں نے ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''اتنا بھی کافی ہے کہ تم نے پچھلی رات باڑے کی یاترا پر آنے والے دو بندوں کے ٹھکانے کا سراغ لگا لیا ہے۔''

''آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے نا ملک صاحب؟'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

''کون سا وعدہ؟'' میں نے بے ساختہ پوچھ لیا۔

''جناب! اتنی جلدی بھول گئے۔'' وہ شاکی نظر سے مجھے تکنے لگا۔ ''میں انعام کی بات کر رہا ہوں ملک صاحب......؟''

''نور محمد! فکر نہ کرو۔'' میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''تمہارا انعام کہیں بھاگا نہیں جا رہا۔ پہلے قاتل کو میرے ہاتھ لگ جانے دو۔ پھر تمہارا انعام پکا ہے۔''

''مجھے اجازت دیں ملک صاحب۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''جب آپ قاتل کو پکڑ لیں تو پھر میں آپ کے پاس آ جاؤں گا۔''

''نہیں نور محمد......'' میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں یوں جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔''

''جی......'' وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ ''کیا مطلب ملک صاحب؟''

''مطلب صاف ظاہر ہے نور محمد!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تم نے جن دو بندوں کا کھرا نکالا ہے اور جن کے ٹھکانے کا سراغ لگایا ہے وہاں تک مجھے کون پہنچائے گا؟ میں نے تو وہ گھر نہیں دیکھے ہوئے......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''آج کا سارا دن تمہیں میرے ساتھ رہنا ہے۔ دعا کرو، شام سے پہلے لالی کا قاتل میری گرفت میں آ جائے اور تمہیں بھی آج ہی انعام مل جائے۔''

''ٹھیک ہے جناب! جیسی آپ کی مرضی۔'' وہ ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''بتائیں، پہلے کس طرف جانا ہے......؟''

''پہلے ادھر جائیں گے جو جگہ تھانے سے زیادہ نزدیک ہوگی۔'' میں نے کہا۔ ''یعنی قلعہ دیدار سنگھ......!''

اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے ایک کانسٹیبل کو ساتھ لیا اور کھوجی بابا نور محمد کی معیت میں قلعہ دیدار سنگھ پہنچ گیا۔ میں نے مقتول قادر بخش عرف لالی کے باپ خدا بخش کے گھر کا رخ نہیں کیا تھا۔ اس سے بعد میں بھی ملاقات ہو سکتی تھی۔

نور محمد مجھے قلعہ دیدار سنگھ کے جس گھر کے دروازے تک لے گیا وہ کسی انور جٹ کا گھر تھا۔ نور محمد نے بڑے یقینی انداز میں مجھے بتایا تھا کہ جس گھوڑے کے کھرے کا اس نے تعاقب کیا تھا وہ باڑے سے جی ٹی روڈ تک اور پھر جی ٹی روڈ سے اس گھر تک آیا تھا۔

''ملک صاحب! میں نے آپ کو پہلی منزل تک پہنچا دیا ہے۔'' وہ فخریہ لہجے میں بولا۔ ''اب آگے آپ کا کام شروع ہوتا ہے۔''

میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور کانسٹیبل علی حسن کی طرف دیکھا۔ کانسٹیبل فوراً میری آنکھ کا اشارہ سمجھ گیا اور آگے بڑھ کر اس نے انور جٹ کے دروازے پر دستک دی۔

دوسری دستک کے جواب میں ایک خوب صورت

عورت نے دروازہ کھولا۔ میں اور کانسٹیبل علی حسن سرکاری یونیفارم میں تھے۔ ہم پر نظر پڑتے ہی وہ عورت چونکی اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

''ہائے ربا...... پولیس......!''

اس کے ساتھ ہی اس نے جلدی سے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس سے بھی زیادہ تیزی دکھائی اور دروازے کے بیچ پاؤں پھنسا کر اس کی کوشش کو ناکام بنا دیا۔ اسی لمحے اندر سے ایک مردانہ اکتائی ہوئی آواز ابھری۔

''زاہدہ...... باہر کون ہے؟''

زاہدہ یقیناً اسی عورت کا نام تھا جس نے دروازہ کھولا تھا اور اپنے سامنے دو پولیس والوں کو چاق وچوبند کھڑے دیکھ کر بدک گئی تھی۔ اس کے ردعمل نے مجھے شک میں ڈال دیا تھا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ دال میں کچھ کالا ہے ورنہ زاہدہ ہمیں دیکھ کر یوں خوف زدہ نہ ہوجاتی۔

''چاچا...... دروازے پر پولیس آئی ہے۔'' زاہدہ نے استفسار کرنے والے شخص کو جواب دیا۔

میں نے سخت لہجے میں اس سے پوچھا۔ ''بی بی! کیا یہ انور جٹ کا گھر ہے؟''

زاہدہ بدکنے کے بعد دروازے کی اوٹ میں ہوگئی تھی۔ اس کی شکل مجھے نظر نہیں آرہی تھی۔ اس نے دروازے کے پیچھے ہی سے جواب دیا۔

''جی...... انور جٹ میرے خاوند کا نام ہے۔''

''پولیس ہمارے گھر کیا لینے آئی ہے......؟'' اندر سے اسی شخص نے پوچھا۔ زاہدہ نے جسے ''چاچا'' کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ ''ٹھہرو، میں آرہا ہوں۔''

''انور جٹ کو باہر بھیجو۔'' میں نے زاہدہ سے کہا۔ ''میں ایک کیس کے سلسلے میں اس سے پوچھ گچھ کرنے آیا ہوں۔''

''انور تو گھر میں نہیں ہے جی۔''

''گھر میں نہیں تو پھر کہاں ہے؟'' میں نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

اس نے بتایا۔ ''وہ کل صبح کا ایمن آباد گیا ہوا ہے جی۔''

''واپس کب آئے گا وہ......؟''

''کہہ گیا ہے، آج شام تک واپس آجائے گا۔'' زاہدہ نے جواب دیا۔

اتنی دیر میں زاہدہ کا ''چاچا'' بھی دروازے پر پہنچ گیا۔ ''کیا بات ہے سرکار، صبح ہی صبح پولیس ہمارے دروازے پر۔ سب خیریت تو ہے نا......؟''

اس بندے کی عمر ساٹھ کے آس پاس نظر آتی تھی۔ وہ جس طرح آنکھوں کو میچ کر ہماری طرف دیکھ رہا تھا، اس سے مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا کہ اس کی دور کی نگاہ میں اچھا خاصا ضعف آچکا تھا۔

''تم سیانے بیانے ہو چاچا......'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''پولیس خوامخواہ تو کسی کے دروازے پر نہیں آتی......؟''

''پتر...... وہی تو میں بھی پوچھ رہا ہوں۔'' وہ باری باری ہم سب کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آخر معاملہ کیا ہے؟''

''معاملہ جو بھی ہے وہ یوں گلی میں کھڑے کھڑے نہیں بتایا جاسکتا۔'' میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''کیا تمہارے گھر میں بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے؟''

میں نے دیکھا کہ ہماری آمد پر گلی میں نصف درجن لوگ جمع ہوگئے تھے۔ ان سب کے چہروں پر گہری تشویش پائی جاتی تھی۔ ان سب کے ذہنوں میں یقیناً ایک ہی سوال ہوگا کہ پولیس انور جٹ کے دروازے پر کیا کرنے آئی ہے۔

میرے استفسار کے جواب میں زاہدہ کے چاچا نے جلدی سے کہا۔ ''کیوں نہیں جناب، آپ اندر بیٹھک میں بیٹھ کر آرام سے بات کریں۔ ویسے میں آپ کو یہ بتادوں کہ انور جٹ گھر میں موجود نہیں۔''

ٹھیک ایک منٹ کے بعد ہم اندر بیٹھک میں بیٹھے ہوئے تھے۔ زاہدہ اور اس کے چاچا بھی ہمارے سامنے موجود تھے۔ اس شخص کا نام مشتاق جٹ معلوم ہوا۔ وہ انور جٹ کا باپ تھا۔ انور کی ماں کا کافی عرصہ پہلے انتقال ہوگیا تھا۔ یہ صرف تین افراد کا کنبہ تھا۔ انور جٹ اور زاہدہ کی شادی چند ماہ پہلے ہی ہوئی تھی۔ مشتاق جٹ کی بینائی قدرے کمزور تھی۔ وہ لوگ کاشت کاری کرتے تھے۔ ان کے پاس دس ایکڑ زرعی اراضی تھی جو ان کی تمام ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کافی تھی۔ زاہدہ کی عمر بیس اور پچیس سال کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ ایک دلکش اور پرکشش لڑکی تھی۔ اس کی آنکھوں سے تیزی اور طراری ٹپکتی تھی۔ میں نے بوڑھے مشتاق جٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''چاچا! تمہاری بہو نے بتایا ہے کہ انور جٹ کل صبح ایمن آباد گیا تھا اور اس کی واپسی شام تک ہوگی۔ کیا وہ پچھلی سے پچھلی رات گھر پر موجود تھا؟''

میں نے مشتاق جٹ سے اس رات کے بارے میں پوچھا تھا جس رات لالی کو باڑے میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس نے پروثوق انداز میں جواب دیا۔

"جی ہاں، وہ تو ہر رات گھر میں موجود ہوتا ہے، بس پچھلی رات اس نے ایمن آباد میں گزاری ہے اور آج شام تک وہ واپس آجائے گا۔"

"ایمن آباد وہ کس کام سے گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ایک بندے سے کچھ رقم لینا تھی جناب۔" مشتاق جٹ نے بتایا۔

"کتنی رقم...... اور کس بندے سے......؟"

"اس بندے کا نام سودی شاہ ہے جی۔" اس نے بتایا۔ "کافی عرصے سے سودی شاہ کی طرف ایک ہزار روپے پھنسے ہوئے ہیں۔ انور اسی سلسلے میں ایمن آباد گیا ہے۔ سودی شاہ کا اصل نام مسعود ہے جی۔"

"کیا انور جٹ بس کے ذریعے ایمن آباد گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں جناب۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "وہ اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر گیا ہے۔"

گھوڑے کے ذکر پر میں نے چونک کر نور محمد کی جانب دیکھا، وہ بھی معنی خیز انداز میں مجھے تکنے لگا۔ اس صورتِ حال نے مشتاق جٹ اور زاہدہ کو بے چین کر دیا۔ زاہدہ نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

"تھانے دار صاحب! آخر بات کیا ہے۔ آپ کس قسم کی تفتیش کرتے پھر رہے ہیں؟"

"جی سرکار! کچھ پتا تو چلے، آپ کو کس سلسلے میں انور کی تلاش ہے؟" مشتاق جٹ کی تشویش بھری آواز ابھری۔

"سلسلہ بہت سنگین ہے چاچا......!" میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تمہیں پتا ہے نا کہ پچھلی سے پچھلی رات کسی نے خدا بخش کے بیٹے لالی کو باڑے میں قتل کر دیا تھا؟"

"جی۔ بہت ہی افسوسناک واقعہ ہے۔" وہ دکھی لہجے میں بولا۔ "لالی بے چارے کے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے لیکن......" اس نے الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھا اور پوچھا۔ "لالی کے قتل سے میرے بیٹے کا کیا تعلق...... آپ انور سے کس قسم کی پوچھ گچھ کرنا چاہتے ہیں؟"

"تعلق نکلا ہے تو میں تمہارے دروازے پر آیا ہوں نا چاچا۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں نے ایک ماہر کھوجی سے قاتل کا کھرا نکلوایا ہے اور اس کھرے نے ہی مجھے تمہارے گھر تک پہنچایا ہے۔"

"کیا مطلب جی؟" مشتاق جٹ پریشان ہو گیا۔

"قاتل باڑے میں سے نکل کر ٹاہلی کے درخت کے نیچے پہنچا تھا پھر وہاں سے گھوڑے پر بیٹھ کر جی ٹی کی طرف گیا اور وہاں سے گھوم کر اس گھر تک آیا تھا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں بتایا۔ "اب تو تمہاری سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ میں تمہارے بیٹے سے کیوں پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں۔"

"آپ کا اندازہ ٹھیک نہیں ہے تھانے دار صاحب۔" مشتاق جٹ نے کہا۔ "میرا بیٹا کسی کے قتل میں ملوث نہیں ہو سکتا۔"

"چاچا بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔" زاہدہ نے جلدی سے کہا۔ "انور ایسا نہیں کر سکتا۔ آپ کو یقین نہیں آ رہا تو گھر کی تلاشی لے لیں......"

"تلاشی کس بات کی۔" مشتاق نے گھور کر اپنی بہو کو دیکھا۔ "انور کوئی گھر میں تھوڑی چھپا بیٹھا ہے۔ وہ ایمن آباد گیا ہوا ہے اور شام کو واپس آئے گا۔"

"نہیں چاچا، میں انور کی بات نہیں کر رہی۔" زاہدہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "وہ تو مجھے بھی پتا ہے کہ انور ایسا سنگین جرم کر ہی نہیں سکتا۔"

"پھر تم نے گھر کی تلاشی کی بات کیوں کی؟" مشتاق نے پوچھا۔

"تھانے دار جی کو شک ہے کہ قاتل گھوڑے پر سوار ہو کر ہمارے گھر تک آیا ہے۔" زاہدہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "اگر یہ ہمارے گھر کی تلاشی لے لیں گے تو انہیں یقین آ جائے گا کہ ہم نے کسی قاتل کو اپنے گھر میں پناہ نہیں دے رکھی۔"

"چاچا! تمہیں گھر کی تلاشی لینے پر کوئی اعتراض ہے؟" میں نے مشتاق جٹ کی طرف دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں پوچھا۔

"نہیں سرکار...... مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" وہ نرم لہجے میں بولا۔ "میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ میرا بیٹا قتل کی کسی واردات میں ملوث نہیں ہو سکتا۔"

"اس بات کا فیصلہ میں خود کر لوں گا کہ انور جٹ کسی واردات میں ملوث ہے یا نہیں۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "وہ جب ایمن آباد سے واپس آئے گا تو میں اس کی خبر لے لوں گا۔ پہلے اس گھر کی تلاشی ضروری ہے۔"

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر زاہدہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ مشتاق جٹ نے اس سے پوچھا۔ "کیا ہوا زاہدہ......؟"

"تھانے دار جی ہمارے گھر کی تلاشی لیں گے تو ان کے ساتھ رہنا ہو گا نا۔" وہ جلدی سے بولی۔ "چاچا! تمہاری

تو طبیعت خراب ہے۔ میں دیکھتی ہوں اس معاملے کو۔ آپ آرام کرو۔‘‘

ایک بات کو میں نے خاص طور پر محسوس کیا کہ ان بہو سسر میں ذہنی ہم آہنگی نہیں پائی جاتی تھی۔ دونوں کو یہ تو یقین تھا کہ انور جٹ، لالی کے قتل میں ملوث نہیں ہو سکتا لیکن میری تفتیش کے سلسلے میں دونوں کا رویہ جدا تھا۔ زاہدہ میرے ساتھ مکمل تعاون کر رہی تھی جبکہ مشتاق جٹ اس سلسلے میں خاصا گریزاں دکھائی دیتا تھا۔ میں اس فرق کو ذہن میں رکھتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور زاہدہ کی راہنمائی میں گھر کی تلاشی لینے لگا۔

وہ ایک درمیانے سائز کا عام سا گھر تھا۔ میں نے مذکورہ مکان کا کونا کونا چھان مارا۔ ایک کمرے سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے کمرے میں جاتے ہوئے بالآخر کامیابی نے میرے قدم چوم لیے۔ اس دوران میں زاہدہ کسی سائے کی طرح میرے ساتھ رہی تھی۔ لکڑی کی ایک بڑی الماری کے پیچھے سے میں ایک گٹھری ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ زاہدہ اس گٹھری کو دیکھ کر بری طرح چونک اٹھی۔ اس نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

’’یہ...... یہ کیا ہے تھانے دار صاحب......؟‘‘

’’یہ تمہارے گھر سے برآمد ہوئی ہے زاہدہ۔‘‘ میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’تم ہی بتاؤ گی، یہ کیا ہے......؟‘‘

’’میں...... تو اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔‘‘ وہ خوف زدہ انداز میں کبھی مجھے اور کبھی اس گٹھری کو تکنے لگی۔ ’’مجھے نہیں پتا، یہ کس نے یہاں چھپا کر رکھی ہے۔‘‘

اس دوران میں چاچا مشتاق بھی ہمارے قریب پہنچ گیا تھا۔ میں نے مذکورہ گٹھری کی گرہ کھولتے ہوئے زاہدہ سے کہا۔

’’فکر نہ کرو...... ابھی سب پتا چل جاتا ہے۔ یہ گٹھری کس کی ہے۔‘‘

میں نے ان دونوں سسر بہو کی موجودگی میں، ان کی آنکھوں کے سامنے وہ گٹھری کھول ڈالی۔ اگلے ہی لمحے مجھ سمیت وہاں موجود تمام لوگ حیران رہ گئے۔ گٹھری کے اندر سے ایک خون آلود لباس برآمد ہوا۔ میں نے اس لپٹے ہوئے مردانہ لباس کو بھی کھول کر دیکھا۔ لباس کے اندر ایک خون آلود خنجر کو چھپا کر رکھا گیا تھا۔ کپڑوں اور خنجر کی دھار پر لگا ہوا خون خشک ہو کر گہری رنگت اختیار کر چکا تھا۔ میں نے یہ تمام چیزیں زاہدہ کے سامنے پھیلاتے ہوئے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

’’ان کو پہچانتی ہو......؟‘‘

’’جی...... یہ لباس تو انور ہی کا ہے......‘‘ وہ بے یقینی سے خون آلود کپڑوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ’’مگر...... میری سمجھ...... میں نہیں آرہا...... یہ سب کیا ہے......‘‘

مشتاق جٹ پر بھی صورتِ حال واضح ہو چکی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامتے ہوئے بولا۔ ’’یا مولا...... یہ سب کیا ہو رہا ہے......؟‘‘

’’جب انور جٹ میرے ہتھے چڑھے گا تو آپ لوگوں کو سب پتا چل جائے گا کہ کیا ہو چکا ہے، کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے......‘‘ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔ ’’انور کا خون آلود لباس اور اس کے اندر لپٹا ہوا خنجر جو کہانی سنا رہا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ لالی کو انور جٹ ہی نے موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ میں ابھی اس کی گرفتاری کے لیے ایمن آباد جا رہا ہوں۔ مجھے بتاؤ، وہ سودی شاہ ایمن آباد میں کس جگہ رہتا ہے۔ میں شام تک یہاں بیٹھ کر انور کی واپسی کا انتظار نہیں کر سکتا۔‘‘

مشتاق جٹ نے مجھے سودی شاہ کے گھر کا ایڈریس بتا دیا۔ ایمن آباد، گوجرانوالہ شہر سے جنوب میں، پانچ چھ میل کے فاصلے پر واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ سودی شاہ کو وہاں تلاش کرنا دشوار نہیں تھا۔ میں مشتاق جٹ کے گھر سے نکلنے لگا تو وہ منت ریز لہجے میں بولا۔

’’تھانے دار صاحب! میرا بیٹا قاتل نہیں ہو سکتا۔ لالی سے اس کی کوئی دشمنی نہیں تھی۔ وہ لالی کے خون میں ہاتھ نہیں رنگ سکتا۔‘‘

’’کمال کرتے ہو تم بھی چاچا!‘‘ میں نے خفگی آمیز انداز میں کہا۔ ’’آلۂ قتل اور تمہارے بیٹے کا خون آلود لباس اسی گھر کے اندر سے برآمد ہوا ہے اور تم کہہ رہے ہو، لالی کے قتل میں انور جٹ کا کوئی ہاتھ نہیں۔ میں اس خون آلود لباس اور خنجر کو ابھی لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے بھیج رہا ہوں۔ پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔ اس گھر میں صرف تین افراد رہتے ہیں۔ انہی میں سے کسی نے اس گٹھری کو لکڑی کی الماری کے پیچھے چھپایا ہوگا نا...... بتاؤ چاچا! اگر انور کا لالی کے قتل میں کوئی ہاتھ نہیں تو پھر تم دونوں میں سے کس نے یہ کام کیا ہے۔ بتاؤ، تم دونوں میں سے کس نے لالی کو قتل کیا ہے......؟‘‘

’’کسی نے نہیں سرکار......‘‘ وہ بے بسی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ’’اس وقت میرا دماغ کام نہیں کر رہا لیکن مجھے اس بات کا یقین ہے کہ ہم تینوں میں سے کسی نے لالی کو قتل نہیں کیا......‘‘

"پھر یہ گٹھری الماری کے پیچھے کیسے پہنچی......؟"

اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ شکست خوردہ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ سوہنا رب ہی جانتا ہے، اس راز کی حقیقت کیا ہے......"

"سوہنا رب تو ہر چیز سے واقف ہے چاچا!" میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ رات تک تمہیں بھی پتا چل جائے گا، اس راز کی حقیقت کیا ہے...... بس، انور جٹ کو میرے ہتھے چڑھنے دو، پھر سب کچھ سامنے آجائے گا۔"

مشتاق جٹ کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا لہٰذا وہ رحم طلب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ زاہدہ بھی مجھے گہری تشویش میں گھری نظر آئی۔ میں ان کے گھر سے باہر نکل آیا۔

ہم انور جٹ کی گلی سے باہر نکلے تو کھوجی بابا نے مجھ سے کہا۔ "ملک صاحب! اب آپ کا کس طرف جانے کا ارادہ ہے؟"

"ظاہر ہے، میں پہلی فرصت میں ایمن آباد روانہ ہونا چاہتا ہوں۔" میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "اتنے بڑے ثبوت کے مل جانے کے بعد انور جٹ کو ایک لمحے کے لیے بھی نظرانداز کردینا سنگین غلطی ہوگی۔"

"اور گکھڑ منڈی والے کام کا کیا ہوگا......؟" اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

"وہ کام بھی ضرور ہوگا......" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "میں ایمن آباد جاؤں گا اور تم حوالدار چمن شاہ کے ساتھ گکھڑ منڈی کا رخ کرو گے۔ تم نے جس گھر تک ٹھگنے ڈھاٹا پوش کا کھرا نکالا ہے، تم لوگ اس گھر کے مکینوں سے پوچھ گچھ کرنے کے بعد اس ٹھگنے بندے کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ تھانے لے آنا۔ باقی کی پوچھ تاچھ اور تفتیش میں خود کروں گا۔"

"ٹھیک ہے ملک صاحب......!" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "آپ بے فکر ہو کر ایمن آباد جائیں۔ یہاں کے معاملات کو ہم سنبھال لیں گے۔"

اور میں واقعی بے فکر ہو گیا۔

☆☆☆

ایمن آباد والے مشن میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ میں اپنے ساتھ ایک کانسٹیبل کو بھی لے گیا تھا۔ سوہی شاہ کا گھر بہت آسانی سے مل گیا تھا اور میرا مطلوبہ بندہ انور جٹ سوہی شاہ کے گھر میں موجود تھا۔ قصہ مختصر، میں انور جٹ کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ تھانے لے آیا۔ جب ہم تھانے پہنچے تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔

ابتدائی پوچھ گچھ تو میں نے ادھر ایمن آباد ہی میں کر لی تھی لیکن انور جٹ نے اس سلسلے میں اپنی قطعی لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ اسے تو یہ تک معلوم نہیں تھا (بقول اس کے) قلعہ دیدار سنگھ میں لالی کو کسی نے قتل کر دیا تھا۔ وہ اس روز علی الصباح گھر سے نکل آیا تھا لیکن میں اس کی کسی بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس کے گھر کے اندر سے مجھے اس کے جرم کا جو ٹھوس ثبوت ملا تھا، میں اسے کس طور نظرانداز کر سکتا تھا۔ حالات اور واقعات اور بڑی حد تک میری تفتیش اس امر کی جانب اشارہ کرتی تھی کہ دو روز قبل وقوعہ کی رات انور جٹ نے خطرناک خنجر کے پے در پے وار کر کے قادر بخش عرف لالی کو موت کے گھاٹ اتارا، پھر وہ گھوڑے پر بیٹھ کر جی ٹی روڈ کی طرف گیا تاکہ تفتیش کو غلط رخ پر ڈال سکے۔ تھوڑا گھوم پھر کر وہ واپس اپنے گھر آگیا تھا اور پھر علی الصباح ایمن آباد کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ یہ کام اس نے اتنی صفائی سے انجام دیا کہ گھر میں موجود زاہدہ اور مشتاق جٹ کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔ یہ معما حل کرنا باقی تھا اور ابھی تک اس امر کا سراغ بھی نہیں لگایا جا سکا تھا کہ انور جٹ نے کس عداوت میں لالی کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

تھانے پہنچ کر میں اسے ٹرائل روم میں لے گیا اور خون آلود لباس مع خون آلود خنجر اس کے سامنے رکھ دیا پھر سخت لہجے میں پوچھا۔ "اس سامان کو پہچانتے ہو؟"

میں ان چیزوں کا ذکر اس سے ایمن آباد میں بھی کر چکا تھا اور اس نے ہر بات سے صاف انکار کیا تھا۔ وہ کسی بھی قیمت پر اپنا جرم قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے گٹھری سے برآمد ہونے والی چیزوں کو حیرت بھری نظر سے بغور دیکھا اور نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"تھانے دار صاحب...... یہ لباس تو میرا ہی ہے مگر...... اس پر خون کیسے لگا...... اور یہ خون آلود خنجر...... میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"یہ گٹھری مجھے تمہارے گھر کے اندر سے لکڑی کی الماری کے پیچھے پڑی ملی ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "تمہیں تو یہ بھی پتا نہیں ہوگا کہ یہ خون آلود سامان تمہارے گھر کے اندر کیسے پہنچا؟"

میرے طنز میں ڈوبے ہوئے استفسار کے جواب میں وہ بڑی ڈھٹائی سے بولا۔ "تھانے دار صاحب! آپ مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے لیں مگر حقیقت یہی ہے کہ میں ان اشیا کے بارے میں واقعی کچھ نہیں جانتا۔"

"تو اس کا مطلب ہے، گھی سیدھی انگلی سے نہیں نکلے گا۔" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں قسموں کے چکر میں تو نہیں ڈالوں گا مگر آج کی رات یہاں تھانے میں تمہاری خصوصی دعوت ضرور کی جائے گی۔ صبح تک تمہاری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔"

وہ خوف زدہ انداز میں مجھے تکنے لگا۔ میں نے اسے حوالات میں بند کیا اور اپنے کمرے میں آگیا۔ مجھے دراصل حوالدار جمن شاہ کا انتظار تھا۔ وہ کھوجی نور محمد کے ساتھ ٹھگنے ڈھاٹا پوش کے ساتھ گھنٹر منڈی گیا ہوا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ مجھے کمرے میں بیٹھے ہوئے بہ مشکل دس منٹ گزرے ہوں گے کہ حوالدار گھنٹر منڈی سے لوٹ آیا۔ نور محمد کھوجی بھی اس کے ہمراہ تھا اور وہ اپنے ساتھ ایک تیم شحیم اور دراز قامت بندے کو بھی پکڑ لائے تھے۔ اس جناتی جثے کے مالک شخص کا نام دلدار پتا چلا۔ وہ اپنے وزن اور جسم کے پھیلاؤ سے اتنا پریشان اور نالاں نظر آتا تھا کہ چلتے ہوئے یہ دشواری اور ناگواریت اس کے چہرے سے جھلکتی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے چل رہا تھا۔

"یہ کیا ہے جمن شاہ......!" میں نے سوالیہ نظر سے باری باری حوالدار جمن شاہ اور کھوجی نور محمد کی طرف دیکھا۔ "تم لوگ تو ٹھگنے ڈھاٹا پوش کی تلاش میں گھنٹر منڈی گئے تھے اور پکڑ لائے ہو ایک ہاتھی کو...... یہ کیسا مذاق ہے؟"

"جناب...... وہ ٹھگنا اس کے اندر سے نکلے گا۔" کھوجی نور محمد نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"کیا مطلب، نور محمد......" میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ "کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ گوشت کے اس پہاڑ نے اس ٹھگنے ڈھاٹا پوش کو نگل لیا ہے......؟"

"بات دراصل یہ ہے ملک صاحب کہ......" جمن شاہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "یہ دلدار ادھر گھنٹر منڈی میں دودھ دہی کی دکان چلاتا ہے۔ دکان سے گھر اور گھر سے دکان، بس یہی اس کی کل مصروفیت ہے۔ یہ چھڑا چھانٹ اس گھر میں رہتا ہے۔ جہاں تک نور محمد نے ٹھگنے بندے کا کھرے کا پیچھا کیا تھا مگر یہ دلدار اس ضد پر اڑا ہوا ہے کہ یہ کسی ٹھگنے بندے کو نہیں جانتا۔ میں نے ادھر ادھر چند لوگوں سے بھی پوچھ گچھ کی ہے۔ دو دن پہلے لوگوں نے اس ٹھگنے کو دلدار کے گھر میں آتے جاتے دیکھا ہے۔ میں نے گھنٹر منڈی میں اس کا تماشا بنانا مناسب نہ سمجھا اور تفتیش کے لیے اسے اپنے ساتھ تھانے لے آیا ہوں۔" وہ لمحے بھر کے لیے سانس درست کرنے کی خاطر تھما پھر بات ختم کرتے ہوئے بولا۔ "اب جو آپ کا حکم......؟"

"حکم ایک نہیں دو ہیں جمن شاہ۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ایک شکار تم گھنٹر منڈی سے پکڑ کر لائے ہو اور دوسرے کو میں ایمن آباد سے گرفتار کر کے لایا ہوں۔ انور جٹ اس وقت تمہاری سلطنت یعنی حوالات میں بند ہے۔ تم اس کی ہسٹری سے واقف ہو۔ میں نے اس کے گھر سے جرائم کے جو ٹھوس ثبوت برآمد کیے ہیں وہ میں تمہیں دکھا چکا ہوں مگر وہ بندہ اپنے جرم کو قبول کرنے کو تیار نہیں۔ اب یہ دونوں بندے تمہارے حوالے ہیں۔ ان کی زبان کس طرح کھلوانی ہے، یہ تمہیں اچھی طرح معلوم ہوگا۔ بس، میری ایک ہی فرمائش ہے۔"

"جی حکم ملک صاحب؟" جمن شاہ نے فرماں برداری سے کہا۔

"میں بہت تھک گیا ہوں اور آرام کرنے اپنے کوارٹر میں جا رہا ہوں۔" میں نے مضمحل انداز میں کہا اور یہ ایک حقیقت بھی تھی کہ آج دن بھر کی بھاگ دوڑ نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ "میں کل صبح جب اپنی سیٹ پر آکر بیٹھوں تو......" میں نے جمن شاہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنی بات مکمل کردی۔ "تو...... یہ دونوں بندے مجھے صحیح وسالم ملنا چاہئیں اس طرح کہ ان کی زبانیں سچ بولنے کے لیے بے قرار ہوں۔"

"ٹھیک ہے ملک صاحب!" جمن شاہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "آپ مطمئن ہو کر کوارٹر میں جائیں۔ آپ کے حکم کی تعمیل کی جائے گی۔"

حوالدار دلدار کو اپنے ساتھ لے کر میرے کمرے سے نکلا تو کھوجی نور محمد بڑے رازدارانہ انداز میں بولا۔ "ملک صاحب! میرے خیال میں اب میرا کام تو مکمل ہو چکا۔ اگر آپ ابھی مجھے فارغ کردیں تو بہت مہربانی ہوگی۔"

"نور محمد......!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خاصے تیز لہجے میں پوچھا۔ "تمہیں یہ خبر کس نے دی کہ آج رات میرا تبادلہ کسی اور ضلع کے تھانے میں ہونے والا ہے؟"

وہ حیرت سے منہ کھول کر مجھے تکنے لگا۔ "میں نے ایسا کب کہا جناب۔"

"تمہاری باتوں سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے جبھی تمہیں اپنے انعام کی ایسی جلدی لگی ہوئی ہے۔" میں نے شکایتی لہجے میں کہا۔ "میں کہیں بھاگا تو نہیں جا رہا اور جہاں تک تمہارے کام کا تعلق ہے تو میری نظر میں وہ ابھی پورا نہیں ہوا......"

وہ الجھن بھری سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''ٹھگنے ڈھاٹا پوش کا ابھی مکمل سراغ نہیں لگ سکا لیکن مجھے جمن شاہ کی صلاحیت پر پورا بھروسا ہے۔ آج کی رات وہ دلدار پر جس قسم کے تجربات کرے گا اس کے نتیجے میں دلدار شیر فروش کو ٹھگنے کے حوالے سے اپنی زبان کھولنا ہی پڑے گی اور......''

میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے مزید کہا۔

''ابھی تک انور جٹ نے بھی اپنے جرم کا اقرار نہیں کیا۔ ہوسکتا ہے، اس کے گھوڑے کے سموں پر تحقیق کرنے کے لیے مجھے دوبارہ تمہاری کھوجیانہ صلاحیتوں سے استفادہ کرنا پڑے اس لیے، ایک آدھ دن کے لیے تم کچہری کے نیچے دم لو۔ میں جب یہاں موجود ہوں تو تمہارا انعام کہیں بھاگا نہیں جا رہا۔''

میری بات اس کی سمجھ میں آگئی اور وہ مجھے سلام کرکے رخصت ہونے لگا تو میں نے تاکیدی انداز میں کہا۔

''نور محمد! جب تک لالی کے قتل کی کشتی کسی کنارے نہیں لگ جاتی، تمہیں تھانے میں حاضر رہنا چاہیے۔ یہ بہت ضروری ہے۔''

''جو حکم آپ کا ملک صاحب!'' وہ فرماں برداری سے بولا۔

تھوڑی دیر بعد میں تھانے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر میں آگیا۔

☆☆☆

اگلی صبح بہت ہی سنسنی خیز اور تہلکہ ڈال دینے والی تھی۔ میں گزشتہ رات گوشت کے پہاڑ دلدار اور انور جٹ کو حوالدار جمن شاہ کے حوالے کر آیا تھا اور حوالدار نے مجھے مایوس نہیں کیا تھا۔ اگرچہ اسے اپنے مشن میں جزوی کامیابی ہوئی تھی تاہم یہ اس کیس کی اہم پیش رفت تھی۔

میں اپنے کمرے میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ جمن شاہ میرے پاس آگیا اور یہ اطلاع دی۔ ''ملک صاحب! ٹھگنے ڈھاٹا پوش کا سراغ مل گیا ہے۔''

''تفصیل کیا ہے؟'' میں ہمہ تن گوش ہوگیا۔

''اس بندے کا نام بوٹا ہے۔'' جمن شاہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''بوٹا چھوٹے موٹے جرائم میں ملوث رہتا ہے۔ دلدار کے ساتھ اس کی پرانی جان پہچان ہے۔ دلدار نے تسلیم کرلیا ہے کہ جس رات لالی کو قتل کیا گیا اس سے ایک دن پہلے بوٹا اس کے پاس گھڑ منڈی آیا تھا پھر اگلے روز اچانک وہ غائب ہوگیا۔ دلدار کے مطابق وہ اس کے پاس دو تین دن رہنے کے لیے آیا تھا پھر اس کا پروگرام تبدیل ہوگیا اور وہ دلدار کو بتائے بغیر اگلی صبح چپ چاپ کہیں چلا گیا۔''

''بوٹا کا کیا پروگرام تھا اور وہ چپ چپاتے کہاں غائب ہوگیا، اس کا میں پتا لگا لوں گا۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ بتاؤ، موٹے دلدار نے اس ٹھگنے... کے ٹھکانے کے بارے میں بھی کچھ اگلا ہے یا نہیں......؟''

''جی...... سب پتا چل گیا ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بوٹا ''راہ والی'' کا رہنے والا ہے۔ میں نے اس کے گھر کا ایڈریس نوٹ کرلیا ہے۔''

''ویری گڈ!'' میں نے سراہنے والی نظر سے حوالدار کی طرف دیکھا۔ ''راہ والی تو یہاں سے بہت قریب ہے۔ اگر بوٹا کی گرفتاری کے لیے کسی کو ادھر بھیجا جائے تو وہ دو گھنٹے میں واپس آجائے گا۔''

''جی ملک صاحب! آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ کس کو راہ والی بھیجنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟''

''اس کا فیصلہ میں تھوڑی دیر بعد کروں گا۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''پہلے تم مجھے دوسرے شکار کی رپورٹ دو...... انور جٹ نے زبان کھولی یا نہیں؟''

''ملک صاحب! وہ ایک ہی بیان پر ڈٹا ہوا ہے کہ اس نے لالی کو قتل نہیں کیا۔'' جمن شاہ نے جواب دیا۔ ''اسے یہ بھی نہیں پتا کہ خون آلود کپڑوں اور خون آلود خنجر والی پوٹلی اس کے گھر میں کیسے پہنچی تھی۔''

''تم نے اس پر سختی بھی کی ہے؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''جی کی ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''وہ ہر تکلیف سے گزرتا رہا لیکن ایک بار بھی اس نے لالی کے قتل کا اقرار نہیں کیا۔''

''ہوں......'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''تمہیں کیا لگتا ہے جمن شاہ؟''

''ملک صاحب! میرا تجربہ تو یہ بتاتا ہے کہ......'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''یا تو وہ بے گناہ ہے یا پھر بہت ہی اونچے درجے کا کلاکار ہے......''

''اس کی ساری کلاکاری تو میں ناک کے راستے نکال دوں گا۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ذرا وہ ٹھگنا میرے ہتھے لگ جائے...... مجھے امید ہے، بوٹا کسی اہم راز کا انکشاف کرسکتا ہے۔ وہ جو دو تین دن کے لیے دلدار کے پاس رہنے آیا تھا اور پھر وقوعہ کے اگلے روز ہی وہ اچانک

غائب ہوگیا تو اس کے پیچھے ضرور کوئی کہانی چھپی ہوئی ہے۔"

"تو پھر میرے لیے کیا حکم ہے ملک صاحب؟" جمن شاہ نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں اس کے سوالیہ نظر کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "تم کانسٹیبل علی حسن کو اپنے ساتھ لے کر فوراً راہ والی روانہ ہوجاؤ۔ میں دو تین گھنٹے کے بعد یعنی دوپہر سے پہلے اس ٹھگنے بوٹا کو یہاں اپنی نظر کے سامنے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے ملک صاحب۔" وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ "انشاءاللہ! میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔"

حوالدار کے جاتے ہی مقتول لالی کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش اسپتال سے آگئی۔ میں نے مقتول کے باپ خدابخش کو بلانے کے لیے اپنے تھانے کے ایک اہلکار کو قلعہ دیدار سنگھ روانہ کردیا۔ مذکورہ بندہ دس منٹ سے بھی پہلے خدابخش کے ساتھ واپس آگیا تو مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ میرے استفسار پر مذکورہ اہلکار نے مجھے بتایا کہ خدابخش تھانے کے قریب ہی اسے مل گیا تھا۔

میں نے ضروری کاغذی کارروائی کے بعد لالی کی لاش خدابخش کے حوالے کی تو وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔

"تھانے دار صاحب! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"کون سی بات خدابخش؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے پتا چلا ہے کہ آپ نے مشتاق جٹ کے لڑکے انور جٹ کو لالی کے قتل کے الزام میں گرفتار کرکے تھانے میں بند کر رکھا ہے۔"

"تمہیں بالکل ٹھیک پتا چلا ہے خدابخش۔" میں نے کہا پھر اسے گٹھڑی والی تفصیل بھی سنادی۔

"جناب...... لیکن...... یہ کیسے...... ہوسکتا ہے......"

خدابخش کی آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی۔

"کیا کیسے ہوسکتا ہے؟" میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"مطلب یہ کہ انور اور لالی میں تو اچھا میل جول تھا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "ان کے درمیان کبھی معمولی سا جھگڑا بھی نہیں ہوا پھر انور اتنا خطرناک قدم کیسے اٹھا سکتا ہے۔ بس، یہی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی۔"

"جو حقائق اب تک سامنے آئے ہیں ان کی روشنی میں تو انور جٹ ہی لالی کا قاتل نظر آتا ہے۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "حالانکہ ابھی تک اس نے اپنی زبان سے اس جرم کا اقرار نہیں کیا لیکن شام تک دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوجائے گا ابھی اس کیس کی ایک کڑی گم شدہ ہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے میں اس کڑی کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔ اس کے بعد ہی اس کیس کے بارے میں کوئی حتمی بات کرسکوں گا۔"

"آپ ایک تجربہ کار تھانے دار ہیں سرکار۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "اپنے کام کو آپ زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔ میری بس آپ سے ایک ہی درخواست ہے جناب۔"

"کیسی درخواست؟" میں نے سوالیہ نظر سے خدابخش کی طرف دیکھا۔

وہ گلوگیر آواز میں بولا۔ "تھانے دار صاحب! میرا جوان جہان بیٹا اس دنیا سے چلا گیا ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ لالی کا قاتل جلد از جلد کیفر کردار کو پہنچے لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ کسی بے گناہ کے ساتھ زیادتی ہو۔"

"تمہارا اشارہ انور جٹ کی طرف ہے؟"

"جی...... آپ سمجھدار ہیں۔" وہ اثبات میں سرہلاتے ہوئے بولا۔

"خدابخش! تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ "میں تمہاری دلی کیفیت کو بخوبی سمجھ رہا ہوں۔ تم صرف اپنے بیٹے کی تدفین کی طرف دھیان دو۔ مجھ پر بھروسا رکھو۔ میں انصاف کے تقاضے پورے کرنا جانتا ہوں۔"

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور رخصت ہوگیا۔

اسی سہ پہر حوالدار جمن شاہ راہ والی سے لوٹ آیا۔ اس کی واپسی کامیاب رہی تھی۔ وہ بوٹا نامی ٹھگنے قد کے اس شخص کو اپنے ساتھ لے آیا تھا جس کی ہمیں تلاش تھی۔ بوٹا کے دوست شیر فروش دلدار کو ابھی تک میں نے رہا نہیں کیا تھا۔ بوٹا کمزور اعصاب کا مالک ثابت ہوا۔ جب اس نے ڈھائی، تین من کے دلدار کو حوالات کے ٹھنڈے ٹھار فرش پر پڑے دیکھا تو اس کی ہمت جواب دے گئی۔ لہٰذا اس کی زبان کھلوانے کے لیے مجھے زیادہ "محنت" نہیں کرنا پڑی۔ بوٹا نے جو بیان دیا اس میں سے غیر ضروری باتوں کو حذف کرکے میں خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

دلدار شیر فروش نے چھترول کے بعد کسی قسم کی غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا۔ وہ واقعی اس راز سے واقف نہیں تھا کہ بوٹا دو تین دن کے لیے اس کے پاس رہنے کیوں آیا تھا اور...... اگر آیا بھی تھا تو ایک ہی رات کے بعد اگلی صبح وہ چپ چاپ کہاں غائب ہوگیا۔ دلدار کی زبانی مجھے یہ پتا چل

چکا تھا کہ بوٹا چھوٹے موٹے جرائم کا ارتکاب کرتا رہتا تھا۔ بوٹا نے بتایا کہ ان دنوں وہ مویشیوں کی چوری پر کمربستہ تھا۔ وہ ولدار کے پاس گلگھڑ منڈی اسی لیے رہنے آیا تھا کہ قلعہ دیدار سنگھ اور اس کے گردونواح کے باڑوں پر ہاتھ صاف کرسکے۔ اب یہ اس کی بدنصیبی کہ اس نے اپنے ''کام'' کا آغاز خدابخش کے باڑے سے کیا اور پہلا قدم ہی ایسا الٹا پڑا کہ اسے فی الفور وہاں سے غائب ہونا پڑا۔

''آخر تم پر ایسی کون سی قیامت ٹوٹ پڑی تھی کہ اگلی صبح تم اپنے میزبان کو بتائے بغیر ہی غائب ہوگئے؟'' میں نے سخت لہجے میں استفسار کیا۔

''جناب! میں نے اس وقت باڑے کا رخ کیا جب ولدار خراٹے دار نیند کے مزے لے رہا تھا۔'' وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ ''رات کے اس پہر قلعہ دیدار سنگھ کے وسنیک اپنے اپنے گھروں میں گہری نیند سو رہے تھے۔ پروگرام کے مطابق میں باڑے کی دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہوگیا اور باڑے کے اندر نصف درجن سے زیادہ جانوروں کو دیکھ کر مجھے بے پناہ خوشی کا احساس ہوا۔ میں نے احتیاط کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے، جانوروں کو باڑے سے باہر لانے سے پہلے ..... باڑے کے کمرے میں جھانکنا ضروری سمجھا تاکہ یہ اطمینان کرسکوں کہ باڑے کا مالک سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے لیکن......''

وہ بولتے بولتے تھما تو میں نے سوال کیا۔ ''لیکن کیا؟''

''تھانے دار صاحب! ابھی میں کمرے میں چند قدم دور ہی تھا کہ میں نے اندر سے ایک لمبے تڑنگے آدمی کو باہر نکلتے دیکھا۔'' وہ سنسنی آمیز انداز میں بتانے لگا۔ ''اس بندے کے ہاتھ میں ایک پوٹلی بھی تھی اور...... اور میں نے اس بندے کو پہچان لیا۔''

''اوہ......'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ''کون تھا وہ؟''

''جناب! یہ ٹھیک ہے کہ اس وقت باڑے میں گھپ اندھیرا تھا لیکن میری آنکھیں دھوکا نہیں کھاسکتیں۔'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''وہ ملنگی کے سوا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔''

''ملنگی......'' میں نے زیرلب دہرایا پھر اپنے سامنے کھڑے، ٹھگنے بوٹا سے لمبو ملنگی کے بارے میں استفسار کیا۔ ''یہ ملنگی کون ہے۔ ذرا اس کا حدود اربعہ بھی تو بتاؤ؟''

''جناب! ملنگی ایک خطرناک ڈاکو ہے۔'' وہ جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔ ''چند سال پہلے وہ جیل چلا گیا تھا۔''

میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ ملنگی کے ذکر پر بوٹا خاصا سراسیمہ دکھائی دینے لگا تھا۔ ایک فوری خیال کے تحت میں نے اس سے پوچھا۔

''بوٹا! کیا ملنگی نے بھی تمہیں باڑے میں دیکھ لیا تھا؟''

''نہیں جناب۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں اس کی نگاہ سے بچنے کے لیے فوراً کمرے کی مغربی دیوار کی اوٹ میں تاریکی میں چھپ گیا تھا۔ ملنگی نے باڑے کی مشرقی دیوار پھلانگی اور میری نظر سے اوجھل ہوگیا۔''

ایک لمحے کے لیے مجھے شک ہوا کہ بوٹا مجھے چکر دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ اپنی گردن بچانے کے لیے کسی ملنگی ڈاکو کا کردار تخلیق کرسکتا تھا۔ میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

''دیکھو بوٹا...... اگر بعد میں کسی مرحلے پر یہ ثابت ہوا کہ تم نے مجھ سے غلط بیانی کی ہے تو میں تمہیں زمین کے اندر ہی دھنسا دوں گا۔ ابھی تو پھر بھی تم زمین کے اوپر چلتے پھرتے نظر آجاتے ہو۔ مجھ سے جھوٹ بولنے کا بڑا بھیانک انجام ہوگا۔''

''میری توبہ تھانے دار صاحب۔'' وہ اپنے دونوں کانوں کو چٹکیوں میں پکڑتے ہوئے بولا۔ ''میری اگلی پچھلی سات نسلوں کی توبہ جو میں نے ایک بھی بات آپ کو غلط بتائی ہو۔''

''ہوں......'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''ملنگی کے چلے جانے کے بعد تم نے کیا کیا؟''

''ملنگی کو اس طرح وہاں سے رخصت ہوتے دیکھ کر میرے دل میں تجسس پیدا ہوا کہ وہ کمرے کے اندر کیا کرکے آیا ہے۔'' بوٹا گہری سنجیدگی سے بتانے لگا۔ ''میں چند منٹ تک تاریکی میں چپ چاپ کھڑا رہا پھر دبے پاؤں کمرے کی جانب بڑھا پھر میں نے جیسے ہی کمرے کے اندر جھانکا تو میرا دماغ گھوم کر رہ گیا......''

''کیوں...... تم نے کمرے میں ایسا کیا دیکھ لیا تھا؟'' میں نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

''تھانے دار صاحب! ملنگی نے ایک بندے کو قتل کردیا تھا۔'' وہ انکشاف انگیز انداز میں بولا۔ ''اندر کمرے میں ایک چارپائی پر ایک بندے کی لاش پڑی ہوئی تھی۔''

''بہت خوب......'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''باڑے میں گھپ اندھیرا تھا اور تم نے کمرے کے اندر جھانک کر دیکھ لیا کہ وہاں چارپائی پر کسی کی لاش پڑی ہوئی ہے؟''

''جناب! میں نے بیٹری مار کر دیکھا تھا کمرے کے اندر۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ پھر اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے یوں اضافہ کیا۔ ''میں جب کسی مہم پر نکلتا ہوں تو ایک بیٹری (ٹارچ) اپنی جیب میں رکھتا ہوں۔ یہ

بہت کام کی چیز ہے۔ اور اندھیری راتوں میں بہت مدد کرتی ہے......'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''میں نے جب ملنگی کو کمرے کے اندر سے نکلتے دیکھا تو اسی لمحے مجھے یقین ہوگیا تھا کہ یہاں کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہوچکی ہے، اسی لیے میں نے بیٹری مار کر اندر کا جائزہ لیا اور جب میں نے ایک بندے کو خون میں لت پت چارپائی پر پڑے دیکھا تو مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ ملنگی نے اس بندے کو قتل کیا ہوگا۔ بس، میں فوراً وہاں سے واپس آ گیا۔ میں قتل کی کسی واردات میں خود کو ملوث نہیں کرسکتا تھا۔ میں چھوٹا موٹا چور ہوں تھانے دار صاحب۔ یہ قتل وتل کے معاملات سے میں کوسوں دور رہتا ہوں پھر مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ اگر ملنگی واپس آ گیا تو کہیں مجھے بھی موت کے گھاٹ نہ اتار دے......''

''تو تم نے کمرے کے اندر قدم نہیں رکھا تھا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''جی نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''وہاں کی جو صورت حال تھی اس نے تو میری مت ہی مار دی تھی تھانے دار صاحب۔ میں سیدھا دلدار کے گھر آیا۔ دلدار بے خبری کی نیند سو رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں صبح ہونے والی تھی۔ میں نے دلدار کو جگانا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی کے ساتھ اس کے گھر سے نکل گیا۔ بس جناب...... باڑے کی دیوار پھلانگتے ہوئے میرے ایک پاؤں کا جوتا اندر ہی گر گیا تھا اور شاید اسی جوتے نے آپ لوگوں کو مجھ تک پہنچایا ہے۔ میں نے دوسرے پاؤں کا جوتا کھیتوں میں پھینک دیا تھا۔''

بوٹا غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا تھا۔ کھوجی نور محمد کی ریسرچ بھی یہی بتاتی تھی کہ چھوٹے پاؤں والا ٹھگنا بندہ مقتول کے کمرے تک گیا تھا مگر کمرے کے اندر داخل نہیں ہوا تھا پھر وہ باڑے کی جنوبی دیوار پھلانگ کر کھیتوں کی سمت بھاگا تھا جبکہ دوسرے آدمی کا کھرا مقتول کے کمرے کے اندر سے نکلتا تھا پھر باڑے کی مشرقی دیوار پھلانگ کر باہر چلا جاتا تھا اور اب بوٹا نے بھی ملنگی کے حوالے سے جو کچھ بتایا تھا وہ کھوجی نور محمد کی تحقیق کی تصدیق کرتا تھا۔

''بوٹا......!'' میں نے ٹھگنے ڈنگر چور کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔ ''تم ملنگی ڈاکو کو کب سے جانتے ہو؟''

''ملنگی پہلے راہ والی میں رہتا تھا جناب۔'' بوٹا نے جواب دیا۔ ''پھر وہ کسی ڈکیتی کی واردات میں گرفتار ہوکر جیل چلا گیا۔ اس کے بعد کا مجھے کچھ پتا نہیں۔ میں نے اس رات جب ملنگی کو مقتول کے کمرے سے نکلتے دیکھا تو مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا کہ وہ وہاں کیا کر رہا تھا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم قادر بخش عرف لالی کے قتل کے بارے میں اور کیا جانتے ہو؟''

''کچھ نہیں جناب...... مجھے جتنا پتا تھا، وہ آپ کو بتا دیا ہے۔'' وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ ''لالی کے قتل سے میرا دور کا بھی واسطہ نہیں سرکار...... آپ مجھے جانے کی اجازت دے دیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔''

''بوٹا...... تمہیں جانے کی بہت جلدی ہے اور مجھے لالی کے قاتل تک پہنچنے کی۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور جب تک میرا مقصد پورا نہیں ہوجاتا، تم میرے مہمان رہو گے بلکہ دلدار کے مہمان رہو گے۔ بس، وہ اس وقت جہاں قیام پذیر ہے تمہیں بھی وہیں پر وقت گزارنا ہوگا۔''

اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ اپنے دوست دلدار شیر فروش کو حوالات کے ننگے فرش پر کسمپرسی کی حالت میں دیکھ چکا تھا۔ اس نے میرے سامنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے التجا کی۔

''تھانے دار صاحب! آپ یقین کریں، میں... بے قصور ہوں۔''

''میں نے یقین کرلیا کہ تم اس کیس میں بے قصور ہو۔'' میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ''لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی حاجی نمازی اور پرہیزگار ہو۔ اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں کہ تم مویشی چور ہو بس، یہی سوچ کر حوالات کی ہوا کھا لو کہ میں نے تمہیں مویشی چراتے رنگے ہاتھوں گرفتار کرلیا ہے۔''

وہ امید بھری نظر سے مجھے تکنے لگا لیکن میں نے کسی رعایت سے کام نہیں لیا اور ایک کانسٹیبل کو بلا کر بوٹا کو اس کے جگری یار دلدار کے پاس پہنچا دیا۔

بوٹا کے بیان کے مطابق لالی کو ملنگی نے موت کے گھاٹ اتارا تھا تاہم اس نے قتل کی یہ واردات اپنی آنکھوں سے ہوتے نہیں دیکھی تھی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ ملنگی کی لالی سے کیا دشمنی تھی......؟

مجھے اس تھانے میں تعینات ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا لہٰذا میں ملنگی کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا۔ میں نے فوری طور پر ایک کانسٹیبل کو بھیج کر مقتول کے باپ خدا بخش کو تھانے بلانے کا فیصلہ کیا لیکن اگلے ہی لمحے میں

نے اپنے اس فیصلے کو بدل دیا۔

یہ ٹھیک ہے کہ ملنگی کے حوالے سے خدا بخش سے پوچھ تاچھ بہت ضروری تھی لیکن آج دن میں، میں نے اس کے جوان بیٹے کی لاش اس کے حوالے کی تھی۔ آج شام ہونے والی تھی۔ یقیناً خدا بخش، لالی کی تدفین سے فارغ ہوا ہوگا۔ اس دل گرفتہ ماحول میں اسے تھانے بلانا مجھے مناسب نہ لگا اور میں خود چل کر اس کے گھر پہنچ گیا۔ حوالدار جمن شاہ بھی میرے ساتھ تھا۔ میں نے راستے میں جمن شاہ سے ملنگی ڈاکو کے بارے میں تفصیلی بات کی۔ جمن شاہ کی معلومات بھی بوتا جتنی ہی تھیں یعنی...... ملنگی ایک خطرناک ڈاکو تھا جو چند سال پہلے گرفتار ہوکر جیل چلا گیا تھا۔

جب کوئی مجرم گرفتار ہوکر جیل چلا جاتا ہے تو پھر وہ لوگوں کی گفتگو کا مرکز نہیں رہتا۔ لوگ رفتہ رفتہ اسے بھلا دیتے ہیں حتیٰ کہ اس مجرم کے حوالے سے پھر کوئی سنسنی خیز واقعہ رونما نہ ہوجائے اور...... ملنگی کی نسبت سے ایک تہلکہ خیز واقعہ ظہور پذیر ہو چکا تھا۔

جب ہم مقتول کے گھر پہنچے تو اندھیرا پھیلنا شروع ہوگیا تھا۔ میں خدا بخش کو لے کر ایک الگ تھلگ جگہ پر بیٹھ گیا۔ چند لمحات تک میں اس کی دل جوئی کرتا رہا پھر اپنے مقصد کی طرف آتے ہوئے کہا۔

''خدا بخش! آج دن میں جب تم میرے پاس تھانے آئے تھے تو میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اس کیس کی ایک کڑی ابھی باقی ہے جو شام تک میرے ہاتھ لگ جائے گی...... یاد ہے نا؟''

''جی...... آپ نے ایسی بات کی تھی۔'' وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''میں تمہاری ذہنی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں خدا بخش۔'' میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''اگر اس وقت تم سے ملنا ضروری نہ ہوتا تو میں کبھی یہاں نہ آتا۔''

''کوئی بات نہیں تھانے دار صاحب۔'' وہ مجروح لہجے میں بولا۔ ''آپ تو قانونی تقاضوں کے سامنے مجبور ہیں اور ظاہر ہے، یہ سب کوششیں آپ لالی کے قاتل تک پہنچنے کے لیے ہی کر رہے ہیں۔''

''بے شک!'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''میں اس کیس کی آخری کڑی تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ تمہارے بیٹے کا قاتل مجھ سے دور نہیں لیکن تمہارے تعاون کے بغیر میں اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔''

''آپ حکم کریں تھانے دار صاحب......'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ لالی کو جس بہیمانہ انداز میں موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے وہ کسی ایسے شخص ہی کا کام ہوسکتا ہے جو اپنے دل میں لالی کے لیے بے پناہ نفرت رکھتا ہو۔'' میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''اور میں اس بندے تک پہنچ گیا ہوں۔''

''کون ہے وہ بدبخت؟'' اس نے دکھی لہجے میں استفسار کیا۔

''ملنگی......!'' میں نے سنسناتے ہوئے انداز میں کہا۔

''ملنگی......'' وہ حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ بولا۔ ''مگر وہ تو جیل چلا گیا تھا۔''

''لیکن وقوعہ کی رات ملنگی کو لالی والے کمرے سے نکلتے دیکھا گیا تھا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی بھی تھی۔''

''اوہ......'' وہ تشویش بھرے انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

''اب تم مجھے بتاؤ کہ ملنگی کی لالی سے کیا دشمنی تھی؟'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''دشمنی کوئی نہیں تھی ملک صاحب......'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''بس لالی کی بہادری کی وجہ سے وہ ڈکیتی کی ایک واردات میں ناکام رہا تھا اور گرفتار ہوگیا تھا۔''

''یہ بات تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی؟'' میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''میرا ملنگی کی طرف دھیان نہیں گیا تھا سرکار۔'' وہ لجاجت آمیز انداز میں بولا۔ ''یہ تو تین سال پہلے کا واقعہ ہے۔ لالی ایک شادی میں گیا ہوا تھا اور ملنگی نے شادی والے گھر میں ڈکیتی کی کوشش کی تھی لیکن لالی نے اپنی جان پر کھیل کر نہ صرف یہ کہ ڈکیتی کی واردات کو ناکام بنا دیا تھا بلکہ اس نے ملنگی کو اس طرح قابو کرلیا تھا کہ پھر وہ ہل نہ سکا اور لوگوں کے جمع ہوجانے پر ملنگی کو پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ بعدازاں ملنگی عدالت سے سزا پا کر جیل چلا گیا تھا۔''

''اور تم مطمئن ہوگئے کہ مجرم گیا جیل......'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''یہ کتنا عرصہ پہلے کی بات ہے؟''

''لگ بھگ تین سال پہلے یہ واقعہ پیش آیا تھا۔'' اس نے بتایا۔

''اور ملنگی کو کتنے سال کی سزا ہوئی تھی؟''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا جناب۔'' وہ بے بسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے، میں کل ہیڈ کوارٹر سے ملنگی کے بارے میں ساری تفصیلات حاصل کرلوں گا۔'' میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا پھر خدا بخش سے سوال کیا۔ ''کیا ملنگی اور انور جٹ میں کسی قسم کا کوئی تعلق ہے؟''

میں نے انور جٹ کے گھر میں سے، لکڑی کی ایک الماری کے پیچھے سے جو گٹھری برآمد کی تھی اس میں انور جٹ کا لباس اور خون آلود آلۂ قتل یعنی وہ خطرناک خنجر موجود تھا لیکن انور جٹ کا اصرار تھا کہ وہ اس گٹھری کے بارے میں کچھ نہیں جانتا کہ وہ لکڑی کی مذکورہ الماری کے پیچھے کیسے پہنچی۔ بوٹا کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ جب اس نے ملنگی کو مقتول کے کمرے سے نکلتے دیکھا تو اس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی بھی تھی۔ اغلب امکان یہی تھا کہ یہ وہی پوٹلی ہوگی جو میں نے انور جٹ کے گھر کے اندر سے برآمد کی تھی۔ یہاں پر یہ اہم سوال اٹھتا تھا کہ ملنگی نے لالی کو قتل کرنے کے بعد وہ پوٹلی انور جٹ کے گھر میں کیسے پہنچائی اور کیوں......؟

''نہیں جی، ایسا کوئی تعلق میرے علم میں تو نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''انور جٹ ایک سیدھا سادہ انسان ہے۔ اس کا ملنگی جیسے مجرم سے کیا واسطہ۔''

میں مزید تھوڑی دیر خدا بخش کے پاس بیٹھ کر تھانے آگیا۔

سب سے پہلے میں نے بوٹا کو اپنے کمرے میں بلایا اور انور جٹ کے گھر سے برآمد ہونے والی گٹھری اسے دکھاتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تم نے وقوعہ کی رات ملنگی کے ہاتھ میں یہی پوٹلی دیکھی تھی؟''

اس نے بہ غور گٹھری کا جائزہ لینے کے بعد متذبذب انداز میں کہا۔ ''تھانے دار صاحب! حق سچ بات تو یہ ہے کہ اب میں پورے دعوے کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ وہی پوٹلی ہے۔ ویسے وہ ایسی ہی پوٹلی تھی۔''

بوٹا ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں نے اسے واپس حوالات بھیج کر انور جٹ کو اپنے پاس بلالیا۔ وہ خاصا مضمحل اور کھویا کھویا سا تھا۔ میں نے اسے اپنے سامنے بیٹھنے کے لیے کہا اور اس سے پہلے کہ میں اس سے کوئی سوال کرتا، وہ فریادی لہجے میں بولا۔

''تھانے دار صاحب! لالی کے قتل سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ آپ کو میری بات کا یقین کرلینا چاہیے۔''

''یقین کرلیا......'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور بولو۔''

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے متذبذب لہجے میں

بولا۔ ”تو آپ کو میری بے گناہی کا یقین آ گیا ہے.....؟“

”کہا ہے نا، یقین آ گیا ہے..... اور بولو؟“ میں نے بہ دستور گہری سنجیدگی سے کہا۔

”تو پھر..... مجھے گھر جانے دیں.....“ وہ مضطرب لہجے میں بولا۔

”ٹھیک ہے، میں تمہیں صبح گھر جانے کی اجازت دے دوں گا۔“ میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ”لیکن میری ایک شرط ہے۔“

”شرط..... کیسی شرط جناب.....؟“ اس کے انداز میں الجھن در آئی۔

”میں تم سے، جو کچھ بھی پوچھوں، اس کا تم سولہ آنے سچ جواب دو گے۔“ میں نے کہا۔

”میں نے تو پہلے بھی آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا جناب۔“

”پہلے کو چھوڑو..... میں اب کی بات کر رہا ہوں۔“ میں نے زور دے کر کہا۔

”جی.....“ وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”پوچھیں جی۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا تم ملنگی نامی کسی ڈاکو کو جانتے ہو؟“

”جی..... ملنگی بہت خطرناک ڈاکو ہے اور شاید اس وقت جیل میں ہے۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”لالی نے بڑی بہادری سے اسے، جن چھا ڈال کر گرفتار کرایا تھا۔“

”وہ جیل میں تھا مگر اب آزاد گھوم رہا ہے۔“ میں نے اسے بتایا۔ ”لالی کے جن جیسے نے ملنگی کو جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے پہنچایا تھا۔ یہ تو ابھی مجھے پتا نہیں کہ وہ اپنی سزا کاٹ کر جیل سے رہا ہوا ہے یا مفرور ہے لیکن میں یہ حقیقت جاننے میں کامیاب ہو گیا ہوں کہ وقوعہ کی رات ملنگی ہی نے بے دردی سے لالی کو قتل کر کے اپنے انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کیا ہے۔“

”اوہ..... یہ تو بہت بری خبر ہے کہ وہ خطرناک ڈاکو آزاد گھوم رہا ہے۔“ وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا۔

”جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔“ میں نے اپنے لہجے کی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ”مگر میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تمہارا لباس اس نے کیسے حاصل کیا اور پھر خون آلود لباس اور خنجر والی گٹھری کو اس نے کیسے تمہارے گھر کے اندر چھپا دیا تاکہ لالی کے قتل کا الزام تم پر آئے؟“

”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا جناب.....“ وہ پریشانی سے بولا۔

”تمہاری ملنگی کے ساتھ کبھی کوئی پرخاش رہی ہے؟“

”نہیں جناب..... بالکل نہیں۔“

”تمہارے گھر میں تم تین افراد یعنی تم، تمہاری بیوی اور تمہارے باپ کے علاوہ اور کس شخص کا آنا جانا ہے؟“ میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”کسی کا بھی نہیں!“ وہ پوری قطعیت سے بولا۔

”پھر تو وہ تم تینوں میں ہی سے کسی کے تعاون سے... گٹھری تمہارے گھر کے اندر چھپا سکتا ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم نے اپنی لاعلمی کا اظہار کر دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب مجھے مشتاق جٹ اور زاہدہ کو تھانے بلا کر تفتیش کرنا ہو گی۔“

”جناب! یہ ساری باتیں میرا دماغ خراب کر رہی ہیں۔“ وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامتے ہوئے بولا۔ ”ابا تو مجرموں اور برے لوگوں سے شدید نفرت کرتا ہے۔ وہ ملنگی کے ساتھ مل کر میرے خلاف کیوں سازش کرے گا۔“

”اور زاہدہ.....؟“ میں نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔

”یہ ٹھیک ہے کہ میرے اور زاہدہ کے بیچ لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ وہ اس حد تک گر جائے گی کہ مجھے پھنسانے کے لیے کسی مجرم کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جائے.....“ اس کی الجھن ساتویں آسمان کو چھو رہی تھی۔

”بس تو اس کا پھر ایک ہی مطلب ہے کہ ملنگی جیل سے کوئی زبردست قسم کا جادو سیکھ کر آیا ہے۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

وہ بے بسی سے سر جھٹکنے لگا۔ ان لمحات میں وہ بہت زیادہ الجھن کا شکار نظر آتا تھا۔ میں نے اسے ایک رات اچھی طرح سوچنے کا موقع فراہم کر کے دوبارہ حوالات میں بھیج دیا۔

☆☆☆

آئندہ روز میں نے دلدار شیر فروش آف گھکھڑ منڈی کو چھوڑ دیا۔ اس ڈھائی من کی لاش کا لالی کے قتل سے کوئی تعلق نہیں تھا تاہم بوٹا اور انور جٹ کو اس وقت تک پولیس کسٹڈی ہی میں رہنا تھا جب تک ملنگی پولیس کی گرفت میں آ کر اپنے جرم کا اقرار نہ کر لیتا۔

اسی روز میں نے اپنے ذرائع استعمال کر کے ملنگی کے بارے میں تفصیلی معلومات بھی حاصل کر لیں۔ وہ اپنی سزا کاٹنے کے بعد لگ بھگ ایک ماہ پہلے جیل سے رہا ہوا تھا۔ بوٹا کی زبانی مجھے پتا چل چکا تھا کہ ملنگی جیل جانے سے پہلے راہ والی میں رہتا تھا لیکن جب میں نے دوبارہ بوٹا سے پوچھ تاچھ کی تو پتا چلا کہ گرفتار ہونے کے بعد ملنگی نے بھی راہ

والی کا رخ نہیں کیا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ جیل سے رہا ہونے کے بعد اس نے اپنا ٹھکانا کہیں اور کرلیا تھا۔

میں نے ملنگی کی گرفتاری کے لیے تین چھاپا مار ٹیمیں تشکیل دیں۔ ہر ٹیم تین افراد پر مشتمل تھی اور ان تین افراد میں ایک سینئر اور دو جونیئر پولیس اہلکار شامل تھے۔ انہیں قلعہ دیدار سنگھ، راہ والی، گکھڑ منڈی اور اردگرد کے علاقوں میں ملنگی کو تلاش کرنا تھا۔ اس دوران میں بوٹا نے کئی بار مجھ سے درخواست کی کہ میں اسے رہا کردوں مگر میں نے اس کی گزارشات پر کان نہیں دھرے۔

چوتھے روز ایک مخبر نے مجھے اطلاع دی کہ ملنگی ڈاکو بھیس بدل کر قلعہ دیدار سنگھ ہی کے ایک گھر میں چھپا بیٹھا ہے۔ یہ اطلاع چونکا دینے والی تھی۔ مطلب، مجرم پولیس کی ناک تلے چھپا بیٹھا تھا۔ مخبر نے جس گھر کی نشاندہی کی تھی وہ عام آبادی سے ہٹ کر ایک طرف بنا ہوا تھا اور حاصل شدہ معلومات کے مطابق ایک غیر آباد مکان تھا۔ میرے لیے تشویش ناک بات یہ تھی کہ وہ قلعہ دیدار سنگھ میں قتل کی ایک واردات کرنے کے بعد اسی علاقے میں کیوں چھپا بیٹھا تھا۔

میں نے چاق و چوبند افراد کا ایک دستہ تیار کیا اور مخبر کے ہمراہ مذکورہ غیر آباد مکان کی جانب روانہ ہوگیا جسے ملنگی نے بغیر اطلاع کے آباد کررکھا تھا۔

مخبر کی اطلاع غلط نہیں تھی۔ ملنگی ایک بھکاری کے بھیس میں واقعی اس مکان میں موجود تھا لیکن خاصا محتاط بھی تھا۔ اسے کسی طرح پولیس کی آمد کی خبر مل گئی۔ ہم ابھی اس مکان سے چند گز کے فاصلے پر ہی تھے کہ اس نے مکان کے عقبی حصے سے فرار ہونے کی کوشش کی۔ میری عقابی نگاہ نے اسے دیکھ لیا اور میں نے للکار کر کہا۔

''ملنگی ...... رک جاؤ......''

میری للکار کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ میں نے ایک بار پھر اسے دھمکی دی۔ ''ملنگی ...... تمہارا کھیل ختم ہوچکا۔ رک جاؤ ورنہ میں گولی چلادوں گا۔''

یوں محسوس ہوتا تھا، اس کی سماعت کہیں رخصت ہوگئی ہو۔ وہ اندھا دھند بھاگتا چلا جارہا تھا۔ روڈ کراس کرنے کے بعد اس نے ریلوے لائن کی جانب دوڑ لگادی۔ اس ریلوے ٹریک کے آگے کھیتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا تھا جن میں چاول کی تیار فصل کھڑی تھی۔ اگر وہ کھیتوں کے اندر گھس جاتا تو ہماری نظروں سے اوجھل ہوجاتا۔ میرے مستعد جوان بھی اس کے تعاقب میں تھے۔

میں نے ایک ہوائی فائر کیا۔ اس کے ساتھ ہی بہ آوازِ بلند کہا۔ ''ملنگی رک جاؤ ورنہ اگلی گولی تمہاری پیٹھ میں پیوست ہوگی......''

میری یہ دھمکی بھی بے کار گئی۔ اسی لمحے ریلوے ٹریک پر ٹرین نمودار ہوئی۔ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ ٹرین اچھی خاصی رفتار کے ساتھ آرہی تھی۔ ملنگی اور ریلوے لائن میں بہت کم فاصلہ رہ گیا تھا۔ میں اگر چاہتا تو ایک گولی مار کر ملنگی کو ٹھنڈا کرسکتا تھا لیکن میں اسے زندہ گرفتار کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کا سینہ کھول کر بہت سے اہم راز اگلوانا تھے۔

ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ٹرین اور ملنگی کے درمیان فاصلہ کم ہوتا جارہا تھا۔ ملنگی کی رفتار سے اس کا عزم جھلکتا تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق وہ ٹرین گزرنے سے پہلے ریلوے لائن کو عبور کرنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ ممکن ہے، ریلوے ٹریک کی دوسری جانب اس نے اپنے فرار کا کوئی بندوبست کررکھا ہو۔ میں کسی بھی قیمت پر اسے ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔

میں نے پکے ارادے کے ساتھ ملنگی کی ٹانگوں کا نشانہ لے کر پے در پے دو فائر کیے۔ اس کی رفتار میں لحاتی تعطل پیدا ہوا لیکن وہ رکا نہیں، ہلکی لنگڑاہٹ کے ساتھ اس نے دوڑنا جاری رکھا۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اب پولیس کے ہتھے چڑھنے کا مطلب ہے، اپنے ڈیتھ وارنٹ پر دستخط کرنا۔

پھر وہی ہوا جس کا خدشہ میرے ذہن کے ایک کونے میں موجود تھا۔ ملنگی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، وہ لنگڑاہٹ آمیز دوڑ کے ساتھ ٹرین کے فرنٹ سے ریلوے لائن عبور کرگیا۔ ایک لمحے کے لیے میں سمجھا کہ وہ گیا ہاتھ سے......

ٹرین کی وجہ سے ہم سب کو چند سیکنڈ کے لیے رکنا پڑا۔ جب ٹرین گزر گئی تو میں نے پٹری کی دوسری جانب نگاہ دوڑائی۔ ملنگی مجھے دور دور تک کہیں نظر نہ آیا۔ اسی لمحے ایک کانسٹیبل نے چیخ سے مشابہ آواز میں کہا۔

''ملک صاحب! ملنگی ادھر پڑا ہے۔''

''کدھر؟'' میں نے بے ساختہ پوچھا۔

کانسٹیبل نے ایک سمت اشارہ کیا تو ملنگی میری نگاہ میں بھی آگیا۔ وہ ریلوے لائن سے تھوڑے فاصلے پر جھاڑیوں میں پھنسا تڑپ رہا تھا۔ یقیناً وہ گزرتی ہوئی ٹرین کی لپیٹ میں آگیا تھا۔ اگر میں نے ٹانگوں پر گولی مار کر اسے زخمی نہ کیا ہوتا تو وہ بہ حفاظت پٹری عبور کرچکا ہوتا۔ گھائل ہونے کے بعد اس کی رفتار میں کمی واقع ہوگئی تھی اور

اسی کمی نے اس کے اندازے کی ایسی کم تیسی کر کے رکھ دی تھی۔ وہ ٹرین کا دھکا کھانے کے بعد، بری طرح زخمی ہو کر ادھر جھاڑیوں میں جا گرا تھا۔ اگر وہ ٹرین کی مکمل زد میں آ جاتا تو پھر اس کا قیمہ بن گیا ہوتا۔

میں لپک کر اس کے قریب پہنچا۔ اس کی حالت بہت بری تھی۔ وہ اپنے ہی خون میں لت پت نظر آرہا تھا۔ اس کے بدن کو ہلکے ہلکے جھٹکے لگ رہے تھے۔ وہ مجھے چند لمحوں کا مہمان دکھائی دیا۔ اگرچہ مجھے اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی تاہم میں نے پھر بھی تحکمانہ انداز میں ایک کانسٹیبل سے کہا۔

”ایک تانگے کا فوری بندوبست کیا جائے۔ اسے اسپتال لے جانا ہوگا۔“

پھر میں ملنگی کی جانب متوجہ ہو گیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس سے پوچھا۔ ”لالی کو تم ہی نے قتل کیا ہے نا؟“

”ج..... جی.....“ وہ شکستہ لہجے میں اقبالِ جرم کرتے ہوئے بولا۔ ”اس..... کمینے کی..... وجہ سے..... میں جیل چلا گیا تھا..... میں ایسے کیسے..... چھوڑ دیتا.....“

”لالی کے قتل میں انور جٹ کو پھنسانے کا کیا سبب تھا؟“ میں نے ملنگی سے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔

”وہ..... بد ذات..... زاہدہ کے ساتھ بہت..... مار پیٹ کرتا تھا..... مجھے اس بات کا بہت..... دکھ تھا.....“

”زاہدہ سے، تمہارا کیا تعلق؟“ میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

”زاہدہ..... آہ..... زاہدہ.....!“ ملنگی نے ایک ہچکی لی اور ساکت ہو گیا۔

ملنگی نے اپنی زندگی کی آخری سانسوں میں جس طرح زاہدہ کو یاد کیا تھا اس سے ساری کہانی میری سمجھ میں آ گئی اور یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ انور جٹ کا لباس کس طرح خون آلود ہوا ہوگا اور پھر کیسے خنجر سمیت ایک پوٹلی میں بند ہو کر انور جٹ کے گھر میں لکڑی کی الماری کے پیچھے پہنچا ہوگا۔ اس کام میں یقیناً زاہدہ نے ملنگی کا ساتھ دیا ہوگا۔

یہ جان لینے کے بعد کہ ملنگی اور زاہدہ میں کوئی سنجیدہ تعلق تھا اور ان دونوں نے ملی بھگت سے ایسا منصوبہ بنایا تھا جس میں ملنگی کا انتقام بھی پورا ہو جاتا اور زاہدہ کی انور جٹ سے بھی جان چھوٹ جاتی۔ گویا مستقبل میں وہ دونوں ایک ساتھ زندگی گزارنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

ملنگی نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں جو سنسنی خیز انکشاف کیا تھا اس نے ساری صورتِ حال واضح کر دی تھی اور انہی حقائق کی روشنی میں، میں نے زاہدہ کو گرفتار کر کے تھانے لانے کا حکم جاری کر دیا۔

وہ جب میرے سامنے آ کر کھڑی ہوئی تو تھر تھر کانپ رہی تھی۔ قصبہ دیدار سنگھ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور ملنگی کو پیش آنے والے حالات وہاں کے ہر رہائشی کے علم میں آ چکے تھے لہٰذا زاہدہ اپنے انجام کے خوف سے مری جا رہی تھی۔ اس سے اقبالِ جرم کرانے میں مجھے کوئی محنت نہیں کرنا پڑی۔

”کیوں کیا تم نے یہ سب؟“ میں نے گرج دار آواز میں پوچھا۔

”میں ملنگی کو پسند کرتی تھی.....“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”مجھے بہادر مرد بہت اچھے لگتے ہیں۔ ملنگی نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ مجھ سے شادی کے بعد وہ جرم کی دنیا کو خیر باد کہہ دے گا۔ اس نے میرا رشتہ مانگا تھا لیکن میرے گھر والوں نے صاف منع کر دیا پھر ملنگی جیل چلا گیا..... میں کئی سال تک اس کا انتظار کرتی رہی اور پھر گھر والوں نے زبردستی انور جٹ کے ساتھ میری شادی کر دی.....“ لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”انور جٹ وحشی ہے۔ میرے ساتھ جانوروں ایسا سلوک کرتا ہے۔ اسی لیے جب ملنگی دوبارہ مجھ سے ملا تو میں نے اس کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ہم نے بہت سوچ سمجھ کر منصوبہ بنایا تھا۔ انور جٹ، لالی کے قتل میں پھانسی چڑھ جاتا اور ملنگی کا انتقام بھی پورا ہو جاتا۔ بس، اب ہم اس بات کا انتظار کر رہے تھے کہ آپ انور جٹ کو جیل بھیجیں لیکن سب کچھ ختم ہو گیا۔“ بات کے اختتام پر اس کے لبوں سے ایک سسکاری جدا ہوئی۔

”ایک دن سب کچھ ختم ہو جاتا ہے زاہدہ.....“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن تمہارے اور ملنگی جیسے انسان اس حقیقت پر غور نہیں کرتے۔“

انور جٹ کو جب پتا چلا کہ اس سارے قصے میں زاہدہ نے مرکزی کردار ادا کیا ہے تو اس نے طیش میں آ کر اسی وقت اسے طلاق دے دی۔ زاہدہ ملنگی کے ساتھ شریکِ جرم ہونے کا اقرار کر چکی تھی لہٰذا میں نے اس کے خلاف چالان تیار کر کے اس کو حوالۂ عدالت کر دیا۔ اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا تھا۔

”کاش..... میں ایسا نہ کرتی.....“

لیکن ”کاش“ کا بھی ایک وقت ہوتا ہے اور ہر چیز اپنے وقت اور اپنے مقام پر ہی اچھی لگتی ہے۔

(تحریر: حسام بٹ)

سارے رشتوں میں ایک عظیم ترین رشتے کی نفرتوں کا قصہ

اگر انسان غور کرے تو اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی راز پوشیدہ ہوتا ہے اور دنیا میں سب سے بڑا راز اللہ نے دل کی صورت بنایا ہے جس میں ایک کائنات آباد کرکے اسے گوشت کے لوتھڑے کی شکل دے دی... لیکن جب چوٹ لگنے اور درد ہونے کا احساس ہوتا ہے تو یہ گوشت کا لوتھڑا خون کے آنسو رُلا دیتا ہے... اس کے دل پر بھی بہت گہرا زخم تھا جس کا درد سہتے سہتے وہ خود پتھر ہوگئی تھی۔

گہرا زخم

ڈاکٹر شیر شاہ سید



پاؤلا ڈمٹری نام تھا اس کا۔ اس دن اسے میں نے پہلی دفعہ دیکھا۔ وہ ہمارے سٹنگ روم میں سر جھکائے میری بیوی کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ بچے باہر کھیل رہے تھے۔ وہ میری بیوی کی ماں تھی۔ کارلا نے مجھے دیکھ کر بڑی سختی سے اپنی ماں سے کہا تھا۔ ”کبھی نہیں، کبھی بھی نہیں آنا میرے پاس، اس گھر اور میرے بچوں پر تمہارا سایہ بھی نہیں پڑنا چاہیے۔ کبھی نہیں کبھی بھی نہیں۔ یو آر نو مور مائی مدر۔ تم میری ماں نہیں ہو اور ہوگی بھی نہیں۔“

وہ کارلا کی ہی طرح خوب صورت تھی۔ ساٹھ سال کے لگ بھگ عمر ہوگی اس کی مگر اس عمر میں بھی وہ بلا کی خوب صورت لگ رہی تھی۔ وہ دھیرے سے اٹھی مجھے دیکھ کر مسکرائی اور خاموشی سے دروازہ کھول کر اپنی گاڑی میں جا بیٹھی، بھرپور نظروں سے اس نے لان میں کھیلتے ہوئے بچوں کو دیکھا اور رخ موڑ گاڑی کا انجن چلا کر رخصت ہوگئی۔

کارلا سے میری ملاقات کلیولینڈ میں ہوئی۔ اوہائیو کے اس شہر میں وہ مجھے اسپتال میں ملی تھی۔ میں پاکستان سے ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کرتے ہی نکل کھڑا ہوا اور نیویارک میں جاکر بسیرا ڈال دیا تھا۔ پیسوں کی کمی نہیں تھی اور ڈیڈی کے تعلقات بھی تھے۔ ڈیڈی سرکاری ملازم تھے۔ تنخواہ کے ساتھ دوسرے وسائل بھی تھے جن کی وجہ سے کبھی روپے پیسوں کی کمی کا سامنا نہیں ہوا۔ دوسرے وسائل کا مجھے کوئی خاص اندازہ پاکستان میں رہ کر نہیں ہوا۔ خاص طور پر اس عمر میں جب میں اسکول اور کالج میں پڑھتا رہا تھا بلکہ میڈیکل کالج کے شروع کے برسوں میں تو میں یہی سمجھتا رہا کہ زندگی میں ہر ایک کے پاس اسی قسم کے وسائل ہوتے ہیں لیکن جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ ڈیڈی کے زیادہ تر وسائل غیرقانونی بلکہ مذہبی اعتبار سے حرام بھی تھے لیکن ہمارے گھر میں اور ہمارے ملنے جلنے والوں کے گھر میں حرام حلال کا اپنا ایک خاص مفہوم ہوتا ہے۔ ڈیڈی کسی زمانے میں شراب پیتے تھے اور عید کی نماز گورنر ہاؤس میں پڑھتے تھے۔ پھر کچھ عرصے بعد بھی شراب تو نہیں چھوڑی مگر آفس میں پابندِ نماز ہوگئے۔ باقی رہا سہولتوں کا ناجائز استعمال اور سرکاری منصوبوں میں ہیرا پھیری، کمیشن میں خاطر خواہ حصہ، یہ کام کم یا زیادہ تو ہوتے رہے مگر ختم نہ ہوئے تھے نہ ہوں گے۔ اب میں سوچتا ہوں کہ اگر وہ یہ سب کچھ نہ کرتے تو شاید ہم سب بھائی بہن کبھی اچھے اسکول، کالج میں نہ پڑھ سکتے اور نہ ہی پیشہ ورانہ کالجوں میں تعلیم حاصل کرسکتے۔ آج ہم سب لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، پروفیشنل ہیں اور ایسی جگہوں پر کام کررہے ہیں جہاں بے ایمانی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

میں نیویارک میں کوئنز کے علاقے میں ایک اپارٹمنٹ میں اپنے دوسرے دوستوں کے ساتھ رہا، وہیں رہ کر یو ایس ایم ایل ای کے امتحان کی تیاری کی۔ ہم چار دوست تھے اور ہم چاروں نے ہی کاپلان کے ادارے میں داخلہ لے لیا تھا۔ کاپلان سینٹر کی برانچیں پورے امریکا میں موجود ہیں جہاں یو ایس ایم ایل ای کے امتحان کی تیاری کرائی جاتی ہے۔ ان کی بھاری فیس ہوتی ہے لیکن اگر دیکھا جائے تو یہ بھاری فیس، امتحان میں پاس ہوکر ڈاکٹر بن جانے کے بعد ملنے والی تنخواہ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔

ہم چاروں نے دل لگا کر یہ کورس کیا اور بہت اچھے نمبروں سے پاس بھی ہوگئے۔ اس زمانے میں امریکا کے حالات ڈاکٹروں کے لیے بہت ہی سازگار تھے اور ہمارے نمبر بھی اچھے تھے۔ نمبر اگر اچھے ہوں تو رنگ نسل مذہب اعتقادات کچھ بھی راہ میں حائل نہیں ہوتے۔

امتحان پاس کرنے کے بعد ہم لوگوں نے میچنگ پروگرام میں درخواستیں ڈال دی تھیں۔ مجھے شروع دن سے ہی شوق تھا کہ سرجری میں ٹریننگ لوں گا اور خدا کا کرنا یہ ہوا کہ مجھے سرجری میں ہی کام مل گیا۔ نہ جانے کیوں شروع میں ڈینور کے نام سے پریشان ہوگیا تھا کہ کون پہاڑوں پر کام کرے گا۔ افسردہ دل کے ساتھ میں وہاں انٹرویو دینے گیا مگر ڈینور آتے ہی اس کی خوب صورتی نے مجھے اپنا گرویدہ کرلیا۔ ڈینور اور اس کے اردگرد کا سارا علاقہ میرے دل کو بھا گیا۔ ہرے بھرے اونچے نیچے پہاڑ، بارش، سردی، بہار کا موسم، خزاں کی ویرانی سب کچھ تھا اس شہر میں۔

مجھے ہوسٹن میں بھی نوکری ملی مگر میں نے فیصلہ کیا کہ ڈینور میں رہوں گا۔

ڈینور کا پہلا سال تو اتنی تیزی سے گزر گیا کہ کچھ پتا ہی نہیں لگا کہ سال کب شروع ہوا اور کب ختم ہوا۔ ایک تو اسپتال کا نظام پھر کام کے اوقات کار ایسے کہ آدمی کو ہوش ہی نہیں رہتا۔ پاکستان میں پروفیسر صاحب 9 بجے بھی آجائیں تو بڑی بات ہے اور اکثر و بیشتر تو ایسا ہوتا ہے کہ پورے ہاؤس جاب کے دوران پروفیسر صاحب کو پتا بھی نہیں ہوتا ہے کہ کون کون سے ڈاکٹران کے پاس کام کرکے چلے گئے ہیں۔ امریکا میں سرجری میں روزانہ صبح ساڑھے چار پانچ بجے کام شروع کرنا پڑتا ہے اور تقریباً روز ہی شام کے سات اور کبھی آٹھ بج جاتے ہیں اور جس روز رات کی بھی ڈیوٹی ہو اس دن نہ دن کا پتا لگتا ہے اور نہ ہی رات کا احساس ہوتا ہے۔

چار سال اسی طرح گزر گئے۔ بیچ میں، میں دس، دس دن کے لیے تین دفعہ پاکستان بھی ہو آیا تھا۔ شروع میں، میں نے کبھی سوچا بھی نہیں کہ میں پاکستان کے علاوہ کہیں اور بھی کام کروں گا کیونکہ بنیادی طور پر مجھے پاکستان اور یہاں کے لوگوں سے محبت تھی اور یہ بھی احساس کہ کتنے کم پیسے خرچ کرکے میں ڈاکٹر بن گیا تھا۔

میں آج حساب لگاتا ہوں کہ پورے پانچ سال میڈیکل میں مشکل سے پانچ ہزار روپے کالج اور امتحان کی فیسوں کی مد میں خرچ ہوئے ہوں گے۔ امریکا میں صرف کالج کے پانچ سال کی فیس کم از کم تین لاکھ ڈالرز ہوجاتی ہے پھر اوپر کا خرچ ہے۔ ایک عام امریکی گھرانا اپنے بچوں کو میڈیکل کالج یا دوسرے اداروں میں اپنے خرچ سے پڑھا ہی نہیں سکتا کیونکہ اتنے پیسے خرچ کرنے کی سکت کسی بھی خاندان میں نہیں ہوتی۔ وہ تو بھلا ہو امریکن بینکنگ سسٹم کا جس میں تعلیم حاصل کرنے والوں کو کم سود پر تعلیمی قرضہ مل جاتا ہے اور اس قرض کی بنیاد پر بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ماں باپ روزمرہ کا خرچ برداشت کرتے ہیں اور یونیورسٹیوں کالجوں کی فیس بینک کے قرضوں سے ادا کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک امریکی ڈاکٹر، انجینئر بنتا ہے یا پی ایچ ڈی کرتا ہے تو زندگی کا آغاز ایک بڑے قرض کے بوجھ سے کرتا ہے۔ پہلی نوکری کے ساتھ ہی اس قرض کو اتارنا شروع کرتا ہے۔

پاکستان میں تو میں ڈاکٹر ایسے ہی بن گیا۔ ایک یہ وجہ تھی پھر پاکستان اپنا گھر بھی تھا، اس کے پہاڑوں، دریاؤں، سمندروں، وادیوں کی اپنی خوب صورتی بھی تھی لیکن اپنے ریزیڈنسی کے آخری سال میں پاکستان جانے کے بعد میں نے فیصلہ کرلیا کہ کبھی بھی پاکستان واپس نہیں جانا ہے۔ مجھے احساس ہوا تھا کہ پاکستان جاتے ہی ڈیڈی اور ان کے دوست میرے لیے کسی بہترین نوکری کا انتظام کردیں گے۔ شاید نہ ہی وی مانگا جائے گا نہ ہی انٹرویو ہوگا۔ میں اپنی تمام تر قابلیت کے باوجود زندگی بھر ایک سورس کی گالی سنتا رہوں گا، لوگ میرے پیٹھ پیچھے یہی کہیں گے، ارے یہ فلاں کا بیٹا ہے، وہ خود زندگی بھر رشوت لیتے رہے پھر بیٹے کو بھی فٹ کر دیا۔ رشوت شاید ڈیڈی کی مجبوری تھی، اچھے طریقے سے رہنے کے لیے ہماری ماں اور ہم سب کو اچھا رکھنے کے لیے، مگر میری کیا مجبوری ہوگی۔ فیلوشپ کے بعد مجھے امریکا میں جہاں چاہوں گا کام مل جائے گا، گوروں، یہودیوں اور ہندوؤں کے مقابلے پر بھی میرے ساتھ ناانصافی نہیں ہوگی۔ میں نے سوچا کہ پاکستان کے قرض کا بوجھ اتنا زیادہ نہیں ہوگا جتنا تکلیف دہ بوجھ ڈیڈی اور ان کے دوستوں کا ہوجائے گا۔

میں نے فیصلہ کرلیا کہ پاکستان واپس نہیں جاؤں گا۔ ڈینور میں چار سال خوب گزرے پھر مجھے بہت اچھی

قبل از وقت

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت آغا تین درویش صورت بزرگوں کے حلقے میں مہابلی اکبر کے دور کی خوبیاں اور برکتیں نہایت وارفتگی سے بیان کر رہے تھے۔ گویا سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ ابوالفضل کے قتل تک پہنچے تو ایسی ہچکی بندھی کہ معلوم ہوتا تھا انہیں اس واردات کی اطلاع ابھی ابھی ملی ہے۔ اس حرکت پر وہ شیخو کو ڈانٹ ڈپٹ کر ہی رہے تھے کہ اتنے میں پہلا درویش بول اٹھا۔ ''اماں چھوڑو بھی۔ بھلا وہ بھی کوئی زمانہ تھا۔ جب لوگ چار گھنٹے فی میل کی رفتار سے سفر کرتے تھے اور روؤسا تک جمعہ کے جمعہ نہاتے تھے۔'' اس کا منہ آغا نے یہ کہہ کر بند کر دیا کہ حضرت اس سنہری زمانے میں ایسی سڑی گرمی کہاں پڑتی تھی؟ پھر پروفیسر شکلا نے آغا کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ہمارے سمے میں بھی بھارت درش کی برکھا رت بڑی ہی سندر ہوتی تھی (مجھے بعد میں پتا چلا کہ ہمارے سمے سے ان کی مراد ہمیشہ چندر گپت موریہ کا عہد ہوتا تھا جس پر وہ تین دفعہ ''تھیسس'' لکھ کر نامنظور کروا چکے تھے) اس مقام پر تیکھی ڈاڑھی والا درویش ایکا ایکی اوچھا وار کر گیا، بولا۔ ''آغا! تم اپنے وقت سے ساڑھے تین سو برس بعد پیدا ہوئے ہو۔'' اس پر آغا، شکلا جی کی طرف آنکھ مار کر کہنے لگے ''تمہارے حساب سے یہ غریب تو پورے دو ہزار سال لیٹ ہوگیا۔ مگر میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں۔ کیا تم اپنے تئیں قبل از وقت پیدا ہونے والوں میں شمار کرتے ہو؟ کیا سمجھے؟''

اقتباس: چراغ تلے از مشتاق احمد یوسفی

مراسلہ: دانش منیر، کراچی

فیلوشپ سرجری میں ہی کلولینڈ کے مشہور اسپتال میں مل گئی تھی۔ میرا اسی وی ایسا تھا کہ اس کے مقابلے میں کوئی بھی نہیں ٹھہرا۔

کلیولینڈ کے پہلے ہی سال میں میری ملاقات کارلا گنوچی سے ہوگئی، وہ بھی اسی اسپتال میں فیلوشپ کرنے نیویارک سے آئی تھی۔ بچوں کے وارڈ میں کام کر رہی تھی۔ وہ روم میں ایستادہ کسی پرانے مجسمے کی طرح حسین تھی۔ نام سے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ اس کا تعلق اٹالین گھرانے سے ہوگا۔ امریکا بھی کیا خوب ملک ہے، ساری دنیا کے مہاجرین امریکا میں آکر بس گئے ہیں اور بستے چلے آرہے ہیں اور یہ دھرتی کسی کو مایوس بھی نہیں کرتی۔ یورپ، افریقا، ایشیا، براعظموں کے ہر ملک کے لوگوں کے لیے راستے کھلے ہوئے ہیں۔ وہ آتے ہیں اور آکر یہاں رچ بس جاتے ہیں۔

کارلا کے دادا پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں اٹلی سے نیویارک آئے تھے۔ نیویارک میں اٹالین لوگوں نے اپنی ایک دنیا بسائی ہوئی ہے۔ امریکا میں رہتے ہوئے بھی وہ اٹلی میں رہتے ہیں۔ وہ زمانہ خراب تھا، بڑی محنت کی تھی ان لوگوں نے پھر آہستہ آہستہ نیویارک کے باسی بن کر خوب پھلے پھولے تھے۔ کارلا کے باپ اوڈانی گنوچی کا بڑا کاروبار تھا۔ کارلا کے رکھ رکھاؤ میں خاندان کی امارت صاف نظر آتی تھی۔

وہ مجھے ڈاکٹرز لاؤنج میں ملی تھی۔ گہرے سیاہ لانبے بال، خوب صورت ترشے ہوئے، کالی سیاہ آنکھیں اور کتابی چہرے پر خوب صورت پیشانی جس سے وہ بار بار بالوں کی لٹ کو جھٹکے سے ہٹاتی تھی۔ یہ اس کا اسٹائل ہی نہیں تھا بلکہ اس کی شخصیت کا جزو بھی بن کر رہ گیا تھا۔

میں نے اسے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ ہم دونوں ہی بیس بال کا فائنل مقابلہ دیکھ رہے تھے۔ دونوں ہی ڈیوٹی پر تھے اور وہ ہفتے کی شام تھی، وہ کھیل میں مکمل طور پر شامل تھی۔ بار بار اس کے چہرے پر لالی کے قمقمے سے جلتے اور بار بار میرے دل کی دھڑکن رک سی جاتی۔ میں نے اسی وقت طے کرلیا کہ امی کی بھیجی ہوئی ساری پاکستانی لڑکیوں کی تصویریں واپس بھیج دوں گا۔ کارلا کی بائیں ہاتھ کی منگنی والی انگلی خالی تھی۔ میں نے سوچا کہ جانے کوئی اس کا بوائے فرینڈ ہوگا، پتا نہیں کتنی پرانی دوستی ہوگی اور جانے میری قسمت میں کیا ہو۔

میں نے کھیل کے ختم ہوتے ہی اسے ڈنر کے لیے مدعو کیا۔ اسپتال کے نزدیک ایک مشہور اٹالین ریسٹورنٹ میں ہم دونوں نے کھانا کھایا۔ لزانیا کے ساتھ مچھلی لہسن کے ساتھ ڈبل روٹی، جھینگے خاص اٹالین کری میں اور ساتھ ہی سرخ اٹالین وائن۔ اس دن مجھے پتا چل گیا کہ اس کا کوئی بوائے فرینڈ نہیں ہے۔ پھر ہم دونوں کی دوستی بڑھی اور بڑھتی چلی گئی۔ آہستہ آہستہ قربت بڑھتی چلی گئی۔ ساتھ ہی کھانا، کبھی اس کے اپارٹمنٹ میں کبھی میرے گھر پر، ساتھ سینما دیکھنا، ساتھ ہی گھومنا، کئی دفعہ میں اس کے ساتھ نیویارک گیا، اس کے باپ سے ملا پھر ہم دونوں کو احساس ہوا کہ ہم دور تک چلے آئے ہیں۔ میں تو اس کی محبت میں گرفتار ہو ہی گیا تھا وہ بھی مجھے چاہنے لگی تھی۔ پھر ایک دن میں نے اسے منگنی کی انگوٹھی پیش کردی تھی۔ اس نے مجھے گلے سے لگایا، چوما پھر انگوٹھی پہن لی تھی۔

فیلوشپ کے فوراً بعد ہم دونوں نیوجرسی چلے گئے اور ساتھ ہی کام کا آغاز کردیا تھا ہم دونوں کو ایک اچھے اسپتال میں بہت اچھی نوکری مل گئی تھی۔

میرے پاس دولت کی فراوانی تھی، مجھے قرض لوٹانا تھا، نہ ہی پیسے گھر بھیجنے تھے۔ میں نے کارلا کے لیے ایک خوب صورت سا گھر خرید لیا تھا۔ ہماری شادی بھی ایک یادگار شادی تھی، مسجد میں نکاح، چرچ میں تقریب اور ہوٹل میں ضیافت۔ ڈیڈی، امی اور میرے بھائی بہنوں نے شادی میں شرکت کی تھی۔ اٹالین لوگ بھی پاکستانیوں کی طرح بہت بولتے ہیں، ویسے ہی زور زور سے اور ویسے ہی گرم جوشی سے۔ کارلا کے باپ نے چرچ میں اسے میرے حوالے کیا، میں اسے چوم کر اور ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر باہر نکلا اور ضیافت میں شرکت کی۔ کارلا کا خاندان، دوست اور میرے گھر والوں کے ساتھ چند پاکستانی دوست بھی موجود تھے۔ وہ دن، شام اور رات خوب تھی، مجھے آج بھی سب کچھ ایک خواب کی طرح یاد ہے۔

میں نے نہ جانے کیوں خودبخود شروع سے ہی یہ سمجھ لیا تھا کہ کارلا کی ماں نہیں ہے اور پھر ایسا ہوا کہ کبھی بھی ہم لوگوں نے اس موضوع پر بات نہیں کی۔ اس دن گھر میں کارلا کی ماں کو دیکھ کر میں چونک گیا اور خاص طور پر جس طرح سے کارلا نے اس سے بات کی تھی وہ بھی میرے لیے بہت حیران کن تھا۔

جاتے جاتے اس کی وہ خاص نگاہ میں بھول نہیں سکا ہوں جب اس نے مڑ کر دیکھا تھا اور مجھ پر ایک بھرپور نظر ڈالی اور گاڑی میں بیٹھ کر چلی گئی۔ میں واپس آیا تو دیکھا

کارلا صوفے پر خاموش بیٹھی، کھڑکی سے دور درختوں کے جھنڈ میں کچھ تلاش کر رہی ہے۔

مجھے دیکھ کر وہ دھیرے سے مسکرائی، ایک اداس سی مسکراہٹ، آہستہ سے بولی۔ ''یہ میری ماں تھی، پاؤلا۔ ایک زمانہ تھا میں اسے تلاش کرتی رہی تھی۔ جانے کہاں کہاں مگر نہیں تلاش کر سکی اسے۔ نہ جانے کتنے برسوں تک اس کے خواب بنتی رہی، اپنے دماغ میں اس امید کے ساتھ کہ ایک دن میری ماں جہاں بھی گئی ہے یکا یک واپس آجائے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

میں خاموشی سے صوفے پر کارلا کے برابر میں بیٹھ گیا، اس کے ماتھے کو چوما، اس کے گالوں کو چھوا، اپنے ہاتھ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے بولا۔ ''مگر کارلا اب اگر پاؤلا واپس آئی ہے تو اسے خوش آمدید کہنا چاہیے تھا۔ تمہیں اس کی ضرورت ہے، میرے ماں باپ بھی پاکستان سے نہیں آئیں گے، بچوں کو گرانڈ پیرنٹس کی ضرورت ہوتی ہے اور تمہاری ماں کو تمہاری ضرورت ہے۔''

''نہیں۔'' سختی سے کہا تھا اس نے۔ ''میں چھوٹی سی تھی صرف چار سال کی، کوئی نہیں تھا میرا۔ اس عمر میں کوئی بھی اپنا نہیں ہوتا صرف ماں ہوتی ہے۔ وہی سمجھتی ہے اتنے چھوٹے بچے کی زبان، اس کی ضرورت پوری کرتی ہے، اس کے مسائل کو سمجھتی ہے، اس کے جذبات کا خیال رکھتی ہے اور وہی عمر ہوتی ہے جب اس بچی کے پیار میں صرف پیار ہوتا ہے۔ کوئی غرض نہیں۔ مجھے یاد ہے اس مہربان ماں کا پیار بھرا چہرہ۔ جھکی جھکی نگاہیں، بار بار چومنا، گلے لگانا، پھر ایک صبح یہ سب کچھ نہیں تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ مجھے یہ تو یاد نہیں کہ میرے باپ پر کیا گزری، مجھے صرف یہ یاد ہے کہ میری ماں میرے پاس نہیں تھی۔ اٹھارہ سال کی عمر تک میرا باپ میری پرورش کرتا رہا، کبھی ماں بن کر، کبھی باپ بن کر، کبھی بھائی بن کر کبھی بہن بن کر۔ مجھے سب یاد ہے اسکول سے کالج تک ایک ایک دن، ایک ایک لمحہ، ہر جگہ جہاں مجھے ضرورت پڑی کہ کسی کی انگلی پکڑ لوں، کسی کا ہاتھ تھام لوں، کسی کے کندھے پر سر رکھ دوں، کسی کی چھاتیوں میں منہ چھپا کر سو جاؤں، مجھے میرا باپ موجود ملا۔ ہر طرح سے ہر وقت میرے ساتھ، میرے پاس۔ ان اٹھارہ برسوں میں میرے باپ نے کبھی مجھ سے میری ماں کے بارے میں کوئی بری بات نہیں کی۔ مجھے یاد ہیں ان کے جواب۔ نہیں نہیں وہ زندہ ہے۔ وہ ضرور تمہیں یاد کرتی ہوگی، ہاں کسی جگہ مجبوری میں پھنس گئی ہوگی۔ بہت اچھی تھی، وہ تم سے بہت پیار کرتی تھی۔ ضرور آئے گی ایک دن تم سے ملنے تمہارے پاس۔ کیسے دور رہ سکتی ہے تم سے۔ بہت اچھی تھی وہ۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ کھڑکی سے باہر ہلتے ہوئے پتوں کو دیکھتی رہی پھر آہستہ سے بولی۔

''وہ سب جھوٹ تھا۔ میری اٹھارویں سالگرہ کے دوسرے دن پاپا نے مجھے بتایا کہ وہ سب کچھ چھپاتے رہے تھے مجھ سے کیونکہ وہ میرے ذہن میں، میرے دماغ میں کوئی منفی بات نہیں ڈالنا چاہتے تھے، جب تک کہ میں خود اچھا برا نہ سمجھنے کے قابل نہ ہو جاؤں۔ اب ایسی عمر تھی کہ وہ مجھے سب کچھ بتا دیں اور انہوں نے برسوں بعد بھی بڑے کرب سے بتایا تھا کہ پاؤلا یکا یک چھوڑ گئی تھی انہیں، کسی دوسرے آدمی کے لیے۔ کسی دوسری ریاست کے کسی اور شہر میں جا کر آباد ہو گئی تھی اس کے ساتھ اور وہاں سے ہی طلاق لے لی تھی ان سے۔ کوئی ماں ایسا نہیں کرتی کہ بچی کو چھوڑ جائے اس طرح سے کہ واپس آ کر دیکھے بھی نہیں، چومے بھی نہیں، چھوئے بھی نہیں مگر اس نے ایسا ہی کیا۔ پاپا نے کہا تھا کوئی مجبوری ہوگی، کوئی مسئلہ ہوگا مگر بیٹی میں تمہیں یہ سب کچھ نہیں بتا سکتا تھا، تم بچی تھیں، چھوٹی تھیں، زخمی ہو جاتیں تو شاید یہ زخم کبھی نہیں بھرتا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں میری ماں مجھ سے چھن گئی، مر گئی، میرے لیے۔'' مجھے یاد تھا یہی کہا تھا اس نے مجھ سے، جب میں نے اس سے اس کی ماں کے بارے میں پوچھا تھا۔

''اس دن سارا کچھ بھاپ بن کر اڑ گیا، میں نے تصورات کا ایک محل بنایا ہوا تھا جس میں میری ماں ایک شہزادی کی طرح بیٹھی اوپر بادلوں سے مجھے دیکھ رہی تھی، مجھے یاد کر رہی تھی، میری حفاظت کر رہی تھی، میرے لیے راہیں بنا رہی تھی مگر سب کچھ جھوٹ نکلا۔ محض ایک جھوٹ۔ وہ ایک چھوٹی سی، ننھی سی، کمزور سی بچی کو چھوڑ کر اپنے کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ میرے باپ کو چھوڑنے کا حق تھا اسے، کیونکہ وہ تو ایک کاغذی بندھن تھا، ایک مذہبی رشتے کے تحت شوہر اور بیوی بن گئے تھے وہ لوگ اور شوہر اور بیوی میں تو محبت ختم ہو سکتی ہے۔ مجھے چھوڑنے کا کوئی حق نہیں تھا انہیں، میں ان کی بیٹی تھی ان کے خون کا حصہ، ان کے وجود کا دوسرا روپ اور اب میرا حق ہے کہ میں اسے کبھی بھی اپنی زندگی میں داخل نہ ہونے دوں اور آج میں نے اپنا وہی اختیار استعمال کیا ہے جس پر برسوں پہلے اسے زعم تھا۔''



محفلِ شعر و سخن

❋ مہرین ناز......حیدرآباد

اڑ جائیں گے تصویر کے رنگوں کی طرح ہیں
ہم وقت کی ٹہنی پہ پرندوں کی طرح ہیں

❋ محمد عباس......نیو سینٹرل جیل ملتان

ہری ہے شاخِ تمنا ابھی جلی تو نہیں
دبی ہے آگ جگر کی مگر بجھی تو نہیں
جفا کی تیغ سے گردن وفا شعاروں کی
کٹی ہے برسرِ میدان مگر جھکی تو نہیں

❋ شازیہ کمال......کراچی

چھوڑ کے جانے والے تجھ کو اتنا بھی احساس نہیں
اس کے دل پہ کیا گزرے گی جس کو غم بھی راس نہیں

❋ احمد حسن عرضی خان......قبولہ شریف بائی پاس

اڑ گیا رنگ راہ گزاروں کا قافلہ بجھ گیا چناروں کا
اوڑھ کر زرد موسموں کی ردا آؤ ماتم کریں بہاروں کا

❋ سیدہ مینا نقوی بھکر......پنجاب

چلو اچھا ہوا دھند پڑنے لگی ورنہ
دور تک تکتی تھیں ان کی راہ میری آنکھیں

❋ توصیف احمد......کراچی

دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں کے تارے سو گئے
آنے والے دور کے محکم ہمارے سو گئے
ان کے سر پر تھا فقط اک بے گناہی کا گناہ
پل میں وہ معصومیت کے استعارے سو گئے

❋ سیدہ اسماء بخاری......اسلام آباد

ارادے جن کے پختہ ہوں نظر جن کی خدا پر ہو
تلاطم خیز موجوں سے وہ گھبرایا نہیں کرتے

❋ اظہر حسین بھچار......ہزاری جتوئی

اب نزع کا عالم ہے مجھ پر تم اپنی محبت واپس لو
جب کشتی ڈوبنے لگتی ہے تو بوجھ اتارا کرتے ہیں
جاتی ہوئی میت دیکھ کے بھی واللہ تم چل کر آ نہ سکے
دو چار قدم تو دشمن بھی تکلیف گوارا کرتے ہیں

❋ ایم خلیل ساحل......اسلام آباد

ذرا ٹھہرو کے بارش ہے یہ تھم جائے تو پھر جانا
کسی کا تجھ کو چھو جانا مجھے اچھا نہیں لگتا

❋ راجہ افتخار علی انی......چوآ سیدن شاہ، مونڑہ

میرے مطلب کا تھا وہ شخص
پر افسوس کہ وہ مطلبی نکلا

❋ محبوب مصور سومرو......گوٹھ کوھری، لاڑکانہ

ساتھ ساتھ تم سدا چلتے رہو
روز روز آ کے یوں ہی ملتے رہو
میری دعا ہے میرے محبوب تم
سدا خوش رہو اور یوں ہی ہنستے رہو

❋ محمد بشارت......کنگر دودرہ

نجانے کیسا امتحان ہے آج کل مجھ پر
مقدر محبت اور دوست تینوں الجھے سے رہتے ہیں

❁ سید نعیم الحسن شاہ بخاری.....اسلام آباد

جو ہوتا اگر دل میں ایمانِ کامل
تو کفار کا پھر نہ غم خوار ہوتا
جہاں گیر ہوتا جہاں بان ہوتا
اگر خوابِ غفلت سے بیدار ہوتا

❁ شبانہ حسن.....لاہور

ٹوٹ کر بھی محبتوں کو معتبر رکھتے ہیں
رہتے ہیں بے خبر، ہر خبر رکھتے ہیں
خودداری گنوانے کا حوصلہ ہم میں نہیں
مگر چپ چاپ بچھڑ جائیں یہ صبر رکھتے ہیں

❁ در شہوار پیرزادہ.....بہاول پور

یہ خنک رت، یہ نئے سال کا پہلا لمحہ
دل یہ کہتا ہے کہ موسم کو اب یاد آئے
ہم نے ماضی کی سخاوت پہ جو پل بھر سوچا
دکھ بھی کیا کیا ہمیں یاروں کے سب یاد آئے

❁ نادر سیال.....میانوالی

اب یہ عالم ہے کہ تنہائی سے تنگ آکر
خود ہی دروازے کی زنجیر ہلا دیتے ہیں

❁ انیلا رشید سیال.....خیر پور (میرس)

یونہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا جاناں
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انساں جاناں

❁ اعجاز احمد راحیل.....ماہی ساہیوال

خوشی کا غم ہے، نہ غم کی خوشی اب تو
بہت اداس گزرتی ہے زندگی اب تو
کہاں گئے وہ شناسا وہ اجنبی چہرے
اجاڑ سی نظر آتی ہے ہر گلی اب تو

❁ خوش بخت رحمٰن.....سینٹرل جیل لاہور

صبح آئے اور شام کر چلے
ہم سفرِ زیست تمام کر چلے

❁ مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ.....خانیوال

سب جرم میری ذات سے منسوب ہیں محسن
کیا میرے سوا شہر میں معصوم ہیں سارے

❁ احمد خان توحیدی.....پاکستان اسٹیل، کراچی

لاریب تیری روح کو تسکین ملے گی
تو قرب کے لمحات میں قرآن پڑھا کر

❁ زاہد چودھری.....چھور کینٹ

بے فیض رفاقت میں ثمر کس کے لیے تھا؟
جب دھوپ تھی قسمت تو شجر کس کے لیے تھا؟
اے مادرِ گیتی تیری حیرت بھی بجا ہے
تیرے ہی کام نہ آیا تو سر کس کے لیے تھا؟

❁ حنا عروج.....کورنگی، کراچی

ساون کی ہیں پھواریں، جیون پہ اب تمہارے
پیاسا مرا شجر ہے، کیا ساتھ تم چلو گے
راہِ جنوں پہ چلنا آساں نہیں ہے دیکھو
دشوار رہ گزر ہے، کیا ساتھ تم چلو گے

❁ محمد امین.....گلبہار، کراچی

انسانوں کی بستی میں کچھ ایسے ہیں دیوانے لوگ
اللہ کے نائب بن بیٹھے پر انساں کو نہ جانے لوگ
ہر اک چہرہ پڑھتے جائیں، ہر اک داماں چاک کریں
ہر اک جوہر ڈھونڈ کے لائیں، خود کو نہ پہچانے لوگ

❁ محمد زریان سلطان.....اردو بازار، کراچی

ہمیں دریافت کرنے سے ہمیں تسخیر کرنے تک
بہت ہیں مرحلے باقی ابھی زنجیر کرنے تک
ہمارے ہجر کے قصے سمیٹو گے تو لکھو گے
ہزاروں بار سوچو گے ہمیں تحریر کرنے تک

❁ قاضی عرفان احمد، ماسٹر جمیل احمد.....چکوال

عطا دیکھی تو صرف رب کی دیکھی
ورنہ کون دیتا ہے کسی کو محبوب اپنا

❁ ریاض بٹ.....حسن ابدال

جدائی پہ قائم ہے نظامِ زندگانی بھی
بچھڑ جاتا ہے ساحل سے گلے مل کے پانی بھی

❁ محمد جاوید.....تحصیل علی پور

دل میں دھڑکن ہو جیسے
تو مجھ میں بستی ہے ایسے

❁ زوہیب احمد ملک.....گلستان جوہر، کراچی

میں اپنے آپ میں نہیں رہتا ہوں اس لمحے
چپکے سے کہتا ہے جب وہ، مجھے تم سے پیار ہے

❁ محمد قاسم رحمان.....ہری پور

یہ راز مجھ پہ کھلا شور میرے اندر تھا
میں سو سکا نہ دریچوں کو بند کر کے بھی

❁ محمد امجد ریاض......اقبال نگر، چیچہ وطنی
صرف احساسِ ندامت، اک سجدہ اور چشم تر
اے خدا کتنا آساں ہے منانا تجھ کو

❁ سکندر خان چانڈیو، سعد خان چانڈیو......حیدرآباد
یہ سال بھی گزرا ہے تیرے پیار کے مانند
آتے ہوئے کچھ اور تھا جاتے ہوئے کچھ اور

❁ عتیق الرحمٰن، عمران عارف، علامہ خالد......فیصل آباد
میں کر رہا تھا فقط تجربہ محبت کا
اب ایسی آگ لگی ہے بجھا نہیں سکتا

❁ ڈاکٹر محمد عنصر عباس......ہڈالی، خوشاب
اتنا کرو کہ صدف مہیا کرو ہمیں
بنیں گے گوہر کیسے یہ ہم پہ چھوڑ دیے

❁ قاری محمد رمضان حسرت الحسنی......خوشاب
شام ہوتے ہی چراغوں کو بجھا دیتا ہوں
دل ہی کافی ہے تیری یاد میں جلنے کے لیے

❁ وقاص امین......لاہور
دیکھ دل ناداں ستاروں کی تمنا نہیں رکھتے
پت جھڑ کے باسی بہاروں کی تمنا نہیں رکھتے

❁ اطہر حسین......کراچی
لوگ بھوکے ہوں تو یہ عقدہ کھلے
کون کتنا صاحبِ کردار ہے

❁ کمال انور......کراچی
یہ تو سچ ہے کہ وہ اسی راہ سے گزریں گے مگر
کوئی دیکھے نہ انہیں، حکم ہوا ہے اب کے

❁ نورین عباس......پشاور
دور افق پہ پھیل گئی ہے کاجل کاجل تاریکی
پاگل پاگل تنہائی میں کس کی یاد کا دیپ جلے

❁ امتیاز احمد......لاہور
اس بیاباں میں ہے سایہ بھی گریزاں مجھ سے
کون دیکھے گا تماشا میری رسوائی کا

❁ زرمین اعجاز......فیصل آباد
صحرا کی سمت جاتے ہو کیوں شہر چھوڑ کر
ویرانیوں کی دل کے نگر میں کمی نہیں

❁ افتخار احمد......کوٹری
مجھ کو تو ہوش نہیں تم کو خبر ہو شاید
لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا

❁ ادریس فاطمہ......میانوالی
خفا نہیں ہے مگر اس ادا کو کیا کہیے
پکارتا ہوں تو وہ مڑ کے دیکھتا بھی نہیں

❁ مدحت......کراچی
تیرے فراق کے لمحوں میں دل نے سوچا ہے
تیرے وصال کے دن کتنے مختصر ٹھہرے

❁ جبران احمد ملک......گلشن اقبال، کراچی
انجان نگاہوں کی یہ مانوس سی خوشبو
کچھ یاد سا پڑتا ہے کہ پہلے بھی ملے ہیں

❁ جنید احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
زندگی تجھ سے ہمیں کوئی تمنا کب ہے
اب تو اس آس پہ جیتے ہیں کہ مرنا کب ہے

❁ امیر خان......راولپنڈی
چاروں طرف فضا میں اداسی بکھر گئی
تم کیا گئے کہ رونقِ شام و سحر گئی

❁ امجد عباس......کوئٹہ
بھول جانے کا میں کیسے تصور کرلوں
میری ہر سانس سے وابستہ ہیں یادیں تیری

❁ محمد اقبال......کورنگی، کراچی
تلخیاں دے کر ہمیں وہ خود بھی تنہا رہ گیا
ہم اگر اجڑے ہیں تو اس کے پاس بھی کیا رہ گیا

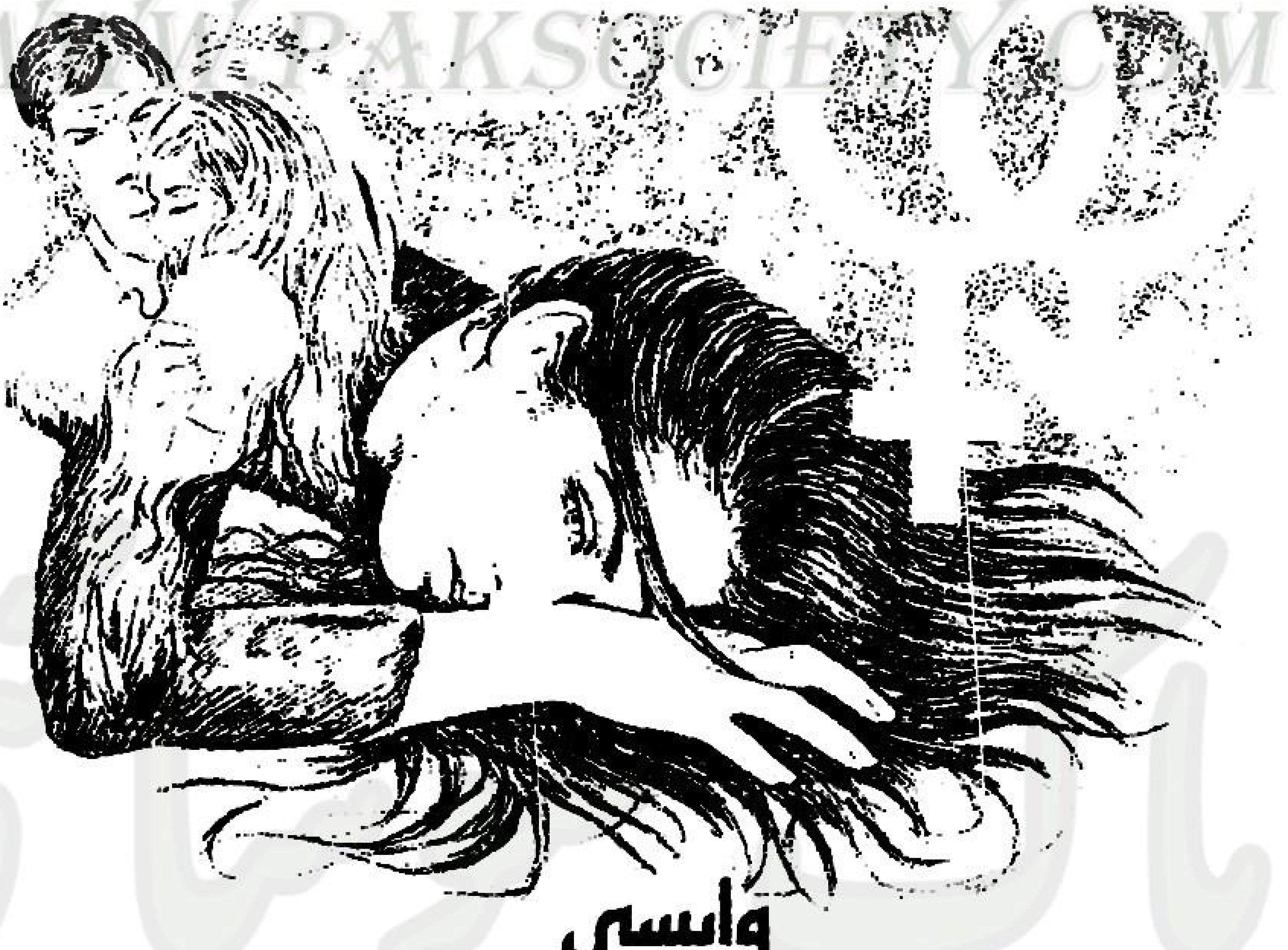
❁ وسیم خان......حیدرآباد
مدت ہوئی کہ چشمِ تحیر کو ہے سکوت
اب جنبشِ نظر میں کوئی داستاں نہیں

کوپن برائے شمارہ مارچ 2015

محفلِ شعر و سخن

نام : ------------------------------

پتا : ------------------------------



واپسی کا سوال

تمثیل حیدر

تعریف ہو یا تنقید بگاڑ اور سدھار... دونوں ہی پیدا کرسکتی ہے بشرطیکہ اس کا درست استعمال کیا جائے ورنہ نتائج آپ کے خلاف بھی نکل سکتے ہیں... جیساکہ یہاں... ہمیشہ دوسروں کو تنقید کا نشانہ بنانے اور خود کو ہر معاملے میں "پرفیکٹ" خیال کرنے والے وقت کے وار سے اس حد تک بے پروا رہتے ہیں کہ گہری کھائی میں گر کر بھی انہیں اپنی کسی غلطی پر پشیمانی کا احساس تک نہیں ہوتا بلکہ انہیں حیرت ہوتی ہے کہ ان کے ساتھ ایسا کیوں ہوا۔

اختیارات کے زعم میں مبتلا چند کمزور لوگوں کا احوال

جب یاد کا آنگن کھولوں تو کچھ دوست بہت یاد آتے ہیں
میں گزرے دنوں کو سوچوں تو......
اب جانے کس گلی میں سوئے پڑے ہیں مدت سے
میں رات گئے تک جاگوں تو......
کچھ دوست بہت یاد آتے ہیں، بہت یاد آتے ہیں،

بار بار آخری لائن کو دُہراتے دُہراتے چودھری ناصر نے دھیرے سے تکیے پر سر رکھا تو یادوں نے حقیقت کا روپ دھار کر اس کی آنکھوں میں بسیرا کرلیا۔

⬬⬬⬬

''بھائی نے ناجائز تعلقات کے شک کی بنا پر بہن کو چارپائی پر باندھ کر زندہ جلا دیا۔'' ناصر نے بلند آواز میں اخبار کی ہیڈ لائن پڑھی اور چونک پڑا۔ ''ارے بابا سائیں!

"یہ تو پاس والے گاؤں کی خبر ہے ناں؟" ناصر نے حیران ہو کر چائے پیتے ہوئے چودھری اکرم سے کہا۔ چودھری نے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے صرف ہنکارا بھرنے پر اکتفا کیا جس کے چہرے پر اس وقت افسوس اور حیرت کے ملے جلے تاثرات تھے۔

"یقین ہی نہیں آتا کہ ابھی اس قسم کے جاہل لوگ بستے ہیں جو شک کی بنیاد پر ایک زندہ انسان کو اس قدر بے رحمی سے قتل کرتے ہیں۔ کھوکھلی روایات اور غیرت کے نام پر قتل کرتے ہوئے میں عار محسوس نہیں کرتے۔" ناصر نے جذباتی لہجے میں کہا۔ چودھری اکرم نے غور سے بیٹے کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھا۔

"بیٹا بات ہوتی ہے تو اس کا بتنگڑ بنتا ہے۔ اگر رشیدے نے اپنی بہن کو زندہ جلایا ہے تو غلطی ضرور اس کی بہن کی ہوگی، تم معصوم ہو تمہیں کیا معلوم آج کل کی لڑکیاں گھر والوں کو بے وقوف بنا کر کس طرح کے کام کر کے اپنے گھر والوں کا شملہ نیچا کرتی ہیں اور کوئی بھی غیرت مند بھائی ایسے اقدامات کو برداشت نہیں کرسکتا۔" چودھری نے بہت بارعب لہجے میں بیٹے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

اسی دوران چودھری فاخر، ناصر کا بڑا بھائی زمینوں سے فارغ ہو کر واپس آیا اور سیدھا باپ کو سلام کرتے ہوئے کرسی پر بیٹھا اور مسکراتے ہوئے بھائی سے پوچھا۔

"خیریت، مزاج برہم کیوں نظر آرہے ہیں؟"

ناصر نے فوراً بھائی کو اخبار کی خبر سنائی اور کہا۔

"دیکھیں ناں ادا فاخر، بابا سائیں کہتے ہیں یہ سب ٹھیک ہوا ہے لیکن یہ تو ظلم ہے، صرف شک کی بنا پر کسی کی جان لینا کہاں کا انصاف ہے؟"

"نہیں ناصر، بابا سائیں نے ٹھیک کہا ہے، میں تو کہتا ہوں ایسی لڑکیوں کو پہلے سرعام چوراہے پر کھڑا کر کے لتر لگائے جائیں، تب عقل ٹھکانے آئے گی ان شریف زادیوں کی۔" چودھری فاخر نے اس قدر نفرت انگیز لہجے میں بات کی کہ کچن میں کھڑی ثنا کا دل پسلیوں میں ایک لمحے کے لیے دھڑکنا بھول گیا۔

ناصر نے حیران نظروں سے بھائی کی جاہلانہ رائے سنی۔ کہیں سے نہیں لگ رہا تھا کہ اس کا یہ بڑا بھائی تعلیم یافتہ ہے۔ "اور ہاں، تم صرف اپنی پڑھائی پر توجہ دو فضول باتوں کی طرف دھیان نہ دو، جو ہوا اچھا ہوا، خس کم جہاں پاک۔" چودھری فاخر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے اب کے بھائی کو سمجھایا جس کی حیرت سے کھلی آنکھوں میں دور تک بے یقینی تھی۔

"لیکن بابا سائیں......!" ناصر نے کچھ کہنا چاہا۔

"بس!" چودھری اکرم نے ہاتھ اٹھا کر بولنے سے منع کردیا۔ ناصر کرسی پر پہلو بدل کر رہ گیا۔ اسی اثنا میں موبائل کی بیپ بجی تو چودھری فاخر موبائل کان سے لگائے باپ سے اجازت لے کر باہر اٹھ آیا۔

"وعلیکم السلام! ہاں جناب کیسے ہو؟" چودھری فاخر نے سلام کا جواب دینے کے بعد شگفتہ انداز میں کہا۔ سامنے والا شاید بس جواب کے انتظار میں تھا، وہ لگاتار بولتا ہی چلا گیا اور جب کافی دیر بعد چپ ہوا تو فاخر کے حلق سے بے ساختہ قہقہہ بلند ہوا۔ "یار تو تو لڑاکا بیویوں کو بھی طعنے دینے میں مات دے گیا۔ اچھا یار معاف کردے میری توبہ جو آئندہ اتنا عرصہ تمہیں بتائے بغیر غائب رہوں۔ بس یار کیا کروں زمینوں کا تھوڑا سا مسئلہ تھا تو......" چودھری فاخر کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ سامنے والا پھر شروع ہوگیا تھا۔

"اوہو یار شہزاد، اب بس بھی کرو کہا ناں غلطی ہوگئی اور کتنا سوری کروں؟ اچھا غصہ ٹھنڈا کرو اور بتاؤ کب شادی ہے تمہاری بہن کی؟ میں ان شاء اللہ ضرور آؤں گا۔"

اس نے کہا اور دوسری جانب کی بات سن کر جواب دیا۔ "ٹھیک ہے ٹھیک ہے یار، میں آجاؤں گا پھر سے نہ شروع ہوجاؤ۔ او کے!" جواب سننے کے بعد فاخر نے کہا اور اللہ حافظ کہہ کر کال کاٹ دی۔

چودھری اکرم اور چودھری وقار دونوں بہت گہرے دوست تھے، دونوں نے کم عیالی خوشحال گھرانا کی پالیسی پر عمل کیا، خدا نے چودھری وقار کو ایک بیٹے چودھری شہزاد اور ایک بیٹی حرا کی دولت سے نوازا جبکہ چودھری اکرم کو دو بیٹے چودھری فاخر اور ناصر اور ایک بیٹی ثنا سے نوازا۔ دونوں خاندانوں میں بے مثال دوستی قائم تھی، بڑوں کی دوستی کا لگا ہوا یہ پودا آج ایک تناور درخت کی شکل اختیار کرچکا تھا۔ دونوں چودھریوں کے بیٹوں میں بھی ان ہی کی طرح بہت گہری دوستی تھی، دونوں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے خوب صورتی میں، وجاہت میں لوگ ان کی مثال دیا کرتے تھے۔ لیکن بہت سی خوبیوں کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ جاگیردارانہ نظام میں ترتیب پانے کی وجہ سے ان کی طبیعت میں بھی عیاشی رچ گئی تھی۔ اپنے علاقے میں تو یہ کسی بھی لڑکی کی طرف میلی نگاہ سے دیکھتے تک نہیں تھے جبکہ علاقہ غیر میں جاکر یہ کسی نہ کسی طرح اپنے جذبے کی تسکین کا سامان پیدا کر

لیا کرتے تھے لڑکیاں ان کی لچھے دار باتوں میں آ کر ان کی وجاہت پر مرمٹیں اور یہ نہیں ایک لمحے میں اجاڑ کر بنا کسی ندامت کے واپس لوٹ آتے جبکہ ناصران دونوں کے برعکس تھا وہ نہایت سلجھی ہوئی اور حساس طبیعت کا مالک تھا اور ان کے گھروں کی معصوم کلیاں ثنا اور حرا جو بچپن کی سہیلیاں اور ہمراز تھیں ان کے لیے کل کائنات ان کے ماں، باپ تھے اور بھائی تو ان کا آئیڈیل تھے۔ پردے کے معاملے میں دونوں خاندان بہت سخت تھے اسی لیے آج تک ایک دوسرے کے گھر آنے جانے کے باوجود دونوں خاندانوں کے بیٹوں نے سوائے ایک ہلکی سی جھلک کے ان دونوں کا چہرہ نہ دیکھا تھا۔ ایک ہنستی مسکراتی، خوشیوں سے بھرپور زندگی کے عکاس تھے یہ دونوں خاندان۔

●●●

''اوہ! میں نے ادا ناصر سے کہا بھی تھا کہ مجھے حرا کے گھر جانا ہے پھر بھی اب تک نہیں آئے۔'' ثنا مسلسل بڑبڑاتے ہوئے بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

ٹرن...... ٹرن...... ٹرن...... اسی دوران فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ''سلیمہ! سلیمہ! ......'' ثنا نے ملازمہ کو آواز دی۔ ''پتا نہیں کہاں مرگئی۔'' کوئی جواب نہ پاکر اس کو مزید غصہ آ گیا۔ مسلسل بجتی گھنٹی کو پہلے تو اس نے نظرانداز کیا لیکن آخر اسے اٹھانا ہی پڑا کہ کہیں بابا سائیں کی نیند نہ خراب ہو۔ ''ہیلو! کون؟'' اس نے بے دلی سے فون ریسیو کیا۔

''تیری ساس! ثنا کی بچی تو ابھی گھر بیٹھی ہے مجھے لگتا ہے میری رخصتی ہو جائے گی تو پھر بھی نہیں آئے گی۔ اگر کچھ شرم باقی بچ گئی ہے تو فوراً سے پیشتر میرے گھر پہنچ ورنہ آج میرے ہاتھوں تم قتل ہو جاؤ گی۔'' حرا نے ایک ہی سانس میں لگاتار بول کے کھٹاک سے فون بند کر دیا۔ ثنا کے ہونٹ یکلخت مسکرا اٹھے۔ اچانک ڈور بیل بجی، ثنا نے فوراً بھاگ کر چادر اوڑھ لی، اسے پتا تھا ادا ناصر ہوں گے اور وہ جانتی تھی، ایک بار وہ اپنے کمرے میں گھس گئے تو پھر باہر نکلنے کا نام نہیں لیں گے اس لیے بھاگ کر صحن میں ہی اسے روک دیا جہاں وہ اپنی بائیک کھڑی کر رہا تھا۔

''ادا ناصر! اب جلدی سے مجھے حرا کے گھر چھوڑ آئیں۔ اب وہ مجھے گالیوں سے نواز رہی ہے اور دیر کی تاں تو وہ باقاعدہ مجھے پیٹے گی۔'' ثنا تیزی سے بولتے ہوئے ناصر کے پیچھے بائیک پر بیٹھ گئی۔

''ارے...... ارے ثنا کی بچی! مجھے سانس تو لینے دو اتنا تھکا ہوا ہوں اور تم ہو کہ آرام بھی نہیں کرنے دے رہیں اور بابا سائیں کو تو بتا دو پہلے۔'' ناصر نے اسے گھُرکا۔

''کیا ہے ادا ناصر کہ میں آپ کو اچھی طرح سے جانتی ہوں آپ ایک بار اپنے کمرے میں گھس گئے تو وہاں سے آپ کو باہر نکالنا خندق کھودنے کے برابر ہے اور ہاں بابا سائیں کو میں آل ریڈی بتا کے اجازت لے چکی ہوں۔ اب پلیز چلیں، میں پہلے ہی اتنا لیٹ ہو گئی ہوں۔''

ثنا نے منت کرتے ہوئے باقاعدہ ہاتھ جوڑ لیے تو ناصر نے ایک مسکراتی، پیار بھری نگاہ بہن کے چہرے پر ڈالی اور بائیک اسٹارٹ کر دی۔

●●●

اج کالا جوڑا پا ساڈی فرمائش تے
ذرا پا کے سامنڑے آ ساڈی فرمائش تے

پورا پنڈال احمد نواز چھینہ کی آواز سے گونج رہا تھا۔ نوجوان تو نوجوان، بوڑھے بھی اس آواز پر جھوم رہے تھے۔ مردوں کی محفل میں کھانے کی دیگوں کی اشتہا انگیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

''آج ثنا کو میں زندہ نہیں چھوڑوں گی، خدا ایسی دوست کسی دشمن کو بھی نہ دے۔'' حرا بڑبڑاتے ہوئے مسلسل کمرے میں چکر لگا رہی تھی، اس کا زرتار آنچل اس کے شانوں سے نیچے ڈھلک رہا تھا، کانوں میں نفیس سے آویزے، بالوں میں گجرے پہنے وہ نظر لگ جانے کی حد تک پیاری لگ رہی تھی۔

''ارے...... ارے! بری بات حرا، دوست ہو کر دوست کے بارے میں ایسا کہتی ہو؟ اٹس ناٹ فیئر یار!'' ثنا نے اندر داخل ہو کر اس کی بڑبڑاہٹ سن کر مسکراتے ہوئے کہا اور پھر فوراً ہی اپنی جگہ سے ہٹ گئی کیونکہ حرا نے اسے زور سے کشن کھینچ کر دے مارا۔

''بدتمیز، جانتی بھی ہو میں تمہارے بغیر کوئی کام نہیں کرتی پھر بھی تم......'' حرا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تو ثنا کو ڈھیر ساری شرمندگی نے آن گھیرا۔

''حرا، میں تو صبح ہی آ جاتی، ادا ناصر کی وجہ سے دیر ہو گئی۔'' ثنا نے پیار سے اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا تو حرا نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

''اچھا دیکھ اب کان پکڑوں کیا؟'' ثنا کو پتا تھا حرا فوراً منع کر دے گی لیکن جب حرا نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے جھٹ سے حرا کے کان پکڑ لیے اور پھر دونوں کھلکھلا کے ہنس پڑیں۔

●●●

"یار کیا بے رنگ زندگی ہے، آج تک اتنے بوریت والے دن میں نے کبھی نہیں گزارے۔" چودھری فاخر نے صوفے پر نیم دراز ہو کر ٹانگوں کو جھلاتے ہوئے کہا۔ "کتنے دنوں سے نہ رنگین آنچل کی مہک، نہ چوڑیوں کی کھنک، نہ پھیلا ہوا کاجل اور نہ ہی کسی ہرنی کے چیخنے کی خوب صورت آواز....." آخر میں اس کے لہجے میں عجیب سی خباثت در آئی جسے کوئی بھی نوجوان شریف لڑکی سن لیتی تو یقیناً اس کے جسم میں خوف کی لہر دوڑ جاتی۔

اس وقت سب دوست شادی کے اس فنکشن میں باقی لوگوں سے الگ کونے میں رکھے صوفوں پر بیٹھے شراب میں مست ہو کر باتیں کر رہے تھے۔ "ارے میرے شیر بس آج کی رات صبر کر پھر دیکھ کل تیرے لیے کیسی تتلی لاتا ہوں۔" انیس نے نہایت اوچھے پن سے مسکراتے ہوئے کہا تو چودھری شہزاد نے آنکھیں سکیڑ کر اس کو دیکھا اور ہونٹوں کو دانتوں تلے دبا کر ہنس دیا جس سے اس کی وجاہت کچھ اور زیادہ بڑھ گئی۔

"اچھا....." اس نے اچھا کو لمبا کھینچ کر طنزیہ انداز میں کہا تو اس کی ہنسی نے انیس کو بھڑکا دیا لیکن وہ اپنے غصے کو ہمیشہ کی طرح دبا گیا اور مسکرا کے کہا۔

"ہنس لے ہنس لے شہزادے، خدا نے اگر تجھے شکل اچھی دی ہے تو اتنا غرور نہ کر، بے شک لڑکیاں تیرے پیچھے منڈلاتی رہتی ہیں لیکن کم تو ہم بھی نہیں عقل کی کھیتی سے دیکھنا اس بار کیسی اپسرا کا شکار کر کے لاتا ہوں۔" انیس چیلنج کرتے ہوئے غصے سے واک آؤٹ کر گیا تو سب ایک دوسرے کو حیران ہو کر دیکھنے لگے۔

شہزاد نے سوالیہ نظروں سے فاخر کو دیکھتے ہوئے کہا "یار میں نے تو مذاق کیا تھا اسے آج کیا ہو گیا؟"

"چھوڑ یار، فکر نہ کر ٹھیک ہو جائے گا آج اس نے زیادہ پی رکھی ہے۔" چودھری فاخر نے تسلی دیتے ہوئے کہا اور چند ہی لمحوں میں انیس کو بھلا کے وہ پھر سے نئے موضوع پر بحث چھیڑ چکے تھے۔

●●●

"دیکھو حرا، مجھے بتاؤ گی نہیں تو تمہاری مدد کیسے کروں گی؟ اب مجھے غصہ آ رہا ہے، بہتر ہوگا اصل بات بتا دو ورنہ میں ابھی آنٹی کو بلاتی ہوں وہ خود ہی تم سے پوچھ لیں گی۔" ثنا نے مسلسل روتی ہوئی حرا کو آخری دھمکی دی۔

"ایسا مت کرنا پلیز! وہ تو مجھے جان سے مار ڈالیں گی۔" حرا نے فوراً تڑپ کر کہا۔ ثنا کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر ماجرا کیا ہے، یہ آج حرا کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ آخر اتنا کیوں اور کس بات پر رو رہی ہے؟ لاتعداد سوال تھے جو اس کا ذہن چکرا رہے تھے۔

"اچھا ٹھیک ہے نہیں بلاتی لیکن تمہیں مجھے رونے کی وجہ بتانی ہوگی۔" ثنا نرم پڑ گئی۔

"میں یہ شادی نہیں کرنا چاہتی..... اور کر بھی کیسے سکتی ہوں جب میرا دل میری دھڑکن کسی اور کے نام منسوب ہو تو خود کو کسی اور کو کیسے سونپ دوں؟ کیسے اپنے جذبات، اپنے احساس کو مار ڈالوں؟ کیسے؟ نہیں ہوگا مجھ سے یہ..... نہیں ہوگا۔" حرا نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا تو ثنا نے فوراً آگے بڑھ کر اس کے منہ پر بے اختیار ہاتھ رکھ دیا کہ مبادا کوئی سن لے۔

"پاگل ہو گئی ہو؟ تمہیں پتا ہے تم کیا بک رہی ہو؟" ثنا نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

"ہاں..... ہاں جانتی ہوں میں، کیوں کروں میں ایسے شخص سے شادی جس کو میں چاہتی ہی نہیں، کیوں بابا سائیں میری خواہشات کا گلا گھونٹ کر اس ان دیکھے شخص کو مجھ پر مسلط کرنا چاہتے ہیں؟ صرف جائداد کے لیے؟ مجھے جائداد نہیں میرا پیار چاہیے، کیوں نہیں سمجھتا کوئی؟ کیا کروں میں؟ پلیز خدا کے لیے میری مدد کرو خدا....." یہ وہ حرا لگ ہی نہیں رہی تھی جسے وہ جانتی تھی حرا پاگلوں کی طرح روتے ہوئے زمین پر بیٹھ گئی اور ثنا کے پاؤں پکڑ لیے اور ثنا کا تو یہ سن کر کہ حرا کسی اور کو پسند کرتی ہے، اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا، اسے آنے والے ہر لمحے میں موت دکھائی دے رہی تھی۔ ثنا نے فوراً ہی جھک کر حرا کو کندھوں سے تھام لیا۔

"پلیز حرا خود کو سنبھالو، کیوں پاگلوں جیسی بات کر رہی ہو، اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہی قسمت میں لکھا ہوگا۔ ہو سکتا ہے جہاں تم چاہتی ہو یہ اس سے بہتر ہو، ماں، باپ اولاد کا برا تو نہیں چاہتے ناں! پلیز حرا اسے اپنا مقدر سمجھ کر قبول کر لو اب کچھ نہیں ہو سکتا، گھر مہمانوں سے بھرا پڑا ہے اور پرسوں تمہاری شادی ہے، پلیز حرا سمجھنے کی کوشش کرو۔"

ثنا نے حرا کو سمجھانے کی ناکام کوشش کی۔

"ہو سکتا ہے۔ سب ہو سکتا ہے۔ پلیز ثنا تم میری مدد کرو، میں اس کے پاس جانا چاہتی ہوں، وہ بہت اچھا ہے تم ملو گی اس سے تو تم بھی مان جاؤ گی کہ میں نے غلطی نہیں کی وہ میرے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے، وہ آج رات پرانی کوٹھی کے پچھواڑے آنے والا ہے، ہم یہاں سے بھاگ کر لاہور جا کر کورٹ میرج کر لیں گے، اس نے وہاں ایک گھر بھی لے لیا ہے۔ پلیز ثنا کسی طرح مجھے یہاں سے نکلنے میں مدد

کرو۔'' حرا نے ہچکیاں لے کر روتے ہوئے کہا۔
ثنا کو تو جیسے کرنٹ لگ گیا۔ ''کیا کہہ رہی ہو حرا، ہوش میں تو ہو؟''

''ثنا اگر تم نے میری مدد نہ کی تو میں یہ زہر پی لوں گی۔'' حرا نے زہر کی شیشی نکال لی جو اس نے کپڑوں میں چھپائی ہوئی تھی۔ ''اور میری موت کی ذمے دار تم ہو گی صرف تم۔''

ثنا کو لگا جیسے کسی نے اس کی روح کھینچ لی ہو۔
''ک......ک......ون ہے وہ؟ کہاں ملا؟'' ثنا نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

انیس کی تین سال پہلے ریچھ کے شکار کے دوران چودھری شہزاد اور فاخر سے دوستی ہوئی' دونوں ہی نہایت خوب صورت اور دلکش شخصیت کے مالک تھے جبکہ انیس کی سانولی سی رنگت تھی اور اس کی شخصیت ان دونوں کے مقابلے میں اور زیادہ دب جاتی تھی۔ انیس ایک اذیت پسند اور جنونی شخص تھا، جو اپنے نفس کی تسکین کے لیے خوب صورت لڑکیوں کو اپنے پیار کے جال میں پھنساتا پھر انہیں طرح طرح سے اذیتیں دے کر اپنے نفس کو خوش کرتا اور اگر اس کا جنون حد سے بڑھ جاتا تو یہ ان کے چہرے بگاڑ کر رکھ دیتا لیکن پھر بھی اس کی تشفی نہ ہوتی اور اگر کوئی لڑکی اس اذیت سے بچ جاتی تو یہ اسے اپنے دوستوں کو استعمال کرنے کے لیے دے دیتا یا پھر کسی کوٹھے پر بیچ دیتا۔

چودھری فاخر اور شہزاد جہاں جاتے لڑکیاں ان کی گرویدہ ہو جاتی تھیں، یہ بہ ظاہر تو مسکراتا رہتا لیکن دل میں رقابت کی آگ جل رہی ہوتی تھی۔ وہ ہر اس لمحہ جب کوئی اپسرا اس کی بانہوں سے نکل کر چودھری شہزاد یا فاخر کی بانہوں میں جاتی تو وہ زہریلے ناگ کی طرح اندر سے لوٹنے لگتا لیکن بہ ظاہر ہنس دیتا۔

آہستہ آہستہ حسد کا یہ جذبہ اس کے اندر ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا اور وہ ہر لمحہ انہیں اپنے آگے جھکانے کے طریقے سوچتا رہتا تھا۔

اس کا اکثر چودھری شہزاد کی حویلی میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ایک دن وہ اس سے ملنے اس کی حویلی گیا تو ملازم نے اسے بیٹھک میں بٹھایا اور چودھری شہزاد کو بلانے چلا گیا۔ بیٹھک کا ایک دروازہ حویلی کے صحن میں کھلتا تھا۔ جو اتفاقاً

اس دن کھلا ہوا تھا۔ انیس کے ذہن میں نجانے کیا سوچ آئی اور اس نے دروازے سے ذرا سا پردہ سرکا کے صحن میں جھانکا اور تبھی اس نے چودھری شہزاد کی بہن حرا کو دیکھا جو بلاشبہ ایک حسین لڑکی تھی۔ حویلی میں کسی ملازم کے دیکھ لینے کے ڈر سے اس نے فوراً پردہ برابر کر دیا اور بنا چودھری کو ملے حویلی سے نکل آیا۔ گھر آکر بار بار حرا کا چہرہ نظروں کے سامنے آجاتا اور پھر اس کے دل میں رقابت کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کا ایک شیطانی منصوبہ سوجھا، اس نے اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس پر عمل شروع کر دیا۔ اس نے حرا کو اپنی محبت کے جال میں پھنسانے کے لیے وہاں کے ایک ملازم کو پیسے دے کر خرید لیا، اس ملازم کے توسط سے ایک ملازمہ جو زنان خانے کے لیے مخصوص تھی اس سے بات چیت ہوئی وہ بھی پیسوں کے لالچ میں انیس سے مل گئی اور انیس کا کام آسان ہو گیا۔ اس نے حرا پر خوب صورت الفاظ کے جال پھینکے، نئے نئے پینترے استعمال کیے اور آخرکار نہ کرتے کرتے حرا اس کی اسیر ہوتی چلی گئی۔ انیس اکثر اس وقت حویلی جاتا جب چودھری شہزاد گھر نہ ہوتا بیٹھک میں ہی وہ حرا سے مل لیتا تھا اور اس کا انتظام وہ ملازمہ کرتی تھی۔

یہ سب چودھری شہزاد کی ناک کے نیچے ہوتا رہا اور اسے پتا بھی نہ چلا کہ انیس اس کے ساتھ کیسا کھیل، کھیل رہا ہے۔ جس روز انیس نے چودھری فاخر اور شہزاد کو چیلنج کیا اسی روز اس نے انتہائی سفاک فیصلہ کر لیا کہ اب وہ حرا سے محبت کا تاوان مانگے گا اور جب وہ اس کی دسترس میں ہوگی، وہ اسے چودھری فاخر کے حوالے کر دے گا اور جب تک چودھری شہزاد کو پتا چلے گا تب تک پانی سر سے اونچا ہو چکا ہوگا۔

❦❦❦

رات کی تاریکی میں دو سائے تیزی سے چلتے ہوئے پرانی حویلی کی جانب رواں دواں تھے۔ اس قدر خاموشی میں کہیں کہیں کوئی خشک پتا قدموں تلے آکر چرمرا کر رہ جاتا اور خاموشی میں خلل ڈالتا یا پھر کہیں کہیں کتوں کے بھونکنے کی آواز اس ماحول کو زیادہ خوفناک بنا رہی تھی۔ ان دونوں سایوں کی چال میں واضح لڑکھڑاہٹ تھی اور ان کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی ان کے پیچھے ہو اور انہیں پکڑے جانے کا ڈر ہو دونوں نے ایک دوسرے کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا، عجیب سرد فضا تھی جس سے ان کی ریڑھ کی ہڈی میں بار بار ایک خوف کی لہر اٹھتی تھی، پیشانی پر خوف سے پھوٹتا پسینا، آنکھوں میں انجانے خدشات لیے ان کے قدم بار بار ڈگمگا جاتے تھے اور لبوں پر مسلسل خدا سے دعا مانگتے دونوں سائے پرانی حویلی کے قریب پہنچ کر رک گئے۔

اور چاروں طرف اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے ایسے دیکھنے لگے جیسے کسی کی تلاش ہو۔ ”کیا وہ آیا ہوگا؟“ ایک خوفزدہ لرزتی ہوئی آواز نے دوسرے سے پوچھا۔

”ہاں وہ مجھے بے پناہ چاہتا ہے۔“ دوسری آواز نے تسلی دی لیکن خوف اس کی آواز میں بھی شامل تھا۔ اچانک ان کے پیچھے جھاڑیوں میں ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی تو وہ دونوں سائے خوفزدہ ہو کر پیچھے مڑے، ایک تیسرا سایہ ان کی طرف لپکا تو وہ دونوں سائے تیزی سے پیچھے ہٹے لیکن جب وہ تھوڑی روشنی میں آیا تو انہوں نے اسے پہچان لیا اور پھر تینوں کے چہروں پر اطمینان پھیل گیا۔

❦❦❦

چودھری فاخر جونہی حویلی سے باہر نکلا سامنے اسے چودھری شہزاد کی کرولا اپنی طرف آتی نظر آئی۔ وہ وہیں گیٹ پر رک گیا۔ چودھری شہزاد نے وہیں سے ہاتھ ہلایا اور اس کے نزدیک آکر گاڑی روک دی اور مسکراتے ہوئے باہر نکلا۔ ”اوئے یار! کدھر رہ گیا تھا۔ نہ فون کیا نہ ملنے آئے؟“ چودھری فاخر نے بے تکلفی سے چودھری شہزاد کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

”بس یار جانتا تو ہے ناں، شادی والا گھر ہو تو بندہ ایک منٹ کے لیے ادھر سے ادھر نہیں ہو سکتا بھی یہ کام تو بھی وہ...... بڑے لوگوں کو بھی تو خوش کرنا ہوتا ہے تو ظاہر ہے ان کے معیار کے مطابق بھی کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔ بڑی مشکل سے ٹائم نکال کر تمہیں ملنے آیا ہوں۔ تم سناؤ کیسے ہو اور ناصر کہاں ہے آج کل نظر نہیں آرہا؟“ چودھری شہزاد نے تفصیلی جواب دے کر آخر میں سوال کیا۔

”یار تمہیں پتا تو ہے وہ پڑھاکو بندہ ہے آج کل C.A. کے Exam شروع ہیں وہ لاہور گیا ہوا ہے لگتا ہے ٹاپ کرے گا۔“ چودھری فاخر کے لہجے میں بھائی کے لیے پیار ہی پیار تھا۔

”ہاں یار واقعی، وہ ذہین لڑکا ہے، ارے ہاں، یاد آیا تم سناؤ انیس نے چیلنج پورا کیا یا پھر بس ایسے ہی بڑھکیں مار رہا تھا؟“ چودھری شہزاد نے مسکرا کر پوچھا۔

”نہ یار، اس بار تو لگتا ہے اس نے لمبا ہاتھ مارا ہے آج صبح ہی اس کا فون آیا تھا، کافی خوش لگ رہا تھا کہہ رہا تھا جلد ہی تمہیں ایسی تتلیاں دوں گا جن کے رنگوں میں رنگ کے تم خود کو بھول جاؤ گے۔“ فاخر نے ایک آنکھ دبا کر شہزاد کو مسکراتے ہوئے کہا۔

”اچھا واقعی؟ یار ویسے مجھے حیرت ہوتی ہے یہ کہاں سے ایسی اپسرائیں ڈھونڈ لیتا ہے' دکھنے میں کیسی شریف

زادیاں بنی پھرتی ہیں اور عمال دیکھو ذرا ان کے! اے ہیلو! کہاں کھو گئے؟ ابھی سے ان لحات میں کھو گئے ہو کیا؟'' شہزاد نے تنفر سے ان لڑکیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے فاخر کو سوچ میں ڈوبا دیکھ کر مسکراتے ہوئے اس کے آگے چٹکی بجائی۔

''نہیں یار!...... میں بس انیس کے بارے میں سوچ رہا تھا، آج اس کا لہجہ بہت عجیب تھا، مجھے صبح سے عجیب سی بے چینی ہو رہی ہے۔''

''چھوڑ یار فضول ٹینشن...... جو بھی ہے فائدہ تو ہمارا ہی ہے ناں۔'' شہزاد نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ پہ ہاتھ مار کر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

انیس کی عیار، چھوٹی سنہری آنکھیں اپنی کامیابی پر خوشی سے چمک رہی تھیں۔ ''اتنی دیر لگا دی، میں تو مایوس ہو گیا تھا مجھے لگا میں نے تمہیں کھو دیا ہے۔'' انیس نے لگاوٹ بھرے انداز میں لہجے میں پریشانی پیدا کرتے ہوئے حرا کے ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگا لیے۔

''تم جانتے تو ہو بابا سائیں کے لوگ جگہ جگہ پہرا دے رہے تھے۔ میرا نکلنا تو واقعی بہت مشکل تھا اگر ثنا میری مدد نہ کرتی تو میں شاید واقعی تم سے دور ہو جاتی۔'' حرا نے پرخلوص نظروں سے اپنی بہن جیسی دوست کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ثنا!'' انیس نے چونک کر چادر میں لپٹی ہوئی لڑکی کو دیکھا جس کی چادر تک خوف سے لرز رہی تھی۔

''ہاں، یہ ثنا ہے...... چودھری اکرم کی بیٹی اور میری اکلوتی دوست۔ سمجھ لو آج یہ ہمارے لیے فرشتہ ثابت ہوئی ہے۔'' حرا کی آنکھوں میں خوشی سے نمی پھیل گئی لیکن انیس تو اس کے پہلے جملے پر ہی اٹک گیا کہ ثنا چودھری اکرم کی بیٹی ہے جبکہ ثنا سراسیمہ سی ایک طرف کھڑی آنے والے وقت کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں ایک جنگ سی چھڑی ہوئی تھی، وہ ابھی تک خود کو نہیں قائل کر سکی تھی کہ دوستی کی خاطر جو اس نے اتنا بڑا قدم اٹھایا ہے وہ ٹھیک ہے۔ اس کی آنکھوں میں واضح طور پر سوچ کی پرچھائیاں لرزاں تھیں۔ انیس نے بے اختیار ٹٹولتی نظروں سے ثنا کے سراپے کا جائزہ لیا اور پھر اچانک اس کی آنکھیں ایک شیطانی خیال سے چمکنے لگیں ''یعنی ایک تیر سے دو شکار'' اس نے مسکراتے ہوئے دونوں کو دیکھا۔ پھر ثنا کی طرف ایک قدم بڑھ کر سر جھکا کے کہا۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ، آپ کی وجہ سے مجھے میری منزل مل گئی، آپ ہمارے لیے واقعی خدا کی طرف سے بھیجا ہوا فرشتہ ثابت ہوئی ہیں اور جس طرح آپ نے دوستی کا حق ادا کیا ہے میں تاعمر اس کے لیے آپ کا احسان مند رہوں گا۔'' اس کے لہجے میں بلا کی عاجزی تھی لیکن اس کی آنکھیں اس کے الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں پھر اس نے تیزی سے پلٹتے ہوئے حرا سے کہا۔

''حرا، جلدی کرو گاڑی میں بیٹھو اب تک تمہیں ڈھونڈنے کے لیے سب روانہ ہو چکے ہوں گے۔ ایسا نہ ہو ہم پکڑے جائیں اور ثنا، آپ بھی گاڑی میں بیٹھو راستے میں محفوظ مقام پر آپ کو اتار دوں گا جہاں سے آپ آسانی سے واپس گھر جا سکیں۔'' انیس نے تیزی سے بولتے ہوئے گاڑی کا اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ ثنا کو وہ عجیب سا لگ رہا تھا، ایک انجانا سا خوف تھا جسے وہ کوئی نام نہ دے سکی پھر وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ گئیں اور گاڑی ایک جھٹکے سے اسٹارٹ ہو کر چل پڑی۔

''ثنا نہ جانے مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ بہت کچھ غلط ہونے والا ہے۔'' حرا نے گاڑی میں بیٹھ کر ونڈو سے باہر جھانکتی ثنا کے کان میں سرگوشی کی تو ثنا جو پہلے ہی بہت خوفزدہ تھی اور صحیح یا غلط کا فیصلہ نہ کر پا رہی تھی، حرا کی بات سن کر اس کا دل پہلے سے زیادہ شدت سے کانپنے لگا اور وہ الجھی نظروں سے اسے تکنے لگی۔

جبکہ ادھر گاڑی چلاتے ہوئے انیس ان کے اندیشوں سے بے خبر ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ سجائے کار ڈرائیو کر رہا تھا، اس وقت خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔

''اس بار تو لگتا ہے تقدیر میرا بھرپور ساتھ دے رہی ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے سوچا۔ ''ارے واہ رے مالک! صحیح کہتے ہیں لوگ، دینے والا جب بھی دیتا ہے چھپر پھاڑ کے دیتا ہے۔'' اسے لگ رہا تھا جیسے برسوں سے اس کے دل میں جو رقابت کی آگ جل رہی تھی اس کے ٹھنڈا پڑنے کا وقت آ گیا ہے۔

''تم دونوں تھک گئی ہو گی یہ لو پانی پی لو اور آرام سے بیٹھو۔'' اس نے پانی کی بوتل ان کی طرف بڑھائی جسے انہوں نے بلا چوں چرا ہاتھ بڑھا کر تھام لیا اور پانی پینے لگیں۔ پانی پیتے ہی ان کا سر بھاری ہونے لگا، دونوں نے پریشان ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا لیکن کچھ کہنے سے پہلے ہی اندھیرے کی آغوش نے انہیں اپنی پناہوں میں لے لیا۔

''ایسے تھوڑے، ہی ان شہزادوں کے ہاتھ تمہیں لگنے دوں گا پہلے اپنے مال سے خود بھی تو فائدہ اٹھاؤں۔''

اس نے نفرت سے کہا اور اس کی حریصانہ نگاہیں ان کے جسموں کا طواف کرنے لگیں جبکہ وہ دونوں بدنصیب اپنے بدلتے مقدر کی خوفناک سیاہی سے بے خبر ہوش سے بے گانہ تھیں۔

⁂

سچ کہا ہے کسی نے اولاد، والدین کے لیے بہت بڑی آزمائش ہوتی ہے اگر فرمانبردار ہے تو والدین کے لیے فخر اور عزت کا باعث ہوتی ہے اور اگر نافرمان ہو تو ذلت کا باعث بنتی ہے۔

شادی والے گھر میں ایک کہرام بپا تھا، خوشیوں کا ماحول غم میں بدل گیا تھا۔ چودھری سائیں کے کارندے بھوکے شکاری کتوں کی طرح حرا اور ثنا کی بو سونگھ رہے تھے۔ علاقے کے لوگوں میں طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں، حرا کے پل بھر کے جذباتی فیصلے نے اس کی اپنی اور والدین کی عزت کا جنازہ نکال دیا۔ چودھرائن کے بینوں سے حویلی کے در و دیوار گونج اٹھے کسی کی آنکھ میں چودھرائن کے لیے ہمدردی تو کئی آنکھیں واضح تمسخر اڑاتی ہوئی نظر آئیں جیسے وہ کہہ رہی ہوں کہ اسی کو مکافات عمل کہتے ہیں۔

''مجھے مردہ یا زندہ کسی بھی حال میں وہ لڑکی چاہیے۔'' چودھری وقار کی گرجدار آواز نے حویلی کے در و دیوار کو ہلا کے رکھ دیا۔ ''اور اس بے غیرت، کتے کی اولاد لڑکے کو یہاں لانے کی ضرورت نہیں آتے ہی اس کی بوٹیاں کر ڈالو۔'' وہ دونوں ملازم اور ملازمہ جنہوں نے انیس کا ساتھ دیا تھا انہیں اپنی واضح موت نظر آ رہی تھی، انہوں نے چپکے سے سامان باندھا اور حویلی سے بھاگ گئے۔ جب چودھری وقار کو اس کی اطلاع ملی تو اس نے فوراً انہیں پکڑ کر واپس لانے کا حکم دے دیا۔ شام تک اس کے حکم کی تعمیل ہو گئی۔ جب وہ ان کے سامنے پہنچے تو ان دونوں کی حالت ابتر تھی چودھری کے کارندوں نے انہیں مار مار کے ادھ موا کر دیا تھا۔ چودھری کو سامنے پا کر دونوں اس کے پاؤں پر گر پڑے، چودھری نے ٹھوکر مار کر دونوں کو پیچھے دھکیل دیا۔

''چودھری صاحب ہمیں معاف کر دیں لالچ نے ہمیں اندھا کر دیا تھا، ایک بار معاف کر دیں آپ کو خدا کا واسطہ.....'' ملازم نے گڑگڑا کر کہا پھر سے چودھری کے پاؤں پکڑ لیے۔

''ان دونوں کے ٹکڑے کر کے کتوں کو کھلا دو۔'' چودھری نے سفاک انداز میں حکم دے کر نفرت سے ان پر تھوک دیا۔

''اس کمینے کا کیا بنا؟'' پھر چودھری نے پلٹ کر اپنے خاص ملازم سے پوچھا۔

''وہ بھی پکڑا جا چکا ہے بشیرے کو بھیجا تھا بس آنے والے ہوں گے۔''

یہ سن کر چودھری کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ''جیسے ہی لے آئیں فوراً مجھے بتانا۔''

''جو حکم سائیں!'' ملازم نے مودب ہو کر جواب دیا۔

⁂

حرا نے خود کو اس شخص کے سامنے بے بس محسوس کیا وہ جتنا خود کو اس سے چھڑانے کی سعی کرتی اتنا ہی وہ اس پر حاوی ہوتا جا رہا تھا اور پھر آخر اس کی مزاحمت دم توڑ گئی۔ سچ کہتے ہیں نفس کی سرکشی انسان کو پاتال میں دھکیل دیتی ہے، اب حرا کو احساس ہو رہا تھا کہ وہ لڑکیاں جو اپنی عزت کی حفاظت نہیں کرتیں خود کو نفس کا غلام بنا لیتی ہیں ان کا یہی انجام ہوتا ہے۔

اپنی بے بسی پر حرا رونا تک بھول گئی، اسے لگا وہ ایک زندہ لاش کی طرح ہے جس کو جانور نوچ رہا ہے اس کے تمام احساسات جیسے مفلوج ہوتے جا رہے تھے یاد تھا تو صرف اتنا کہ کس طرح اس نے جذبات میں آ کر والدین اور اپنی عزت کو روند ڈالا، کس طرح اس نے اپنے نسوانی وقار کی دھجیاں بکھیر دیں اور پھر آہستہ آہستہ اس کا ذہن اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا اور نجانے کتنی دیر بعد اس کی آنکھ کھلی تو وہ کافی دیر خالی خالی نظروں سے چھت کو تکتی رہی جیسے یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو کہ وہ کہاں ہے؟ پھر اس کی نظر قریب سوئے وجود پر پڑی تو سب کچھ ایک دم فلم کی طرح اس کی نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ اس نے بے ساختہ چودھری فاخر کے ہاتھ کو خود سے پرے ہٹایا، اس کا لباس چیخ چیخ کر اعلان کر رہا تھا کہ وہ اپنی عزت، اپنا نسوانی وقار کھو چکی ہے۔ حرا نے بے پناہ نفرت سے اس شخص کو دیکھا جو اس کی عزت سے کھیل کے چین سے سو رہا تھا۔ حرا کا سر چکرانے لگا، اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ اس کا یقین تھا کہ محبت پاکیزگی کا دوسرا نام ہے۔ کیسی محبت کا اس نے ہاتھ تھاما جس نے اسے جنت سے جہنم میں دھکیل دیا۔ مگر یہ اچانک اس کی نظر پھلوں کی ٹوکری میں رکھی ہوئی چھری پر پڑی اس کے وجود میں جوار بھاٹا سا اٹھا، اس نے جنونی انداز میں جھپٹ کر چھری اٹھائی اور پھر پلٹ کر پے در پے وار کر کے چودھری فاخر کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

ثنا نے کسمسا کے جب آنکھ کھولی تو اس نے کسی شخص کو خود پر جھکے ہوئے دیکھا، اس کی دھڑکن کی رفتار ایک دم سے تیز ہوگئی، اس نے پھرتی سے اس شخص کو بیڈ پر دھکا دے کر کھڑا ہونا چاہا لیکن وہ شاید کوئی گھاک کھلاڑی تھا۔ اس نے فوراً ثنا کو بازو سے کھینچ کر بیڈ پر واپس گرا دیا اور اپنے بازوؤں کی گرفت میں لے کر اسے خود سے اور قریب کر لیا۔

''چھوڑ...... چھوڑو مجھے......'' ثنا کی آواز کپکپا گئی، اس نے دونوں ہاتھوں کی قوت سے اسے دور کرنا چاہا۔ چودھری شہزاد کو ایسا لگا جیسے مندر میں گھنٹیاں بج اٹھی ہوں، اس نے جھٹکے سے ثنا کو بالوں سے پکڑ کے اس کا چہرہ اوپر کیا۔

''کیا کہا ذرا پھر سے کہو۔'' اور یہ کہہ کر نظریں اس کے چہرے پر بھٹک گئیں، وہ مصور کا شاہکار تھی۔

''خدا کا واسطہ چھوڑ دو مجھے، جانے دو پلیز! میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں مجھے گھر جانے دو، کیا بگاڑا ہے میں نے تمہارا؟''

بے بسی سے ثنا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ چودھری شہزاد بے خود سا اسے تکے جا رہا تھا۔ اس کی نم آنکھیں، کپکپاتے ہونٹ، ماتھے پر پسینے سے بھیگی ہوئی چند لٹیں...... اس کا دل چاہا یہ سب کچھ ہمیشہ کے لیے بس اس کا ہو جائے صرف اسی کا! بے اختیار اس نے اپنی انگلیوں کے پوروں سے ثنا کے گالوں پر بہتے آنسو صاف کیے۔ اس نے بھرپور مزاحمت کی لیکن چودھری شہزاد کے سامنے بے بس ہوگئی مگر چودھری شہزاد کی گرفت اس کے گرد مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی۔

اس کے ہونٹوں کا لمس آہستہ آہستہ ثنا کی گردن تک پہنچ گیا تو ثنا کی جان سے کانپ کر رہ گئی اور پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور بہک جاتا، موبائل کی مسلسل بجتی رنگ نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ چودھری شہزاد کی گرفت ڈھیلی پڑتے ہی ثنا تڑپ کر اس کے بازوؤں کے حصار سے نکل کر دیوار کے کونے میں سمٹ کر بیٹھ گئی۔ چودھری شہزاد نے بہت دلچسپی سے اس کے کپکپاتے وجود کو دیکھا جو اس وقت اور زیادہ قیامت ڈھا رہا تھا۔

''ہیلو!'' اس نے ثنا کو اپنی نظروں کی گرفت میں لیتے ہوئے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف بابا سائیں کی آواز سنتے ہی ایک دم مودب ہوگیا ''جی بابا سائیں! کیا...... کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ یہ نہیں ہوسکتا...... حرا ایسا نہیں کرسکتی، وہ ہمارا خون ہے ہمارا...... وہ اس طرح عزت نہیں اچھال سکتی......'' چودھری شہزاد نے غم وغصے کی شدت سے چیختے ہوئے کہا۔ حرا کا نام سنتے ہی ثنا نے چونک کر حیران نظروں سے چودھری شہزاد کو دیکھا جس کی آنکھیں اس وقت لال انگارہ بنی ہوئی تھیں۔

''کون...... کون تھی وہ لڑکی؟'' دوسری طرف کی بات سننے کے بعد چودھری شہزاد نے غصے سے پوچھا۔'' ثنا نے سہم کر شہزاد کو دیکھا۔

''ثنا!'' جواب سننے کے بعد اس نے فوراً ثنا کی طرف دیکھا، کیونکہ انیس نے اس لڑکی کا نام بھی یہی بتایا تھا۔ ''حلیہ کیسا تھا؟'' چودھری شہزاد نے پوچھا۔ ''بس بابا سائیں بس...... کافی ہے، یوں سمجھیں حرا مل گئی۔'' اس نے غور سے ثنا کو دیکھتے ہوئے کہا اور موبائل ایک طرف پھینک دیا۔ ثنا کو ایسا لگا جیسے روح اس کا ساتھ چھوڑ کر جا چکی ہو۔ چودھری شہزاد تیر کی طرح لپک کر اس کی طرف آیا۔ ''بولو کہاں ہے حرا؟ بولو کہاں ہے؟ میں جانتا ہوں تم وہی ہو جس نے اس کی مدد کی۔ بتاؤ ورنہ ایسا حشر کروں گا کہ آنے والی نسلیں بھی پناہ مانگیں گی۔'' اس نے غصے سے ثنا کے بالوں کو مٹھی میں جکڑتے ہوئے کہا۔ اس کا ذہن یہ بات تسلیم نہیں کر رہا تھا کہ انیس نے اسے دھوکا دیا ہے، نہ ہی یہ بات اس کے ذہن کے کسی گوشے میں آئی تھی کہ انیس نے جو دوسری لڑکی اس کے دوست کو دی ہے وہ اس کی بہن حرا ہے۔ تکلیف کی شدت سے ثنا کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل آئے لیکن خوف کی شدت سے اس کی زبان نے ہلنے سے انکار کر دیا۔

''بولو جواب دو کہاں ہے حرا؟'' چودھری شہزاد نے ایک زوردار چانٹا مارا جس سے ثنا کے ہونٹوں سے خون بہنے لگا لیکن وہ پھر بھی چپ رہی۔ ''تم ایسے نہیں بتاؤ گی......'' اس نے بیلٹ اتار لی اور جنونی انداز میں ثنا کو پیٹنے لگا، جہاں جہاں بیلٹ لگتی کپڑے پھٹ جاتے اور خون رسنے لگتا۔

''مت مارو مجھے...... خدا کے لیے مت مارو...... میرا کوئی قصور نہیں۔'' ثنا نے چیختے ہوئے کہا اور پھر اسے شروع سے آخر تک ساری کہانی سنا ڈالی کہ کس طرح انیس نے انہیں دھوکا دیا، پہلے اس نے خود حرا کی عزت تار تار کی پھر اپنے دوست چودھریوں کے بیٹوں کے لیے ادھر لے گیا۔ ساری روداد سن کر چودھری شہزاد کا چہرہ لٹھے کے مانند سفید ہوگیا۔

''تمہارا مطلب ہے تم چودھری فاخر کی بہن ہو اور میری بہن کو انیس نے اس وقت چودھری فاخر کے پاس...... نہیں...... نہیں، یہ نہیں ہوسکتا......''

چودھری شہزاد کی غم کی شدت سے آواز بیٹھ گئی۔ اسے لگا زمین آسمان ایک ہوگئے ہیں پھر اس نے اچانک

ٹیبل کی دراز سے پستول نکالا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

واپسی کا کوئی سوال نہیں
گھر سے نکلے ہیں آنسوؤں کی طرح!

چودھری شہزاد کے باہر نکلتے ہی ثنا نے فوراً آگے بڑھ کر دروازے کو کنڈی لگا دی۔ "یا اللہ رحم! کیا کروں میں؟ ادا فاخر اور بابا سائیں کا پتہ نہیں کیا حال ہوگا، کتنا پریشان ہوں گے وہ اور جب انہیں پتا چلے گا مرے ساتھ...... نہیں...... نہیں...... ادا فاخر تو یقیناً مجھے مار ڈالیں گے اور اگر انہوں نے کچھ نہ کہا تو لوگوں کے طعنے مجھے جینے نہیں دیں گے۔ لیکن میرے مالک! آپ تو جانتا ہے، میرا کوئی دوش نہیں میں تو..... میں تو صرف اپنی دوست کی مدد کر رہی تھی یا میرے مولا! میری مدد فرما یہ کیسا امتحان ہے؟ یا اللہ حرا کو اپنی حفظ و امان میں رکھنا پتا نہیں اس کے ساتھ کیا ہوا ہوگا۔ وہ ان حالات سے کیسے نمٹے گی۔" ثنا مسلسل ہی روتے ہوئے دعائیں مانگ رہی تھی۔ روتے روتے اس کی ذہنی رو ایک ہی بات پہ اٹک گئی اور وہ ایک ہی بات کی تکرار کرنے لگی۔

"میری وجہ سے میرے ویر اور بابا سائیں کا سر شرم سے جھک گیا ہے، مجھے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں...... کوئی حق نہیں...... کوئی حق نہیں۔" اور پھر اس نے اپنی ساری کانچ کی چوڑیاں اتاریں اور انہیں توڑ کے پھانک لیا۔

"بابا سائیں! مجھے معاف کر دینا، میں آپ کے گھر کی زینت نہ بن سکی۔"

حویلی کے تہ خانے میں چودھری اکرم اور چودھری وقار کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے انیس رسی سے بندھا ہوا زمین پر آڑھے ترچھے انداز میں لیٹا ہوا تھا، جگہ جگہ سے اس کی قمیص پھٹی ہوئی تھی جسم سے خون رس رہا تھا۔

"ہوش میں لے آؤ اس بدذات کو......" چودھری اکرم نے اپنے ملازم کو حکم دیا۔ انیس کے حلق میں پانی انڈیلا گیا تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔

چودھریوں کو دیکھ کر خوف سے اس کی حالت پتلی ہوگئی۔ چودھری وقار چلتے ہوئے اس کے پاس آیا اور جھٹکے سے اس کے بال مٹھی میں پکڑ کے کہا۔ "کہاں ہیں ہماری لڑکیاں؟ کیا کیا تو نے ان کے ساتھ؟"

چودھری اکرم کو چودھری وقار سے پتا چلا تھا کہ ان کی بیٹی بھی ساتھ بھاگ گئی ہے تو وہ غصے سے فوراً ان کی طرف آیا تاکہ دونوں مل کر ان کو ڈھونڈوائیں اور اپنے ہاتھوں سے انہیں موت کے گھاٹ اتار سکیں کیونکہ انہوں نے اپنے باپ کا شملہ نیچا کر دیا تھا، اب سزا کی حق دار تھیں وہ۔

نفرت اور جلال سے چودھری اکرم کا جسم کانپ رہا تھا اس نے بھی آگے بڑھ کر زور سے انیس کے منہ پہ لات ماری اور زخموں پر نمک چھڑک دیا۔ انیس بے آب مچھلی کی طرح تڑپنے لگا اور تڑپ تڑپ کے رحم کی بھیک مانگنے لگا۔

"بتاؤ ہماری لڑکیاں کہاں ہیں؟ بتاؤ، ورنہ اس سے بھی بھیانک موت مرو گے۔" چودھری وقار نے گرجدار غصیلے لہجے میں کہا تو انیس نے اٹک اٹک کر تمام حال کہہ سنایا جسے سنتے ہی دونوں چودھری کے چہروں پہ موت کی زردی چھا گئی۔

چودھری وقار نے کھڑے کھڑے دیوار کا سہارا لیا اور دل میں درد محسوس کر کے بیٹھتا چلا گیا، ملازموں نے فوراً بڑھ کر اسے تھام لیا لیکن اس کی آنکھیں بند ہوتی گئیں تہ خانے میں شور مچ گیا۔ ملازموں نے فوراً چودھری وقار کو اٹھایا اور اسپتال کی طرف بھاگے۔ اس تمام عرصے میں چودھری اکرم سن دماغ کے ساتھ انیس کو یک ٹک دیکھتا رہا اور پھر اچانک اس نے پستول نکال کر تمام گولیاں انیس کے سینے میں اتار دیں۔

چودھری شہزاد انتہائی تیز ڈرائیونگ کرتے ہوئے چودھری فاخر کے فارم پر پہنچ گیا۔ اس جگہ کا چودھری شہزاد کے علاوہ صرف انیس کو پتا تھا کوئی بھی اس قسم کا کام ہوتا، اس فارم پر ہی ہوتا تھا۔ فارم میں داخل ہو کر وہ تیزی سے ہال کمرے کی طرف بڑھا کمرے کا دروازہ بند تھا اس نے دروازہ بجانا شروع کر دیا لیکن چودھری فاخر نے کوئی جواب نہ دیا تو چودھری شہزاد کا غصہ انتہائی حدوں کو چھونے لگا آخر اس نے غصے سے لکڑی کے دروازے کو بجا بجا کر اس کی کنڈی توڑ ڈالی اور طوفان کی طرح اندر داخل ہو گیا لیکن اندر داخل ہوتے ہی حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹنے کے قریب ہو گئیں۔

سامنے ہی خون میں لت پت چودھری فاخر کی لاش پڑی ہوئی تھی اور قریب ہی حرا اپنے لباس سے بے پروا خاموش نظروں سے اس کی لاش کو تک رہی تھی۔

"یہ...... یہ سب کس نے کیا ہے؟" چودھری شہزاد کے منہ سے گھٹی گھٹی آواز نکلی۔ لیکن حرا کی پوزیشن میں پھر بھی کوئی فرق نہ آیا۔ "حرا!" چودھری شہزاد نے ایک بار پھر اسے پکارا اور آگے بڑھ کے اس کو چادر اوڑھا دی، اس کو اب سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔

"ہاہاہاہا......" اچانک حرا نے قہقہے لگانا شروع کر دیے۔ چودھری شہزاد نے چونک کر بہن کو دیکھا، پھر وہ ہنستے ہنستے بے تحاشا رونے لگی، ایسے لگتا تھا جیسے اس کی ذہنی رو بہک گئی ہوگی، وہ بے تحاشا ہنستی تو کبھی رونے لگتی۔ شہزاد بہن کی حالت دیکھ کر پریشان ہوگیا اس نے آگے بڑھ کر اسے چپ کرانے کی کوشش کی تو وہ کرنٹ کے مانند پیچھے ہٹی۔

"ہاتھ مت لگانا مجھے...... ہاتھ مت لگانا، میں تمہیں بھی مار ڈالوں گی ہاہاہا...... مار ڈالوں گی...... م م میں...... سب کو مار ڈالوں گی ہاہاہاہاہا...... اور پھر اس نے خود کو مارنا شروع کر دیا اور اپنے بال کھینچنے لگی۔ "ایسا ہی ہونا چاہیے مجھ جیسی لڑکیوں کے ساتھ...... ایسا ہی ہونا چاہیے۔"

چودھری شہزاد بہن کی حالت دیکھ کر کتنے ہی لمحے اسے بے یقین نظروں سے تکتا رہا اور پھر جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچ گیا اس نے پستول والا ہاتھ سیدھا کر کے حرا کو زندگی کی قید سے رہائی دے دی۔ چودھری شہزاد کا پورا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا اس نے آہستہ سے بڑھ کر دیوار کا سہارا لیا، پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر گر گیا۔ پھر وہ چلتا ہوا بہن کے نزدیک آیا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کے بہن کا سر گود میں رکھا۔

کافی دیر وہ خالی خالی نظروں سے بہن کا چہرہ دیکھتا رہا۔

وہ سوئے ہوئے محل کی شہزادی لگ رہی تھی جو بس ابھی نیند سے جاگنے والی ہو، اسے لگا وہ ابھی اٹھ کر پوچھے گی۔ "کیا ہوا شہزاد لالہ؟ آپ ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟ آپ کی حرا کو کچھ نہیں ہوا۔" اور پیار سے ہمیشہ کی طرح مسکرا کے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دے گی مگر وہ اب خاموش تھی۔ حرا کے چہرے پر بچوں کی سی معصومیت تھی وہ کافی دیر بہن کے بالوں میں، اس طرح پیار سے ہاتھ پھیرتا رہا جس طرح وہ پیار سے نیند سے جگایا کرتی تھی۔ آج اس کی زندگی کا کل سرمایہ اس کے ہاتھوں سے لٹ گیا تھا پھر تھوڑی دیر بعد کانپتے ہاتھوں سے اس نے پستول اٹھا کر اپنی کنپٹی پر رکھ کے ٹریگر دبا دیا۔

اس رات خوب بارش ہوئی ایسا لگتا تھا آسمان بھی ان کے غم میں شریک ہے اس لیے خوب کھل کے رو رہا ہے۔

"بابا سائیں!

اپنے اس گناہ گار بیٹے کو اس کی آخری غلطی سمجھ کر معاف کر دینا۔ میں حرا کو اس حال میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اگر وہ زندہ رہتی تو اس کی زندگی جہنم سے بھی بدتر گزرتی۔ نہیں بابا سائیں، میں یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

کیا آپ کو لگتا ہے کہ حرا کے ایسا کرنے کا ذمے دار انہیں ہے؟ نہیں۔ ہم ہیں بابا سائیں، ہم...... بابا لڑکیاں نازک آبگینوں کی طرح ہوتی ہیں جنہیں سنبھال کر بہت احتیاط سے رکھا جاتا ہے، یہ ان نرم شاخوں کی طرح ہوتی ہیں جنہیں پیار سے جدھر چاہیں موڑ دیں اور سختی سے موڑیں تو ٹوٹ جائیں گی اور ہم نے بھی یہی کیا، ہم نے بھی سختی کی اور حرا پر اپنی مرضی مسلط کرنا چاہی اور اس سے اس کی خواہش تک نہ پوچھی...... اور دوسری وجہ یقیناً ہمارے اپنے اعمال بھی ہیں کہ ہم جیسے مرد جو اپنے رشتوں کا تو احترام کرتے ہیں لیکن دوسروں کی بہو، بیٹیوں کو اپنا مال سمجھتے ہیں، یہ نہیں سوچتے کہ جس طرح ہماری سوچ اس قدر گھٹیا اور غلیظ ہے تو یقیناً باقی مردوں کی بھی ہماری بیٹیوں کے بارے میں یہی سوچ ہو سکتی ہے اور بابا سائیں! میں بھی انہی مردوں میں شامل تھا اس لیے مجھے بھی اپنے کیے کی سزا ملنی چاہیے۔

بابا سائیں!

میں بھول گیا تھا فرمان خدا کو کہ:

"بدکار عورتیں بدکار مردوں کے لیے ہیں اور بدکار مرد بدکار عورتوں کے لیے، اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لیے ہیں اور پاک مرد پاک عورتوں کے لیے۔ پاک دامن رہو تمہاری عورتیں پاک دامن رہیں گی بے شک زنا ایک قرض ہے جس نے بھی اسے لیا تو ادائیگی اس کے گھر والوں ماں، بیوی، بہن، بیٹی سے ہوگی، اے ابن آدمؑ! اگر تو عقل مند ہے تو جان لے پس جو زنا کرتا ہے اپنے گھر کی طرف راستہ دیتا ہے۔"

وہ راستہ میں نے خود دیا اپنے گھر کی طرف۔ میری حرا تو معصوم تھی۔

بابا سائیں!

میں ساری عمر اپنے جرم کی پاداش میں ضمیر کی دہکتی ہوئی آگ کی لپٹوں میں نہیں جی سکتا۔ مجھے معاف کر دینا...... مجھے معاف کر دینا...... شاید...... شاید اللہ کی ذات کو مجھ گناہ گار پر ترس آجائے، میرے لیے دعا کیجیے گا۔

فقط

آپ کا گناہ گار بیٹا۔"

مرنے سے پہلے چودھری شہزاد نے باپ کے نام خط لکھ کر خود کو موت کے اندھیروں کے حوالے کر دیا۔

ایک ہی علاقے میں چار جنازے لوگوں کے لیے
"دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو"
کی تفسیر پیش کر رہے تھے۔

ماروی

محی الدین نواب

پندرہویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا بادو باراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیّر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیّر خیز سنگم۔

ایک [illegible] چاہتوں اور نفرتوں کا ایک [illegible] سلسلہ





گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ داستان ہے دورِ جدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی منگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جمر و اور چاچی فتی کے ساتھ اندرونِ سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ گاؤں کا وڈیرا حشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہٰذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوٹھ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا وڈیرا حشمت کی منشی گیری کرتا تھا۔ وڈیرا حشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کر دی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہو گیا۔ گاؤں سے فرار ہو کر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے میمن گوٹھ آ گئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاچی کے ساتھ پہلے ہی آ چکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہوگئی جو کہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون، لیکن ہو بہو مراد کا ہم شکل تھا۔ بس دونوں کے درمیان صرف قسمت کا فرق تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ حشمت جلالی جو کہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کر چکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کر لی اور خاموشی سے فرار ہو گئی۔ وڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی برباد کر کے قتل کر دیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے مسخ کر کے اسے اپنی بیٹی ظاہر کر کے الزام مراد پر لگا دیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا، ارادہ اسے اپنی جگہ دے کر خود گوشہ نشین ہونا تھا۔ محبوب کے سرپرست اس کے والد کے زمانے کے معروف جگی تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل ہمیرا کو سیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل و جان سے مرمٹا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا جس میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بطور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہو گیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی لیکن وڈیرا باپ اور بیٹوں کو خبر نہیں تھی کہ زلیخا کہاں اور کس حال میں ہے۔ ماں رابعہ جانتی تھی لیکن مراد سے نالاں تھی۔ وہ شوہر اور بیٹوں سے بھی ناراض تھی لہٰذا انہیں خبر نہیں کی۔ مراد اس قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کر رہا تھا۔ اسی باعث اس کی وڈیرا حشمت سے دشمنی ہو گئی۔ یہ بات پارٹی کے لیڈر تک پہنچ گئی نتیجتاً چانڈیو استعفا دے کر چلا آیا۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہو گیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سہیلی کی شادی میں شرکت کے لیے گوٹھ گئی، تاہم محبوب چانڈیو اسے بچا لایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کو رہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ، بہرام اور دارا اکبر آئے۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی۔ مقدمے کو معلوم نہیں کب تک چلنا تھا لیکن محبوب نیک نیتی سے ان کا مددگار تھا اور حق کہ ماروی محبوب کے احسانات سے بچنے کے لیے جان بوجھ کر غائب ہو گئی۔ اس خبر کے بعد وہ دلبرداشتہ ہو کر خود مراد کی جگہ جیل میں قید ہو گیا جبکہ دوسری جانب ماروی کی تلاش کا لالچ دے کر مراد کو مرینہ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہو گیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے شکنجے سے فرار ہو گیا۔ جبکہ دوسری جانب ہمیرا اور جگی صاحب محبوب کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ مرینہ اپنے باپ کے بل پر بہت شاطرانہ چالیں چل رہی تھی۔ مگر قسمت کی دیوی مراد پر مہربان تھی جو مرینہ کے ہاتھوں سے نکل گیا تھا، اتفاق سے راستے میں ماروی چاچی اور چاچا اس کے ساتھ لگ گئے لیکن کسی نہ کسی طرح مراد کو ہو گیا کہ مرینہ ماروی کو جام تھارو کے چودھری کے پاس لے جا رہی ہے لہٰذا مشکلات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے وہ ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کرا لیتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگتی ہے جس کے باعث اس کی یادداشت چلی جاتی ہے۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کر کے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کر کے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہو جاتا ہے۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جا رہا تھا۔ مرینہ کے پالتو غنڈے مراد کو کسی نہ کسی طرح جیل سے نکال کر لے جاتے ہیں۔ باہر نکال کر ان کے درمیان سخت مقابلہ ہوتا ہے۔ جس میں قانون کا خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مرجاتا ہے۔ ماروی کا علاج ہوتا ہے مگر ماروی محبوب اور مراد دونوں کو نہیں پہچانتی۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر کو بو کے ساتھ مل گیا۔ مرینہ کے راستے میں پھر رکاوٹ بن گیا۔ مرینہ کو پتا چل گیا کہ مراد ماسٹر کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ادھر جگ دیو مراد کو سرحد پار کرانے کے لیے اپنے ساتھ لے جاتا ہے مرینہ آرمی والوں کو اطلاع کر دیتی ہے۔ جگ دیو مارا جاتا ہے اور مراد مرینہ کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ مرینہ گولیاں مار کر مراد کو زخمی کر دیتی ہے اور اسے اپنا اسیر بنا لیتی ہے۔ ادھر ماروی کے دوبارہ سر میں چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آ جاتی ہے۔ مراد مرینہ کے زیرِ اثر آ چکا تھا۔ ماروی کو پتا چل گیا اور اس نے مراد کو اپنانے سے انکار کر دیا تاہم مراد نے اسے اپنی پارسائی کا یقین دلایا اور کہا کہ وہ اس دلدل سے نکل آئے گا۔ رابعہ خاتون نے مراد کے بچے ماروی کے ہاں پہنچا دیا۔ ادھر مرینہ دوبارہ TMET آفیسر بن گئی تھی مراد کے ساتھ ڈبل گیم کھیل رہی تھی وہ مراد کو حاصل کر کے اور اس کے ساتھ کچھ وقت بتا کر ریڈ الرٹ والوں کو پیش کرنے والی تھی جس کے بدلے اسے اور اس کے ڈیپارٹمنٹ کو پچاس لاکھ ڈالرز کی رقم ملتی۔ مراد نے سرجری کے ماہر ڈاکٹر مینی سن سے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروائی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے ایمان علی کی شکل دے دی۔ وہ ڈاکٹر کے گھر پر ہی رہنے لگا۔ وہاں اس کے ساتھ ایمان کا دوست عبداللہ کینڈی بھی آ گیا۔ مراد نے اس کی بھی سرجری کروا کے اسے اپنا چہرہ دے دیا اب یونا عبداللہ مراد بن گیا تھا۔ دشمن مراد کو بونا دیکھ کر چکرا گئے۔ مراد کو بےقصور ثابت کرنے کے لیے گڈ گھر اپلشن نامی تنظیم کی عورتیں سرگرم ہو گئیں۔ وہ ایک پریس کانفرنس میں مراد کو بےقصور ثابت کرتیں۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ماروی صبح کی نماز کے بعد کلام پاک کی تلاوت کر رہی تھی۔ وہ عربی زبان نہیں سمجھتی تھی۔ کلام پاک صحیح تلفظ سے پڑھنے کے لیے وہ ہر صبح تلاوت جاری رکھتی تھی۔ ایسا ہوتا تھا کہ وہ بڑی عقیدت اور ایمان سے پڑھتی تھی لیکن خیالات کہیں اور بھٹکتے رہتے تھے۔ وہ ایسے وقت خیالات سے چونک کر توبہ کرتی ہوئی رحل پر رکھے ہوئے قرآن مجید کو جھک کر چوم لیتی تھی۔

اس روز بھی یہی ہوا۔ تلاوت کے دوران میں اس کے خیالات مراد کی طرف بھٹکنے لگے تو اس نے توبہ کی پھر سر جھکا کر مقدس صفحات کو چوما تو یکایک جیسے غائب دماغ ہوگئی۔ سر قرآن مجید پر رکھا تو پھر اٹھا نہ سکی۔

وہ چند ساعتوں تک سکتے میں رہی اور خود کو جیسے بھول گئی۔ پھر اسے کچھ یاد آنے لگا۔ اس نے خود کو سکھر کے اسپتال میں دیکھا۔ وہ خود کو مراد کو، محبوب کو اور چاچی وغیرہ کو بھول گئی تھی۔

پھر اس نے دیکھا۔ ایک ڈاکٹر عدیلہ اس کا علاج کرنے آیا کرتی تھی۔ سب سے مردوں کے انداز میں محبت کرتی تھی پھر انکشاف ہوا کہ وہ سچ مچ مرد ہے۔ ماروی نے اسے بھگا دیا تھا۔ اسے بہت کچھ یاد آرہا تھا اور یہ آخری واقعہ بھی یاد آیا جب وہ غازی بابا کے دربار گئی تھی۔ وہاں سمیرا نے اسے سیڑھیوں کی بلندی سے دھکا دیا تھا۔

اس نے چونک کر کلام پاک پر سے سر اٹھایا۔ اسے آٹھ ماہ کی گزری ہوئی باتیں یاد آگئی تھیں۔ اس نے قرآن مجید کو اٹھا کر چوما۔ اسے سینے سے لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ ان لمحات میں وہ روحانیت سے سرشار ہو رہی تھی۔ وہ جیسے کلام پاک میں جذب ہوگئی تھی۔ عجب جذب کے عالم میں تھی۔ بڑی دیر تک سوچ سے خالی ہو کر گم صم سی بیٹھی رہی۔ پھر کلام پاک کو جزدان میں لپیٹ کر مصلے سے اٹھ گئی۔

یہ معلوم کر کے دکھ ہو رہا تھا کہ عدیلہ بہن اور سہیلی بن کر دھوکا دے رہی تھی بلکہ دے رہا تھا اور سمیرا میٹھی چھری ہے۔ اس نے اسے مار ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے چاچی منی کے پاس آکر کہا۔ ”مجھے آٹھ مہینے کی بھولی ہوئی باتیں یاد آرہی ہیں۔“

منی نے کہا۔ ”یہ تو اچھی بات ہے تمہاری دماغی توانائی بڑھ گئی ہے۔ پھل اور میوے کھاتی رہا کرو۔“

وہ بولی۔ ”چاچی! ان آٹھ مہینوں میں میرے ساتھ کیا ہوا؟ یہ آپ نہیں جانتیں۔ کوئی نہیں جانتا۔“

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”ایسا کیا ہوا تھا۔ میں دن رات تمہارے ساتھ رہتی ہوں اور میں نہیں جانتی؟“

”ایک ڈاکٹر عدیلہ میرا علاج کرنے آتی تھی۔ تم نہیں جانتیں۔ وہ عورت نہیں تھی۔ مرد تھا۔“

منی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ”کیا کہہ رہی ہو؟“

وہ عدیلہ عرف عدیل کے متعلق بتانے لگی۔ منی نے تمام باتیں سننے کے بعد کہا۔ ”یا اللہ! وہ مرد تھا اور میں اسے پہچان نہ سکی۔ تم مجھے بتاتیں تو میں اسے جھاڑو سے مار کر بھگاتی۔“

”میں کسی طرح کا ہنگامہ نہیں چاہتی تھی پھر وہ کئی دنوں تک میرے ساتھ تنہائی میں رہا۔ دوسروں کو معلوم ہوتا تو وہ طرح طرح کی باتیں بناتے۔ اس مرد کا کچھ نہ جاتا۔ میں بدنام ہوجاتی۔“

”اچھا کیا بیٹی! اسے چپ چاپ بھگا دیا۔“

ماروی ذرا چپ رہی پھر بولی۔ ”ایک میٹھی چھری مجھے مار ڈالنا چاہتی تھی۔“

منی نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولی۔ ”سمیرا کتنی محبت کرنے والی ہے نا؟“

منی نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا پھر کہا۔ ”اس نے تمہیں محبوب سے دور کرنے اور مراد سے ملانے کے لیے ہماری مدد کی تھی۔“

ماروی نے کہا۔ ”اس نے مجھے یہاں سے بھگانے کے لیے کتنا زبردست اغوا کا ڈراما کیا تھا۔“

منی نے کہا۔ ”اور ہمیں دو لاکھ روپے بھی دیے تھے۔ میں خوب سمجھتی ہوں۔ وہ محبوب صاحب سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اس لیے وہ سب ناٹک کیا تھا۔“

”بلا سے ناٹک کیا تھا۔ ہمارے لیے تو نیکی کی تھی۔“

ماروی نے کہا۔ ”جب اس کی نیکی کام نہ آئی اور میں واپس آگئی اور محبوب اسی طرح میرے دیوانے رہے تو وہ نیک عورت میری دشمن بن گئی۔

”چاچی! میں غازی بابا کے دربار میں سیڑھیوں سے خود نہیں گری تھی۔ سمیرا نے مجھے دھکا دے کر گرایا تھا۔“

منی نے حیرانی سے منہ پر ہاتھ رکھا۔ ”ہائیں۔ یہ کیا کہہ رہی ہو؟ اس نے تمہیں دھکا دے کر اوپر سے گرایا تھا؟ لعنت ہے اس کلموہی پر۔ ابھی محبوب صاحب کو فون کرو۔ یہاں بلاؤ اور اس جھاڑو پھری کی اصلیت بتاؤ۔“

منی نے ہاتھ بڑھا کر اس سے فون لینا چاہا۔ ”لاؤ میں فون کرتی ہوں۔“

ماروی نے ہاتھ کھینچ کر فون کو اس سے دور کرتے

ہوئے کہا۔"رک جاؤ چاچی! مجھے ذرا سوچنے دو۔"

"اس میں سوچنا کیا ہے؟ محبوب صاحب کو اس کمینی کی اصلیت نہ بتائی تو وہ پھر کوئی موقع پا کر تمہیں مار ڈالے گی۔"

"اللہ بچانے والا ہے۔ جب تک میرے نصیب میں زندگی ہے' مجھے کوئی نہیں مارے گا۔ ایک بات میرے دماغ میں پھنسی ہوئی ہے۔ میں اچھی طرح سوچ لوں پھر بولوں گی۔"

وہ منی کے پاس سے اٹھ کر بولی۔"شہزاد سو رہا ہے۔ میں دیکھ کر آتی ہوں۔"

وہ پھر اپنے کمرے میں آئی۔ شہزاد گہری نیند میں تھا۔ وہ مطمئن ہو کر ٹہلنے لگی۔ سوچنے لگی کہ محبوب کو سیرا کی دشمنی کے بارے میں معلوم ہوگا تو کیا ہوگا؟

یہی ہوگا کہ ماروی کا وہ دیوانہ طیش میں آ کر اسے گولی مار دے گا اور پھانسی پر چڑھ جائے گا۔ اگر اسے گولی نہیں مارے گا تو اسے اپنے کاروبار سے' اپنے دفتر سے باہر کر دے گا۔ جبکہ وہ محبوب کے اربوں روپے کے بزنس کو ایمانداری سے سنبھال رہی ہے۔

وہ پھر منی کے پاس آ گئی۔ اس کے سامنے بیڈ پر بیٹھ کر بولی۔"چاچی! محبوب کو اس کی اصلیت نہ معلوم ہو تو اچھا ہے۔"

"کیوں نہ معلوم ہو؟ اللہ نے تمہیں بچایا ہے۔ مر جاتیں تو وہ ابھی محبوب کی دلہن بن کر عیش کر رہی ہوتی۔"

"تم یہ سب نہ سوچو۔ محبوب کو معلوم ہوگا تو وہ اسے اپنے کاروبار سے نکال دیں گے پھر اس کی صورت نہیں دیکھیں گے۔ میری عقل کہتی ہے کہ وہ ان کے بہت سے کاروباری راز کو جانتی ہے۔ ان کی ملازمت سے نکل کر انہیں سو طرح سے نقصان پہنچا سکتی ہے۔"

منی قائل ہو کر سر ہلا رہی تھی۔ ماروی نے کہا۔"معروف صاحب نے سیرا کو بیٹی بنایا ہے۔ وہ بھی محبوب کے خلاف بیٹی کا ساتھ دیں گے تو دیکھتے ہی دیکھتے [illegible]

"عورت جسے دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہے اسے اپنا بنائے رکھنے کے لیے سوکن کی موت چاہتی ہے۔ مرینہ بھی تو مراد کو صرف اپنا بنائے رکھنے کی خاطر مجھے مار ڈالنا چاہتی تھی۔ یہ تم سکھر میں دیکھ چکی ہو۔ میں بھی دل میں سوچتی رہتی ہوں کہ وہ مر جائے تو میرے راستے کا کانٹا نکل جائے گا۔ اسی طرح سیرا بھی میری موت چاہتی تھی۔ بے شک وہ میری جان کی دشمن ہے لیکن محبوب کی وفادار ہے۔ اس کے اربوں کے کاروبار کو ڈوبنے سے بچا رہی ہے۔"

"میری بیٹی! تم اس دشمن عورت کے لیے کتنی محبت اور شرافت سے سوچ رہی ہو۔"

"سیرا کے لئے نہیں' محبوب کے لیے سوچتی ہوں۔ ہم پر ان کے بڑے احسانات ہیں۔ ان احسانات کا بدلہ چکانے کا یہ اچھا موقع ہے کہ میں سیرا کے خلاف نہ بولوں۔ اسے محبوب کے کاروبار سے الگ نہ ہونے دوں۔ محبوب کا اس پر اعتماد بحال رہے۔ انہیں ایک پیسے کا بھی نقصان نہ پہنچے۔"

منی اس کی باتیں سن رہی تھی اور اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی پھر اس نے کہا۔"بیٹی! میری عقل میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ سیرا دشمن بن کر محبوب صاحب کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ میں یہ بھی مانتی ہوں کہ وہ محبوب صاحب کے پیچھے پاگل ہے۔ اگر تم اس کے خلاف نہیں... بولو گی تو وہ ہمیشہ ان کی وفادار بن کر رہے گی اور ان کے کاروبار کو سنبھالتی رہے گی۔

"ٹھیک ہے' اس دشمن عورت کو اللہ پر چھوڑ دو۔ اللہ نے چاہا تو تمہارا بھلا ہوگا۔ مراد دو تاریخ سے پہلے آئے گا اور تمہیں اپنی دلہن بنائے گا پھر سیرا کے دل سے حسد جلاپا ختم ہو جائے گا۔"

چاچی قائل ہو گئی تھی کہ جس نے ماروی کو مار ڈالنا چاہا تھا اسے معاف کر دیا جائے۔ اس وقت شہزاد کے رونے کی آواز [illegible] کمرے میں آئی پھر بیٹھ

"کیا کہہ رہی ہو۔ میں نہیں سمجھا؟"

"وہ عدیلہ نہیں عدیل تھا۔ عورت نہیں تھی مرد تھا۔"

"تم واقعی چونکا رہی ہو۔ حیران کر رہی ہو۔"

وہ عدیلہ کے متعلق اسے تفصیل سے بتانے لگی۔ وہ تمام باتیں سننے کے بعد طیش میں آکر بولا۔ "اس بہروپیے کی یہ مجال کہ وہ عورت بن کر تمہارے ساتھ رہتا تھا۔ میں اس کی ایسی پٹائی کراؤں گا۔ ایسا سبق سکھاؤں گا کہ وہ عورت بن کر شریف لڑکیوں کو دھوکا دینا بھول جائے گا۔"

"آپ غصے میں نہ آئیں، اس سے جھگڑا کریں گے تو بات بڑھے گی۔ میں بدنام ہو جاؤں گی کہ اس مرد کے ساتھ روز آٹھ گھنٹے رہا کرتی تھی۔"

وہ درست کہہ رہی تھی۔ ایک ذرا وقفے سے بولی۔ "ایک تو میں یونہی آپ کی کوٹھی میں، آپ کے سائے میں رہ کر بدنام ہوتی چلی آرہی ہوں۔ پھر ایک دوسرا مرد بھی مجھ سے وابستہ کیا جائے گا تو میں کہاں منہ چھپانے جاؤں گی؟"

محبوب کا جوش اور غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ "تم درست کہتی ہو۔ میں تمہاری بدنامی کی طرف جانے والا کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا۔ چلو اب تم آرام کرو۔ میں لنچ کے وقت آؤں گا۔"

محبوب رابطہ ختم کر کے انگاروں پر لوٹنے لگا۔ اس سے یہ برداشت نہیں ہو رہا تھا کہ ایک مرد روزانہ آٹھ گھنٹے اس کی ماروی کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ انجانے میں اسے سہیلی سمجھ کر اپنا ہاتھ پکڑنے دیتی ہوگی۔ مگر وہ کمبخت بہروپیا اور کئی بہانوں سے پتا نہیں کہاں کہاں ہاتھ رکھتا ہوگا؟

ایسی باتیں سوچ کر غصہ ٹھنڈا نہیں ہو رہا تھا اور بھڑک رہا تھا۔ وہ ٹھنڈا ہونے کے لیے باتھ روم میں آگیا۔ شاور کھول کر ٹھنڈے پانی میں بھیگنے لگا۔ اس طرح دماغ کچھ ٹھنڈا ہونے لگا۔

وہ دس بجے آفس پہنچا تو سمیرا اور معروف کاروباری رپورٹس پیش کرنے آگئے۔ اس نے کہا۔ "معروف صاحب! میں بہت الجھا ہوا ہوں۔ کسی کاروباری مسئلے پر بات نہیں کروں گا۔"

معروف نے پوچھا۔ "خیریت تو ہے؟ تمہارے عشقیہ معاملات تو معمول پر آگئے تھے۔ اب کوئی نئی بات ہوگئی ہے؟"

"نئی بات یہ کہ ماروی آٹھ ماہ کی جو باتیں بھول گئی تھی وہ سب اسے یاد آگئی ہیں۔"

سمیرا نے چونک کر محبوب کو دیکھا۔ معروف نے کہا۔ "یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ تم کیوں الجھ رہے ہو؟"

"ان آٹھ مہینوں میں ماروی کے ساتھ دھوکا ہوتا رہا ہے۔"

سمیرا کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ اندر سے سہم گئی۔ ان لمحات میں وہاں سے فوراً ہی اٹھ کر بھاگ جانا چاہتی تھی اور جیسے بھاگنے کے لیے اپنی کرسی پر پہلو بدل رہی تھی۔

محبوب نے کہا۔ "اسے آٹھ ماہ کی ایک ایک بات یاد آگئی ہے۔ آپ جس ڈاکٹر عدیلہ کو اس کے علاج کے لیے لائے تھے، وہ ایک بہروپیا تھا۔ عورت نہیں تھی ایک مرد تھا۔"

یہ دھماکا کرنے والی بات تھی۔ وہ دونوں اسے بے یقینی سے دیکھنے لگے۔ معروف نے کہا۔ "یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ رحمان کو میں برسوں سے جانتا ہوں۔ وہ کوئی ہیرا پھیری کرنے والا شخص نہیں ہے۔ اپنے بیٹے کو بیٹی بنا کر ہمارے گھر کیوں بھیجے گا؟"

"اس نے بیٹے کو بیٹی بنا کر صرف ہمارے گھر نہیں بھیجا ہے۔ آپ ذرا سوچیں وہ ہمیشہ بیٹی بن کر رہتا ہوگا۔ تب ہی اس نے ڈاکٹر عدیلہ کے نام سے سائیکاٹرسٹ کی سندیں حاصل کی ہیں۔"

معروف نے کہا۔ "او گاڈ! رحمان دیکھنے میں تو چکر باز نہیں لگتا۔ میں ابھی اس سے بات کروں گا۔"

وہ بولا۔ "مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ جی چاہتا ہے ابھی جاؤں ور اس کے بہروپیے بیٹے کو گولی ماردوں۔"

"نہیں محبوب۔ طیش میں آکر ایسی باتیں نہ سوچو۔ میں ان باپ بیٹے سے نمٹ لوں گا۔"

محبوب غصے کی حالت میں کبھی معروف کو اور کبھی سمیرا کو دیکھ رہا تھا۔ س کی تو جان نکلی جا رہی تھی۔ دماغ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ ماروی نے اس کے خلاف بھی زہر اُگلا ہوگا۔ محبوب ڈاکٹر عدیلہ کے بعد اس کی خبر لینے والا ہے۔ اسی لیے بار بار غصے سے دیکھ رہا ہے۔

اس نے جھنجلا کر اٹھتے ہوئے ایک فائل کو میز پر پھینکا تو وہ میز پر سے ہوتی ہوئی سیرا کی گود میں آگئی۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔ سمجھ گئی کہ اب اس کی شامت آگئی ہے۔

وہ غصے میں اس کی طرف دیکھے بغیر یہ بولتا ہوا وہاں سے گیا کہ وہ لنچ کے بعد آئے گا پھر اور باتیں کرے گا۔ گویا یہ بول کر گیا تھا کہ لنچ کے بعد سمیرا کی خبر لے گا۔ دل میں جو چور تھا، وہ کمبخت یہی بول رہا تھا اور اسے دوپہر لنچ تک انتظار کی سولی پر لٹکا رہا تھ۔

محبوب چلا گیا۔ جس دروازے سے گزر کر گیا تھا، اسے سمیرا دیکھتی رہی۔ یہی سمجھ میں آرہا تھا کہ وہ غصے سے

فائل کو اس پر سپینک کر گیا ہے۔ ابھی کچھ بول نہیں رہا ہے۔ لنچ کے بعد بولے گا اور اسے لات مار کر ملازمت سے اور اپنی زندگی سے نکال دے گا۔

معروف اپنے فون پر عدیلہ کے باپ رحمان کے نمبر پنچ کر رہا تھا۔ وہ کرسی سے اٹھ کر بولی۔ ”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ گھر جا رہی ہوں۔ آج کام نہیں کر سکوں گی۔“

وہ جواب سنے بغیر وہاں سے نکل کر اپنے آفس کیبن میں آگئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ماروی کو بھولی ہوئی باتیں یاد آجائیں گی۔ اس پر ہیبت طاری ہو رہی تھی۔ پیٹ میں گولا سا گھوم رہا تھا۔ دل کی دھڑکنیں ڈوب رہی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کہاں بھاگ کر جائے اور منہ چھپا لے۔

وہ کسی بھی طرح باتیں بنا کر ماروی کو جھٹلا نہیں سکتی تھی۔ ایک طرح سے ماروی مقتولہ تھی۔ اسے قتل کیا گیا تھا۔ وہ چشم دید گواہ کہتی کہ کس نے اسے سیڑھیوں کی بلندی سے گرایا تھا تو عدالت بھی اس کے بیان کے مطابق قتل کی مرتکب ہونے والی کو ضرور سزا دیتی۔

وہ محبوب کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ اس کی شریک حیات بننے کے لیے پاگل ہو رہی تھی اور حالات تھے کہ اچانک بدل رہے تھے۔ وہ اس کی نظروں سے گرنا نہیں چاہتی تھی۔ یوں ذلیل ہو کر، بے آبرو ہو کر اس کے دل سے نکلنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا، کیا کرے۔ ایک ہی بات ذہن میں آرہی تھی کہ محبوب کی نظروں سے گرنے سے پہلے مر جائے۔

ماروی نے اسے ایسی دلدل میں گرا دیا تھا، جہاں سے وہی اسے نکال سکتی تھی۔ ورنہ وہ تو دھنستی ہی چلی جا رہی تھی۔

☆☆☆

مراد اندرا روڈ کی فٹ پاتھ پر اپنی موٹر سائیکل کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ ایسے وقت ماروی نے اسے پکارا۔ وہ فون کو کان سے لگا کر بولا۔ ”ہائے مراد کی جان! کیا ہو رہا ہے؟“

”اپنے بچے کو پیار کر رہی ہوں۔ لو سنو۔“

اس نے زوردار آواز کے ساتھ شہزاد کا بوسہ لیا۔ مراد نے کہا۔ ”ہائے یہ مجھ تک پہنچ گیا ہے۔ مجھ سے کہہ رہا ہے۔ فوراً جاؤ اور بوسہ لینے والی کو پکڑو اور بازوؤں میں جکڑ لو۔“

وہ ہنسنے لگی پھر بولی۔ ”ایک بات کہنے کو فون کیا ہے۔ ویسے تم کہاں ہو۔ ٹریفک کا شور سنائی دے رہا ہے۔“

”میں ایک سڑک کے کنارے کسی کا انتظار کر رہا ہوں۔ وہ آکر مجھے ایک پریس کانفرنس میں لے جائے گا۔“

”اس کا مطلب ہے، آزادی سے گھوم رہے ہو۔ کوئی تم پر مراد ہونے کا شبہ نہیں کر رہا ہے؟“

”خدا کا شکر ہے۔ میں ایمان علی کے چہرے کے ساتھ توقع سے زیادہ محفوظ رہنے لگا ہوں۔“

”ایک بات سنو جو آٹھ ماہ کی باتیں میں بھول گئی تھی، وہ سب مجھے یاد آگئی ہیں۔“

”یہ تو بڑی اچھی بات ہو گئی۔ اب تمہارے ماضی کے کسی دور میں اندھیرا نہیں رہے گا۔ تمہارا دماغ کمزور نہیں رہا ہے۔ تمہیں گزاری ہوئی زندگی کی تمام باتیں یاد رہا کریں گی۔“

”میں اور بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں لیکن تم کہیں سڑک کے کنارے ہو۔ مجھے شور سنائی دے رہا ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔ ہم پھر کسی وقت آرام سے باتیں کریں گے۔ میں فون بند کرتا ہوں۔“

”ٹھہرو۔ ایک بار کہہ دو کہ دو تاریخ سے پہلے آرہے ہو۔“

”میں ہر حال میں آؤں گا۔“

پھر وہ دھیمی سرگوشی میں بولا۔ ”ہونا مراد بن کر......“

وہ ہنسنے لگی۔ رابطہ ختم ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک نوجوان موٹر سائیکل پر آکر وہاں رک گیا پھر بولا۔ ”میں ماتا جی (جگنی بائی) کا بیٹا ہوں۔ انہوں نے مجھے بھیجا ہے۔ آؤ چلیں۔“

وہ پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اس کے پیچھے چل پڑا۔ جب گھا گھرا پلٹن کے علاقے میں پہنچا تو کانفرنس شروع ہو گئی تھی۔ عبداللہ کبڈی مائیک کے سامنے کھڑا ہوا بول رہا تھا۔ حاضرین کے سامنے اپنی ہسٹری بیان کر رہا تھا۔

وہاں کے تمام چھوٹے بڑے اخبارات کے رپورٹر اور فوٹو گرافر آئے ہوئے تھے۔ وقفے وقفے سے کیمروں کی فلیش لائٹس جل بجھ رہی تھیں۔ ٹی وی چینلز کے کیمرے بھی پریس کانفرنس کو کوریج دے رہے تھے۔ لوگ اچھی خاصی تعداد میں آئے ہوئے تھے۔

عبداللہ کبڈی کے بعد جگنی بائی مائیک کے سامنے آکر کہہ رہی تھی۔ ”ہماری گھا گھرا پلٹن اپنے گرتو کا پالن کرتی ہے۔ ہماری منو کامنا ہے کہ جو مظلوم ہیں انہیں انصاف دلایا جائے۔ آپ نے مراد کے ہم شکل عبداللہ کبڈی کی جیون کہانی سنی ہے۔ جب اس بچارے نے جنم لیا تھا تو یہ اور اس کے ماں باپ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہ

کسی مراد علی منگی کا ہم شکل ہے۔

"ہم نے کبڈی کے بارے میں بڑی چھان بین کی ہے۔تب یہ جانکاری ملی ہے کہ پچھلے برس سونامی میں اس کا پورا خاندان بچ بچ کے موت مارا گیا ہے۔"

"اپنے اپنے نصیب ہوتے ہیں۔ایک بونی عورت بھی اپنے پتی اور اپنی بیٹی کے ساتھ زندہ بچ گئی تھی۔میں انہیں آپ کے سامنے بلا رہی ہوں۔آپ ان کا بیان بھی سن لیں۔"

انہیں بلایا گیا۔وہ تین بونے اسٹیج پر آئے۔ان میں سے دو میاں بیوی تھے تیسری ان کی جوان بیٹی تھی۔بہت ہی خوبصورت تھی۔عبداللہ کبڈی اسے بے اختیار دیکھنے لگا۔

جگنی بائی نے مائیک کو ذرا نیچے کر کے بونوں کے سامنے رکھا۔ایک معمر بونے نے کہا۔"میرا نام جان کریمر ہے۔یہ میری بیوی ہیلنا ہے، اور یہ میری بیٹی فرمونا ہے۔ہم عیسائی ہیں۔ایک بار ہماری ملاقات عبداللہ کبڈی اور اس کے والدین سے ہوئی تھی۔ہم سب مدراس سے ممبئی ایک ٹرین میں جا رہے تھے۔ہمارا پندرہ گھنٹوں تک ساتھ رہا تھا۔"

اس کی بیوی ہیلنا نے کہا۔"ہم نے دو برس پہلے عبداللہ کبڈی کے ساتھ ٹرین میں بہت سارا وقت گزارا ہے اور اس کے تباہ ہونے والے خاندان کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔"

فرمونا نے کہا۔"ہم بونوں کی دنیا میں عبداللہ کبڈی بہت ہی ہینڈسم اور باڈی بلڈر ہے اور بہت سے کمالات دکھاتا ہے۔ایک بار اس سے ملنے کے بعد کوئی اسے بھول نہیں سکتا۔"

کبڈی ایک طرف بیٹھا فرمونا کو دیکھے جا رہا تھا۔انہوں نے پہلے کبھی ایک دوسرے کو نہیں دیکھا تھا۔شاید فرمونا نے کبھی اسے کہیں سے چھپ کر دیکھا ہو۔اس وقت اس کی باتوں سے لگاوٹ ظاہر ہو رہی تھی۔

وہ تینوں بونے جگنی بائی کی پلاننگ کے مطابق بول رہے تھے۔ان کی حمایت نے تصدیق کر دی کہ وہ بونا مراد علی منگی نہیں ہے بلکہ پیدائشی طور پر اس کا ہم شکل ہے۔

کبڈی نے بہت پہلے کسی سے عشق کیا تھا۔وہ اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔اس کے بعد وہ پھر کبھی عشق و محبت کے بارے میں سوچتا ہی نہیں تھا۔کئی برس گزر گئے تھے دل کسی کی طرف مائل نہیں ہوتا تھا۔بہت عرصے بعد فرمونا اس کے دل کو چھو رہی تھی۔

اسٹیج کے پیچھے ایک چار دیواری میں کئی کمرے تھے۔وہاں کام کرنے والی عورتیں پریس اور الیکٹرونک میڈیا کے لوگوں کے لیے میزوں پر کھانے پینے کا سامان رکھ رہی تھیں۔وہ تینوں بونے بیان دینے کے بعد ادھر چلے گئے تھے۔

کبڈی کا دل کھنچا جا رہا تھا۔کانفرنس کا اختتام ہوتے ہی ادھر جانے لگا۔مہمان کھانے کی میزوں پر آ رہے تھے اور کبڈی کے پاس آ کر اُسے روک روک کر اس سے سوالات کر رہے تھے۔وہ مختصر سے جوابات دے کر ان سے پیچھا چھڑوا رہا تھا اور اسے جگہ جگہ ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔

مراد نے اسے روک کر پوچھا۔"کہاں بھٹک رہے ہو؟ کسے تلاش کر رہے ہو؟"

"یار! کیا پوچھتے ہو۔تم نے فرمونا کو دیکھا ہے۔بلا کی حسین ہے۔ایسے ہی حسین وجود کے لیے کہتے ہیں...." وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔"اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے۔"

مراد نے ہنستے ہوئے کہا۔"تم گئے کام سے۔ویسے یہ عشق واقعی ہے یا عارضی؟"

"واقعی ہے۔میں تو اسے اپنی گھر والی بناؤں گا۔"

وہ جھک کر اس کے کان میں بولا۔"یہ مت بھولو کہ یہاں سے کسی دن بھی ہمیں پاکستان جانا ہے۔وہاں ایک طویل مدت کو ڈراما پلے کرنا ہے۔"

وہ شکست خوردہ انداز میں ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔پھر بولا۔"کیا کروں؟ ایسے وقت یہ کیا ہو گیا؟ یہ دل تو گڑبڑ کر رہا ہے۔اس کے لیے مچل رہا ہے۔"

پھر اس نے مراد کو اشارے سے کہا کہ کان قریب لائے۔وہ اس کے سامنے جھک گیا۔اس نے کان میں کہا۔"یار! پاکستان میں کتنا لمبا ڈراما ہو گا؟ میرا خیال ہے ایک یا دو مہینے میں تمہارا کام ہو جائے گا اور تمہاری تو پلاننگ ہے کہ کسی دوسرے ملک میں جا کر ماروی کے ساتھ زندگی گزارو گے۔"

وہ بولا۔"ہاں۔وہاں دیر تک بونے مراد کا ناٹک نہیں چلے گا۔وہاں کی پولیس اور جاسوس بڑی رازداری سے تمہارے پیچھے مجھے ڈھونڈتے رہیں گے۔یہ بات میرے دماغ میں ہے ہمیں مجبوراً کسی دوسرے ملک میں جا کر رہنا ہوگا۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔فرمونا کے لیے میرا پیغام لے جاؤ۔بات پکی کرو۔میں دو ماہ بعد یہاں آ کر اس سے شادی کروں گا۔پھر تم جس ملک میں ماروی کے ساتھ رہو گے وہاں فرمونا کے ساتھ آ جاؤں گا۔"

جگنی بائی کو بتایا گیا کہ اس کا بیٹا بونا مراد فرمونا کے

عشق میں گرفتار ہوگیا ہے۔ وہ حیرانی سے بولی۔ ”مراد! تم تو پاکستان میں ماروی سے شادی کرنے والے ہو؟“

وہ بولا۔ ”تو کیا ہوا؟ ہمارے دین میں اجازت ہے کہ بہت مجبوری ہو تو دو شادیاں کی جاسکتی ہیں۔ میری مجبوری یہ ہے کہ وہ پاکستان میں رہتی ہے اور فرمونا انڈیا میں۔ میں دونوں ملکوں میں گھریلو ازدواجی زندگی گزاروں گا۔ پلیز میرا رشتہ پکا کرائیں۔ میں دو ماہ بعد آکر اسے اپنی شریک حیات بناؤں گا۔“

پھر اس نے تنہائی میں جگنی کو سمجھایا۔ ”میں بونا ہوگیا ہوں۔ فرمونا میرے مطابق بونی ہے۔ ادھر ماروی میرے قد سے اونچی ہوگئی ہے۔ پتا نہیں اس کے ساتھ گزارہ ہوگا یا نہیں؟ اسی لیے میں فرمونا کو اپنی دلہن بنانا چاہتا ہوں۔“

بات سمجھ میں آگئی۔ جگنی نے کہا۔ ”اطمینان رکھو۔ میں فرمونا کے ماں باپ سے تمہارے لیے اسے مانگ لوں گی۔“

مراد نے کہا۔ ”تم فرمونا کے چکر میں پڑ گئے ہو۔ اصل کام کی طرف بھی دھیان دو۔ مرینہ کل یہاں پہنچنے والی ہے۔ چیپت راؤ نے کہا ہے وہ یہاں آنے سے پہلے تم سے باتیں کرنا چاہتی ہے۔“

کبڈی نے کہا۔ ”لو ابھی سم بدل کر بات کرتا ہوں۔“

اس نے سم بدل کر مرینہ کے نمبر پنچ کیے۔ وہ انجانے نمبر پڑھ کر بولی۔ ”ہیلو کون؟“

”میں ہوں تمہارا یار دلدار۔“

وہ ناگواری سے بولی۔ ”او گاڈ! پھر اسی بونے کی آواز سن رہی ہوں۔ دیکھو میں کہہ چکی ہوں کہ کبھی یقین نہیں کروں گی۔ تم مراد علی منگی ہو ہی نہیں سکتے۔“

”یقین نہیں کرو گی تو یہاں کس سے ملنے آؤ گی؟ جہاں جاؤ گی مجھے پاؤ گی۔ یہ اچھی طرح سن لو کہ مجھے تم سے ملنے کا شوق نہیں ہے اور نہ ہی میں تمہارے عشق میں مرا جارہا ہوں۔ کل کا ٹکٹ کینسل کراؤ اور لندن میں اپنے کام دھندے سے لگی رہو۔“

”نہیں۔ میں تو آؤں گی۔ تمہیں دیکھوں گی کہ کیا چیز ہو؟“

”ضرور آکر دیکھو لیکن یاد رکھو۔ اگر تمہارے ساتھ جاسوس ہوں گے اور وہ دور سے میری نگرانی کرتے رہیں گے تو ان کے ساتھ تم بھی ماری جاؤ گی۔ تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ پیار سے آؤ۔ مجھ سے ملو۔ جب دیکھو کہ بونا ہوگیا ہوں اور تمہارے قابل نہیں رہا ہوں تو شرافت سے واپس چلی جاؤ۔ میرے سر کی قیمت تمہیں بہت مہنگی پڑے گی۔“

”تم درست کہہ رہے ہو۔ دشمنی ہر حال میں مہنگی پڑتی ہے۔ میں پیار سے آؤں گی۔ جب یقین ہوجائے گا کہ واقعی تمہیں جادو سے گھٹا دیا گیا ہے تو تمہیں سوری بول کر واپس چلی آؤں گی۔ تم اپنا پتا تو بتاؤ؟“

”جلدی کیا ہے؟ یہاں پہنچو تو سہی۔ تمہیں میرے گھر کا پتا معلوم ہوجائے گا۔“

”او کے میں کل آرہی ہوں۔“

اس نے رابطہ ختم کردیا۔ وہ فون کو مٹھی میں جکڑ کر سوچنے لگی۔ اسے اچھی طرح یقین ہوگیا کہ مراد چالیں چل رہا ہے۔ خود سامنے نہ آکر کسی بونے کو آگے بڑھا رہا ہے۔

وہ اٹھ کر ٹہلتے ہوئے سوچنے لگی۔ ”اس نے چہرہ بدل لیا ہے۔ وہ موت بن کر بالکل میرے قریب رہے گا تب بھی اسے پہچان نہیں سکوں گی۔ اس کی پلاننگ یہ ہوگی کہ وہ ایک بونے مراد کے ذریعے پہلے مجھے دوڑائے گا پھر کسی خفیہ پناہ گاہ میں بلائے گا اور مجھے تو خطرہ مول لے کر جانا ہی ہوگا۔ عقل کہتی ہے مجھے صرف جنگجو بن کر ہی نہیں معشوقہ بن کر بھی جانا چاہیے۔ اگر میں جوانی کے ہتھیاروں کو سان پر چڑھاؤں گی تو اس کی کسی پناہ گاہ میں تنہا جانا مہنگا نہیں پڑے گا۔“

اس نے سینٹر ٹیبل پر رکھے ہوئے فون کو اٹھا کر ... ڈائریکٹر جنرل کو مخاطب کیا۔ ”سر! میں مراد سے تنہا ملنے کا رسک نہیں لوں گی۔ اپنے ٹیرا اسکواڈ کے سراغرسانوں کے ساتھ جاؤں گی۔ ہم کل ہی اس کے سر کی قیمت وصول کریں گے۔“

وہ خوش ہو کر بولا۔ ”شاباش مرینہ! اب تم نے عقل سے صحیح فیصلہ کیا ہے۔ بولو۔ اسے گھیرنے کے لیے کیا کرنا چاہتی ہو؟“

وہ بولی۔ ”ہمارے ڈیپارٹمنٹ میں چار انتہائی شاطر سراغرساں اور شوٹرز ہیں۔ کل کی فلائٹ میں ان کے بھی ٹکٹ او کے کرائیں۔ وہ میرے ساتھ جائیں گے لیکن مجھ سے لاتعلق رہیں گے۔ میں انہیں اپنی پلاننگ سمجھاؤں گی۔ آپ بھی انہیں سمجھائیں۔

”مراد کو ماسٹر کو بوبو کی سرپرستی حاصل ہے۔ اس کے جاسوس ائرپورٹ سے میری نگرانی کریں گے۔ ہمارے سراغرسانوں کو ان کی نظروں میں نہیں آنا چاہیے۔ وہ انڈین کلچر کے مطابق لباس پہن کر جائیں گے۔ انہیں دیکھ کر یہی سمجھا جائے گا کہ وہ اپنے دیس میں رہنے یا رشتے داروں سے ملنے آئے ہیں۔ یہ یاد رکھیں کہ جب رشتے داروں سے ملنے آئے ہیں تو وہ ہوٹل میں قیام نہیں کریں گے۔“

ڈائریکٹر جنرل نے کہا۔ ''وہاں انڈین فیملیز میں ان کی رہائش کے انتظامات ہو جائیں گے۔ ڈونٹ وری۔ بی ایزی...''

وہ دونوں مراد سے نمٹنے' اسے زندہ یا مردہ حاصل کرنے کے سلسلے میں ایک ایک پہلو پر غور کر رہے تھے۔

☆☆☆

دوسرے دن پریس اور الیکٹرونک میڈیا کے ذریعے بڑی ہلچل رہی۔ پورے ملک میں بونے مراد کا چرچا ہو رہا تھا۔ یہ تسلیم کیا جا رہا تھا کہ وہ مراد علی منگی نہیں ہے۔ اکثریت کہہ رہی تھی کہ چھ فٹ سے بھی اونچا آدمی اچانک چار فٹ کا بونا نہیں بن سکتا۔ ایسا سوچنا سراسر حماقت ہے۔ ایم این اے دھرم داس نے عبداللہ کبڈی کو آئی جی آف پولیس اور خفیہ ایجنسی والوں کے سامنے پیش کر کے یہ سند حاصل کر لی کہ وہ پیدائشی بونا ہے اور اتفاقاً مراد کا ہم شکل ہے۔ صرف جگنی بائی اور اس کی تینوں بیٹیوں کو یہ قصہ سنایا گیا تھا کہ ایک تانترک مہاراج نے اسے بونا بنا دیا ہے۔ وہ دراصل مراد علی منگی ہے۔ بعد میں مرینہ کو بھی تانترک مہاراج کی کہانی سنائی گئی تھی۔ جبکہ وہ یقین نہیں کر رہی تھی۔ وہ اسے آنکھوں سے دیکھنے اور اصل مراد علی منگی تک پہنچ کر پچاس لاکھ ڈالرز حاصل کرنے آ رہی تھی۔

وہ شام کو چار بجے وہاں پہنچنے والی تھی۔ مراد عبداللہ کبڈی اور ڈاکٹر منی من کے علاوہ پوری کھاگھرا پلٹن بڑی نفرت سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔

ڈاکٹر منی من نے مراد سے کہا۔ ''تم مرینہ کو کئی بار عبرتناک سزائیں دے چکے ہو پھر بھی دیکھ رہے ہو کہ وہ دوستی کی آڑ میں دشمنی کرتی چلی آ رہی ہے۔''

مراد نے کہا۔ ''میں نے سوچ لیا ہے۔ اس بار اس کا قصہ ہی تمام کروں گا۔''

''نہیں بیٹے۔ اس کی جان نہ لو۔ اسے زیر کرنے کے بعد میرے فیصلے پر چھوڑ دو۔ میں اسے ایک انجکشن لگاؤں گا۔ وہ باقی زندگی پاگل خانے میں گزارے گی۔''

بدنام زمانہ تنظیموں اور انڈر ورلڈ کے سربراہوں کا ایک اجلاس سسلی کے سیون اسٹار ہوٹل میں ہوا تھا۔ وہاں شراب وشباب کی مستیوں میں مراد علی منگی تک پہنچنے اور اسے ہلاک کرنے کی تدبیریں سوچی گئی تھیں۔ مرینہ کو اور ماروی کو بھی ٹریپ کرنے کی پلاننگ کی گئی تھی۔ اب اس اجلاس کے خطرناک جاسوس اور شوٹرز بھی دہلی پہنچ گئے تھے۔ انہیں معلوم ہوا تھا کہ مرینہ انڈیا اپنے محبوب مراد علی منگی سے ملنے جا رہی ہے۔

جب لندن کی فلائٹ رن وے پر آ کر رکی تو اس وقت ائرپورٹ کی عمارت کے باہر دور تک نادیدہ دشمن مورچے بنائے ہوئے تھے۔ وہ عام شہریوں کی طرح سیدھے سادے بے ضرر دکھائی دے رہے تھے۔

مرینہ لگیج ہال سے باہر آئی تو اس کے چار جاں باز سراغرساں اس سے ذرا دور آس پاس ہی تھے۔ جگنی بائی اور اس کی بیٹیاں بھی ادھر ادھر تھیں۔ کھاگھرا پلٹن کی جاسوس عورتیں بھی لندن سے آنے والے مسافروں کو تاڑ رہی تھیں۔ ورشا نے ایک جاسوس کو تاڑ لیا۔ وہ اپنی اٹیچی فرش پر رکھے' دور کھڑی ہوئی ایک خوبصورت اور اسمارٹ لیڈی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہی مرینہ ہے۔ ورشا نے جاسوس کو دیکھا۔ اس نے کال کی تو اُدھر مرینہ نے کال اٹینڈ کی۔ وہ دونوں کو غور سے دیکھ رہی تھی اور اپنے فون پر ماں سے کہہ رہی تھی۔ ''ماتا جی! میں جہاں کھڑی ہوں وہاں ایک شخص نیوی بلیو سفاری سوٹ میں ہے۔''

وہ سفاری سوٹ والا فون پر کہہ رہا تھا۔ ''مرینہ! ہمارے سفارت خانے کی گاڑی آ گئی تھی۔ جیری اس میں بیٹھ کر گیا ہے۔ یہ کیسی نادانی ہے؟ اسے سمجھنا چاہیے تھا کہ ہماری یہ گاڑی دشمنوں کی نظروں میں ہو گی۔''

مرینہ نے کہا۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو۔ اچھا ہوا تم اس گاڑی میں نہیں گئے۔ یہاں سے ایک رینٹ کار لے لو۔''

ورشا نے دیکھا۔ مرینہ نے فون بند کیا تو سفاری سوٹ والے نے بھی اپنے فون کو بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔

اس نے ماں سے کہا۔ ''وہ جو بلیک جینز اور جیکٹ میں خوبصورت سی عورت انگریز جیسی لگ رہی ہے' وہی مرینہ ہو گی۔ وہ پھر کسی کو فون کر رہی ہے۔''

مراد مرینہ کے قریب ہی کھڑا تھا۔ وہ فون پر اس کے نمبر پنچ کرنے لگی۔ رابطہ ہونے پر کبڈی کی آواز سنائی دی۔ مرینہ نے کہا۔ ''مراد! میں یہاں آ گئی ہوں۔ تم کہاں ہو؟''

وہ بولا۔ ''پیٹ خراب ہو گیا ہے۔ ٹوائلٹ میں ہوں۔''

وہ ناگواری سے بولی۔ ''لعنت ہے۔ کیا تم ہمیشہ ٹوائلٹ سے ہی بولتے رہتے ہو؟''

''میں کیا کروں؟ تم ایسے ہی وقت کال کرتی ہو۔ جب میں یہاں آ کر بیٹھتا ہوں۔''

''میں سمجھ رہی تھی تم مجھے ریسیو کرنے آؤ گے۔''

''کیا مجھے پاگل کتے نے کاٹا ہے کہ گولیاں کھانے آؤں گا۔ تم کسی ہوٹل میں جاؤ۔ چیت راؤ کے آدمی چھپ

کر تمہاری نگرانی کر رہے ہیں۔"

"تم مجھے بلا کر چھپ رہے ہو۔ یہ غلط ہے۔ تمہیں ابھی آنا چاہیے۔ تم پہلے تو ایسے نہیں تھے۔"

"پہلے کی بات نہ کرو۔ میں پہلے چار فٹ کا بھی نہیں تھا۔ حالات نے بدل ڈالا ہے۔ اور میں بدل گیا ہوں اور کیا کرسکتا ہوں؟ جو کہہ رہا ہوں' وہ کرو۔ کسی ہوٹل میں جاؤ۔ میں اچھی طرح مطمئن ہونے کے بعد تمہیں لینے آؤں گا۔" کبڈی نے اس کا جواب سنے بغیر فون بند کر دیا۔

وہ جھنجلا گئی۔ کئی ٹیکسی ڈرائیور مسافروں سے پوچھتے پھر رہے تھے کہ وہ ٹیکسی میں جانا چاہیں گے یا پرائیویٹ ٹیکسی میں؟ مراد نے بھی مرینہ کے پاس آ کر پوچھا۔ "میڈم! میرے پاس پرائیویٹ ٹیکسی ہے۔ اے سی بھی ہے۔ ویری کمفارٹیبل ہے۔"

مرینہ سوچ میں تھی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو ایک جوان ہینڈسم ڈرائیور' نیلی وردی میں کھڑا تھا۔ بڑی متاثر کرنے والی پرسنالٹی تھی' وہ بولی۔ "ہاں۔ سامان اٹھاؤ۔"

اس نے ایک تابعدار کی طرح جلدی سے اس کی اٹیچی اور ایک گٹار کو اٹھایا۔ اس گٹار پر غلاف چڑھا ہوا تھا۔ وہ جرائم کی دنیا کا کھلاڑی بن چکا تھا۔ یہ سمجھ گیا کہ مرینہ کو موسیقی کا شوق نہیں ہے۔ وہ گٹار کے اندر گن چھپا کر لے جارہی ہے۔

برٹش ائر لائن کے عملے اور انڈین پولیس کی ملی بھگت سے گن لے جانے کی سہولت فراہم کی گئی ہوگی۔ اس نے گٹار اٹھایا تو مرینہ نے فوراً ہی ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "یہ گٹار مجھے دے دو۔"

اس نے مراد سے گٹار لے کر اپنے شانے سے لٹکا لیا۔ [illegible] ہتھیار اس کا زیور تھے۔ اپنا زیور کسی کے ہاتھ میں جانے نہیں دیتی تھی۔ وہ کار کی پچھلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اسے حکم دیا۔ "ہوٹل تاج محل چلو۔"

وہ مرینہ کے پاس آ کر پچھلی سیٹ کی کھڑکی پر جھک کر بڑی رازداری سے بولا۔ "میڈم! میں وزیٹرز لابی سے یہاں تک دیکھتا آرہا ہوں۔ ایک شخص ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے آپ کو دیکھ رہا تھا۔ اب یہاں میری گاڑی کے پیچھے اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھ گیا ہے۔ میں دعوے سے کہتا ہوں۔ وہ آپ کا پیچھا کرے گا۔"

مرینہ نے فوراً ہی گھوم کر پچھلے شیشے کے پار دیکھا۔ اسے مراد کی طرح ایک قدآور شخص نظر آیا۔ وہ اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر ہیلمٹ پہن رہا تھا۔ وہ مراد کی طرح تندرست' مند دکھائی دے رہا تھا۔ جبکہ مراد اس کے پاس ہی کھڑا تھا۔ وہ بولی۔ "شاباش تم نے مجھے ہوشیار کر دیا ہے۔ گاڑی چلاؤ۔ میں اس پر نظر رکھوں گی۔"

وہ اسٹیئرنگ سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ وہ جانتا تھا کہ ائرپورٹ پر ایک ٹیکسی ڈرائیور کی حیثیت سے مرینہ کے قریب جائے گا تو وہ اس کے قد اور جسامت کو دیکھ کر شبہ کرے گی۔

اس نے خود کو شبہے سے بالاتر رکھنے کے لیے اپنے جیسے دو قدآور جوانوں کی خدمات حاصل کی تھیں۔ ان میں سے ایک ابھی مرینہ کے پیچھے لگ گیا۔ دوسرا بعد میں کہیں نظر آنے والا تھا۔

سفاری سوٹ والا رینٹڈ کار حاصل کر چکا تھا۔ وہ بھی مرینہ کی ٹیکسی کے پیچھے لگ گیا تھا اور ورشا مسلسل اس کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ جگنی اور اس کی دو بیٹیاں اور کئی جاسوس عورتیں مختلف گاڑیوں میں تھیں۔ انہیں جس پر شبہ ہو رہا تھا۔ اس کے تعاقب میں وہ اپنی گاڑیاں دوڑا رہی تھیں۔

مرینہ کبھی پیچھے گھوم کر دیکھتی کبھی دائیں بائیں کھڑکیوں کے پار نظریں دوڑاتی تھی۔ وہ قدآور موٹر سائیکل والا فاصلہ رکھ کر پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا۔

اسے شبہ ہوا کہ تعاقب کرنے والی گاڑیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ اس نے مراد سے کہا۔ "ابھی ہوٹل کی طرف نہ جاؤ۔ ایسے راستوں پر چلو' جہاں کم سے کم ٹریفک ہوتا ہے۔"

مراد راستہ بدل کر جانے لگا۔ ایسے وقت چیپت راؤ نے مرینہ کو فون پر مخاطب کیا۔ اس سے بولا۔ "میں چیپت راؤ بول رہا ہوں' کیا تم دہلی پہنچ گئی ہو؟"

وہ بولی۔ "انجان نہ بنو چیپت راؤ۔ ! تم یہاں موجود ہو اور مجھے دیکھ رہے ہو۔"

"یہ تمہارا غلط اندازہ ہے۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ مراد کے ساتھ کولکتہ میں ہوں۔ تم دہلی بونے مراد کو دیکھنے آئی ہو۔ اس سلسلے میں ہم خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں۔"

"یہ کیا بکواس ہے؟ وہ بونا خود کو مراد کہہ رہا ہے۔ میرے اندر کی ایسی باتیں بتا رہا ہے جسے صرف مراد جانتا ہے۔ اگر مراد کولکتہ میں ہے تو وہ بونا دہلی میں خود کو مراد کیوں کہہ رہا ہے؟ کیسے میرے اندر کی باتیں جانتا ہے؟"

"تم آ ہی گئی ہو۔ اس بونے سے ملاقات ہو جائے تو اس سے ضرور معلوم کرنا کہ قد چھوٹا کیسے ہو گیا ہے؟ اور وہ تمہارے اندر کی خفیہ باتیں کیسے جانتا ہے؟"

”اگر وہ بونا مراد ثابت ہوگا تو میں اسے کسی کیڑے کی طرح پیروں میں مسل دوں گی۔“

اس نے فون بند کر دیا۔ مراد ڈرائیو کرتا ہوا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”میڈم! دو دنوں سے ہمارے دیس میں بونے مراد کی بہت دھوم مچی ہے۔ کیا آپ اسی بونے سے ملنے آئی ہیں؟“

وہ الجھی ہوئی تھی۔ سخت لہجے میں بولی۔ ”گاڑی چلاؤ اور اپنے کام سے کام رکھو۔“

اس کے فون سے پھر رِنگ ٹون ابھرنے لگی۔ اس نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔ ڈینجرس ریکٹ کے ڈی بلیک نے کہا۔ ”مرینہ! مجھے ایک ایک پل کی رپورٹ مل رہی ہے۔ اس وقت کئی گاڑیاں تمہاری گاڑی کے تعاقب میں ہیں۔ میں پھر سمجھاتا ہوں۔ ففٹی ففٹی پر راضی ہوجاؤ۔ تم جہاں بھی مراد سے ملنے جارہی ہو، میرے آدمی تمہیں سکیورٹی دیتے ہوئے وہاں تک پہنچا دیں گے۔“

وہ بولی۔ ”میں مراد سے ملنے نہیں جارہی ہوں۔ تم اپنے آدمیوں کی لاشیں گننے کا انتظار کرو۔“

اس نے فون بند کر کے غلاف کے اندر سے گٹار کو نکالا۔ مراد عقب نما آئینے میں دیکھ رہا تھا۔ اس نے گٹار کے اندر سے ایک پستول نکال کر جینز کی کمر ڈھیلی کی پھر اندر ہاتھ ڈال کر پستول کو اپنی جانگھ سے لگے ہوئے بیلٹ میں اٹکا دیا۔ پھر ایک شاٹ گن نکال کر اسے لوڈ کرنے لگی۔

مراد نے سہم کر کہا۔ ”یہ... یہ کیا کر رہی ہو؟ یہ تو بندوق ہے۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ کیا مجھے.....“

وہ ڈانٹ کر بولی۔ ”یو شٹ اپ نان سنس۔ میں تمہیں کیوں ماروں گی؟ تم گاڑی چلا رہے ہو اور آئینے میں مجھے دیکھ رہے ہو؟ فوراً آئینے کا رُخ بدلو اور سامنے دیکھتے رہو۔ اور خبردار! میرے معاملے میں بالکل خاموش رہو۔“

”میں کیسے خاموش رہوں؟ میں بہت دیر سے سمجھ رہا ہوں کہ آپ کوئی گڑبڑ والی میڈم ہیں۔ کتنی ہی گاڑیاں ہمارے پیچھے لگ گئی ہیں اور آپ نے بندوق نکال لی ہے۔“

وہ پھر سخت لہجے میں بولی۔ ”تم چپ رہو گے یا نہیں؟“

اسی وقت فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ مرینہ نے فوراً گھوم کر دیکھا۔ اس سڑک پر گاڑیاں کم تھیں۔ ایک کار دوسری کار پر تڑاتڑ فائر کرتے ہوئے فراٹے بھرتے ہوئے بائیں طرف جانے والی سڑک پر مڑ کر بھاگی جارہی تھی۔

ورشا نے ریفلڈ کار پر گولیاں چلائی تھیں۔ اس کار کا پہیہ برسٹ ہوا تھا۔ ایک گولی سفاری سوٹ والے کو زخمی کر چکی تھی۔

اب سفارت خانے کی گاڑی ورشا کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ مرینہ کے ساتھ آنے والے جاسوس اس گاڑی میں تھے۔ وہ کھڑکیوں سے ہاتھ نکال کر ورشا کی گاڑی کو نشانہ بنا رہے تھے۔

ایسے وقت جگنی بائی اور جاسوس عورتوں کی گاڑیاں فائر کرتی ہوئی آگئیں۔ ان کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہونے لگا۔ گھگھرے والیاں دو گاڑیوں میں تھیں، دو اطراف سے گھیر رہی تھیں۔ پھر جگنی بائی نے ایک دستی بم پھینکا تو وہ کھڑکی کے راستے گاڑی کے اندر پہنچ گیا۔

پھر اس سے پہلے کہ اس بم کو واپس باہر پھینکا جاتا۔ ایک زبردست دھماکا ہوا۔ اس گاڑی کے پرخچے اُڑ گئے۔ گھاگھرے والیاں دور رک گئی تھیں۔ پھر وہ گاڑیوں کو موڑ کر واپس جانے لگیں۔

مرینہ ان سے بہت دور دوسری سڑک پر تھی۔ اس کے ساتھ آنے والے ایک جاسوس نے فون پر کہا۔ ”مرینہ! سوسیڈ۔ سفارت خانے کی گاڑی تباہ ہوگئی ہے۔ ہمارے دو ساتھی مارے گئے ہیں۔ جیری کی کار کو بھی ناکارہ بنا دیا گیا ہے۔ ایک لڑکی اس پر بھی فائر کرتی ہوئی گئی تھی۔ پتا نہیں جیری زندہ بھی ہے یا نہیں؟“

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”ہم خسارے میں پڑ گئے ہیں۔ تم محتاط رہو۔ یہ معلوم کرو کہ کن لوگوں نے ہمیں نقصان پہنچایا ہے۔“

”وہ ساری کی ساری عورتیں ہیں۔ پتا نہیں یہ عورتیں کس تنظیم سے تعلق رکھتی ہیں۔“

وہ بولی۔ ”تعجب ہے ہم نے پہلے کبھی سنا نہیں کہ عورتیں اتنی زیادہ تعداد میں کسی سنڈیکیٹ یا ریکٹ کے لیے کام کرتی ہیں۔ وہ بھی انڈیا میں؟“

”مرینہ! اب تک مراد کہیں نظر نہیں آرہا ہے اور دوسرے دشمن ہمیں نقصان پہنچا رہے ہیں۔“

اسی لمحے تڑاتڑ فائرنگ کی آواز آئی۔ دو گولیاں ٹیکسی کی باڈی سے ٹکرا کر گزر گئیں۔ مرینہ فون کو ایک طرف پھینکتے ہوئے جھک گئی۔ شاٹ گن کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

مراد نے سیٹ کے نیچے کھسکتے ہوئے ٹیکسی کو سڑک کے کنارے روک دیا۔ وہ چیخ کر بولی۔ ”یو ایڈیٹ! تم نے گاڑی کیوں روکی ہے۔ وہ ہمیں گھیر لیں گے۔“

وہ بولا۔ ”میں مرنے کے لیے گاڑی نہیں چلاؤں گا۔“

مراد نے دیکھ لیا تھا۔ ٹینا اور ڈولی کی گاڑیاں سروس روڈ پر تھیں اور وہ دشمنوں کی طرف فائر کر رہی تھیں۔ دشمن اپنی گاڑیوں سے نکل کر فائر کرتے ہوئے دور جا رہے تھے۔ وہ ٹینا اور ڈولی کو اپنا حامی پا کر مراد کی ٹیکسی سے نکل آئی تھی، اسے انجانی حمایت اور حوصلہ مل رہا تھا۔ وہ بھاگنے والوں پر فائر کرنے لگی۔

ایسے وقت کمانڈر اپلٹن کی دو گاڑیاں اور آ گئی تھیں۔ چاروں طرف سے فائرنگ کے نتیجے میں وہ سب کے سب مارے گئے۔ ٹینا نے مرینہ کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ ''اے جاؤ۔ بھاگو یہاں سے۔ ابھی اور دشمن ہیں۔ وہ دیکھو اُدھر تمہارا کوئی درست ہے یا دشمن وہ دوسرے سروس روڈ پر جا رہا ہے۔''

مرینہ نے سر گھما کر دیکھا۔ ایک قد آور شخص ہیلمٹ پہنے موٹر سائیکل پر جا رہا تھا۔ وہ فوراً ہی ٹیکسی میں بیٹھتی ہوئی مراد سے بولی۔ ''گاڑی چلاؤ۔ وہ دیکھو..... سروس روڈ پر اس موٹر سائیکل والے کو جانے نہ دو۔ اسے پکڑو۔''

مراد نے ٹیکسی کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ ون وے ہے اور وہ دوسری طرف کے سروس روڈ پر ہے۔ آگے چوراہے پر اس کی طرف جا سکیں گے۔''

وہ سخت لہجے میں بولی۔ ''باتیں کم کرو۔ رفتار بڑھاؤ۔''

وہ بولا۔ ''آپ مجھے ڈانٹتی ہیں تو اچھا لگتا ہے۔ امی مرحومہ یاد آجاتی ہیں۔ کیا آپ اپنے بچوں کو اسی طرح ڈانٹتی ہیں؟''

''یو نان سنس! کیا میں بچوں والی لگتی ہوں۔ ابھی میری شادی نہیں ہوئی ہے۔''

''پلیز ایک بات بتا دیں۔ وہ موٹر سائیکل والا کون ہے؟ میں دو دنوں سے کبھی پورے مراد کا ذکر سن رہا ہوں۔ کبھی آدھے مراد کا۔ یہ کون ہے؟''

''یہ پورا ہے۔ اسپیڈ اور بڑھاؤ۔''

پھر وہ چونک کر بولی۔ ''ارے وہ دیکھو۔ وہ اُدھر گلی میں مڑ گیا ہے۔ اسے نظروں سے اوجھل نہ ہونے دو۔ اسے پکڑو۔''

''کیسے پکڑوں؟ کیا ٹیکسی کو ہوا میں اڑا کر لے جاؤں؟''

وہ بری طرح مضطرب ہو کر کھڑکی سے باہر سر نکال کر دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک گلی میں مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

مراد ایک یوٹرن کے کٹ پر آ کر ٹیکسی کو ادھر لے جانے لگا۔ اس گلی میں مڑ کر آگے بڑھتا چلا گیا۔ یہ سب اس کی پلاننگ کے مطابق ہو رہا تھا۔ گلی کے دوسرے سرے پر جگنی بائی کے فارم ہاؤس کی حد شروع ہو گئی تھی۔

وہ احاطے کی دیوار کے ساتھ ٹیکسی ڈرائیو کرتا ہوا ایک بڑے آہنی گیٹ کے پاس آیا۔ وہ گیٹ کھلا ہوا تھا اور اندر وہی موٹر سائیکل دکھائی دے رہی تھی۔

وہ فوراً ہی ٹیکسی سے باہر آتے ہوئے بولی۔ ''یہ اس کی گاڑی ہے۔ وہ یہاں آیا ہے۔''

اس نے گیٹ کے اندر آ کر دیکھا۔ وہاں دور تک ویرانی تھی۔ فارم ہاؤس کا کوئی ملازم بھی نہیں تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک خوبصورت سا رہائشی بنگلا تھا۔ اس بنگلے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

وہ تیزی سے چلتی ہوئی بنگلے کے برآمدے میں آئی پھر اس نے آواز دی۔ ''یہاں کوئی ہے؟''

اسے جواب نہیں ملا۔ وہ شاٹ گن کو مضبوطی سے تھام کر کھلے ہوئے دروازے پر آئی۔ کمرا خالی تھا۔ اس نے پھر آواز دی۔ ''مراد! میں جانتی ہوں۔ تم یہاں ہو۔ یہ آنکھ مچولی بند کرو۔ دیکھو میں آئی ہوں۔ دروازے پر آ جاؤ۔''

وہ آ گیا۔ دروازہ کھلا تو وہاں بونا مراد کھڑا ہوا تھا۔ وہ گھور کر بولی۔ ''مراد کہاں ہے؟''

وہ کمرے میں واپس جاتے ہوئے بولا۔ ''میں ہوں مراد۔ میں ائرپورٹ سے یہاں تک لاشیں گراتا اور خون کی ندیاں بہاتا آیا ہوں پھر بھی تم پہچان نہیں رہی ہو۔''

وہ اس کے سامنے ایک طرف سے دوسری طرف جاتے ہوئے بولا۔ ''تازہ ترین اطلاع کے مطابق ریڈ الرٹ کے پانچ اور ڈینجرس ریکٹ کے چار جیالے مارے جا چکے ہیں۔ تمہارے ساتھ آنے والے تین جاسوس بھی جہنم میں پہنچ گئے ہیں۔

''ایسا کب تک ہوتا رہے گا؟ خدا جانتا ہے میں اپنی ماروں تک پہنچنے کے لیے کب تک آگ اور لہو سے کھیلتا رہوں گا۔''

وہ گرجنے کے انداز میں بولی۔ ''زیادہ نہ بولو۔ مجھے فوراً بتاؤ مراد کہاں ہے؟''

''تمہارے سامنے ہے۔ تمہیں یقین دلانے کا ایک ہی راستہ رہ گیا ہے۔''

وہ پھر ٹہلنے کے انداز میں اِدھر سے اُدھر جاتے ہوئے بولا۔ ''لندن میں تمہارا سروس ریکارڈ کہتا ہے کہ تم ناقابلِ شکست اور ناقابلِ تسخیر ہو۔ اس زمین پر صرف ایک مراد ہی ہے جو تمہاری ہڈیاں اور پسلیاں نچوڑ کر رکھ دیتا ہے۔''

وہ اس کے سامنے پینترا بدلتے ہوئے بولا۔ ''تو پھر آؤ۔ ابھی تمہاری ہڈیاں توڑ کر ثابت کروں گا کہ میں ہی مراد

علی منگی ہوں۔''

وہ شاٹ گن سے اس کا نشانہ لیتے ہوئے بولی۔''میں ایک بونے سے مقابلہ کر کے اپنی انسلٹ نہیں کروں گی۔ تجھے گولی مار کر یہاں مراد کو ڈھونڈ نکالوں گی۔''

کبڈی اپنی عادت کے مطابق دونوں پنجوں پر اچھلتے ہوئے جوگنگ کرتے ہوئے بولا۔

''ہاؤ ہُو۔ ہاؤ ہُو
کہاں کا میں اور کہاں کی تُو
چل ہوجا چھو منتر چھو چھو چھو۔''

وہ فضا میں اچھل کر قلابازی کھاتے ہوئے اس کے دائیں سے بائیں گیا پھر قلابازیاں کھاتا ہوا بائیں سے دائیں آیا۔ مرینہ کی نظریں ایک جگہ ٹھہر نہیں رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ادھر سے ادھر بھٹک رہی تھیں۔

پھر اس کے حلق سے اچانک ہی کراہ نکلی۔ کبڈی نے فضا میں چھلانگ لگاتے ہوئے اس کے ہاتھوں پر کک ماری تھی۔ جیسے پتھر آ کر لگا ہو۔ اس کے ہاتھ سے گن چھوٹ کر دور فرش پر گئی۔ وہ قلابازیاں کھاتا ہوا گن کو اٹھاتا ہوا اس کے روبرو کھڑا ہو گیا۔ اب وہ نشانے پر تھی۔

یہ مرینہ کے لیے لمحہ فکریہ تھا۔ اس کی توقع کے خلاف بونا خود کو قد آور مراد ثابت کر رہا تھا۔

اس نے کیا عجب تماشا دکھایا تھا۔ پلک جھپکتے ہی اس کی گن اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ اس نے ایسی کک ماری تھی کہ اب تک ہاتھوں میں تکلیف محسوس ہو رہی تھی پھر بھی یقین نہیں ہو رہا تھا کہ وہ جس سے ہمیشہ شکست کھاتی آئی ہے، وہی مراد سامنے کھڑا ہے۔

وہ حیرانی سے بولی۔''فار گاڈ سیک۔ سچ بولو تم۔ کون ہو؟''

اس نے کہا۔''پہلے مراد علی منگی تھا۔ اب اپنا نام عبداللہ کبڈی رکھ لیا ہے۔ دشمنوں سے چھپنے کے لیے صورت بھی بدل دی۔ نام بھی بدل چکا ہوں۔'' وہ ایک صوفے سے ٹیک لگا کر بولا۔''ہائے مرینہ! دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیا ہو جاتا ہے؟ جو چھٹانک بھر کا نظر آتا ہے، وہ پل بھر میں سوا سیر ہو جاتا ہے۔'' وہ گن کو خالی کرتے ہوئے بولا۔''تم مجھے مراد تسلیم نہ کرو۔ میں نے تو تمہارے ساتھ راتیں کالی کی ہیں، میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔ یہ جانتا ہوں کہ جینز کے اندر ایک پستول ہے۔ وہ ایک بیلٹ کے ذریعے تمہاری جانگھ سے بندھا ہوا ہے۔ تم میدان میں اترنے سے پہلے اسی طرح تیار ہو کر آتی ہو۔''

وہ اسے گھور کر دیکھ رہی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ کمبخت اندر تک پہنچا ہوا ہے۔ پستول نکالنے نہیں دے گا۔ پھر کوئی بازی گری دکھائے گا، بہت ہی پھرتیلا ہے۔ ویسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اس نے گن خالی کر دی تھی۔

وہ بولی۔''ہاں میں نے پستول چھپائی ہے۔ اسے نکال رہی ہوں۔ مچھر کی اولاد! کیا مجھے روک سکے گا؟''

اس نے اپنی جینز کی کمر ڈھیلی کی۔ وہ پنجوں کے بل اچھلنے لگا۔ اس نے اپنا ہاتھ جینز کے اندر پہنچایا۔ وہ جوگنگ کرتے ہوئے بولا۔

''ہاؤ ہُو۔ ہاؤ ہُو۔ کہاں کی گن اور کہاں کی تُو
چل ہوجا چھو منتر۔ چھو چھو چھو۔''

وہ فضا میں اچھلتا ہوا قلابازی کھاتا ہوا اس کے سر کے اوپر سے گزرتا ہوا پیچھے گیا۔ مرینہ نے فوراً ہی پیچھے پلٹ کر دیکھا وہ پستول کو نکال نہیں پائی تھی۔ پہلے اس کے حملے سے بچنا چاہتی تھی۔

وہ پیچھے جا کر ایک صوفے پر کھڑا ہوا تھا پھر وہاں سے اچھل کر اس نے قلابازی کھائی اور اس کے شانوں پر آ کر بیٹھ گیا۔ وہ اسے آسانی سے گرا سکتی تھی لیکن اچانک ہی اس کی سانسیں رکنے لگیں۔ کبڈی نے گردن کے اطراف دونوں ٹانگوں کو پھندے کی طرح کس دیا تھا۔

وہ کبڈی کی دونوں رانوں کے درمیان ہاتھ ڈال کر پھندے کو ڈھیلا کرنے کی کوشش کرنے لگی، لیکن وہ تو جیسے آہنی شکنجہ تھا۔ کھل نہیں رہا تھا اور اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ ہار ماننے والی نہیں تھی۔ یکبارگی پیچھے کی طرف دوڑتے ہوئے دیوار سے ٹکرائی تو کبڈی کے حلق سے کراہ نکلی۔ وہ بھی ٹکرایا تھا۔ شکنجہ کھلتے ہی وہ شیرنی بن گئی۔

اس نے دونوں ٹانگوں کو پکڑ کر آگے کی طرف جھٹکا دیا تو وہ فرش پر آ کر اوندھے منہ گرا۔ دن میں تارے نظر آنے لگے۔ آخر وہ بھی تربیت یافتہ فائٹر تھی۔ اب تک کسی نے اسے زیر نہیں کیا تھا پھر ایک بونے کی کیا بساط تھی؟

وہ اس کے پاس آئی پھر ایک زور کی ٹھوکر مارنا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے ہی وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ٹھوکر خالی جانے کے باعث وہ ایک طرف گھوم گئی۔ اسی لمحے کبڈی نے اس کی ٹانگ پر ٹانگ ماری تو اس کے قدم فرش پر سے اکھڑ گئے۔ وہ چاروں شانے چت ہوئی لیکن کمال پھرتی سے گھوم کر ایک ہاتھ کے بل اٹھ کر اس کے منہ پر ایک کک ماری، وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے جا کر گرتے گرتے سنبھل گیا۔ دونوں ہی پھرتیلے اور تیز رفتار تھے۔ ذرا بھی رک کر مقابل کو سنبھلنے کا موقع نہیں دے رہے تھے۔

اس وقت کہا نہیں جاسکتا تھا کہ کون کس پر حاوی ہوگا۔ قد اور جسامت کے لحاظ سے مرینہ بھاری کم تھی۔ کبڈی اپنی مہارت کے باعث اس کے مقابلے پر ٹھہرا ہوا تھا۔ اسی وقت مراد دروازہ کھول کر کمرے میں آیا۔ اس نے کبڈی کے شانے کو تھپک کر کہا۔ ”بہت ہو چکا تم جاؤ۔ مجھے اپنا کام کرنے دو۔“

مرینہ اس ٹیکسی ڈرائیور کو گھور کر سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ کبڈی وہاں سے چلا گیا۔ مرینہ نے پوچھا۔ ”تم ایک دوسرے کو جانتے ہو؟“

وہ بولا۔ ”اس کی بات چھوڑو۔ یہاں ہم تم ہیں اور ہم بھی ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔“

اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ ”کون ہو تم؟“

وہ مسکرا کر بولا۔ ”ائرپورٹ سے یہاں تک میری .. ہم سفر رہی ہو۔ مجھ سے باتیں کرتی رہی ہو۔ پھر بھی پہچان نہ سکیں۔“

وہ اپنے اصل لب و لہجے میں بولا۔ ”مراد علی منگی کو نہیں پہچانو گی تو اس کے سر کا سودا کیسے کرو گی؟“

وہ ایک دم سے تڑپ کر اس کے قریب آکر اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تم مراد ہو۔ میرے مراد ہو۔“

وہ اس کے چہرے کو ادھر ادھر سے چھو کر بولی۔ ”تم چہرہ بدل چکے ہو۔ بائی گاڈ! جب میں تمہیں پہچان نہ سکی تو کوئی دشمن تمہیں نہیں پہچان سکے گا۔“

وہ اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر ٹھوڑی کے نچلے حصے پر اپنا منہ رگڑتے ہوئے بولی۔ ”ہاں یہ تم ہی ہو۔ تمہارے پسینے کی مہک کہہ رہی ہے کہ تم میری راتوں کے ہم سفر رہے ہو۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”میں نے سنا ہے، تم میرے بچے کی ماں بننے کے لیے باؤلی ہو رہی ہو۔“

”ہاں میرے باؤلے پن کا یہ کھلا ثبوت ہے۔ میں پھر تمہارے ساتھ وقت بتانے کے لیے آفس سے چھٹی لے کر سات سمندر پار سے آئی ہوں۔“

”مجھے یقین ہے۔ اتنی محبت کوئی نہیں کرے گا، جتنی تم کرتی ہو۔ میرے ساتھ مستیاں کرنے کے لیے پچاس لاکھ کی خطیر رقم کو بھی ایک طرف رکھ دیا ہے۔ وہ رقم کہیں نہیں جائے گی۔ جب میرے بچے کی ماں بننے کے آثار پیدا ہوں گے۔ تب میرے سر پر رکھی ہوئی رقم وصول کر لو گی۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کیا میں تمہارے سر کا سودا کروں گی..... ہرگز نہیں۔ کسی کو کرنے بھی نہیں دوں گی۔“

”تو پھر اپنے ڈپارٹمنٹ کے چار شوٹرز اور سرافر ساتوں کو ساتھ لے کر کیوں آئی تھیں؟“

”میں انہیں ساتھ نہیں لائی تھی۔ وہ اپنی روٹین کے مطابق ڈیوٹی کرنے آئے ہیں۔“

”ڈیوٹی یہی ہے کہ مجھے زندہ یا مردہ، کسی بھی حالت میں ریڈ الرٹ کے حوالے کیا جائے گا۔“

”تم مجھ پر شبہ کیوں کر رہے ہو؟“

اس نے پوچھا۔ ”یاد ہے، جب ہم دُرگا پرساد کی کوٹھی میں چھپے ہوئے تھے۔ وہاں تم نے اپنے ڈائریکٹر جنرل سے فون پر باتیں کی تھیں پھر انگریزی بولتے بولتے اچانک ہی فرنچ بھاشا بولنے لگی تھیں، کیا مجھے بتاؤ گی کہ فرانسیسی زبان میں کیا بول رہی تھیں اور مجھے کس طرح الو بنا رہی تھیں؟“

”میں تمہیں کیوں الو بناؤں گی؟ میری سمجھ میں نہیں آتا کیوں مجھ پر شبہ کر رہے ہو؟“

وہ اس سے لگی ہوئی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ ”سچ بولو گی تو یہاں سے زندہ جا سکو گی۔“

مرینہ پریشان ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ یہ سمجھ رہی تھی کہ فرانسیسی زبان کا ترجمہ اسے معلوم ہو گیا ہے لیکن مراد کو کون ترجمہ سنائے گا؟

وہ بولی۔ ”کسی نے میرے خلاف تمہیں بھڑکایا ہے۔“

مراد نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر مارا۔ وہ ایک قدم پیچھے چلی گئی، جھنجلا کر بولی۔ ”میں جھوٹا الزام اٹھانے اور مار کھانے نہیں آئی ہوں۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا جانتی ہوں۔ پیز مراد! میرے پیار کو میری وفاؤں کو سمجھو۔ مرینہ.. جیسی جان دینے والی عورت کبھی تمہیں نہیں ملے گی۔ میری قدر کرو۔“

”تمہیں ایک نہیں کئی بار آزما چکا ہوں۔ تم فطرتاً ناگن ہو۔ ڈسنے سے باز نہیں آتی ہو۔“

یہ کہہ کر اس نے پھر ایک ہاتھ مارنا چاہا۔ مرینہ نے اس حملے کو روک دیا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے حملہ کیا۔ وہ بچ گئی پیچھے ہٹ کر بولی۔ ”کیا تمہیں اپنی طاقت پر گھمنڈ ہے؟“ وہ پینترا بدلنے کے انداز میں بولی۔ ”اس لیے مغرور ہو کہ دشمنوں کو مارتے آئے ہو۔ ان کے حملوں سے بچتے رہے ہو اور......“ اس نے بات ادھوری چھوڑ کر اچانک ہی اچھل کر ایک کک ماری۔ وہ لات اس کے سینے پر لگی۔ وہ زمین پر گڑی ہوئی بھاری چٹان کی طرح تھا۔ ایک ذرا سا ڈگمگا کر پھر تن کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ادھوری بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”اور میں بھی کئی بار تم سے مات کھا چکی ہوں۔ آخری بار تم پر حاوی ہو گئی تھی۔ تمہیں زخمی اور

بے دست و پا کر کے اپنا غلام بنا لیا تھا۔" وہ اس کے سامنے دائیں سے بائیں جاتے ہوئے بولی۔ "اگر مرد کے بچے ہو اور تنہا مجھے زیر کرنے آئے ہو تو ابھی دیکھ لوگے۔ تمہیں اپاہج بنا کر یہاں سے لے جاؤں گی۔"

اس نے کہا۔ "میں تنہا تمہیں زیر کروں گا۔ یہاں کوئی ہمارے درمیان نہیں آئے گا۔"

وہ جدھر جا رہی تھی۔ وہ ادھر گھوم کر اسے دیکھتا جا رہا تھا۔ اچانک ہی مرینہ نے فرش پر گرتے ہی اس کی ٹانگ پر ٹانگ ماری۔ اس کے پاؤں فرش پر سے اکھڑ گئے۔ وہ اچھل کر اس کے قریب ہی چاروں شانے چت ہو گیا۔

پھر دونوں ہی بڑی پھرتی سے اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ وہ اس کے مقابلے میں ہلکی پھلکی سی تھی۔ اس سے چند سیکنڈ پہلے اٹھتے ہی اس کے منہ پر کک ماری۔ منہ دوسری طرف گھوم گیا پھر دوسری کک اس کے پاؤں پر لگی تو وہ سنبھل نہ سکا۔ دوسری بار زمیں بوس ہو گیا۔

وہ بے شک بہت ہی تربیت یافتہ تھی۔ ہتھیاروں کے بغیر لڑنے کی تکنیک جانتی تھی لیکن ایک قباحت تھی۔ عورت ہونے کے باعث پتھریلی ادا۔ وہ فولاد تھا۔

مرینہ کے حملے اسے بار بار گرا رہے تھے اور چوٹ پہنچا رہے تھے لیکن وہ چوٹیں بے اثر ہو رہی تھیں۔ اس کے کئی کامیاب حملوں کے بعد مراد کا ایک گھونسا منہ پر پڑا تو وہ چکرا کر رہ گئی۔ آنکھوں کے سامنے لمحاتی اندھیرا چھا گیا۔ وہ فوراً ہی پیچھے دیوار سے لگ کر سنبھل گئی تھی سنبھلنے کے بعد فوراً ہی حملہ نہ کر سکی۔ مراد نے اس کا موقع نہیں دیا۔ اس کے پیٹ پر ایک زور کی لات ماری۔ اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ وہ تکلیف کی شدت سے پیٹ پکڑ کر جھکنے لگی۔ اس نے تکلیف سے کراہتے ہوئے فرش پر گھٹنے ٹیک دیے۔ مراد نے اس کے جھکے ہوئے چہرے پر ایک زور کی ٹھوکر ماری پھر کہا۔ "سو سنار کی، ایک لوہار کی۔ اب اٹھو اور حملے کرو۔"

وہ ٹھوکر کھا کر فرش پر گر کر تڑپ رہی تھی۔ ناک سے اور باچھوں سے لہو رس رہا تھا۔ پیٹ کی تکلیف الگ تڑپا رہی تھی۔ اب وہ اسے ڈھیل دینا نہیں چاہتا تھا۔ اسے وہاں سے اٹھنے اور کچھ بولنے کے قابل نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اس نے پھر اس کے منہ پر ٹھوکر ماری تو وہ چیخیں مارتی ہوئی ماہیٔ بے آب کی طرح پھڑپھڑانے لگی۔

اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے کراہتے ہوئے ادھر سے ادھر فرش پر لوٹتے ہوئے بولی۔ "آہ

شہ پارہ

ہماری گلی میں ایک فقیر آتا ہے، وہ صدا دیتا ہے ہر چند منٹ کے بعد اس کی صدا گلی میں گونجتی ہے۔

"میری باری کیوں اتنی دیر کر دی۔"

اس کی صدا سن کر مجھے غصہ آتا ہے۔ میرے اندر کی بھٹیارن چڑ چڑ، دانے بھونتی ہے۔ ایک روز میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے دوڑ کر فقیر کو پکڑ لیا۔

"یہ تو کیا کر رہا ہے بابے؟" میں نے غصے سے پوچھا۔

"صدا دے رہا ہوں بابو جی۔" وہ بولا۔

"کیا مطلب ہے تیرا اس صدا سے؟" میں نے اسے ڈانٹا۔

"میں منگتا ہوں، مانگ رہا ہوں۔" فقیر بولا۔

"کیا ایسے مانگا کرتے ہیں؟ احمق پہلے مانگنا سیکھ۔ جو مانگنا ہے منت کر کے مانگ۔ ترلے کر دینے والے کا ادب کر، احترام کر تو، تو اس کے خلاف شکایت کر رہا ہے کہ میری باری کیوں اتنی دیر کر دی۔ بے وقوف دینے والے کی مرضی ہے، چاہے جلدی دے چاہے دیر سے دے۔ چاہے کم دے، چاہے زیادہ دے، چاہے دے چاہے نہ دے۔"

فقیر بولا۔ "جا بابو جی! اپنا کام کر۔ مانگنے والا جانے اور دینے والا جانے۔ تو ما ما لگتا ہے کیا؟ میں نے ساری زندگی یہی صدا دی ہے۔ اس نے کبھی مجھے ٹوکا نہیں، کبھی غصہ نہیں کیا، الٹا وہ مجھے دیتا رہا ہے، دیتا رہا ہے۔"

مفتی ممتاز کا حسین شہ پارہ

کالج میں رزلٹ کا دن تھا، ایک دوست دوسرے سے یار میرے ابو میرے ساتھ کھڑے ہیں، تو جا اور جلدی سے میرا رزلٹ دیکھ کر آ، اگر میں ایک پیپر میں فیل ہوا تو کہنا ایک مسلمان بھائی تم کو سلام کہتا ہے اور اگر 2 میں فیل ہوا تو کہنا 2 مسلمان بھائی سلام کہتے ہیں۔

دوست گیا اور واپس آ کے بولا۔ "یار پوری امت مسلمہ تجھے سلام کہہ رہی ہے۔"

مرسلہ: رضوان تنولی کریڑوی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

بس۔ بس کرو مراد...... میں مر جاؤں گی۔''

وہ ایک بار نہیں کئی بار اس پر رحم کھا چکا تھا۔ اسے گولی نہیں ماری تھی۔ صرف سزائیں دی تھیں۔ اس بار وہ رحم سے خالی ہو گیا تھا۔ اس نے پھر ایک زور کی لات اس کے پیٹ پر ماری۔ وہ تکلیف نا قابل برداشت تھی۔ اس کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی۔ وہ کچھ بولنے اور کراہنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اس کا جسم ہولے ہولے جھٹکے کھا رہا تھا۔ پھر اس پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ مراد نے فون نکال کر ڈاکٹر ممی سن کو مخاطب کیا۔ ''ڈیڈ! آجائیں۔ یہ بے ہوش ہو گئی ہے۔ آپ کے آنے تک ہوش میں آجائے گی۔''

اس نے رابطہ ختم کر کے مرینہ کو دیکھا۔ وہ فرش پر اپنے آپ سے غافل پڑی تھی۔ انسان جس زمین پر زیادہ اچھلتا ہے اسی زمین پر زندگی سے خالی ہو کر سو جاتا ہے۔ وہ اس کے سامنے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ بے چاری.... اسے بے حس و حرکت دیکھ کر بہت افسوس ہو رہا تھا۔ پھر وہ صوفے پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ مرینہ ہوش میں آرہی تھی۔ اس کے منہ سے ہائے کے انداز میں ایک لمبی سانس نکلی۔ اس کے قریب آکر اس پر جھک گیا۔ وہ بول رہی تھی۔ ''مو۔ مجھے۔ نن۔ نا۔ مارو......'' وہ ذرا چپ ہو کر لمبی سانس لے کر بولی۔ ''جو پونجی..... ساری دنیا سے .... چھپا کر رکھی تھی وہ...... وہ تمہیں دیتی رہی۔'' وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولی۔ ''ہائے۔ ہائے مراد....! اس پونجی کے صدقے معاف کر دو......''

اس نے ہمدردی سے اس پر ہاتھ رکھا۔ بے شک اس نے اپنی آبرو کا سرمایہ اس پر لٹایا تھا۔ وہ محبت کے قابل تھی لیکن پچاس لاکھ ڈالرز بھی حاصل کرنا چاہتی تھی۔ یوں اس نے پیار کرنے والے کی نفرتیں مول لی تھیں۔

وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔ ''پھر ایک بار تمہیں زندہ چھوڑوں گا لیکن سزا ضرور دوں گا۔ اب جو سزا ملے گی وہ بہت ہی عبرتناک ہوگی۔ پھر شاید تم راہ راست پر آجاؤ گی۔ میں تمہارا سرمایہ لوٹ کر تم سے اتنی ہی ہمدردی کر سکتا ہوں۔''

ڈاکٹر ممی سن آگیا۔ مراد نے مرینہ کو بازوؤں میں اٹھا کر ایک بیڈ پر لا کر لٹا دیا۔ وہ آنکھیں کھولے دیکھ رہی تھی لیکن کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔ اسے یاد نہیں تھا کہ وہ تھوڑی دیر پہلے نیم بے ہوشی کی حالت میں کیا بولتی رہی تھی۔ اب وہ مراد کو چپ چاپ رحم طلب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

ڈاکٹر ممی سن دوا سے بھری ہوئی ایک سرنج لے آیا۔ اس کے بازو پر جھکتے ہوئے بولا۔ ''ڈونٹ وری ابھی تمہیں آرام آجائے گا۔''

انجکشن کی سوئی بازو میں پیوست ہوتے ہی مرینہ کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ''اب آنکھیں کھولے گی تو ایک نئی مرینہ ہوگی۔ اس کی نئی زندگی پاگل خانے سے شروع ہوگی۔''

☆☆☆

سمیرا کا بہت برا حال تھا۔ ماروی کو بھولے ہوئے آٹھ مہینے یاد آگئے تھے۔ وہ واردات بھی یاد آگئی تھی جو غازی بابا کے دربار میں ہوئی تھی۔ یہ انکشاف ہونے والا تھا کہ سمیرا نے اسے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔

اب سمیرا کی گھبراہٹ کا یہ عالم تھا کہ چلتی تو لڑکھڑانے لگتی تھی جیسے پیروں تلے سے زمین نکل رہی ہو۔ بھوک اڑ گئی تھی۔ پانی بھی حلق سے نہیں اتر رہا تھا۔ اس نے طبیعت خراب ہونے کا بہانہ کیا اور دفتر سے بھاگ کر گھر آگئی۔ اسے محبوب کے فون کا انتظار تھا۔ وہ فون پر گالیاں سننے کی منتظر تھی۔

وہ دل میں کہہ رہی تھی۔ ''مجھے بڑی سے بڑی اذیت ناک سزا ملے۔ لیکن محبوب کی نفرت نہ ملے۔ میں برداشت نہیں کر سکوں گی۔ ایک کمزور امید کے سہارے جی رہی ہوں کہ کبھی نہ کبھی دن ان کی دلہن بنوں گی۔ اگر محبوب نفرت کرنے لگیں گے تو امید دم توڑ دے گی۔ میرا بھی دم نکل جائے گا۔''

یہ سوچ کر بھی پریشان ہو رہی تھی کہ محبوب آفس میں ڈاکٹر عدیلہ کے خلاف بول رہے تھے۔ بہت غصے میں تھے لیکن میرے خلاف کچھ نہیں کہہ رہے تھے۔

اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔ کیا ماروی نے محبوب کو آٹھ مہینوں کی تمام باتیں نہیں بتائی ہیں؟

کیا بعد میں خوب نمک مرچ لگا کر محبوب سے تنہائی میں بولنے والی ہے؟ وہ ہر روز اس کے ساتھ لنچ کرتے ہیں۔ ابھی اس کے ساتھ بیٹھے مزے سے بول رہے ہوں گے۔ جبکہ آفس سے غصہ دکھا کر گئے ہیں۔ اس کے ساتھ خوب چٹخارے لے کر کھا رہے ہوں گے۔ یہاں میرے حلق سے ایک دانہ نہیں اتر رہا ہے۔

او گاڈ! یہ ماروی کتنی خوش نصیب ہے۔ اس کے ایک نہیں دو عاشق ہیں۔ ایک دور ہو جاتا ہے تو اس کا غم بھلانے کے لیے دوسرا موجود رہتا ہے۔ اس پر کوئی مصیبت آتی ہے تو دونوں میں سے کوئی نہ کوئی اس کا باڈی گارڈ بن کر حفاظت کرنے چلا آتا ہے۔ وہ بڑی سے بڑی مصیبتوں سے گزرتی

آ رہی ہے لیکن اس پر ذرا بھی آنچ نہیں آ رہی ہے۔ بڑے آرام و سکون سے زندگی گزار رہی ہے اور میں یہاں عذاب میں مبتلا ہو گئی ہوں۔ اپنی غلطی کی سزا پا رہی ہوں۔

کیا ضرورت تھی اسے سیڑھیوں پر سے دھکا دینے کی۔ اب فکر و پریشانی اور خوف، دہرا اس کے دھکے کھا رہی ہوں۔ اب پچھتا رہی ہوں۔ نہ اس کی جان لینے کی کوشش کرتی۔ نہ ابھی......

وہ آگے کچھ سوچ نہ سکی۔ اگر محبوب کال کرتا، اسے گالیاں دیتا تو ایک ذرا تسلی ہوتی۔ وہ طرح طرح کی باتیں بنا کر اپنی صفائی میں بہت کچھ کہتی۔ اسے اپنی صفائی پیش کرنے کا اور الزام سے بچنے کا کچھ تو موقع ملتا۔

لیکن بات تو آدھے تیر کی طرح سینے میں ماروی نے اٹکا دی تھی۔ اگر بول دیتی تو تیر آر پار ہو جاتا پھر جو ہوتا دیکھا جاتا۔

ادھر معروف تجلی نے رحمان سے فون پر کہا۔ ''تم نے برسوں کی دوستی کا لحاظ نہیں کیا اور بیٹے کو بیٹی بنا کر ایک شریف گھرانے کی لڑکی کے علاج کے لیے بھیجتے رہے ہمیں اندھا بناتے رہے۔''

رحمان نے کہا۔ ''میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ میں بیٹے کو بیٹی یا بیٹی کو بیٹا بناؤں، یہ میرا پرسنل گھریلو معاملہ ہے۔ یہ مان لو کہ میں نادان نہیں ہوں۔ میں نے قانون کی گرفت میں آنے والی کوئی حرکت نہیں کی ہے۔''

''بھیس بدل کر شریف گھرانوں میں جانا جرم ہے۔''

وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''کس شریف گھرانے کی بات کر رہے ہو۔ میرا بیٹا جس ماروی کا علاج کرنے جاتا تھا۔ اس کا گھرانا کیا ہے؟ اس کا تو گھر ہی نہیں ہے۔ اسے تو محبوب علی چانڈیو نے اپنی داشتہ بنا کر ایک کوٹھی میں رہنے کو دی ہے۔''

''یو شٹ اپ رحمان! تمہیں کسی شریف زادی پر کیچڑ نہیں اچھالنا چاہیے۔''

''کیا ثابت کر سکتے ہو کہ وہ اس کوٹھی میں راتیں رنگین کیے بغیر اس کی داشتہ نہیں، اس کی بہن بن کر رہتی ہے؟''

''پلیز رحمان! وہ لڑکی بہت ہی نیک اور پاک دامن ہے۔ وہ اپنے منگیتر کا انتظار کر رہی ہے۔ اس کی منکوحہ بنتے ہی اس کوٹھی سے چلی جائے گی۔''

''اگر وہ نیک اور پاک دامن ہے تو تم نے اسے بیٹی بنا کر اپنے گھر میں کیوں نہیں رکھا؟ اسے کس رشتے سے محبوب کی کوٹھی میں چھوڑا ہوا ہے؟''

معروف اس بات کا معقول جواب نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے کہا۔ ''میں تمہیں فون پر نہیں سمجھا سکوں گا۔ تم اپنے بیٹے کی غلطیوں کو سدھارنے کے بجائے جارحانہ انداز اختیار کر رہے ہو۔''

رحمان نے کہا۔ ''دیگراں نصیحت خود را فضیحت۔ پہلے محبوب اور ماروی کی غلطیاں درست کرو۔ پھر میرے بیٹے کو سدھارنے کی باتیں کرو۔''

یہ کہہ کر رحمان نے فون بند کر دیا۔ معروف سر جھکا کر سوچنے لگا۔ رحمان نے بڑی سچی اور کھری باتیں کی تھیں۔ وہ انکار نہیں کر سکتا تھا۔ ہزار نیک نیتی کے باوجود کوئی ماروی اور محبوب کو پاک دامن اور پارسا نہیں کہہ سکتا تھا۔

معروف نے محبوب کے نمبر پنچ کیے پھر رابطہ ہونے پر کہا۔ ''رحمان بیٹے کو بیٹی بنا کر دھوکا دے رہا ہے میں نے اسے باتیں سنائیں تو اس نے بھی مجھے باتیں سنا ڈالیں۔''

محبوب نے کہا۔ ''وہ آپ کو کیا باتیں سنائے گا۔ آپ تو کسی سے فراڈ نہیں کرتے ہیں۔''

''ہمیں بعض اوقات اپنی ہی غلطی اپنی سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ تمہیں الزام دے رہا تھا کہ جب ماروی تمہاری داشتہ بن کر رہ سکتی ہے تو اس کا بیٹا، ماروی کے پاس کیوں نہیں جا سکتا۔''

''یہ کیا بکواس ہے؟ آپ نے اسے کہا نہیں کہ میں نے اسے کتنی عزت آبرو سے رکھا ہے؟''

''وہ کہہ رہا تھا، میں ثابت کروں کہ ایک ارب پتی تاجر ایک باپ بن کر یا بھائی بن کر اس پر لاکھوں کروڑوں روپے لٹا رہا ہے۔ محبوب...... ! تم سچی بات نہ ثابت کر سکو گے، نہ دنیا مانے گی۔ اگر قانونی طور پر تمہارا محاسبہ کیا جائے تو تم ماروی کے ساتھ گناہ آلود زندگی گزارنے والے بدکار کہلاؤ گے۔''

''پلیز آپ تو ایسی باتیں نہ کریں۔''

''میں نہیں کروں گا۔ رحمان کو اس کے بیٹے کے معاملے میں چھیڑا جائے گا تو وہ سرِعام عدالت میں تمہیں چیلنج کرے گا، اس بات کو آگے نہ بڑھاؤ۔ اسے یہیں ختم کر دو۔''

وہ ذرا چپ رہا پھر بولا۔ ''آپ درست فرماتے ہیں۔ میں ڈاکٹر عدیلہ بن کر آنے والے پر مٹی ڈالتا ہوں۔''

''شاباش، ٹینشن فری رہو۔ دو تاریخ کو تو وہ تمہاری وائف بننے والی ہے پھر ماروی کو بدنام کرنے والے بھی چپ ہو جائیں گے۔ کیا میں امید کروں کہ تم پھر سے ہشاش بشاش ہو کر ابھی آفس آؤ گے؟''

''جی ہاں۔ میں ایک گھنٹے میں آ رہا ہوں۔ کیا سیمرا وہاں ہے؟''

"نہیں۔ وہ اچانک ہی کچھ اپ سیٹ ہوگئی تھی۔ تمہارے جانے کے بعد اس نے کہا کہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آفس میں کام نہیں کرسکے گی۔ وہ گھر چلی گئی ہے۔"

"معروف صاحب! وہ چپ چپ سی گم صم سی رہنے لگی ہے۔ آپ اسے سمجھائیں۔"

"میں کیا سمجھاؤں۔ وہ تمہارے پیار کی بہت اہم بازی ہار رہی ہے۔ بڑے صبر سے اپنی شکست کا تماشا دیکھ رہی ہے۔ کہہ رہی تھی۔ دو تاریخ سے پہلے چھٹی لے کر پنڈی چلی جائے گی۔ وہاں دو چار ہفتے گزارنے کے بعد آئے گی۔"

"معروف صاحب! وہ بہت اچھی ہے۔ مجھے دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہے۔ میں جانتا ہوں، وہ ایک بہترین لائف پارٹنر ثابت ہوگی لیکن میں کیا کروں؟ میرا دل، میرا دماغ میرا نہیں رہا ہے۔ یہاں صرف اور صرف ماروی ہے۔ میں سمیرا کو اپنی تمام دولت دے سکتا ہوں لیکن ماروی کے حقوق نہیں دے سکوں گا۔"

"میں سمیرا کے حق میں تمہیں سمجھاتے سمجھاتے تھک گیا ہوں۔ اب کچھ نہیں کہوں گا۔ دل ہی دل میں دعا مانگتا رہتا ہوں کہ دو تاریخ سے پہلے میری بیٹی سمیرا کے لیے کوئی معجزہ ہوجائے۔"

"یعنی آپ چاہتے ہیں کہ کوئی گڑبڑ ہوجائے اور ماروی مراد کی دلہن بن جائے۔"

"میں تم سے بحث نہیں کروں گا ایک ہی بات کہوں گا کہ تمہارے کاروبار کو سنبھالنے والی سمیرا تمہارے شایانِ شان ہے۔ میں نے ماروی کو ذہانت سے دیکھا ہے اور سمجھا ہے۔ وہ مراد کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ اسی کی دیوانی ہے۔"

یہ بڑی تلخ حقیقت تھی۔ محبوب سمجھتا تھا کہ وہ مراد کے بیٹے کو کیوں کلیجے سے لگائے رکھتی ہے۔ مراد کے لیے جیسی دیوانی ہوتی رہتی تھی، ایسی دیوانگی کی مثال کوئی چاہنے والی پیش نہیں کرسکتی تھی اور محبوب کی دیوانگی کہتی تھی کہ ماروی اسے بھی چاہتی ہے۔ خواہ احسان مند ہوکر چاہتی ہو۔ اس کی نگاہیں جب اسے دیکھتی تھیں تو ان لمحات میں وہ آنکھیں صرف محبوب کے لیے ہوتی تھیں۔

محبوب نے کہا۔ "معروف صاحب! آپ درست فرماتے ہیں۔ ماروی آج مراد کی دیوانی ہے۔ کل جب میری منکوحہ بنے گی تو اس کی شرم وحیا اور اس کی شرافت اسے صرف میری ذات تک محدود رکھے گی۔ پھر اس کے دل میں مجازی خدا رہے گا۔ مراد قصۂ پارینہ بن جائے گا۔"

"میں نے کہا نا، تم سے کوئی بحث نہیں کروں گا۔ ابھی آفس آؤ گے تو ہم صرف کاروباری باتیں کریں گے۔"

"ابھی فون بند نہ کریں۔ پلیز یہ بتادیں کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں ماروی کو جبراً اپنی دلہن بنا رہا ہوں؟"

"میں کیا بولوں؟ لوک داستان کا عمر بھی یہی سمجھتا تھا کہ وہ ماروی پر جبر نہیں کررہا ہے۔ اس غریب لڑکی کی زندگی سنوار رہا ہے۔ اس نے ایک عالیشان محل میں اسے قید کررکھا تھا۔"

"آپ اس کی مثال نہ دیں۔ میں نے ماروی کو اپنی کوٹھی میں قید نہیں کیا ہے۔ اسے شادی کے لیے مجبور نہیں کیا ہے، وہ خود ہی مجھ سے متاثر ہوتی رہی ہے۔"

"وہ تمہاری اس کوٹھی میں قیدی ہے۔ تم نے اپنی دولت کی اور احسان مندی کی نادیدہ زنجیریں اسے پہنائی ہیں۔ اسے اپنی شرافت سے سحرزدہ کردیا ہے۔"

وہ ذرا توقف سے بولا۔ "محبوب! ایمان سے کہو، تم نئے دور کے عمر ہو۔ تم نے ایسی زنجیریں پہنائی ہیں جو دکھائی نہیں دیتیں تو وہ توڑے گی کیسے؟"

یہ کہہ کر اس نے رابطہ ختم کردیا۔ محبوب سر جھکا کر سوچنے لگا۔ اپنے آپ کو سمجھانے لگا۔ "نہیں، میں نے ماروی کو نادیدہ زنجیریں نہیں پہنائی ہیں۔ خود ماروی نے ایک بار کہا تھا کہ میری دولت اور احسانات نے اسے مجبور نہیں کیا ہے۔ وہ میری نیک نیتی اور شرافت سے متاثر ہوکر مجھے چاہنے لگی ہے۔ اگر معروف صاحب میری نیکی اور شرافت کو جادو کہہ رہے ہیں تو کیا شریف لوگ اپنی شرافت چھوڑ دیں؟ نہیں ..... اللہ تعالیٰ نیکی اور شرافت کا صلہ دیتا ہے اور مجھے وہ صلہ دو تاریخ کو ملے گا۔"

☆☆☆

ڈاکٹر عدیلہ عرف عدیل لندن میں تھا۔ وہ معالج کی حیثیت سے کچھ روز ماروی کے ساتھ رہ چکا تھا اور چند روز میں ہی اس کی قربت سے سحرزدہ ہوگیا تھا۔

وہ سہیلی بن کر اس کا ہاتھ پکڑتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی اسے مختلف بہانوں سے چھو لیا کرتا تھا۔ کیا حسن تھا، جیسے ہی انکشاف ہوا کہ وہ عدیلہ نہیں عدیل ہے۔ عورت نہیں مرد ہے، ماروی طیش میں آگئی تھی۔ اس نے غصہ برداشت کرتے ہوئے اس سے کہا تھا کہ چپ چاپ وہاں سے چلا جائے۔ کبھی پلٹ کر نہ آئے۔ آئے گا تو وہ ڈاکٹر عدیلہ کا بھانڈا پھوڑ دے گی۔ پھر مراد اور محبوب اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

وہ ڈاکٹر عدیلہ کا راز رکھنے اور اپنی عزت برقرار رکھنے کے لیے خاموشی سے آگیا تھا لیکن قسمیں کھاتا رہا تھا

کہ اسے ضرور حاصل کرے گا۔ اسے چھونے کے بعد اس کے پورے بدن کو حاصل کرنے کا جنون سوار ہو گیا تھا۔

اس کے باپ رحمان نے مشورہ دیا تھا۔ ''اب تم عدیلہ کا خول اتارو اور اپنی مردانہ شخصیت سے اسے متاثر کرو۔''

لیکن وہ مراد اور محبوب کی قد آور اور بھاری بھرکم شخصیات کے سامنے صفر ہو سکتا تھا۔ اس نے کہا۔ ''نو ڈیڈ! میں نے لیڈی ڈاکٹر عدیلہ کی جو پرسنالٹی بنائی ہے۔ یہی مجھے بہتر لگتی ہے۔ جب بھی ماروی کو حاصل کرنے کا موقع آئے گا تو میں مرد بن جاؤں گا۔''

وہ اپنی ماں کے سائے میں بچپن سے نسوانی لب ولہجہ اور چال ڈھال سیکھتا آیا تھا۔ عورت پن اس کی گھٹی میں پڑا تھا۔ وہ بچپن ہی سے لندن کی اونچی سوسائٹی کی خواتین کے درمیان پرورش پاتا رہا تھا۔ وہ خواب میں دیکھے یا آئینے میں دیکھے، خود کو ایک حسین لڑکی کے روپ میں دیکھتا تھا۔ وہ اس حد تک حسین تھا کہ کئی مرد اس پر عاشق ہو گئے تھے۔

اس کے اندر مرد بننے کی تمنا اس حد تک رہی کہ آئندہ نسل پیدا کرنے کے لیے اس نے ایک بار شادی کی، ایک بیٹی کا باپ بھی بن گیا۔ پھر وہ بیوی مر گئی۔ وہ وقتی مرد جو سو گیا تھا، اسے ماروی کی قربت نے جگا دیا تھا۔ اس کے ماں باپ ضد کر رہے تھے کہ نسل بڑھانے کے لیے اسے ایک بیٹے کا باپ بننا چاہیے۔ جب اس نے ماروی کو دیکھا اور اسے چھولیا تو تب ماں باپ کی ضد اچھی لگی۔ اس کے اندر کے مرد نے بھی ضد کی کہ اب ایک بیٹے کا باپ بننا ہی پڑے گا۔ باپ نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کرائے کے بدمعاشوں کے ذریعے ماروی کو اغوا کرائے گا پھر اسے بیٹے کے پاس پہنچا دے گا۔

وہ صبر کر رہا تھا لیکن ایسا کوئی موقع ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

پھر ایک دن رحمان نے بیٹے کو خوشخبری سنائی کہ ماروی کو حضرت عبداللہ شاہ غازی کے دربار میں حادثہ پیش آیا تھا۔ جس کے نتیجے میں وہ پچھلی باتیں بھول گئی ہے۔ یعنی یہ بھی بھول گئی ہے کہ لیڈی سائیکاٹرسٹ عدیلہ اس کا علاج کرنے آیا کرتی تھی۔ وہ بھول گئی ہے کہ کوئی مرد عدیل سے عدیلہ بن کر اسے دھوکا دیتا رہا تھا۔

عدیل نے خوش ہو کر کہا۔ ''ڈیڈ! یہ تو کمال ہو گیا۔ میں اس بار ایک مرد عادل بن کر اس کے سامنے جاؤں گا تو وہ نہیں پہچانے گی کہ میں عدیلہ بن کر اس کے پاس آیا کرتا تھا۔ میں نئے سرے سے اسے دوست بنا کر اس کی محبت حاصل کروں گا۔ وہ محبت نہیں کرے گی اپنے دو عاشقوں سے متاثر رہے گی تو میں اسے سیر و تفریح کے بہانے کہیں لے جاؤں گا۔ وہاں کرائے کے بدمعاش اسے اٹھا کر ہماری کسی خفیہ جگہ پہنچا دیں گے۔''

''ہاں بیٹے! تم ماروی کے لیے مچل رہے تھے۔ اب یہ اچھا موقع ہاتھ آ گیا ہے۔ تم چلے آؤ۔''

''یس ڈیڈ! ویک اینڈ کے بعد کسی بھی فلائٹ میں آؤں گا۔''

''یعنی چار دنوں کے بعد آؤ گے۔ اتنی دیر کیوں کرو گے؟ آج ہی کسی فلائٹ میں سیٹ ملتی ہے تو آج ہی آ جاؤ۔''

''یہاں سمر سیزن کا بہت بڑا فیشن شو ہو رہا ہے۔ میں اس شو میں نئے ملبوسات پہن کر کیٹ واک کروں گی۔''

''یو شٹ اپ۔ تم پھر لڑکیوں کی طرح بول رہے ہو۔''

''سوری ڈیڈ! آپ کے سامنے بیٹا ہی بن کر بولوں گا آج سے چوتھے دن جو شو ہونے والا ہے۔ اس کی بڑی دھوم مچی ہے۔ وہاں میرے حسن کو اور میری چال کو دیکھ کر سب ہی دیوانے ہو جائیں گے۔ آپ ٹی وی پر یہ پروگرام ضرور دیکھیں۔''

اس نے باپ سے رابطہ ختم کیا۔ پھر فیشن شو کی ریہرسل میں جانے کی تیاری کرنے کے لیے سنگار میز کے سامنے آ گیا۔

وہ بہت خوب صورت تھا۔ اس کی خوبروئی میں مردانہ وجاہت نہیں بلکہ نسوانیت تھی۔ وہاں کی حسین لڑکیوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ اس کے بدن میں زنانہ لوچ اور لچک تھی۔ اس کی چال دیکھ کر مرد آہیں بھرتے تھے اور لڑکیاں اس سے حسد کرنے لگتی تھیں۔

اس کے فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ اس نے ننھی سی اسکرین کو پڑھنے کے بعد فون کو کان سے لگا کر کہا۔ ''ہائے مسٹر رابرٹ! میں ابھی تمہیں ہی یاد کر رہی تھی۔''

وہ ہچکی لیتے ہوئے بولا۔ ''ہاں مجھے ہچکیاں آ رہی تھیں تب ہی میں سمجھ گیا کہ تم مجھے یاد کر رہی ہو۔''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''میرے فیشن شو میں آ رہے ہو نا؟''

''وہاں تو سر کے بل آؤں گا۔ یہ بتاؤ، تم دور رہ کر مجھے یاد کرتی ہو جب قریب آتا ہوں دور، دور رہتی ہو۔ یہ کیسی تڑپانے والی ادائیں ہیں؟''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''اس طرح میری کشش اور بڑھ جاتی ہے۔ ابھی تم میرے لیے تڑپ رہے ہو، مجھے اچھا لگ رہا ہے۔''

''کم از کم ایک کس تو دیا کرو۔''

''سوری رابرٹ! میں تم سے کہہ چکی ہوں۔ میرا ایک ایک بوسہ اور میرا انگ انگ صرف میرے ہونے والے ہزبینڈ کے لیے ہے۔ اچھا مجھے دیر ہو رہی ہے، میں ریہرسل کے لیے جا رہی ہوں۔ پھر کسی وقت باتیں ہوں گی۔''

اس نے فون بند کر دیا۔ جب تک وہ جاگتی رہتی دل پھینک جوانوں کی درجنوں کالیں آتی رہتی تھیں۔ ان سے چھٹکارا پانے کے لیے وہ سونے سے پہلے اگلی صبح تک کے لیے فون کا سوئچ آف رکھتی تھی، پھر کسی کی مداخلت کے بغیر گہری نیند میں ڈوب جاتی تھی۔

اسے عورتوں کی طرح بولتے ہوئے، عورتوں کی طرح سوچتے ہوئے بہت اچھا لگتا تھا۔ اس روز جوان لڑکیوں اور لڑکوں کی کالیں آ رہی تھیں۔ جوان لڑکے اس سے ڈیٹ مانگ رہے تھے۔ وہ فخر سے ہنستے ہوئے زیر لب بڑبڑائی۔

''ماروی! تیرے تو صرف دو ہی دیوانے پروانے ہیں۔ یہاں تو میرے پیچھے پروانوں کی قطار لگی رہتی ہے۔''

وہ ریکارڈر کو آن کر کے موسیقی سننے لگی اور دھن میں مست ہو کر رقص کر رہی تھی۔ ایسے وقت کال بیل کی آواز سنائی دی۔ اس نے ریکارڈر کو آف کیا۔ وہی گیت گنگناتی ہوئی اپارٹمنٹ کے ایک کمرے اور کوریڈور سے گزرتی ہوئی بیرونی دروازے تک آئی پھر اسے کھولا۔ باہر اس کی دو سہیلیاں اور تین بوائے فرینڈز کھڑے تھے۔ عدیلہ نے بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا۔ ایک سہیلی سنتھیا نے پوچھا۔ ''کہیں جا رہی تھیں؟''

وہ بولی۔ ''ہاں فیشن شو کا ریہرسل اٹینڈ کرنا ہے۔''

دوسری سہیلی روبی نے کہا۔ ''تم بہت لکی ہو۔ فیشن شو میں ماڈلنگ کے لیے تمہارا انتخاب کیا گیا ہے۔''

عدیلہ نے کہا۔ ''تمہارا انتخاب نہیں کیا گیا۔ تمہیں مایوسی ہوئی تھی۔ اس روز تو تم رو پڑی تھیں۔''

روبی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میں اس وقت ایموشنل ہو گئی تھی۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ تم حسین اور پرکشش تو ہو ہی تمہیں ادائیں دکھانا بھی خوب آتا ہے۔''

سنتھیا نے ایک بوائے فرینڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ جان برگ تو تم پر مرتا ہے۔''

جان برگ نے مسکرا کر کہا۔ ''ہائے عدیلہ......!''

عدیلہ نے ناگواری سے ہائے کہا۔ وہ اچھی خاصی عمر والا تھا۔ لیکن تو جوانوں کی طرح سنتھیا کا بوائے فرینڈ کہلاتا تھا۔ وہ سنتھیا سے بولی۔ ''اگر تمہارا بوائے فرینڈ مجھ پر مرتا ہے تو یہ غلط ہے۔ اپنے اس اولڈ بوائے کو اپنے ہی چٹیا کوٹ سے باندھ کر رکھا کرو۔''

جان برگ نے مسکرا کر کہا۔ ''کوئی حسینہ مجھے نظر انداز کرے اور نخرے دکھائے تو وہ اور زیادہ میرے دل میں گھس جاتی ہے۔ آئی لو یو عدیلہ!''

اس کی ڈھٹائی پر سب ہنسنے لگے۔ ایک انڈین بوائے فرینڈ دیو کمار نے کہا۔ ''عدیلہ! تمہیں اصولاً آئی لو یو تو کہنا چاہیے۔ بھئی سوسائٹی کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں۔''

عدیلہ نے منہ پھیر کر جاتے ہوئے کہا۔ ''میں تم لوگوں کے لیے ڈرنک لے کر آتی ہوں۔''

ایک اور بوائے فرینڈ جیری نے کہا۔ ''شام ہو گئی ہے۔ واڈکا لے آؤ۔ پینے کا مزہ آ جائے گا۔''

وہ جاتے ہوئے بولی۔ ''میں ایک پیگ سے زیادہ کسی کو نہیں دوں گی۔ مجھے ابھی ریہرسل میں جانا ہے۔''

وہ ڈرائنگ روم کی طرف چلی گئی۔ روبی نے منہ بنا کر کہا۔ ''فیشن شو میں سلیکٹ کیا ہو گئی ہے زمین پر پاؤں نہیں پڑ رہے۔ میں صرف دو نمبر سے پیچھے رہ گئی۔ یہ آگے نکل گئی۔''

جان برگ نے کہا۔ ''سلیکشن لسٹ میں اب بھی تمہارا نام ہے لیکن ایکسٹرا کی حیثیت سے۔ اگر عدیلہ نہ رہی تو شو میں پرفارم کے لیے تمہیں ہی کال کی جائے گی۔''

عدیلہ کیوں نہیں رہے گی۔ سب نے بڑی خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ عدیلہ شراب کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی آ گئی۔ جان برگ نے کہا۔ ''سنتھیا! میں تمہارے اصرار کرنے سے یہاں چلا آیا۔ اگر تمہارے ساتھ نہ آتا تو عدیلہ مجھے ویلکم نہ کرتی۔ بہرحال میں نفرت کا جواب نفرت سے دینا جانتا ہوں۔ میں اس گھر کی ایک گھونٹ شراب بھی نہیں پیوں گا۔ میں جا رہا ہوں۔ کلب میں تمہارا انتظار کروں گا۔''

جیری نے کہا۔ ''او نو جان تمہیں نہیں جانا چاہیے۔ ہم عدیلہ سے تمہاری صلح کرائیں گے۔''

وہ جاتے ہوئے بولا۔ ''میں جھکنا اور صلح کرنا نہیں جانتا۔ سوری تم لوگ انجوائے کرو۔''

سنتھیا اس کے ساتھ جاتے ہوئے بولی۔ ''اسے جانے دو۔ یہ بہت ضدی ہے۔ میں اسے دروازے تک چھوڑ کر آتی ہوں۔''

وہ دونوں چلے گئے۔ وہ سب اپنے لیے پیگ بنانے لگے۔ عدیلہ نے بھی اپنے لیے ایک پیگ بناتے ہوئے کہا۔ ''اونہہ! انگاروں پر لوٹ رہا ہے۔ کل ہی کی بات ہے۔ اس

نے مجھے کس کرنا چاہا تھا۔ میں نے ایک طمانچہ رسید کر دیا تھا۔ تب سے یہ خار کھا رہا ہے۔"

اس نے شیشے کے جام کو ہونٹوں سے لگا کر ایک گھونٹ لیا پھر کہا۔ "میرے یہ گلابی ہونٹ صرف میرے ہونے والے لائف پارٹنر کے لیے ہیں۔"

روبی اسے کینہ پرور نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ عدیلہ نے غٹاغٹ پینے کے بعد کہا۔ "میں تمہاری طرح نہیں ہوں۔ ان ٹچڈ ہوں۔ کسی کا باپ بھی مجھے ہاتھ نہیں لگا سکے گا۔"

سنتھیا نے آکر اپنے لیے ایک پیگ لیا۔ پھر ایک گھونٹ پی کر کہا۔ "تم بہت بولتی ہو عدیلہ! ہم لڑکیاں کسی نہ کسی مرد سے زیر ہونے کے لیے پیدا ہوتی ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ وہ زیر کرنے والا خاوند ہی ہو۔ یہ تو جانتی ہو، ہزبینڈ کے آنے سے پہلے کتنے ہی ہمارا بینڈ بجا دیتے ہیں۔"

عدیلہ نے دل میں کہا۔ "اونہہ! نہ میرا کوئی ہزبینڈ ہوگا اور نہ ہی بوائے فرینڈ۔ نہ میں لڑکی ہوں۔ نہ کسی سے زیر ہونا ہے۔ مجھے تو ماروی کو زیر کرنا ہے۔"

وہ شیشے کے جام کو سینٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے دل میں پورے یقین سے کہہ رہی تھی۔ "میں عدیلہ کی حیثیت سے ایک کامیاب زندگی گزار رہی ہوں۔ پاکستان جا کر ماروی کے لیے عدیل بن جاؤں گی۔ وہ میری سیج پر آنے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔"

اس نے کن انکھیوں سے سنتھیا اور روبی کو دیکھ کر سوچا۔ "عدیلہ کی لائف میں کتنا مزہ آرہا ہے۔ یہ لڑکیاں میری اداؤں بھری جوانی کو دیکھ کر جلتی کڑھتی ہیں اور لڑکے میرے لیے آہیں بھرتے رہتے ہیں۔ میں سچ مچ بہت انجوائے کر رہی ہوں۔"

ان سب نے ایک ایک پیگ لے کر جام خالی کر دیے۔ عدیلہ نے کہا۔ "ڈیئر آل۔ مجھے ریہرسل کے لیے جانا ہے۔"

سنتھیا نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "آل رائٹ، ہم بھی جا رہے ہیں۔ اب تمہارے فیشن شو میں ملاقات ہوگی۔"

عدیلہ ان سب کو سی آف کرنے کے لیے بیرونی دروازے تک آئی پھر ان کے جاتے ہی دروازے کو اندر سے بند کرلیا۔ ایسے وقت رنگ ٹون نے اسے پکارا۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی شراب کی ٹرالی کے پاس آئی۔ وہاں سے فون اٹھا کر بٹن دبا کر کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے فیشن شو کے منتظم نے کہا۔ "عدیلہ! ریہرسل کا ٹائم چینج ہوگیا ہے تم نو بجے آؤ۔ ورنہ یہاں بور ہو جاؤ گی۔"

اس نے شکریہ ادا کرکے رابطہ ختم کر دیا پھر اس نے ٹرالی کی طرف دیکھ کر سوچا۔ "دو گھنٹے بعد جانا ہے...... کیوں نہ ایک پیگ اور ہو جائے۔"

اس نے بلیک لیبل کا ایک پیگ بنالیا۔ اسے چاہے جانے کا نشہ تھا۔ اس نے مست ہوکر ایک گھونٹ پیا۔ فون پھر بولنے لگا۔ اس نے ننھی سی اسکرین کو دیکھا۔ ایک انجانا نمبر تھا۔ لیکن اسے کان سے لگاتے ہی وہ انجانا نہ رہا۔ دوسری طرف سے جان برگ کی آواز سنائی دی۔

وہ کہہ رہا تھا۔ "میری آواز سن کر فون بند نہ کرنا۔ ورنہ دروازہ توڑ کر چلا آؤں گا۔"

وہ نفرت سے بولی۔ "تمہارا باپ بھی دروازہ نہیں توڑ سکے گا۔ ٹوٹنے سے پہلے پولیس آجائے گی۔"

"تم مجھ سے نفرت کیوں کرتی ہو؟"

"آئینہ دیکھو۔ تم سے محبت کرنے والی کوئی بات نہیں ہے۔ پتا نہیں سنتھیا تم پر کیوں مرتی ہے۔"

"ایک بار تنہائی میں بلاؤ پھر تم بھی مجھ پر مرنے لگو گی۔"

"تم خواب دیکھتے رہ جاؤ گے۔ مجھے کبھی تنہائی میں حاصل نہیں کرسکو گے۔"

یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ اسی وقت جان برگ اس کے پیچھے ڈرائنگ روم کے دروازے پر آگیا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے اپارٹمنٹ سے باہر نہیں گیا تھا۔ وہیں ایک کمرے میں چھپ گیا تھا۔ یہ سنتھیا، روبی اور ان کے بوائے فرینڈز کی ... پلاننگ کے مطابق ہو رہا تھا۔

جان برگ نے اپنے بند ہوجانے والے فون کو دیکھا پھر عدیلہ کو دیکھا اور دل میں کہا۔ "سالی نخرے والی......"

اس نے ری ڈائل کیا پھر دبے قدموں اس کے پیچھے آنے لگا۔ عدیلہ کے فون سے رنگ ٹون ابھر رہی تھی۔ وہ اسے نہیں اٹھا رہی تھی۔ اپنے جام کا آخری گھونٹ پی رہی تھی۔ وہ اس کے صوفے کے پیچھے آکر کھڑا ہوگیا۔

عدیلہ کے سامنے فون چیختے چیختے چپ ہوگیا۔ جان برگ نے پھر نمبر ری ڈائل کیے پھر اس کا فون چیخنے لگا۔ وہ اس کی چیخ سے بے نیاز ہوکر پھر ایک پیگ بنانا چاہتی تھی۔ اسی وقت وہ دھیمی آواز میں بولا۔ "ہائے عدیلہ! فون نہ اٹھاؤ۔ تب بھی بولوں گا۔"

اس نے حیرانی سے فون کو دیکھا پھر یکبارگی صوفے سے اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ پلٹ کر پیچھے دیکھا تو مارے دہشت کے چیخ پڑی۔ اس نے ایک الٹا ہاتھ رسید کیا۔ وہ

پیچھے جاکر شراب کی ٹرالی سے ٹکرا کر فرش پر گر پڑی۔ وہ صوفے کے ایک طرف سے گھوم کر اس کے پاس آگیا۔ وہ حواس باختہ سی اسے دیکھ رہی تھی۔

اس نے اپنے لباس میں سے ایک چاقو نکال کر اسے ایک جھٹکے سے کھولا۔ اسٹین لیس اسٹیل کا تیز دھاری دار پھل روشنی میں چمک رہا تھا۔

وہ سہم کر فرش پر بیٹھے بیٹھے کھسک کر دور ہونے لگی۔ جان برگ نے اپنا ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھایا پھر کہا۔ ''نفرت موت دے گی۔ زندگی چاہتی ہو تو ہاتھ تھام لو۔''

ہاتھ تھامنے میں ہی خیریت تھی۔ عدیلہ نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ جان برگ نے اسے تھام کر ایک زور کا جھٹکا دیا تو وہ فرش پر سے اٹھتی ہوئی اس کے سینے سے آکر لگ گئی۔

''میں نے پیار سے کس کرنا چاہا تھا تم نے طمانچہ مار دیا۔ اب مارو۔''

وہ اسے ایک ہاتھ سے جکڑ کر اس کے لبوں پر اتر گیا۔ دوسرے ہاتھ میں چاقو تھا۔ وہ دم سادھے ہوئے تھی جب اس نے چھوڑا تو وہ لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے بولی۔ ''مم۔ میں وہ نہیں ہوں، جو تم سمجھ رہے ہو۔''

''ہاں۔ میں سمجھ رہا ہوں، تم بہت پارسا ہو۔ بڑے فخر سے کہتی ہو کہ ان ٹچڈ ہو۔ ابھی یہ گزرتا ہوا وقت کہہ رہا ہے کہ تمہاری پارسائی کے چیتھڑے اڑ جائیں گے۔''

یہ کہتے ہی اس نے بلاؤز کے گریبان کو پکڑ کر اس پر چاقو کی دھار رکھی تو وہ سامنے سے کٹتا چلا گیا اور پھر وہ چونک گیا۔

وہ چاقو کو دیکھ رہی تھی اور بری طرح سہمی ہوئی تھی۔ جان برگ نے کہا۔ ''اب سے دو برس پہلے میں نے ہی ربیکا کا مرڈر کیا تھا۔ وہ سالی بھی میرے ساتھ سونے سے انکار کر رہی تھی۔''

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''جیسا تم سوچ رہے ہو، میں ویسی نہیں ہوں۔''

وہ بولا۔ ''کوئی بات نہیں۔ میں نے ایک ایسی لڑکی کے ساتھ بھی وقت گزارا ہے، جو تمہاری طرح بھرپور نظر آنے کے لیے مصنوعی چیزیں استعمال کرتی تھی۔''

وہ اسے بازوؤں میں بھرتے ہوئے اپنے جنون کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہیں کسی حال میں نہیں چھوڑوں گا۔ تم نے مجھے بہت سلگایا ہے۔''

وہ پھر کچھ بولنا چاہتی تھی۔ اس نے پیٹی کوٹ کی کمر کو پکڑ لیا۔ اس نے پیٹی کوٹ پر چاقو کی دھار رکھی تو وہ دور تک کٹتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی راز ہائے نہاں بھی کھل گیا۔ پھر اس نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر مارتے ہوئے پوچھا۔ ''یے یہ کیا ہے؟''

بڑا زبردست ہاتھ پڑا تھا۔ ناک سے لہو کے چند قطرے نکل آئے۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ ''میں تو پہلے ہی بتانا چاہتی تھی مگر تم نے سنا ہی نہیں۔''

وہ اب سننے والا نہیں تھا۔ چاقو ایک طرف پھینک کر دونوں ہاتھوں سے اس کی پٹائی کرنے لگا۔ کہنے لگا۔ ''کتے کی اولاد! مجھے اب تک دیوانہ الو بنا رہا تھا۔ میں تجھے چھوڑوں گا نہیں۔ اب یہ چاقو تجھ میں پیوست ہوگا۔''

وہ اپارٹمنٹ باہر سے بند تھا۔ فی الحال کوئی آنے والا نہیں تھا اور اندر سے کسی کی آواز بھی باہر نہیں آرہی تھی۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔ تکلیف کی شدت سے نکلنے والی آواز اس کمرے میں دم توڑ رہی تھی۔

اس آواز میں بڑی بے بسی تھی۔ رحم کی التجا تھی۔ تو یہ تھی کہ اب فطرت کے خلاف مرد سے عورت نہیں بنے گی لیکن توبہ کا وقت گزر چکا تھا۔ پھر ایک بڑی ہی کربناک دم توڑتی ہوئی آخری آواز ابھری اور گہری خاموشی چھا گئی۔ بعض حالات میں اندازہ ہوتا ہے کہ آواز مر جائے تو زندگی بھی مر جاتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد دھیمی سی آواز ابھری۔ ''ہیلو ننھیا! میں نے قصہ تمام کر دیا ہے۔ روبی سے بولو، عدیلہ کی عدم موجودگی میں اب اسے فیشن شو میں طلب کیا جائے گا۔ میں ابھی آرہا ہوں۔'' پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ بند اپارٹمنٹ میں کوئی بولنے والی نہ رہی۔

☆☆☆

مرینہ ایئر کنڈیشنڈ بیڈروم میں فوم کے لچکدار بستر پر سونے کی عادی تھی۔ اس وقت کچرا گھر کے باہر پھیلے ہوئے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں گہری نیند سو رہی تھی۔ وہ کم سے کم لباس میں رہنے کی عادی تھی۔ اس وقت بھی بالشت بھر کے لباس میں وہاں پڑی تھی۔ پھر بھلا لوگوں کی بھیڑ کیسے نہ لگتی۔ وہاں سے گزرنے والے لوگ رک رک کر اسے دیکھ رہے تھے اور طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔

''پتا نہیں بیچاری کون ہے؟ بدمعاشوں نے اسے اغوا کیا ہوگا۔''

''ہاں اغوا کیا ہوگا۔ اس کے ساتھ زیادتی کی ہوگی۔ پھر وہ حرامزادے اسے یہاں پھینک کر چلے گئے ہیں۔''

پھر وہ سب چپ ہو گئے۔ وہ بہت ہولے سے کسمسائی تھی۔ نیند میں تھی تو بیدار ہو رہی تھی۔ لوگوں نے

دیکھا۔ وہ پھر ساکت ہوگئی تھی۔ تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔ سب ہی چاہتے تھے کہ وہ آنکھیں کھولے۔ اٹھ کر بیٹھے اور اپنے بارے میں کچھ بتائے اور وہ ان کے تجسس کو بھڑکا رہی تھی۔ ایک بار پھر کسمسانے لگی۔ اس بار حلق سے کراہیں نکل رہی تھیں۔ شاید وہ کچھ بولنے والی تھی۔

سب ہی لوگ اس کے قریب آنے لگے۔ دو چار آدمی رضاکارانہ انداز میں قریب آنے والوں کو روک رہے تھے۔ انہیں دور کرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ''اس سے دور رہو، یہ اتنی بھیڑ دیکھ کر گھبرا جائے گی۔ بھگوان کے لیے پیچھے ہٹ جاؤ۔''

ایسے وقت پولیس کی موبائل گاڑی آگئی۔ کئی سپاہی گاڑی سے اتر کر لوگوں کو دور کرنے لگے۔ انسپکٹر نے قریب آکر اسے دیکھا تو منہ میں پانی آگیا۔ وہ آنکھیں کھول کر اسے دیکھ رہی تھی پھر سر گھما کر ہر طرف عورتوں سے زیادہ مردوں کی بھیڑ دیکھ رہی تھیں۔

انسپکٹر نے پوچھا۔ ''کون ہو تم؟''

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو چھونے لگی۔ پھر بولی۔ ''کون ہوں میں؟''

انسپکٹر نے اس کی طرف جھک کر کہا۔ ''ہاں بولو۔ کون ہو؟ یہاں کیسے آگئیں۔ اور ایسی حالت میں کیوں ہو؟''

ایک عورت نے کہا۔ ''اے انسپکٹر! اس کے بدن کو للچا کر دیکھ رہا ہے۔ پہلے اسے کپڑے تو پہنا۔ پھر انکوائری کر۔''

انسپکٹر نے جھنجلا کر کہا۔ ''کیا بکواس کر رہی ہو۔ میں اس کا تن ڈھانپنے کے لیے کہاں سے کپڑا لاؤں گا۔ اتنی ہی ہمدردی ہے تو اپنی چادر اسے دے دو۔''

وہ بولی۔ ''میرے پاس ایک ہی چادر ہے۔''

مرینہ ان سب کو ایسے دیکھ رہی تھی جیسے پہلی بار انسانوں کو دیکھ رہی ہو۔ اس نے ایک بوڑھی خاتون سے پوچھا۔ ''اے مائی! میں کون ہوں؟''

وہ بولی۔ ''بیٹی! تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ خود کو نہیں پہچان رہی ہو؟ کیا تمہارا دماغ الٹ گیا ہے؟''

ایک جوان عورت نے پوچھا۔ ''اے بہن! تمہارے کپڑے کیا ہوئے؟ کچھ تو یاد کرو، یہاں کیسے آئی ہو اور کہاں سے آئی ہو؟''

انسپکٹر نے کہا۔ ''اٹھو ہمارے ساتھ تھانے چلو۔ وہاں تم اشنان کرو گی۔ چلو اٹھو، یہاں تماشا بن رہی ہو۔''

ڈاکٹر ٹمی سن نے پتا نہیں کیسی دوا اس کے بازو میں انجیکٹ کی تھی۔ آئندہ اس کی دماغی حالت بدلتی رہنے والی تھی۔ کبھی وہ خود کو بھولنے والی تھی کبھی یاد کرنے والی تھی۔ وہ کچرے کے ڈھیر سے اٹھ کر کھڑی ہوئی تو اچانک اسے یاد آیا۔ وہ یکا یک چیخ کر بولی۔ ''میں مرینہ ہوں' مجھے یاد آگیا ہے۔ میں لندن کی بہت بڑی پولیس آفیسر ہوں۔ اے انسپکٹر مجھے سیلوٹ کرو۔''

اس بات پر سب مسکرانے لگے۔ ایک نے کہا۔ ''لندن کی پولیس آفیسر دلی کے کچرا گھر میں، وہ بھی ننگی......''

اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ وہ حیران اور پریشان تھی کہ ابھی ایک فارم ہاؤس میں تھی۔ اب اچانک اس کچرا گھر میں کیسے پہنچ گئی۔ اس نے کہا۔ ''انسپکٹر! یقین کرو میں لندن کی MET آفیسر ہوں۔ میرا نام مرینہ ولاور ہے۔''

انسپکٹر نے اسے چھو لینے کے لیے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''مجھے یقین ہے۔ تھانے چلو، وہاں باتیں ہوں گی۔''

''مجھے فون دو۔ میں اپنے ڈائریکٹر جنرل سے بات کروں گی۔ ابھی فون کروں گی۔''

انسپکٹر نے اس کے شانے اور بازو کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ''فون یہاں نہیں ہے۔ تھانے میں ہے۔ وہاں چلو۔''

وہ اس کا ہاتھ تھام کر گاڑی کے پاس آیا۔ مرینہ اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھنے لگی۔ انسپکٹر نے کہا۔ ''یہ میری سیٹ ہے' تم پیچھے سپاہیوں کے ساتھ بیٹھو۔''

وہ بولی۔ ''سپاہیوں کے ساتھ مجرموں کو بٹھایا جاتا ہے۔ میں آگے بیٹھوں گی۔''

وہ اگلی سیٹ پر جم کے بیٹھ گئی۔ انسپکٹر بھی اس سیٹ پر آکر اس سے لگ کر بیٹھ گیا۔ اگرچہ اس کے بدن سے کچرے کی بو آرہی تھی۔ تاہم دل کے ارمان پورے ہو رہے تھے۔ مرینہ انسپکٹر کی طرف ایک ذرا توجہ نہیں دے رہی تھی وہ یاد کر رہی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟

وہ کئی بار مراد سے جنگ لڑ چکی تھی۔ پچھلی لڑائی کسی فارم ہاؤس میں ہوئی تھی۔ پہلے ایک بونا مراد اس سے مقابلہ کرتا رہا پھر اصلی مراد ایک نئے چہرے کے ساتھ آگیا تھا وہ ہمیشہ ہی اس سے مات کھاتی رہی تھی۔ پچھلی بار مراد نے خوب پٹائی کی تھی۔ وہ مار کھاتے کھاتے بے ہوش ہوگئی تھی۔ پھر جب ہوش آیا تو اس نے ایک ڈاکٹر کو دیکھا اس نے بازو میں ایک انجکشن لگایا تھا۔ اس کے بعد وہ خود سے غافل ہوگئی تھی۔ پتا نہیں کتنا وقت گزر گیا ہوگا۔ ابھی کچرے کے ڈھیر میں اسے ہوش آیا تھا۔

پولیس کی گاڑی تیز رفتاری سے جا رہی تھی۔ اچانک

اس نے انسپکٹر کی طرف توجہ دی۔ وہ اس سے چپک کر بیٹھا ہوا تھا اور اس کی گوری ..... ران پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ یکلخت اس کے اندر کی فائٹر بیدار ہوگئی۔ اس نے ایک کہنی زور سے اس کے پیٹ میں ماری۔ وہ ''اونک'' کی آواز نکالتا ہوا تکلیف سے دہرا ہوگیا۔ اس نے وہی کہنی اس کے جھکے ہوئے چہرے پر ماری تو ناک سے لہو چھلکنے لگا۔ اسے سنبھلنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے تارے ناچ رہے تھے۔ ساتھ بیٹھے ہوئے ڈرائیور سپاہی نے چیخ کر کہا۔ ''اے پاگل کی بچی! یہ کیا کررہی ہے؟''

اس نے اچانک ہی بریک لگا کر گاڑی روکی۔ مرینہ نے انسپکٹر کے ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا۔ گاڑی کے رکتے ہی سپاہی دوڑتے ہوئے اگلے حصے کی طرف آئے۔ ڈرائیور چھلانگ لگا کر باہر چلا گیا۔ مرینہ نے انسپکٹر کی گردن میں ایک بازو کا پھندا ڈال کر ریوالور کو اس کی کنپٹی سے لگا کر کہا۔ ''خبردار! کوئی قریب آئے گا یا گولی چلائے گا تو مجھ سے پہلے تمہارا افسر مرے گا۔ فوراً اپنی گنیں پھینکو اور یہاں سے دور بھاگتے جاؤ۔''

وہ سب اپنے افسر کو بے بسی کی حالت میں چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے تھے۔ انسپکٹر کی گردن پھنسی ہوئی تھی۔ اس نے بہ مشکل کہا۔ ''اس کی بات مانو۔ ہتھیار پھینک کر جاؤ۔ نہیں تو یہ مار ڈالے گی۔ یہ پاگل ہے، کچھ بھی کرسکتی ہے۔''

سپاہیوں نے ہتھیار پھینک دیے۔ وہاں سے دور جانے لگے۔ مرینہ کھسکتی ہوئی ڈرائیونگ سیٹ پر آئی۔ وہ بھی اپنی گردن کے ساتھ گھسٹتا ہوا اس کے شکنجے میں ہی رہا۔ وہ فیصلہ کرچکی تھی کہ آگے اسے کہاں جانا ہے اور کیا کرنا ہے؟

اس نے انسپکٹر کی گردن کو چھوڑ کر اس کے منہ پر ریوالور کی نال رکھتے ہوئے کہا۔ ''تجھے میرا چکنا بدن اچھا لگتا ہے۔ چل اپنا سر میری چکنی رانوں کے درمیان لے آ۔ چل جلدی کر۔''

اس نے حکم کی تعمیل کی۔ اپنا منہ ادھر لے گیا۔ مرینہ نے اس کی گردن کو دونوں رانوں کے درمیان دبوچ کر کہا۔ ''یہاں سے تیرا باپ بھی نہیں نکل سکے گا۔ اب وہیں سانسیں لیتے رہنا۔''

یہ کہہ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی پھر اسے آگے بڑھا کر اس کی رفتار بڑھاتی چلی گئی۔ وہ عیاشی بھول گیا تھا۔ یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ وہ پاگل ہے کہیں گولی نہ چلادے۔ اگر وہ زندہ رہ جاتا تو شراب پیتے وقت یار دوستوں کے سامنے اکڑ کر کہتا کہ لندن والی کو جیت کر آیا ہے۔ وہ ایسے جہنم میں پہنچ کر سانسیں لیتا رہا ہے جہاں بڑھاپے کا دم نکل جاتا ہے صرف جوانی وہاں سے بخیریت واپس آتی ہے۔

وہ ڈرائیو کررہی تھی اور ونڈ اسکرین پر مراد کی صورت دیکھ رہی تھی۔ وہ پہلے بھی اسے برہنہ کرکے بیچ بازار میں چھوڑ گیا تھا۔ اس بار پھر اس نے کچرے میں اسے پھینکنے سے پہلے بے لباس کردیا تھا۔ صرف بالشت بھر کی ستر پوشی رکھی تھی۔

مرینہ کو ایسے شرمناک سلوک پر غصہ آنا چاہیے تھا لیکن پھر ایک بار اپنے مرد سے ہار کر اس پر پیار آرہا تھا۔ پیار اس لیے بھی آرہا تھا کہ اس نے پھر اسے زندہ چھوڑ دیا تھا جبکہ وہ دونوں اس بار ایک دوسرے کو مار ڈالنے کا آخری فیصلہ کرچکے تھے۔

وہ دونوں ارادے کے پکے تھے لیکن ایک دوسرے کے معاملے میں کچے ہوجاتے تھے۔ وہ لندن سے صرف اس کے سر کا سودا کرنے اور پچاس لاکھ ڈالرز حاصل کرنے آئی تھی۔ یہ سوچ رکھا تھا کہ اس سے سامنا ہوگا تو مقابلہ نہیں کرے گی۔ اسے دیکھتے ہی گولی ماردے گی اور مراد بھی اس کی دوغلی حرکتوں سے بیزار ہوگیا تھا۔ وہ جس طرح پیار کا فریب دے کر اس کی زندگی کا سودا کرنے والی تھی اس کے پیش نظر یہی فیصلہ کرنا تھا کہ اس بار اس سے کوئی رعایت نہیں کرے گا۔ سامنا ہوتے ہی اسے گولی ماردے گا لیکن پھر ایک بار اس نے بخش دیا تھا۔ پتا نہیں کیا سوچ کر اسے زندہ چھوڑ دیا تھا۔ وہ گاڑی ڈرائیو کرتی ہوئی سوچ رہی تھی۔ وہ مجھے کبھی ہلاک نہیں کرے گا۔ ماروی کی محبت میں مجھ سے کتراتا ہے اور مجھ پر مرتا بھی ہے اور میں بھی تو اس کے لیے پاگل ہوتی رہتی ہوں۔

اس نے گاڑی کو برطانوی سفارت خانے کے سامنے لاکر روک دیا۔ گن مین سے کہا۔ ''گیٹ کھولو۔ میں MET آفیسر مرینہ ہوں۔ اندر انفارم کرو۔''

گن مین نے کیبن میں آکر برطانوی سفیر کو اطلاع دی۔ ''لندن کی میٹ آفیسر برہنہ حالت میں آئی ہے۔ اس کے ہاتھ میں گن ہے اور وہ انڈین پولیس افسر کو گن پوائنٹ پر لائی ہے۔ مجھے گیٹ کھولنے کا حکم دے رہی ہے۔''

سفیر نے کہا۔ ''مجھ سے فون پر بات کراؤ۔''

گن مین نے کہا۔ ''میڈم! آپ یہاں آکر فون پر بات کریں۔''

وہ بولی۔ ''پہلے تم یہاں آکر اس کمبخت کو گن پوائنٹ پر رکھو۔ پھر میں کیبن میں آؤں گی۔''

گن مین نے اس کے حکم کی تعمیل کی پھر اس نے کیبن

میں آکر سفیر سے فون پر کہا۔ ''مسٹر جان لیورا! میں میٹ آفیسر مرینہ ہوں۔ مراد منگی نے میرے کپڑے اتار دیے ہیں۔ ایک انسپکٹر میرے راستے میں رکاوٹ بن رہا تھا۔ میں اسے گن پوائنٹ پر یہاں لے آئی ہوں۔ ابھی آپ کے سامنے آکر اپنی روداد بیان کروں گی۔''

''ٹھیک ہے تم اپنی گن سیکیورٹی گارڈ کو دے کر خالی ہاتھ یہاں آؤ۔''

اس نے اپنی گن سیکیورٹی گارڈ کو دی۔ پھر سفارت خانے کی عمارت میں داخل ہوئی۔ اس وقت جہاں سے گزر رہی تھی، وہاں کا عملہ اسے حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ سفیر کے آفس کا دروازہ بند تھا۔ وہاں ایک چپراسی کھڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ''میں میٹ آفیسر مرینہ ہوں۔''

پھر اس نے دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر آئی تو سفیر جان لیورا سے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر بولا۔ ''کون ہو تم؟''

مرینہ نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر جان! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ میں مرینہ ہوں۔ ہم لندن میں کئی بار مل چکے ہیں۔''

سفیر نے فوراً ہی میز کی دراز سے پستول نکال کر کہا۔ ''یو شٹ اپ۔ فوراً بولو۔ کون ہو؟ اور یہاں کس ارادے سے آئی ہو۔''

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ''میں حیران ہوں۔ تم مجھے پہچاننے سے انکار کیوں کر رہے ہو؟''

''اس لیے کہ تم مرینہ نہیں ہوں۔ میں اس کی صورت لاکھوں میں پہچان سکتا ہوں۔''

وہ اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ''تم یہ کہہ رہے ہو کہ میری یہ صورت مرینہ کی نہیں ہے؟ میں کوئی دوسری عورت ہوں؟''

وہ انٹرکام کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''ابھی گارڈز آکر تمہیں یہاں سے لے جا کر پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ تمہیں ٹارچر کیا جائے گا۔ تب تم سچ بولو گی کہ ایک انڈین پولیس افسر کو یہاں گن پوائنٹ پر کیوں لائی ہو؟ اور کس ارادے سے مرینہ بن کر آئی ہو؟''

اس کی بات ختم ہوتے ہی مرینہ نے میز پر رکھے ہوئے پیپر ویٹ کو اٹھا کر اس کے ہاتھ کا نشانہ لیا۔ اس کا نشانہ درست کیسے نہ ہوتا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ایسے وقت وہ بجلی کی تیزی سے ایکشن میں آئی تھی۔ وہ چھلانگ لگا کر میز کے اوپر سے گزرتی ہوئی سفیر کو کک مارتی ہوئی اس کی جگہ پہنچی پھر جھک کر فرش پر سے پستول کو اٹھا لیا۔

وہ لات کھا کر پیچھے گیا تھا۔ پھر سنبھل کر دیکھا تو اپنے ہی پستول کے نشانے پر آگیا تھا۔ وہ بولی۔ ''مسٹر جان! میں دشمن نہیں ہوں۔ ابھی تم سے زیادتی کرنے کی معافی چاہتی ہوں۔ تم نہیں سمجھ سکتے میرے ساتھ کیسی زیادتی ہو رہی ہے۔ یہاں آئینہ ہو تو مجھے دکھاؤ۔ مجھے شبہ ہو رہا ہے کہ میری صورت بدل دی گئی ہے۔''

وہ بولا۔ ''آئینہ میز کی تیسری دراز میں ہے۔''

اس نے دراز کو کھول کر آئینہ نکالا۔ پھر اپنی صورت دیکھتے ہی حیرت سے چیخ پڑی۔ ''او گاڈ! مراد نے کیسی مکاری کی ہے۔ مجھے نئی زندگی دی ہے۔ مگر نئے چہرے کے ساتھ تاکہ میں پہچانی نہ جاؤں اور آئندہ میٹ آفیسر کا عہدہ حاصل نہ کرسکوں۔''

اس نے آئینے کو میز پر پھینک کر سفیر سے کہا۔ ''پلیز فوراً ڈائریکٹر جنرل جان انتھونی سے بات کراؤ۔''

اس نے فون اٹھا کر رابطہ کیا۔ مرینہ نے اس سے فون لے کر اسے اپنے کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے جان انتھونی کی آواز سنائی دی۔ وہ بولی۔ ''سر! میں مرینہ بول رہی ہوں۔''

وہ ایک دم سے جوش میں آکر بولا۔ ''مرینہ! تم کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ تمہارے ساتھ یہاں سے جانے والے ہمارے اہم سراغرساں مارے گئے۔ میں کل سے تمہیں کال کر رہا ہوں لیکن تمہارا فون بند پڑا ہے۔''

وہ بولی۔ ''میرا فون، آئی ڈی کارڈز، میٹ آفیسر کا بیج اور پاسپورٹ سب ہی چھن گیا ہے حتیٰ کہ میرے تن کا لباس بھی اتار لیا گیا ہے اور کیا بولوں، مجھ سے میرا چہرہ بھی چھین لیا گیا ہے۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہو؟''

''مراد سے مقابلہ بہت مہنگا پڑا ہے۔ میری جان بچ گئی ہے۔ یہی غنیمت ہے۔ وہ مکار چاہتا ہے کہ میں مرینہ کی حیثیت سے پہچانی نہ جاؤں۔ میں نے ابھی آئینہ دیکھا ہے۔ میرے چہرے پر پلاسٹک سرجری کے ذریعے تبدیلی لائی گئی ہے۔''

''تم ابھی جان لیور کے فون سے بول رہی ہو؟''

''جی ہاں۔ مسٹر جان مجھے مرینہ تسلیم نہیں کر رہے ہیں۔ میں مراد کی چال کو کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔ پہلے میں آپ کو خفیہ کوڈ نمبرز بتا رہی ہوں۔ آپ یہ نمبر سن کر یقین کرلیں گے کہ میں ہی میٹ آفیسر ہوں۔''

وہ بولتے بولتے رک گئی۔ ڈاکٹر ممی سن کی دوا نے

ری ایکٹ کیا۔ اس نے اچانک کمزوری محسوس کی۔ اس کے ساتھ ہی ہاتھ سے فون چھوٹ گیا۔ پستول چھوٹ گیا۔ وہ میز پر جھکتے جھکتے فرش پر گر پڑی۔ جان لیور نے پریشان ہوکر اسے دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ”کیا ہوا میڈم؟“

وہ فرش پر گرنے کے بعد تھوڑی دیر تک ساکت پڑی رہی۔ سفیر نے فون اٹھا کر کہا۔ ”مسٹر انتھونی! یہ آپ سے باتیں کرتے کرتے اچانک ہی گر پڑی ہے۔“ پھر وہ مرینہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ اٹھ کر بیٹھ رہی ہے۔ میں آپ سے بات کراتا ہوں۔“

وہ فرش پر مرینہ کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ”آر یو آل رائٹ؟ لو بات کرو۔“

وہ فون کو اور جان لیور کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کس سے بات کروں؟ کون ہو تم؟“

”ہائیں؟“ وہ حیرانی سے بولا۔ ”مجھے جانتے ہوئے بھی پوچھ رہی ہو کہ میں کون ہوں؟“

وہ پریشان ہوکر بولی۔ ”میرے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے؟ ابھی میں کچرا گھر میں تھی، یہاں کیسے آگئی؟“

جان لیور نے فون کو کان سے لگا کر کہا۔ ”مسٹر انتھونی! آپ اس کی باتیں سن رہے ہیں۔ یہ ابنارمل ہے۔ چند لمحے پہلے مجھے پہچان رہی تھی۔ اب مجھے اجنبی سمجھ رہی ہے۔“

پھر وہ مرینہ سے بولا۔ ”تم مجھے نہیں پہچانتیں۔ اپنے ڈائریکٹر جنرل جان انتھونی کو تو پہچانتی ہو؟“

”یہ کون ہے؟ کہاں کا ڈائریکٹر جنرل ہے؟“

وہ فون پر بولا۔ ”یہ آپ کو بھی پہچاننے سے انکار کر رہی ہے۔ آپ اس سے بات کریں گے۔“

جان انتھونی نے کہا۔ ”اس سے پوچھو کہ وہ کون ہے؟“

جان لیور نے اس سے یہی سوال کیا۔ وہ بولی۔ ”ابھی تو میں کچرا گھر میں انسپکٹر سے پوچھ رہی تھی۔ لوگوں سے بھی پوچھ رہی تھی کہ میں کون ہوں؟ شاید وہ مجھے جانتے ہوں۔ انہوں نے بتایا ہوگا کہ میں کون ہوں؟ مگر میں یہاں کیسے آگئی۔ وہ بہت سارے لوگ تھے، کہاں چلے گئے؟“

”میڈم! ہم بھی جانتے ہیں، تم کون ہو؟ تمہارا نام مرینہ ولاور ہے۔ ابھی تم خود ہی کہہ رہی تھیں۔ پھر اچانک ہی اپنے آپ کو نہیں پہچان رہی ہو۔“

اس نے جان لیور کے ہاتھ سے فون چھین کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ ”اے تم کون ہو؟ کیا میرا نام مرینہ ہے؟ کیا تم مجھے جانتے ہو؟“

”تمہاری آواز اور لہجے سے پہچان رہا ہوں۔ تھوڑی دیر پہلے باتیں کرتے وقت تم ہوش و حواس میں تھیں۔ اچانک ابنارمل ہوگئی ہو۔ میرا اندازہ ہے کہ مراد نے تمہارے ساتھ ایسا کچھ کیا ہے کہ تم خود کو اجنبی سمجھ رہی ہو اور تمہیں اجنبی بن کر رہنے کے لیے اس نے تمہارا چہرہ بدل دیا ہے پلیز یہ فون مسٹر لیور کو دو۔“

اس نے فون جان لیور کی طرف بڑھایا۔ وہ اسے لے کر کان سے لگا کر بولا۔ ”جی فرمایئے؟“

جان انتھونی نے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ یہ مرینہ ہے، آپ اس پر خصوصی توجہ دیں۔ اسے سخت سیکیورٹی میں رکھتے ہوئے مینٹل اسپتال میں داخل کرائیں۔ مہنگے اور تجربہ کار دماغی امراض کے ماہرین سے علاج کرائیں۔ ایک بار پھر کہتا ہوں سیکیورٹی سخت ہونی چاہیے۔ مراد علی منگی اس کی تاک میں رہے گا۔ ہمارے جاسوس بھی اس کی تاک میں رہیں گے۔ آپ کو بہت محتاط رہنا ہوگا۔“

مراد نے پلاننگ کی تھی کہ اسے ابنارمل بنا کر کسی کچرا گھر میں پہنچا کر اسے پگلی کے طور پر پیش کیا جائے۔ ڈاکٹر مجی بن نے کہا تھا کہ وہ انجکشن کے اثر سے کبھی ابنارمل رہے گی۔ کبھی نارمل ہوجائے گی۔ اگر اس کے ڈیپارٹمنٹ والے اس سے غافل رہیں گے۔ چہرے کی تبدیلی کے باعث اسے پہچان نہیں سکیں گے تو قانون کے محافظ اسے ایک لاوارث دماغی مریضہ سمجھ کر کسی پاگل خانے میں پہنچا دیں گے۔

مرینہ کی قسمت اچھی تھی، اس نے نارمل رہنے کے دوران ڈائریکٹر جنرل سے حواس میں رہ کر فون پر باتیں کی تھیں اور اسے اپنے اعتماد میں لے لیا تھا۔ اب وہ سخت سیکیورٹی میں رہ کر مہنگے اور تجربہ کار ماہرین کے زیر علاج رہنے والی تھی۔

☆☆☆

جگنی بائی بڑی دیانت داری سے مراد کی ہم راز بن کر اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ اس کے باوجود مراد نے اسے پوری طرح راز دار نہیں بنایا تھا۔ اسے دھوکے میں رکھا تھا کہ عبداللہ کبڈی ہی مراد علی منگی ہے اور ایک تانترک مہاراج نے اسے بونا بنا دیا ہے۔

اب وہ دل سے تسلیم کر رہا تھا کہ جگنی بائی پر آنکھیں بند کرکے بھروسا کرسکتا ہے۔ اس نے کبڈی کو مراد سمجھ کر اسے بیٹا بنایا تھا اور ایک ماں بننے کا حق ادا کرتی آرہی تھی۔ اس نے پریس کانفرنس کے ذریعے پورے انڈیا میں یہ بات پھیلا دی تھی کہ بونا کبڈی مراد کا ہم شکل ہے لیکن مراد نہیں ہے۔ قانون کے محافظ اسے مراد سمجھ کر گرفتار نہ کریں اور اس

کی تلاش میں بھٹکنے والے بدنام زمانہ قاتل اور جاسوس اس بونے کو مراد کے دھوکے میں گولی نہ ماریں۔ عقل سے سوچیں کہ کوئی قدآور جادو سے بھی بونا نہیں بن سکتا۔

تمام خطرناک تنظیموں کے شوٹرز اس بونے کو دیکھ کر الجھ گئے تھے۔ انہوں نے اسے ٹارگٹ نہیں بنایا تھا وہ قدآور مراد کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔

دشمنوں کو یقین تھا کہ مرینہ دہلی آکر مراد سے ضرور ملے گی۔ درجنوں شوٹرز اور مرینہ کے اپنے جاسوس مراد کو پکڑنے کے لیے ائرپورٹ سے مرینہ کی نگرانی کرتے رہے تھے۔ ایسے وقت جگنی بائی کی گھاگ ر اپلٹن نے کام دکھایا تھا۔ دہلی کی سڑکوں پر کئی لاشیں گرادی تھیں۔ مراد کو بھرپور سیکیورٹی دی تھی۔ جس کے نتیجے میں وہ ایک گولی چلائے بغیر مرینہ کو فارم ہاؤس میں لے گیا تھا۔

اس نے مرینہ کے کس بل ڈھیلے کردیے تھے اور ڈاکٹر نے اسے ایک انجکشن کے ذریعے بے ہوش کردیا تھا۔ تب وہ مرینہ کو سرجری کے لیے وہیں چھوڑ کر جگنی بائی کے ساتھ اس کی رہائش گاہ میں آگیا تھا۔

اس نے جگنی بائی کو بتایا کہ مرینہ کا چہرہ تبدیل کیا جارہا ہے۔ انجکشن کے اثر سے وہ نیم پاگل رہا کرے گی۔ کبھی نارمل رہے گی کبھی خود کو بھول جایا کرے گی۔ جگنی نے پوچھا۔ ''اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

وہ بولا۔ ''اب تو رات ہوگئی ہے۔ صبح ہونے سے پہلے آپ اپنی تابعدار خواتین کو حکم دیں کہ وہ مرینہ کو کسی کچرا گھر میں ڈال کر چلی جائیں۔ میں دور سے اس کی نگرانی کرتا رہوں گا۔''

''میں بھی تمہارے ساتھ رہوں گی۔ دیکھوں گی کہ وہ ابنارمل رہ کر کس طرح پاگل خانے میں پہنچائی جائے گی۔'' پھر وہ بولی۔ ''میرا بیٹا مراد بہت ہی عاشق مزاج ہے۔ پاکستان میں ماروی سے عشق کرتا رہا۔ یہاں فرمونا کا دیوانہ ہوگیا ہے۔''

مراد نے پوچھا۔ ''کیا فرمونا کے ماں باپ اسے داماد بنانے پر راضی ہوجائیں گے؟''

''راضی ہوگئے ہیں۔ میرے مراد جیسا داماد ڈھونڈنے سے نہیں ملے گا۔ میں نے بات پکی کردی ہے۔''

وہ بہت خوش ہورہی تھی۔ اپنے بیٹے کے لیے اس کے قد کے برابر بونی بہو لانے والی تھی۔ مراد نے اس کی محبت اور ممتا کو دیکھ کر کہا۔ ''آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔''

''ہاں کہو۔ تم بھی میرے بیٹے جیسے ہو؟''

وہ بولا۔ ''مراد جیسے خطرات سے کھیلتا آرہا ہے اس کا تقاضا ہے کہ وہ کسی کو اچھی طرح آزمائے بغیر اس پر بھروسا نہ کرے اور اپنا رازدار نہ بنائے۔''

''ٹھیک کہتے ہو۔ مراد کو اپنے سائے پر بھی بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔''

''آپ برا نہ مانیں۔ ہم نے اب تک آپ پر بھی بھروسا نہیں کیا تھا لیکن اب کررہے ہیں۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو؟ میں سمجھی نہیں؟''

اس نے بڑے ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ وہ بولا۔ ''وہ سچ مچ عبداللہ کبڑی ہے، مراد نہیں ہے۔''

جگنی بائی نے اسے بے یقینی سے دیکھا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ''اب میں آنکھیں بند کرکے آپ پر بھروسا کررہا ہوں اور یہ راز بتارہا ہوں کہ مراد علی منگی میں ہوں۔''

وہ بڑے غور سے اس کی صورت دیکھنے لگی۔ مراد نے کہا۔ ''وہ تانترک مہاراج والی کہانی جھوٹی ہے۔ ہم نے دشمنوں کو الجھائے رکھنے کے لیے کبڑی کے چہرے پر مراد کا چہرہ یعنی میرا چہرہ بنایا ہے۔''

''تم مراد ہو؟ ڈاکٹر مگنی سن کے بیٹے نہیں ہو؟''

وہ دونوں ہاتھوں سے اس کے چہرے کو چھونے لگی۔ اس نے کہا۔ ''یہ کبڑی، ڈاکٹر ڈیڈی اور دھرم داس جی جانتے ہیں، آج فائٹ کرتے وقت مرینہ کو معلوم ہوا کہ یہ میرا موجودہ چہرہ ہے اور اب آپ کو رازدار بنارہا ہوں۔''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''اب مجھ پر اعتماد ہوا ہے اور سچ مچ اپنا رازدار بنارہے ہو۔''

اس نے کہا۔ ''آپ سے ایک التجا ہے۔ یہ راز اپنی کسی بیٹی کو نہ بتائیں۔''

''کبھی نہیں بتاؤں گی۔ میں ماں ہو کر جانتی ہوں۔ وہ تینوں مراد علی منگی کی دیوانی ہیں۔ تمہارا جینا دوبھر کردیں گی۔''

اس بات پر دونوں ہنسنے لگے۔ یہ صرف ہنسنے کا ہی نہیں رونے کا بھی مقام تھا۔ کمرے کے باہر ورشا کھڑکی سے لگی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ ماں کو اطمینان تھا کہ تینوں بیٹیاں اپنے اپنے بیڈروم میں سورہی ہیں۔

اتفاق سے ورشا کی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ جماہی لیتی ہوئی پانی پینے کے لیے ڈائننگ روم میں آئی تھی پھر ان کی باتیں سن کر ٹھٹک گئی تھی۔

اس نے واضح طور پر سنا تھا اور سنتے ہی دل کی دھڑکنیں پاگل ہونے لگیں۔ جسے تصور میں دیکھتی تھی، وہ سامنے کچھ فاصلے پر چہرے پر چہرہ لگائے بیٹھا تھا۔ اگر ماں

وہاں موجود نہ ہوتی تو وہ دوڑتی ہوئی جا کر اس سے لپٹ جاتی۔ اسے یقین دلاتی کہ اس کی رازدار بن کر رہے گی اور اس کی آئیڈیل دھرم پتنی بن کر اس کی سیوا کرتی رہے گی۔

وہ دبے قدموں اپنے بیڈروم میں واپس آ گئی۔ سوچنے لگی کہ ایسا کیا کرے، کہ بہنوں کو یہ راز معلوم نہ ہو۔ اس نے بیڈ کے سرے پر بیٹھ کر ایک تکیے کو اٹھا کر اسے اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ اس کے اندر ایسی ہلچل اور بے چینی تھی کہ ابھی جا کر اس کے سینے سے لگ جانا چاہتی تھی۔

ادھر مراد جگنی بائی سے باتیں کر رہا تھا۔ دونوں اس بات سے بے خبر تھے کہ ایک سرپھری لڑکی کو یہ راز معلوم ہو گیا ہے۔ جگنی بائی نے مراد سے باتیں کرنے سے پہلے تینوں بیڈروم میں جا کر دیکھ لیا تھا اور تینوں بیٹیوں کو گہری نیند میں دیکھ کر مطمئن ہو گئی تھی۔

مراد نے کہا۔ ''میرا پاسپورٹ اور اہم کاغذات تیار ہو چکے ہیں۔ کل تک عبداللہ کبڈی کا پاسپورٹ مل جائے گا۔''

جگنی بائی نے کہا۔ ''کبڈی تمہارا ہم شکل ہے۔ اس پر اگرچہ شبہ نہیں کیا جارہا کہ وہ پاکستانی جاسوس مراد علی منگی ہے۔ پھر بھی وہ یہاں سے پاسپورٹ کے ذریعے پاکستان جائے گا تو شبہ ہوگا کہ وہ پاکستان کیوں جارہا ہے؟''

''ہم نے ہر پہلو پر اچھی طرح غور کیا ہے۔ ہم یہاں سے سیدھے پاکستان نہیں جائیں گے۔ ڈاکٹر ڈیڈی کے ساتھ پہلے لندن جائیں گے، کبڈی وہیں رہ جائیں گے۔ میں کبڈی کے ساتھ پاکستان چلا جاؤں گا۔''

''وہ فرمونا سے شادی کرنے یہاں آئے گا تو اس کا پاسپورٹ چیک کرنے والے سوال کریں گے کہ وہ پاکستان کیوں گیا تھا؟ انٹیلی جنس والے اس کے پیچھے پڑ جائیں گے۔''

مراد ذرا چپ رہا۔ سوچتا رہا پھر بولا۔ ''آپ فرمونا کے والدین سے بات کریں، آج کل میں بیٹی کی شادی کبڈی سے کردیں تو وہ اسے لندن لے جائے گا۔ آئندہ وہیں اس کے ساتھ زندگی گزارے گا۔ انڈیا واپس نہیں آئے گا۔''

''بیٹے! یہ تو گڈے گڑیا کا کھیل ہوتا ہے۔ صبح سوچا اور شام کو شادی ہو گئی۔ وہ راضی نہیں ہوں گے پھر بھی میں ان سے بات کروں گی۔''

مراد نے کبڈی سے فون پر پوچھا۔ ''کہاں ہو؟''

وہ بہت خوش تھا۔ بڑی ترنگ میں بولا۔ ''فرمونا کے پاس ہوں۔ وہ کچن میں ہے...... مجھے اپنے ہاتھ کا پکوان کھلا کر یہاں سے جانے دے گی۔ یار! خدا مجھ پر مہربان ہے۔ یہ بہت اچھی لڑکی ہے بہترین شریکِ حیات ثابت ہوگی۔''

مراد نے کہا۔ ''اس کے والدین راضی ہیں لیکن ہمارے حالات ایسے ہیں کہ تمہاری شادی کھٹائی میں پڑ سکتی ہے۔''

مراد جگنی بائی سے ہونے والی باتیں اسے بتانے لگا۔ اس نے تمام باتیں سننے کے بعد کہا۔ ''میں ابھی فرمونا کے والدین سے بات کروں گا۔ ہمارے سامنے دو ہی راستے ہیں کہ دو چار دنوں میں ہماری شادی ہو جائے۔ ورنہ فرمونا کے والدین اسے ایک آدھ ماہ بعد لندن لے کر آئیں تو وہاں اسے میری دلہن بنائیں۔ واقعی میں پاکستان میں قدم رکھنے کے بعد انڈیا واپس نہیں آسکوں گا۔ بہرحال میں ابھی بات کرتا ہوں۔''

کبڈی سے بات ہو گئی۔ مراد نے کہا۔ ''ماتا جی! کافی دیر ہو چکی ہے۔ میں گھر جا کر عشا کی نماز پڑھوں گا۔''

''اب رات کے وقت کہاں جاؤ گے؟ یہاں نماز پڑھ لو۔ یہیں رات گزارو۔ صبح چلے جانا۔''

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''معاف کریں ماتا جی! آپ کے گھر میں خطرے کی ایک نہیں تین گھنٹیاں ہیں۔ صبح تک بجتی رہیں گی۔ مجھے سونے نہیں دیں گی۔''

جگنی بائی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اصل بات بتاؤں کہ یہ لڑکیاں ایک دوسری کو مات دینے اور نیچا دکھانے کے لیے تم سے عشق کر رہی ہیں۔ وہ نہیں چاہتیں کہ ان کے مقابلے میں کوئی دوسری تمہیں جیت لے۔''

''لیکن وہ تو قریب آ کر کچھ زیادہ ہی اوور ہو جاتی ہیں۔''

''میں ماں ہوں، دعوے سے کہتی ہوں کہ وہ اپنے آپ پر بہت کنٹرول رکھتی ہیں۔ انہوں نے آج تک نہ کوئی گناہ کیا ہے نہ کریں گی۔ اب سے پہلے بھی وہ تینوں ایک نوجوان کے پیچھے پڑ گئی تھیں۔ آخر بڑی بیٹی مینا نے اسے جیت لیا پھر جیتنے کے بعد ٹھینگا دکھا کر کہا۔ تماشا ختم، ابھی شادی کا ارادہ نہیں ہے۔ ہمیں گھرانا پلٹن میں ماتا جی کی گدی سنبھالنی ہے۔''

وہ بڑے فخر سے بولی۔ ''میری بیٹیاں زبردست فائٹر ہیں صرف کسی مرد کے لیے نہیں، میری گدی حاصل کرنے کے لیے بھی تینوں ہمیشہ ایکشن میں رہتی ہیں اور زیادہ سے زیادہ، نمایاں کارنامے انجام دے کر میری گدی کی حق دار بننا چاہتی ہیں۔''

پھر اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں دیر ہو رہی ہے چلو میں چھوڑ آتی ہوں۔''

''آپ اتنی رات کو مجھے چھوڑنے جائیں گی اور تنہا

واپس آئیں گی۔ مجھے اچھا نہیں لگے گا۔ آپ کار کی چابی دیں۔ ویسے بھی صبح یہاں آنا ہے اور ہمیں کسی کچرا گھر میں جانا ہے۔"

اس نے مسکرا کر کہا۔ "وہ بہت اچھلتی ہوئی لندن سے آئی تھی۔ میں دیکھوں گی کہ وہ بدبو کے ڈھیر میں خود کو پا کر کیسے ری ایکٹ کرے گی؟"

وہ دونوں کوٹھی کے باہر آئے، کار احاطے میں کھڑی ہوئی تھی۔ جگنی بائی نے کہا۔ "میری پلٹن کی تین عورتیں ڈاکٹر کے پاس ہیں، وہی مرینہ کو وہاں سے کسی کچرا گھر میں پہنچائیں گی پھر مجھے اطلاع دیں گی۔ تب میں تمہیں کال کروں گی۔"

"میں آپ کی کال سنتے ہی یہ گاڑی لے آؤں گا۔"

وہ اسٹیئرنگ سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا پھر کار اسٹارٹ کر کے "شبھ راتری" کہتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ جگنی بائی نے کوٹھی کے اندر آکر ماں جگدمبے کی مورتی کے آگے سر جھکایا۔ ہاتھ جوڑ کر زیر لب پرارتھنا کی۔ پھر اپنے بیڈروم کی طرف جاتے جاتے رک گئی۔ اسے تینوں بیٹیوں کا خیال آیا۔ اس نے نینا کے کمرے کا دروازہ کھول کر دیکھا۔ وہ سو رہی تھی۔ دوسرا دروازہ کھولا تو ڈولی بھی گہری نیند میں تھی۔ اس نے تیسرا دروازہ کھولا تو بیڈ خالی تھا۔ ورشا نہیں تھی۔

اس نے کمرے میں آکر واش روم کے بند دروازے سے کان لگا کر سنا۔ اندر خاموشی تھی۔ اس نے ہلکی سی دستک دے کر پوچھا۔ "تم یہاں ہو......؟"

اسے جواب نہیں ملا۔ ماں نے دروازے کے ہینڈل پر دباؤ ڈالا تو وہ کھل گیا۔ ورشا وہاں نہیں تھی۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی اسٹور روم کے دروازے پر آئی۔ اسے کھول کر دیکھا تو یقین ہو گیا کہ وہ اتنی رات کو گھر سے باہر گئی ہے۔

تینوں لڑکیوں کو دن رات کہیں بھی جانے کی آزادی تھی لیکن وہ ماں سے کہہ کر جاتی تھیں کہ کہاں جا رہی ہیں اور کیوں جا رہی ہیں۔ ورشا پہلی بار ماں کو اطلاع دیے بغیر گئی تھی۔ دل میں بات آئی، کیا مراد کے پیچھے گئی ہے؟ آج تک ایسا نہیں ہوا۔ کوئی بیٹی اتنی رات کو اجازت لیے بغیر نہیں جاتی۔ یہ کمبخت گئی کہاں ہے؟

اس نے اپنے فون پر اس کے نمبر پنچ کیے۔ پھر اسے کان سے لگایا اور سنا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ ایسے وقت اس نے چونک کر بیڈ کی طرف دیکھا۔ تکیے کے نیچے سے فون جھانک رہا تھا اور وہاں سے رنگ ٹون ابھر رہی تھی۔ جگنی نے اپنا فون بند کیا تو ادھر سے رنگ ٹون بھی بند ہو گئی۔ وہ اپنا فون چھوڑ کر گئی تھی۔

ماں نے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا۔ دماغ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ وہ مراد کے پیچھے گئی ہے لیکن کیسے گئی ہے؟ مراد تو تنہا کار میں گیا ہے۔ کیا وہ پہلے ہی اس کے گھر پہنچ گئی ہے؟

اس نے سوچا، تھوڑی دیر انتظار کرے جب مراد گھر پہنچ جائے گا تو فون پر معلوم کرے گی کہ ورشا وہاں پہنچی ہوئی ہے یا نہیں؟

مراد ونڈ اسکرین کے پار دیکھتا ہوا کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ ڈرائیونگ کے اصولوں کے مطابق دائیں بائیں آگے پیچھے بیک وقت توجہ دینی پڑتی ہے۔ وہ اس وقت ایسے راستے پر جا رہا تھا جہاں زیادہ گاڑیاں نہیں چل رہی تھیں اور کوئی دشمن تعاقب میں نہیں تھا۔ اس لیے وہ کسی اندیشے میں مبتلا نہیں تھا۔ پیچھے نہیں دیکھ رہا تھا۔

وہ ایسے ہی وقت پیچھے سے سیٹوں کے درمیان سے چپ چاپ طلوع ہوئی، ٹھیک اس کے پیچھے سیٹ پر بیٹھ کر مسکرانے لگی۔ جسے حاصل کرنا چاہتی تھی۔ وہ ایک ہاتھ کے فاصلے پر تھا۔

ایسے وقت مراد نے محسوس کیا جیسے کار کی محدود فضا میں اور تنہائی میں بہت ہلکی سی آہٹ یا لباس کی سرسراہٹ ابھری ہو۔ پھر اس نے سوچا یہ فریب سماعت ہے۔ میں کار میں تنہا ہوں۔ کسی کی آہٹ کہاں سے پیدا ہوگی؟

وہ اگلی سیٹ کی پشت پر دونوں ہاتھ رکھ کر اس کی گردن پر جھک گئی۔ اس کے پسینے کی مہک کو سونگھنے لگی۔ ایسے وقت اس نے اپنی گردن پر گرم سانسیں محسوس کیں۔ یکبارگی اسٹیئرنگ بہک گیا۔ گاڑی ادھر سے ادھر بھٹکنے لگی اس نے بڑی پھرتی سے اسے قابو میں کرتے ہوئے سڑک کے کنارے روکا۔ فوراً ہی پلٹ کر دیکھا تو گاڑی کے بھٹکنے سے وہ بھی ادھر ادھر ہوتی ہوئی سیٹوں کے درمیان گر پڑی تھی۔ اب کراہتی ہوئی وہاں سے اٹھ رہی تھی۔ وہ حیرانی سے بولا۔ "ورشا...... تم؟"

وہ کمر پکڑ کر کراہتے ہوئے بولی۔ "ہائے! تم نے تو مجھے مار ہی ڈالا ہے۔ کیا پریم کرنے والی سے ایسا برتاؤ کرتے ہیں۔"

اس نے کہا۔ "سمجھ گیا۔ تم پہلے سے یہاں آکر چھپ گئی تھیں۔ یہ کیا حرکتیں ہیں ورشا؟ تم تینوں اچھی طرح جان گئی ہو کہ نہ مجھے حسن و شباب کی رنگینیوں سے دلچسپی ہے۔ نہ میں تم تینوں میں سے کسی سے بھی جسمانی تعلق رکھوں گا۔"

"پہلے مجھے معلوم نہیں تھا۔ ابھی معلوم ہوا ہے کہ تم کسی بھی لڑکی کو منہ کیوں نہیں لگاتے ہو۔ میں بہت حسین ہوں اور نوجوان ہوں، یہ مجھے آئینہ کہتا ہے اور دنیا بھی کہتی ہے

لیکن تم میری طرف مائل نہیں ہوتے، اس کی وجہ ابھی معلوم ہوئی ہے۔"

اس نے گھور کر پوچھا۔ "تمہیں کیا معلوم ہوا ہے؟"

"یہی کہ......" وہ بڑے بچے تلے انداز میں بولی۔ "تم صرف ماروی کے دیوانے ہو۔ اس کے سوا کسی کو منہ نہیں لگاؤ گے۔ ہے نا یہی بات؟"

وہ ٹھٹک گیا، ذرا سنبھل گیا۔ پھر بولا۔ "یہ کیا بول رہی ہو؟ ماروی کا دیوانہ تو وہ مراد ہے۔"

"مراد ہوتا نہیں ہوسکتا۔ تا مترک مہاراج کی جھوٹی کہانی سنائی گئی ہے، پھر یہ کہ وہ مراد ہوتا تو اپنی ماروی کو بھول کر فرمونا پر عاشق نہ ہوتا اور اب تو وہ اس سے شادی کرنے والا ہے۔"

وہ اس کی طرف جھکتی ہوئی بولی۔ "کیا مراد ایسا ہے؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "حالات انسان کو بدل دیتے ہیں، ہمارے دین میں بحالتِ مجبوری دوسری شادی کرنے کی اجازت ہے۔ اس کی مجبوری یہ ہے کہ اسے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق پاکستان میں رہنا ہوگا اور تمہارے اس دیس میں بھی آتے جاتے رہنا ہوگا۔ اس لیے ماروی وہاں اس کی شریکِ حیات رہے گی اور یہاں فرمونا اس کا گھر بسائے گی۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "یعنی ماروی وہاں تمہاری شریکِ حیات بن کر رہے گی اور یہاں میں تمہاری دھرم پتنی بن کر تمہاری سیوا کرتی رہوں گی۔"

وہ پھر ٹھٹک گیا۔ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "یہ...... یہ کیا کہہ رہی ہو؟ میں ماروی سے شادی کیوں کروں گا؟ اس سے تو مراد شادی کرے گا۔"

وہ اس کے سینے پر ایک انگلی چھوتے ہوئے بولی۔ "اور مراد تم ہو۔ اب کھل جاؤ، زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ ابھی تم نے ماتا جی سے جتنی باتیں کی ہیں، وہ سب میں نے سن لی ہیں۔"

وہ اس کا منہ تکنے لگا۔ پریشان ہونے کی بات تھی۔ ایک انتہائی غیر سنجیدہ اور خود غرض لڑکی اس کا راز معلوم کر چکی تھی۔

وہ بولی۔ "پریشان کیوں ہوتے ہو؟ کیا میں پیٹ کی ہلکی ہوں کہ دوسروں سے تمہارے اندر کی بات بولتی پھروں گی؟ تم مجھے کسی بھی طرح آزما لو۔ میں اپنی جان دے دوں گی لیکن تمہارا یہ راز اپنی زبان تک نہیں آنے دوں گی۔"

وہ پچھلی سیٹ سے اگلی سیٹ کی طرف جھک گئی۔ اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر بولی۔ "آج سے ہم ایک دوسرے کے رازدار بن کر رہیں گے مراد......! میں نے تمہارے ہی لیے جنم لیا ہے۔ اگلے سات جنموں تک تمہارے ہی لیے پیدا ہوتی رہوں گی۔"

وہ اپنی گردن سے اس کی بانہوں کو الگ کرتے ہوئے بولا۔ "کیا کر رہی ہو؟ یہ سڑک ہے۔ کیا تماشا بناؤ گی، بھیڑ لگاؤ گی؟"

اسی وقت ایک پولیس افسر نے کار کی باڈی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "اے باہر نکلو۔ کیا چومنے چاٹنے کے لیے گھر چھوٹا پڑ گیا تھا کہ کھلی سڑک پر آگئے ہو؟"

مراد نے گھور کر درشا کو دیکھا، پھر کار سے باہر آکر بولا۔ "آفیسر! آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ یہاں ایسا کچھ نہیں ہو رہا ہے۔"

وہ بولا۔ "میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، کیا تم بہن سمجھ کر اسے گلے لگا رہے تھے؟"

مراد نے دیکھا۔ دو سپاہی اس کے دائیں بائیں آکر یوں کھڑے ہو گئے تھے جیسے گرفتار کر کے لے جانے والے ہوں، اس نے جیب سے نوٹوں کی چھوٹی سی گڈی نکالی۔ اس میں سے سو سو کے پانچ نوٹ وردی کی اوپری جیب میں رکھے۔ دو سپاہیوں کو سو سو روپے دیے، پھر کچھ کہے سنے بغیر اسٹیئرنگ پر آکر بیٹھ گیا۔ کار کو اسٹارٹ کیا، باہر جیسے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا وہ قانون کے محافظوں کے سامنے سے گزرتا چلا گیا۔

درشا اگلی سیٹ پر اس کے برابر آکر بیٹھ گئی تھی۔ وہ کار کی رفتار بڑھاتے ہوئے بولا۔ "اگر رشوت کام نہ آتی تو ابھی ہم حوالات میں ہوتے۔ فار گاڈ سیک، چپ چاپ بیٹھی رہو۔ اب کوئی تماشا نہ کرو۔ میں گھر پہنچ جاؤں گا تو تم اپنی ماتا جی کی یہ گاڑی لے جانا۔ اگر انہیں معلوم ہوگا کہ تم گھر میں نہیں ہو تو وہ پریشان ہو جائیں گی۔"

وہ بڑے عزم سے بڑے ہی ٹھوس لہجے میں بولی۔ "میں واپس جانے کے لیے نہیں آئی ہوں۔"

اس نے ناگواری سے پوچھا۔ "پھر کہاں جانے کے لیے آئی ہو؟ خواہ مخواہ فضول باتیں کر رہی ہو۔"

"میں تمہاری رازدار بن چکی ہوں۔ مجھ سے دوستی کرو۔ ہم آج کی رات گزاریں گے پھر میں صبح چلی جاؤں گی۔ اس کے بعد ہم ملتے رہا کریں گے۔ تم پاکستان جا کر ماروی کو اپنی دلہن بناؤ گے۔ پھر یہاں آؤ گے تو میں تمہاری دھرم پتنی بن جاؤں گی۔"

وہ گاڑی کو ایک سڑک پر موڑتے ہوئے بولا۔ "جیسا سوچ رہی ہو، ویسا کچھ نہیں ہوگا۔ میں اپنی ماروی کے اعتماد

کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔ اس پر کوئی سوکن نہیں لاؤں گا۔"

اس نے چیلنج کرنے کے انداز میں پوچھا۔ "کیا تم نہیں چاہتے کہ میں تمہارا راز اپنے سینے میں چھپا کر رکھوں؟"

اس نے پوچھا۔ "صاف صاف بولو۔ کیا میں تمہارے ساتھ راتیں کالی کرتا رہوں گا تو میرا راز چھپا کر رکھوگی ورنہ نہیں؟"

"تم ہی بولو۔ جب تم سے پیار نہیں ملے گا تو کیوں رازدار بن کر رہوں گی۔"

"یعنی دشمنوں کو بتادوگی کہ میں مراد علی منگی ہوں۔"

"اتنی جلدی ایسی دشمنی نہیں کروں گی۔ پہلے تمہارے راستے کی رکاوٹیں بنتی رہوں گی، تمہیں مجبور کرتی رہوں گی۔"

"معلوم تو ہو کس طرح مجبور کرتی رہوگی؟"

"تمہارا پاسپورٹ اور ضروری کاغذات تیار ہو چکے ہیں، انہیں اٹھا کر پھینک دو۔ میں تمہیں پاکستان جانے نہیں دوں گی۔ جب میرے نہیں بنو گے تو ماروی کے بھی نہیں بنو گے۔ مجھے ٹھکرا کر جانا چاہو گے تو تمہیں بارڈر پر روک لیا جائے گا۔ آرمی اور انٹیلی جنس والے سرجری کے ماہر ڈاکٹر ممنی سن کو حراست میں لیں گے۔ اس کے بعد تمہارے اس چہرے کے پیچھے چھپا ہوا مراد آسانی سے باہر آجائے گا۔"

وہ ڈرائیو کرتا ہوا ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے بولا۔ "اچھا تو تم مخبری کروگی۔ دشمنی کا ارادہ کر چکی ہو۔ ان لمحات میں تم بہت خوش نصیب ہو کہ ماتا جی کی بیٹی ہو۔ اس ماتا جی کی، جو کسی غرض یا لالچ کے بغیر میری ماں بننے کا ثبوت دیتی آرہی ہیں۔ ان کی مہربانیوں سے ہی میں بہ آسانی اپنی ماروی کے پاس جاسکوں گا۔" اس نے کن انکھیوں سے ورشا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "شکر کرو کہ ان کی بیٹی ہو۔ کوئی اور ہوتیں تو ابھی ایک کے بعد دوسری سانس نہیں لے پاتیں۔"

وہ ہنستی ہوئی بولی۔ "کیا تم مجھے ایک کمزور لڑکی سمجھ رہے ہو؟ میں مرینہ سے زیادہ خطرناک ہوں۔ پلیز بات نہ بڑھاؤ، دوستی کرو، پھر کسی رکاوٹ کے بغیر ماروی کے پاس جا کر عیش کرو۔"

اس نے ڈاکٹر ڈیڈی کے بنگلے کے احاطے میں آکر کار روک دی' وہ بولی۔ "اور یہ بات یاد رکھو، تم ماتا جی کو میرے بارے میں فون نہیں کروگے۔ انہیں معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"مجھے تو ان سے بات کرنی ہوگی۔ یہ بتانا ہوگا کہ تم مجھے بلیک میل کر رہی ہو۔"

"تو پھر فون کرو۔ میں جارہی ہوں۔ وہ مجھے کہیں ڈھونڈ نہیں سکیں گی۔ میں تمہیں بھی نظر نہیں آؤں گی لیکن میری دشمنی تمہیں دکھائی دیتی رہے گی۔ یہ لکھ لو کہ تم کبھی پاکستان اپنی ماروی کے پاس نہیں جاسکو گے۔"

وہ اسے گہری سنجیدگی سے دیکھنے لگا۔ ویسے بھی بدترین حالات سے گزر رہا تھا۔ اب ایک نازک موڑ پر آن پہنچا تھا۔ اس نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ "اچھی بات ہے۔ میں تمہاری ماتا جی سے بات نہیں کروں گا۔"

وہ کار کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ "باہر نکلو۔"

پھر باہر آکر بولا۔ "نہیں۔ بیٹھی رہو۔ ابھی ڈیڈی دروازہ کھولنے آئیں گے۔ تمہیں ان کی نظروں میں نہیں آنا چاہیے، تم یہیں چھپی رہو۔"

"میں یہی کہنے والی تھی، مجھے ان کی نظروں میں نہیں آنا چاہیے لیکن میں کب تک چھپی رہوں گی؟"

"میں کوشش کروں گا کہ وہ جلد ہی اپنے بیڈروم میں سونے کے لیے چلے جائیں، پھر میں یہاں آکر تمہیں لے جاؤں گا۔"

وہ الجھ کر رہ گیا تھا۔ وہ جوان چھوکری بہت بڑا چیلنج بن گئی تھی۔ اگر اس کی بات نہ مانتا تو واقعی وہ دشمنی پر اتر آتی۔ اس وقت وہ اتنی پاورفل ہوگئی تھی کہ اسے اس کی جانِ حیات ماروی کے پاس جانے سے روک سکتی تھی۔

اس نے دروازے کے پاس آکر کال بیل کے بٹن کو دبایا پھر سر گھما کر کار کی طرف دیکھا۔ وہ نظر نہیں آرہی تھی۔ سیٹوں کے درمیان جا کر چھپ گئی تھی۔ ڈاکٹر نے دروازہ کھول کر اسے دیکھا پھر کہا۔ "آؤ بیٹے! بڑی رات کردی ہے۔ معلوم ہوتا ہے جگنی بائی کے ساتھ تھے۔ ان کی کار لے کر آئے ہو۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے اندر آئے۔ ڈاکٹر نے دروازے کو بند کیا۔ مراد نے دھیمی آواز میں کہا۔ "ڈیڈی! بڑی مشکل میں ہوں۔ ورشا میرے پیچھے پڑ گئی ہے۔ اس کار میں چھپی ہوئی ہے۔ میرے ساتھ یہاں رات گزارنا چاہتی ہے۔ میں کیا کروں؟ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "میں سمجھ گیا۔ میرا بیٹا گناہوں سے دور بھاگتا ہے۔ ویسے ایک بالشت بھر کی چھوکری سے کیوں ڈر رہے ہو؟ یہاں سے بھگاؤ، اس کی ماں برا نہیں مانے گی۔"

"ڈیڈ......! وہ میرا راز جان گئی ہے، اسے معلوم ہو گیا ہے کہ میں اس چہرے کے پیچھے چھپا ہوا ہوں۔ وہ میری اس کمزوری سے کھیل رہی ہے۔ مجھے یہ کہہ کر بلیک میل کر

رہی ہے کہ اسے خوش نہیں کروں گا تو مجھے پاکستان نہیں جانے دے گی۔ میرے خلاف مخبری کرے گی میں بارڈر پار نہیں جاسکوں گا۔"

ڈاکٹر بھی پریشان ہوگیا۔ اس کا منہ تکنے لگا پھر بولا۔ "یہ ورشا تو بہت ہی سنگین مسئلہ بن گئی ہے، تمہارا پاسپورٹ اور تمام اہم کاغذات تیار ہوچکے ہیں، کل تک کبڈی کے کاغذات بھی مل جائیں گے۔ میں سوچ رہا تھا ہم تینوں اسی ہفتے لندن کے لیے روانہ ہوجائیں۔ وہاں سے تم اور کبڈی پاکستان جاسکو گے۔"

"ہمارے راستے کی تمام رکاوٹیں دور ہوچکی تھیں۔ ہم بڑی بھاگ دوڑ کے بعد آسانی سے جانے والے تھے لیکن اب...... اب ورشا کو ناراض کرنے سے ہماری تمام محنت پر پانی پھر جائے گا۔ میں اپنی ماروی کے پاس نہیں جاسکوں گا۔"

"کیا تم نے جگنی بی بی کو یہ باتیں بتائی ہیں؟"

"میں بتانا چاہتا تھا لیکن ورشا نے چیلنج کیا ہے کہ ماتا جی کو بلاؤں گا تو وہ یہاں سے بھاگ جائے گی۔ ماں سے بھی دور ہوجائے گی، پتا نہیں کہاں چھپ کر مجھ سے دشمنی کرتی رہے گی؟"

وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "آؤ ڈائننگ ٹیبل پر چلو۔ وہاں کھاتے بھی رہو اور باتیں بھی کرتے رہو۔"

"نو ڈیڈ! میں پہلے نماز پڑھوں گا۔ اس سے پہلے اسے اندر بلاؤں گا ورنہ وہ تلملاتی رہے گی۔ آپ بیڈروم میں چلے جائیں۔ ادھر نہ آئیں، اس سے انجان بنے رہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں سونے جارہا ہوں۔ آج تمہیں عقل سے کام لینا ہوگا۔ صرف ایک ہفتے کی بات ہے، ہم تینوں یہاں سے چلے جائیں گے تو یہ بلا بھی ہمیشہ کے لیے ٹل جائے گی۔ ابھی انکار کرو گے تو اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارو گے۔"

وہ اپنے بیڈروم کی طرف چلا گیا۔ مراد تھوڑی دیر تک کھڑا سوچتا رہا۔ وہ حالات سے مجبور ہونا نہیں جانتا تھا۔ ورشا کو ایک چٹکی میں مسل کر شمشان گھاٹ پہنچا سکتا تھا لیکن یہ اس ماں کی کوکھ اجاڑنے والی بات ہوتی جو صحیح معنوں میں ایک ماں بن کر اسے، اپنے گھر اپنی ماروی کے پاس پہنچانے کے راستے ہموار کر چکی تھی۔

وہ بھی اس کی بیٹی کو نہ ہلاک کرنا چاہتا تھا نہ اس کی عزت سے کھیلنا چاہتا تھا۔ اسے صرف اپنے اللہ پر بھروسا تھا۔ اس نے اپنے اللہ سے جو وعدہ کیا تھا، اس کے مطابق ہر حال میں گناہ سے بچنا چاہتا تھا اور یہ فی الحال ناممکن نظر آرہا تھا۔ وہ سوچتا ہوا باہر کار کے پاس آیا پھر دروازہ کھول کر بولا۔ "آجاؤ، ڈیڈی اپنے کمرے میں ہیں۔ چپ چاپ چلی آؤ۔"

وہ باہر آئی۔ خوش ہوکر اس سے لگ کر بولی۔ "آئی لو یو۔"

وہ بولا۔ "یہ لواسپاٹ نہیں ہے، اندر چلو۔"

وہ اندر آگئے۔ ورشا بیڈروم میں آکر پھر اس سے لپٹنا چاہتی تھی، وہ اسے دور کرتے ہوئے بولا۔ "ابھی میرے پاس نہ آؤ، میں نماز پڑھنے جارہا ہوں۔"

وہ جھنجلا کر بولی۔ "یہ نماز پڑھنے کا کون سا وقت ہے۔"

"ہم اللہ تعالیٰ کے آگے کسی وقت بھی سجدہ کرسکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے محبت کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔"

وہ پاؤں پٹخ کر بولی۔ "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی میں محبت کرنے آئی ہوں اور تم نماز پڑھنے جارہے ہو۔"

"جھنجلاؤ مت۔ صبر کرو، وہاں کرسی پر جاکر بیٹھو اور انتظار کرو۔"

"یہ تو بتاؤ، کتنی دیر تک پڑھو گے؟"

"آج تو میں چاہتا ہوں قیامت تک پڑھتا رہوں۔ میں نے کہا نا، صبر کرو۔"

وہ وضو کرنے کے لیے واش روم میں چلا گیا اور اسے یہ اطمینان ہوا کہ وہ اس کے ساتھ راضی ہوگیا ہے۔ لہٰذا وہ بے جا ضد نہیں کررہی تھی۔ بے چینی سے ادھر ادھر ٹہل رہی تھی۔ وضو کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا لیکن ورشا کو یوں لگ رہا تھا کہ وقت گزرتا جارہا ہے اور وہ واش روم سے واپس آنا بھول گیا ہے یا جان بوجھ کر دیر کررہا ہے۔

وہ کمرے میں آکر مصلے کو بچھا کر نماز کے لیے کھڑا ہوگیا۔ وہ اس کے ایک طرف فرش پر بیٹھ کر بولی۔ "تم شاید مجھ سے کترا رہے ہو۔ میں بھی دیکھتی ہوں، کب تک بھاگتے رہو گے۔"

وہ عبادت کے لیے مینار کی طرح کھڑا ہوا تھا۔ وہ نیچے بیٹھی سر اٹھا کر اس کے قد اور جسامت کو دیکھ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا، پہاڑ تلے بیٹھی ہے۔ وہ اور زیادہ اس کے حواس پر چھا رہا تھا۔

وہ اپنی عبادت میں مصروف تھا۔ یہ اپنی پریم پوجا میں لگی تھی۔ کہتے ہیں، جو ہونی ہے، وہ ہو کر رہتی ہے اور وہ ہو کر رہنے کے لیے ہی پاس بیٹھی تھی۔

آگے نماز تھی۔ پیچھے گناہ تھا گویا وہ انڈین پاسپورٹ تھی۔ اس پاسپورٹ پر مہر لگانے کے بعد ہی مراد پاکستان جاسکتا تھا۔

اس نے بڑے صبر سے انتظار کیا۔ اس کی بے چینی کہہ رہی تھی کہ بہت وقت گزر چکا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ جوانی گزر جائے اور وہ بیٹھی کی بیٹھی رہ جائے۔

وہ نماز کے بعد دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا۔ ''اے میرے معبود! تو میری مدد فرما رہا ہے۔ جو بندے گناہوں سے دامن بچانے کی حتی الامکان کوششیں کرتے ہیں، ان کی کوششوں کا انعام تو ہی دیتا ہے۔ میں جے پور سے یہاں تک، مرینہ اور بینزیکا سے لے کر ورشا تک دامن بچاتا آرہا ہوں۔ تیری کرم نوازی سے میں اپنی کوششوں میں کامیاب رہا ہوں۔''

وہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر دل ہی دل میں بولا۔ ''میں تیرے آگے ہاتھ پھیلا کر ورشا سے نجات چاہتا ہوں اور یہ عہد کرتا ہوں کہ نجات نہ ملی تب بھی گناہ گار نہیں بنوں گا۔ بھی ورشا کو ٹھکرا کر اس کی دشمنی مول لوں گا۔''

وہ بڑے عزم سے کہہ رہا تھا۔ ''ایمان علی کے چہرے کے پیچھے چھپا نہیں رہ سکوں گا۔ آرمی اور انٹیلی جنس والوں سے اور تمام دشمنوں سے چھپتا پھروں گا۔ اپنی ماروی کے پاس پاکستان نہیں جاسکوں گا۔ کوئی بات نہیں، ماروی سے دور ہو جاؤں گا اور دشمنوں سے جنگ جاری رکھوں گا۔ میں حوصلہ کر رہا ہوں، کسی بھی حال میں گناہ گار نہیں بنوں گا۔''

ورشا نے بیزار ہو کر کہا۔ ''بس بھی کرو۔ کب تک دعائیں مانگتے رہو گے۔ مانگنے سے ماروی نہیں ملے گی یہاں تمہیں ورشا ہی ملے گی۔''

یہ کہتے ہوئے وہ پیچھے سے آکر اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر اس سے لپٹ گئی۔ گویا جہنم کا شعلہ آکر لپٹ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے حلق سے کراہ نکلی۔ بانہوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ کراہتی ہوئی آہستہ آہستہ جھکتی ہوئی فرش پر گر پڑی۔

معجزہ ہو گیا۔ وہ آپ ہی آپ مصلے اور مراد سے دور ہو گئی۔ مراد نے اسے نہیں ٹھکرایا تھا۔ وہ تقدیر کی ٹھوکر کھا کر گری تھی۔

مراد اسے تکلیف میں دیکھ کر پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''یہ اچانک تمہیں کیا ہو رہا ہے؟''

وہ گھٹنوں کو پیٹ سے لگا کر کراہتی ہوئی بولی۔ ''ماتا جی کو کال کریں، جلدی کریں۔''

اس نے ابھی چیلنج کیا تھا کہ وہ جگنی بائی کو فون کرے گا تو وہ ماں کو بھی چھوڑ کر کہیں چلی جائے گی اور چھپ کر اس سے دشمنی کرے گی۔ مراد نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ اب وہ خود ہی ماں سے بات کرنا چاہتی تھی۔

اس نے جگنی بائی سے رابطہ کیا پھر کہا۔ ''ورشا ڈاکٹر ڈیڈی کے بنگلے میں ہے۔ اچانک شدید تکلیف میں مبتلا ہو گئی ہے۔ آپ اس سے باتیں کریں۔''

اس نے فون کو ورشا کے کان سے لگایا۔ وہ ہائے ہائے کرتی ہوئی بولی۔ ''وہی مہینے والی پرابلم ہے، آپ فوراً دوائیں لے کر آجائیں۔ مجھ سے تکلیف برداشت نہیں ہو رہی ہے۔''

ماں نے کہا۔ ''برداشت کرو، میں ابھی آرہی ہوں۔''

ماں آنے والی تھی۔ مراد کی سمجھ میں کسی حد تک آیا کہ وہ کس مسئلے سے دوچار ہے۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔ کیا خدا کی قدرت ہے۔ جو نہ سوچو، وہ ہو جاتا ہے۔ مراد سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بندوق آپ ہی آپ خالی ہو جائے گی۔

اس نے ڈاکٹر کے دروازے پر آکر دستک دی، وہ دروازہ کھول کر بولا۔ ''خیریت تو ہے؟''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''ہماری توقع سے زیادہ خیریت ہی خیریت ہے۔ ابھی ماتا جی یہاں آرہی ہیں۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''یہ اچانک کیا ہو گیا؟ وہ ورشا تو منع کر رہی تھی؟''

مراد نے اسے بتایا کہ اس پر مسلط ہونے والی لڑکی کس طرح اچانک خاص مسئلے سے دوچار ہو گئی ہے۔ ہوس کی تیز رفتار گاڑی آگے نہ بڑھ سکی تھی۔ اسے سرخ بتی نے روک دیا تھا۔ دونوں ورشا کے پاس آئے۔

وہ تکلیف کی شدت سے بے حال ہو رہی تھی۔ رہ رہ کر درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ مراد اس کی حالت دیکھتے ہوئے کمرے سے واپس جانے لگا، وہ تڑپ کر بولی۔ ''تم میرے لیے غیر مرد نہیں ہو۔ میرے پاس رہو مجھے حوصلہ دو۔ پلیز نہ جاؤ۔''

ڈاکٹر چلا گیا۔ مراد نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ''قدرت کا تماشا دیکھ رہی ہو؟ تم کہہ رہی تھیں، مانگنے سے ماروی نہیں ملے گی یہاں ورشا ہی ملے گی۔ بولو، ورشا ابھی مل رہی ہو؟ کاتب تقدیر سے لڑ سکتی ہو تو بیڈ پر

آؤ....."

"پلیز طعنے نہ دو۔ میری بیت کو سمجھو۔ مجھے گلے لگا کر پیار کرو، میری تکلیف کم ہوجائے گی۔"

"یہ سچ ہے، کتے کی دم کبھی سیدھی نہیں ہوتی، میں اپنے پروردگار کا شکر گزار ہوں۔ آئندہ چار پانچ دنوں تک تمہارے شر سے محفوظ رہوں گا اور تب تک یہاں سے چلا جاؤں گا۔ کیندا اب ماتا جی کے کورٹ میں ہے وہ تمہیں کھیلنے کا موقع ہی نہیں دیں گی۔"

اسی وقت ماں آ گئی۔ ڈاکٹر باہر ہی سے یہ وضاحت کرتا آ رہا تھا کہ ورشا کس طرح مراد کی کار میں چھپ کر یہاں تک آئی ہے اور کس طرح اسے بلیک میل کر رہی تھی۔

ماں اس کا لباس اور اس کی دوائیں لے کر آئی تھی۔ اس نے مراد اور ڈاکٹر سے کہا۔ "آپ دونوں باہر جائیں پلیز۔" وہ دونوں باہر آ گئے۔ جگنی بائی نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا پھر سیدھی بیٹی کے پاس آ کر اس کے منہ پر ایک لات ماری۔ "مر جا حرامزادی! میں نے تم تینوں کو پن (نیکی) کمانے کی تعلیم دی اور تو پاپ کما رہی ہے۔ میں یہ دکھانا چاہتی ہوں کہ کس طرح ایک ہندوستانی عورت پڑوسی ملک کے ایک بیٹے کو اپنا بیٹا بنا کر اس کی مشکلیں آسان کرتی ہے۔ میں جو کر رہی ہوں تو اس کا الٹا کر رہی ہے۔"

بیڈ کے سرہانے ایک جگ میں پانی رکھا ہوا تھا۔ وہ ایک گلاس میں پانی لے کر ورشا کے پاس آئی۔ اسے کھانے کے لیے دوائیں دیں، پھر کہا۔ "تیرے لیے کپڑے لائی ہوں۔ واش روم میں جا۔ چھی چھی ایک غیر مرد کے کمرے میں آ کر یہ بے شرمی پھیلائی ہے۔ میرا سر جھکا دیا ہے۔ گھر چل پھر تیری خبر لیتی ہوں۔ دیکھتی ہوں تیرے اندر جوانی کی کتنی آگ بھری ہے۔ تجھے راکھ کر کے رکھ دوں گی۔"

وہ اپنا لباس اٹھا کر واش روم کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ "تم کیا کرو گی؟ مارو گی؟ پیٹو گی اور بڑی تکلیف دہ سزائیں دو گی۔ زیادہ کرو گی تو جان سے مار ڈالو گی اور میں مرتے دم تک مراد کا پیچھا نہیں چھوڑوں گی۔ اگر وہ میرا نہ ہوا تو ماروی کا بننے کے لیے پاکستان بھی نہیں جا سکے گا۔"

اس نے چیلنج کیا پھر واش روم میں جا کر دروازے کو بند کر دیا۔ جگنی بائی گہری سنجیدگی سے بند دروازے کو دیکھنے لگی۔ وہ بیٹی ماں کی نیکی اور شرافت کو جانتی تھی اور اس کی ممتا کو بھی مانتی تھی کہ اس کی ممتا بیٹی کو زیادہ اذیتیں نہیں پہنچائے گی۔ وہ سر پھری ماں سے خوف زدہ نہیں تھی۔ مراد کا پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔

جگنی بائی کو کچھ ایسا کرنا تھا کہ مراد بہ آسانی سرحد پار چلا جائے اور ورشا دشمنی نہ کرے اور یہ ممکن نہیں تھا۔ عورت جب ناگن بن جاتی ہے تو ڈستی ضرور ہے۔

☆☆☆

اس رات ماروی نے خواب میں دیکھا۔ اس کا مراد آ گیا ہے۔ اگرچہ اس نے فون پر کہا تھا کہ اس کا چہرہ بدل چکا ہے لیکن خواب میں وہی بچپن کے مراد کا چہرہ تھا۔ کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔

وہ اسے بازوؤں میں اٹھائے، اپنے سینے سے لگائے ایک پھولوں بھرے ماحول سے گزر رہا تھا۔ خوش نصیبی ان پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کر رہی تھی۔ وہ اس کے کان کے پاس جھک کر کہہ رہا تھا۔ "میں نے وعدہ کیا تھا۔ لو میں آ گیا۔ اب جلدی سے میری دلہن بن جاؤ۔"

یہ کہتے ہی اس نے چوم لیا۔ وہ ایک دم سے شرما گئی۔ پٹ سے آنکھ کھل گئی۔ وہ ابھی تک نظر آ رہا تھا اور وہ چومنے والی شرارت اسے گدگدا رہی تھی۔ وہ بھرپور انگڑائی لیتی ہوئی شہزادی کی طرف آ گئی۔ ننھا مراد اس کے پہلو میں سو رہا تھا۔ اس نے بے اختیار اس پر جھک کر اسے چوم لیا۔ باپ کا پیار بیٹے کو دے کر اچھا لگا۔

محبوب نے بھی خواب دیکھا۔ ماروی دلہن بنی ہوئی تھی۔ قاضی صاحب اس کا نکاح اس سے پڑھاتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔ "ماروی تمہیں مراد علی منگی کے نکاح میں دیا جاتا ہے۔ تمہیں قبول ہے؟"

ماروی نے کہا۔ "قبول ہے۔"

محبوب نے تڑپ کر کہا۔ "میں دولہا ہوں۔ نکاح مجھ سے پڑھاؤ، مراد سے کیوں پڑھا رہے ہو؟"

اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ پھر اس نے دیکھا ماروی اس کی دلہن بنی سہاگ کی سیج پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ محبوب اس کی طرف کھنچا چلا آیا۔ پھر قریب آ کر ٹھٹک گیا۔ اس دلہن کے پیچھے مراد علی منگی بیٹھا ہوا تھا۔

محبوب نے کہا۔ "مراد! یہ کیا حرکت ہے؟ ماروی میری دلہن ہے۔ جاؤ یہاں سے۔"

مراد جواباً ہنسنے لگا۔ ایسے ہی وقت محبوب کی آنکھ کھل گئی۔ وہ چاروں شانے چت پڑا ہوا تھا۔ خالی خالی نظروں سے چھت کو تکنے لگا۔ اس کے اندر یہ اندیشہ چھپا ہوا تھا کہ ماروی کو منکوحہ بنانے سے پہلے مراد اسے اپنی دلہن بنا لے گا۔ عقل کہتی تھی کہ مراد بھی خود کو جرائم سے اور گناہوں سے

ہلاک ثابت نہیں کرسکے گی۔ یہاں چہرہ بدل کر بھی آئے گا تو کسی نہ کسی دن پکڑا جائے گا۔

وہ خود کو پوری طرح مطمئن کرنا چاہتا تھا کہ دو تاریخ کو ماروی اس کی دلہن بنے گی اور دو تاریخ صرف پندرہ دنوں کے فاصلے پر رہ گئی تھی لیکن اطمینان قلب نہیں تھا۔ وہ لیٹا ہوا تھا۔ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پریشان ہوکر سوچنے لگا، کیا کرے؟ کس طرح ابھی جاکر ماروی کو فوراً منکوحہ بنا کر لے آئے؟ دھڑکا سا لگا تھا کہ دو تاریخ سے پہلے قیامت آجائے گی اور وہ قیامت مراد کی صورت میں آئے گی۔ محبوب مانتا تھا کہ ماروی اس کی فرماں بردار ہے اس کی ہر بات مانتی ہے لیکن یہ بات نہیں مانے گی کہ آج ہی اس سے نکاح پڑھوا لے۔ وہ منکوحہ بن کر محبوب کے پاس آتی تو مراد کے بیٹے کو بھی ساتھ لاتی۔ یعنی یار کو کسی صورت اپنے پاس ضرور رکھتی۔ اس نے کئی بار سوچا کہ ماروی کو جبراً اپنی شریکِ حیات بنا رہا ہے۔ محبوب حقائق کو تسلیم نہیں کر رہا تھا۔ وہ ایک ہی بات کہتا تھا کہ شادی کے بعد ماروی اسے دل و جان سے چاہنے لگے گی۔ وہ حیا والی ہے۔ شادی کے بعد بے حیائی سے مراد کا نام نہیں لے گی۔ مختصر یہ کہ وہ ماروی کی طلب سے باز آنے والا نہیں تھا۔

سمیرا نے بھی خواب میں دیکھا تھا کہ مراد اس سے ملنے آیا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”تم نے ماروی کی جان لینے کی حماقت کی لیکن میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔“

سمیرا نے کہا۔ ”تم مجھے کیوں معاف کر رہے ہو؟“

وہ بولا۔ ”میں چاہتا ہوں جب ماروی میری دلہن بن جائے تب محبوب تنہا نہ رہیں۔ تم ان کی زندگی کی ساتھی بن جاؤ۔ محبوب کے ہم پر بڑے احسانات ہیں۔ ہم ان کی خاطر تمہارے جرم کو معاف کر رہے ہیں۔“

پھر سمیرا نے خواب دیکھا۔ مراد اس کا ہاتھ پکڑ کر ماروی کے سامنے لایا تھا۔ ماروی اس سے ناراض تھی لیکن مراد کو دیکھتے ہی خوش ہوکر بولی۔ ”تم میری جان کی دشمن ہو مگر میرے مراد کو مجھ سے ملانے لائی ہو اس لیے تمہیں معاف کرتی ہوں۔ اب تم یہاں سے محبوب کی زندگی میں جاؤ۔“

اسی وقت سمیرا کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ پچھلے دو دنوں سے سہمی ہوئی تھی۔ اس انتظار میں تھی کہ محبوب جب بھی آئے گا تو اس سے نفرت کرے گا۔ لیکن محبوب نے اس سے فون پر جب بھی باتیں کیں تو اسے الزام نہیں دیا کہ اس نے ماروی کو ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ یوں اطمینان ہوا کہ ماروی نے اس کے خلاف شکایت نہیں کی ہے۔ اس کے اندر حوصلہ پیدا ہوا اس نے سوچا کہ خود ماروی کے پاس جائے اور اس سے معافی مانگے۔ اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ پھر اس خواب نے حوصلہ دیا تو وہ شاور لے کر اچھا سا لباس پہن کر صبح سویرے ہی ماروی کی کوٹھی میں آگئی۔ وہ ڈرائنگ روم میں ننھے شہزاد کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ سمیرا کو دیکھ کر سنجیدہ ہوگئی۔ اس کے تیور بدل گئے۔ وہ ناگواری سے بولی۔ ”اعلیٰ ظرفی کا تقاضا ہے کہ دروازے پر آئے ہوئے دشمنوں کو بھی خوش آمدید کہو۔ اس لیے میں رسمی طور پر کہہ رہی ہو، آؤ بیٹھو۔“

وہ دروازے پر کھڑی تھی۔ سر جھکا کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ایک صوفے کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ ایسے وقت ختی چاچی آئی اسے دیکھتے ہی ٹھٹک گئی پھر اس نے ماروی کو دیکھا۔ وہ بولی۔ ”چاچی! سمیرا کے لیے شربت لے آؤ۔“

سمیرا کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔ اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ماروی نے کہا۔ ”میں سمجھ گئی اتنی صبح آئی ہو۔ کچھ کھایا بھی نہیں ہوگا۔ یہ ہمارے ساتھ ناشتا کریں گی۔ تم ناشتا تیار کراؤ۔“

وہ اچانک ہی دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رونے لگی...... ماروی اور چاچی اسے چپ چاپ دیکھ رہی تھیں۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ ”میں معافی کے قابل نہیں ہوں پھر بھی التجا کرتی ہوں مجھے معاف کردو۔“

سمیرا نے آنکھوں سے ہاتھ ہٹایا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔ وہ بولی۔ ”ماروی! تم بہت عظیم ہو۔ تم نے محبوب سے میری شکایت نہیں کی۔ اگر کرتیں تو میں اب تک ان کی نظروں سے گر چکی ہوتی۔ میں نے تمہیں سیڑھیوں پر سے گرایا۔ تم مجھے نظروں سے گرنے سے بچا رہی ہو۔ تمہاری عظمت کے سامنے میں بہت چھوٹی بہت حقیر ہوگئی ہوں۔“

ماروی جیسے اس کے آنسوؤں کو اور اس کی باتوں کو اہمیت نہیں دے رہی تھی۔ وہ اسے نظرانداز کرتی ہوئی چاچی سے بولی۔ ”آج سنڈے ہے، محبوب بھی یہاں ناشتا کرنے آئیں گے۔“

ختی نے کہا۔ ”ہاں بیٹی! مجھے یاد ہے۔“

سمیرا پریشان ہوکر بولی۔ ”کیا محبوب ابھی آئیں گے، میں روتی ہوئی صورت لے کر ان کا سامنا نہیں کروں گی۔“

ماروی نے کہا۔ ”ہاں انہیں معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ تم

کیوں رو رہی ہو؟ نہ میں نے تمہارے خلاف ان سے کچھ کہا ہے اور نہ تم خوامخواہ اعترافِ جرم کرو۔"

اس نے کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں نے تمہاری جان لینے کی کوشش کی اور تم مجھ پر مہربان ہو رہی ہو۔ کیا میں قابلِ نفرت نہیں ہوں؟"

"جب میں معاف کر چکی ہوں تو پھر قابلِ نفرت نہیں ہو۔ اگر ایک طرف تم نے مجھے مار ڈالنے کی کوشش کی تھی تو دوسری طرف تم محبوب کے اربوں روپے کے کاروبار کو ڈوبنے سے بچا رہی ہو۔ معروف صاحب کی راہنمائی میں بڑی دیانتداری سے ان کا کاروبار سنبھال رہی ہو۔ میری دشمن سہی، محبوب کے لیے دیانت دار ہو۔ لہٰذا میں تمہارے خلاف کچھ نہ بول کر تمہاری وفاداری کا انعام تمہیں دے رہی ہوں۔"

وہ بڑی عقیدت سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "ماروی! تمہاری عظمت کے سامنے میرا سر جھک گیا ہے۔"

"صرف خدا کے آگے سر جھکاؤ۔ وہ مجھے دو تاریخ کو اپنی دلہن بنانے والے ہیں۔ میں دعا مانگ رہی ہوں کہ کسی طرح تم ان کی دلہن بن جاؤ۔ یہ صاف سمجھ میں آتا ہے کہ تم ان کی بہترین شریکِ حیات ثابت ہوگی۔ خدا کرے یہ بات محبوب کی سمجھ میں آ جائے۔"

ماروی کس قدر تعمیری انداز میں اس کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اسے محبوب کی دلہن بنانا چاہتی تھی اور وہ اس کے خلاف کیا کر چکی تھی؟ اس کا جھکا ہوا سر مارے شرم کے نہیں اٹھ رہا تھا۔

اسی وقت باہر کار کے آنے کی آواز سنائی دی۔ ماروی نے کہا۔ "محبوب آ گئے ہیں۔"

سمیرا فوراً ہی اپنا حلیہ درست کرنے کے لیے اندر کمرے کے واش روم میں چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی محبوب دروازہ کھول کر آیا۔ پھر ماروی سے بولا۔ "باہر سمیرا کی کار کھڑی ہے۔"

وہ بولی۔ "ہاں وہ اندر ہے ابھی آئے گی آج وہ بھی ہمارے ساتھ ناشتا کرے گی۔"

"میں تم سے مراد کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں تم یقین نہیں کرو گی، وہ یہاں آ کر اپنے آپ سے دشمنی کرے گا۔ وہ کسی بھی بھیس میں رہے گا۔ انٹیلی جنس والوں سے چھپ نہیں سکے گا۔ اس پر کئی قتل کے علاوہ عالی جناب کے قتل کا بھی سنگین الزام ہے اور عالی جناب کوئی معمولی شخص نہیں تھا۔"

"میں جانتی ہوں، وہ برسرِ اقتدار پارٹی کا بہت ہی معروف سیاستداں تھا اور وزیر تھا لیکن اس کے قتل کے وقت مراد پاکستان میں نہیں تھا۔"

وہ بات کاٹ کر بولا۔ "ہم اس موضوع پر پہلے بھی بحث کر چکے ہیں۔ تم نہیں مانو گی کہ وہ یہاں آئے گا تو گرفتار کر لیا جائے گا۔ پھر اسے رہائی دلانے کے لیے اور مقدمہ لڑنے کے لیے جو بھاگ دوڑ ہوگی اس کے نتیجے میں ہماری شادی التوا میں پڑ جائے گی۔"

وہ بڑے یقین سے بولی۔ "ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ مراد گرفتار نہیں ہوگا۔ جب وہ ثابت کر دے گا کہ اب وہ مجرم نہیں رہا ہے اور مرینہ سے یا کسی عورت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ گناہوں سے توبہ کر کے پانچوں وقت کا نمازی ہے۔ تو آپ دونوں کا پلڑا برابر ہو جائے گا۔ پھر تو آپ دو تاریخ کو مجھے اپنی منکوحہ نہیں بنا سکیں گے۔"

"ایسا نہ کہو۔ میں دو تاریخ کا بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں، مراد اب مرتے دم تک جرائم کی دنیا سے نہیں نکل سکے گا۔ میں کئی پہلوؤں سے غور کرتا رہا ہوں وہ ایسی دلدل میں دھنسا ہوا ہے کہ وہ مجرم بن کر ہی زندگی گزار سکے گا اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔"

ماروی نے سر جھکا لیا۔ چہرے سے ظاہر کرنے لگی کہ مراد کے لیے بہت پریشان ہو رہی ہے۔ جبکہ اندر سے مطمئن تھی۔ یہ جانتی تھی کہ وہ یونا مراد بن کر ایسا تماشا کرنے آئے گا کہ قانون کا کوئی محافظ اسے مجرم مراد علی منگی ثابت نہیں کر سکے گا اور جرائم کی دنیا کے سب ہی مجرم اسے عبداللہ کبڈی سمجھ کر نظر انداز کریں گے۔ وہ ثابت کرنے والا تھا کہ اب مجرم مراد نہیں رہا ہے۔

☆☆☆

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

اور شاہین مراد پرواز کے لیے پر تول رہا تھا۔ اس کا نشیمن انڈیا میں نہیں پاکستان میں تھا۔ اس کے پاسپورٹ اور دیگر اہم متعلقہ کاغذات پر کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ائر انڈیا کی ایک فلائٹ میں اس کی سیٹ بھی او کے ہو گئی تھی۔

اب تو دو چار ہاتھ لبِ بام رہ گیا تھا، ایسے ہی وقت ورشا بہت بڑی رکاوٹ بن گئی تھی۔ جگجی بائی اسے مراد کے بیڈ روم سے پکڑ کر گھر لے آئی تھی۔ وہ عارضی روگ لگنے کے باعث مجبور ہو گئی تھی۔ لیکن ماں سے صاف

صاف کہہ دیا تھا کہ مراد سے شادی کرے گی۔ اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔

ماں نے کہا۔ "کیا دنیا میں وہی ایک مرد رہ گیا ہے؟ ہمارے دیس میں کتنے ہی گبرو جوان ہیں۔ کسی کا بھی ہاتھ پکڑ لے۔"

وہ بولی۔ "تم بھی جوانی میں پتاجی کے پیچھے پڑ گئی تھیں۔ تمہارے ماں باپ اور پوری برادری پتاجی کے خلاف تھی لیکن تم نے اپنی ضد منوالی۔ میں بھی تمہاری بیٹی ہوں۔ مراد کو یہاں سے بھاگنے نہیں دوں گی۔"

ماں سوچ میں پڑ گئی پھر بولی۔ "اچھا جو تیرے جی میں آتا ہے، وہ کر لیکن مجھ سے یہ وعدہ کر کہ نیتا اور ڈولی کو مراد کا بھید نہیں بتائے گی۔"

"میں پاگل نہیں ہوں کہ انہیں بتاؤں گی۔ انہیں معلوم ہوگا تو وہ بھی مراد کے پیچھے پڑ جائیں گی۔"

جگنی بائی بیٹی کو باغی اور مراد کا دشمن نہیں بنانا چاہتی تھی۔ ایسی تدبیر سوچ رہی تھی جس پر عمل کر کے مراد کو کسی رکاوٹ کے بغیر سرحد پار کرا دے۔

دوسری دشمن مرینہ تھی۔ اسے بھلایا نہیں جا سکتا تھا۔ ڈائریکٹر جنرل جان انتھونی نے پہلے دن اسے ایک مینٹل اسپتال میں ٹریٹمنٹ کے لیے بھیجنے کو کہا تھا۔ وہاں کے ڈاکٹروں کی رپورٹ نے بتایا کہ کسی مہلک دوا کے ذریعے اس کے دماغ کو ناکارہ اور کمزور بنایا گیا ہے جس سے وہ ایک آدھ گھنٹے کے لیے غائب دماغ ہوجاتی ہے پھر نارمل ہوجاتی ہے اس کے بعد پھر غائب دماغ ہوجاتی ہے اور اپنے آپ کو بھول جاتی ہے۔

مرینہ نے ایک بار نارمل ہوکر ڈائریکٹر جنرل جان انتھونی سے فون پر باتیں کی تھیں اور وہ خفیہ کوڈ نمبرز بتائے تھے جو صرف وہ جانتا تھا۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ وہی مرینہ ہے اور مراد نے اپنے دشمنوں کو بھٹکانے کے لیے اس کا چہرہ بدل دیا ہے۔

مرینہ نے ڈائریکٹر جنرل سے کہا تھا کہ صرف وہی مراد کو نئے چہرے سے پہچان سکتی ہے۔ آئندہ وہ جب بھی ہوش و حواس میں رہے گی تو کسی باڈی گارڈ کے ساتھ اسے تلاش کرنے نکلے گی اور اسے کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ نکالے گی۔

جان انتھونی نے انڈیا میں اپنے سفیر سے کہا تھا کہ ایک بنگلے میں مرینہ کی رہائش کا انتظام کیا جائے۔ مہنگے اور تجربہ کار ڈاکٹروں سے اس کا علاج کرایا جائے۔ اس کے ساتھ مستقل ایک باڈی گارڈ کو رہنا چاہیے۔ وہ ہوش میں رہ کر جو بھی حکم دے، اس پر کسی تاخیر کے بغیر فوراً عمل کرنا چاہیے۔

وہ جب بھی نارمل ہوتی تھی ایک کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر قدآور مراد کو اور بونے مراد کو ڈھونڈتی پھرتی تھی۔ ایسے وقت برقع پہن کر رہتی تھی کیونکہ وہ دونوں ہی مراد کے تبدیل شدہ چہرے سے اسے پہچان سکتے تھے۔ اس نے تیسرے ہی دن بونے مراد کو ایک ائرویز ایجنسی کے باہر ڈاکٹر ممی سن کے ساتھ دیکھا۔ فارم ہاؤس میں جب مراد نے اس کی پٹائی کر کے نیم بے ہوشی کی حالت میں پہنچا دیا تھا۔ تب ڈاکٹر نے آکر اسے انجکشن لگایا تھا۔

وہ ڈاکٹر کو پہچان نہ سکی، کیونکہ اس وقت نیم بے ہوشی طاری تھی۔ وہ اس کے چہرے کو یاد نہ رکھ سکی۔ وہ ائرویز ایجنسی کے دفتر میں آگئی۔ وہاں ایک کمپیوٹر کے سامنے ایک خاتون بیٹھی ہوئی تھی۔ اس سے بولی۔ "کیا ائر انڈیا کی کوئی فلائٹ کل لندن جارہی ہے؟"

خاتون نے کہا۔ "کل نہیں پرسوں صبح دس بجے ایک فلائٹ ہے۔"

مرینہ نے مسکرا کر کہا۔ "مجھے بونے بہت اچھے لگتے ہیں، ابھی میں نے آفس کے باہر ایک بونے کو دیکھا ہے۔ کیا وہ بھی کہیں جارہا ہے؟"

"ہاں پرسوں دس بجے کی فلائٹ سے لندن جانے والا ہے۔"

مرینہ نے حیرانی سے کہا۔ "میں حیران ہوں، کیا وہ بونا اکیلا اتنی دور جائے گا؟"

"نہیں اس کے ساتھ اور دو افراد ہیں۔"

"میں اس بونے سے ایک بھی ملاقات کرنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو اس کا رہائشی پتا بتائیں گی۔"

"ڈاکٹر ممی سن بہت مشہور ہیں۔ کھڑگ سنگھ روڈ کے پیچھے ان کا کلینک اور بنگلا ہے۔"

"وہ کس شعبے کے ڈاکٹر ہیں؟"

"وہ پلاسٹک سرجری کے ماہر ہیں۔"

وہ آگے سن نہ سکی۔ اس کے ذہن میں روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا۔ چشم زدن میں یہ بات سمجھ میں آگئی کہ اس ڈاکٹر نے ہی مراد کو ایک خوبرو جوان بنایا ہے اور بونے کو مراد کا چہرہ دیا ہے۔

اس کی سمجھ میں آرہا تھا۔ "صرف اتنا ہی نہیں۔ میرا یہ

چہرہ بھی اس کمبخت ڈاکٹر نے تبدیل کیا ہے۔"

وہ آفس سے باہر آکر اپنی کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ "مجھے ڈاکٹر مینی......"

وہ آگے نہ بول سکی۔ اپنی روٹین کے مطابق غائب دماغ ہوگئی۔ خود کو بھول گئی۔ باڈی گارڈ نے کہا۔ "میڈم! آپ پریشان نہ ہوں۔ ہم آپ کو پہچانتے ہیں۔ ابھی گھر لے چلتے ہیں۔"

وہ تقریباً دو گھنٹے تک خود سے غافل رہنے والی تھی، موجودہ حالات میں ایک انار کے پیچھے دو بیمار تھیں۔ ورشا کی طبیعت دوسرے دن سنبھل گئی تھی۔ اس نے جگنی بائی سے کہا۔ "میں باہر گھومنے پھرنے جاؤں گی۔"

"میں جانتی ہوں، کہاں جاؤ گی۔ وہ تمہیں نظر نہیں آئے گا۔"

"کیوں نظر نہیں آئے گا؟ کیا کہیں بھاگ گیا ہے؟"

"بھاگ کر کہاں جائے گا؟ پرسوں فلائٹ کی سیٹیں اوکے ہوگئی ہیں۔ ابھی وہ آگرہ گیا ہے۔"

"وہ آگرہ ضرور جائے لیکن اس دیس سے باہر نہیں جاسکے گا۔ اگر تم میری ماں ہو اور بیٹی کے جذبات کو اچھی طرح سمجھتی ہو تو میرے لیے اسے راضی کرو۔ وہ تمہیں ماں کہتا ہے تمہاری ہر بات مانتا ہے۔"

"میں ماں ہوں۔ صرف بیٹیوں کے نہیں، بیٹے کے جذبات کو بھی سمجھتی ہوں۔ میرا یہ بیٹا ماروی کا دیوانہ ہے۔ تم اسے اگلے جنم میں بھی حاصل نہیں کرسکو گی۔"

"میں آخری بار کہتی ہوں۔ اگر تم چاہتی ہو کہ وہ ہماری آرمی اور انٹیلی جنس والوں کے ہتھے نہ چڑھے تو اسے ابھی فون کرو۔ اسے میرے پاس آنے کو بولو۔ آگے تم سمجھدار ہو۔"

وہ منہ پھیر کر باہر چلی گئی۔ ماں نے کہا۔ "میرے پیٹ کی بچی، میرے آگے پھدک رہی ہے۔ ٹھوکر لگے گی تو عقل آئے گی۔"

مرینہ ہوش میں آگئی۔ اس نے فوراً ہی ادارے کے جاسوس کو طلب کیا اور کہا۔ "ڈاکٹر مینی سن کے کلینک میں جاؤ۔ معلوم کرو، وہاں جو بوڑھا ہے وہ پرسوں کن افراد کے ساتھ دس بجے والی فلائٹ سے جائے گا، ہوسکے تو تینوں کے نام معلوم کرو۔"

جاسوس نے ایک گھنٹے کے بعد ہی فون پر کہا۔ "ڈاکٹر مینی سن اپنے بیٹے اور ایک بڈھے کے ساتھ جائے گا۔"

مرینہ نے پوچھا۔ "کیا تم نے اس کے بیٹے کو دیکھا ہے؟"

"نہیں وہ آگرہ گیا ہے۔"

اس نے باڈی گارڈ سے کہا۔ "فوراً گاڑی نکالو۔ ہم آگرہ جارہے ہیں۔"

وہ اپنا ضروری سامان اور دوائیں ایک بیگ میں رکھ کر باہر آئی، پھر کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق دوائیں کھارہی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ جلد ہی اس کی دماغی کمزوری دور ہوجائے گی۔

اس نے آگرہ تک دوڑ لگائی۔ شام ہوچکی تھی ایک رات وہاں رہی، دوسرے دن پورے شہر میں گھومتی رہی۔ عشق کرنے والے تاج محل کو دیکھنے ضرور آتے ہیں۔ اس کا خیال تھا، مراد وہاں ضرور آئے گا لیکن وہ دوسری رات تک وہاں بھٹکنے. رہنے کے بعد بھی اپنے یار کی ایک جھلک نہ دیکھ سکی۔ دہلی واپس آگئی۔ دوسری صبح وہ اسے ائرپورٹ پر پکڑنے والی تھی۔

ورشا بھی اسے تلاش کررہی تھی۔ اس نے ایک بار اسے فون کیا تو رابطہ نہ ہوسکا۔ اس نے دوپہر کو پھر شام کو کال کی تب اس کی آواز سنائی دی۔ "ہاں ورشا بولو۔ کیا بات ہے؟"

وہ بولی۔ "تم کہاں ہو؟ میں ابھی ملنا چاہتی ہوں۔"

"کیا یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی کہ خدا کو ہمارا ملنا منظور نہیں ہے۔ تم نے بلیک میلنگ کے ذریعے مجھے پوری طرح مجبور کردیا تھا۔ میں تمہارے شکنجے سے نکل نہیں سکتا تھا۔ اس کے باوجود تم پر قدرتی آفت نازل ہوئی اور تم مجھے چھوڑ کر جانے پر مجبور ہوگئیں۔ اب پرسوں کا ٹکٹ اوکے ہوگیا ہے۔ میرے جانے تک تم سرخ فیتے سے بندھی رہوگی۔ میرے ساتھ راتیں گزارنے کی حسرت ہی رہ جائے گی۔"

"ہاں ابھی مجبور ہوں۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہم ایک ساتھ راتیں گزاریں۔ صرف ملاقات کرو۔ ہم گھومتے پھرتے پیار سے اچھا وقت گزاریں گے۔"

"میں تم سے کہہ چکا ہوں، مجھے بھول جاؤ۔ تم مجھے چھو بھی نہیں سکوگی۔ میرے جانے کے بعد سوچتی رہوگی کہ سائے کے پیچھے بھاگتی رہی ہو۔"

"یہ خوش فہمی دل سے نکال دو کہ سیٹ اوکے ہوگئی ہے تو آسانی سے چلے جاؤ گے۔ یہ لکھ لو کہ مجھ سے نہیں ملوگے تو پاکستان جاکر ماروی سے بھی نہیں مل سکوگے۔ انڈین انٹیلی جنس والے تمہیں جانے نہیں دیں گے۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ فون بند کر دیا۔ ورشا نے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ کر اپنے فون کو دیکھا۔ وہ گھاس نہیں ڈال رہا تھا۔ اس کی بلیک میلنگ سے ہراساں نہیں تھا اور وہ آخری فیصلہ کر رہی تھی کہ اسے یہاں سے جانے نہیں دے گی۔

مرینہ بھی آگرہ سے واپس آ کر تھک ہار کر بڑبڑا رہی تھی۔ ''مجھ سے کہاں چھپے گا؟ کل ائر پورٹ پر اسے میں ہی نئے چہرے کے ساتھ پہچان سکوں گی۔ اسے جانے نہیں دوں گی۔''

اس نے اپنے ڈیپارٹمنٹ کے جاسوسوں کو یہ نہیں بتایا تھا کہ مراد دوسری صبح ائر انڈیا کی فلائٹ سے جا رہا ہے۔ اس نے صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ مراد کو نئے بہروپ میں پہچان سکتی ہے اور اسے تلاش کرتی پھر رہی ہے۔

اب اس کا من مزاج بدل گیا تھا۔ وہ مرد ہی کیا جو حواس پہ چھا نہ جائے۔

وہ پھر سے دل کو جکڑ رہا تھا۔ مرینہ اپنے ڈائریکٹر جنرل کو بھی فریب دے رہی تھی۔ مراد کے سر کا سودا کرنے کا خیال ہوا ہو گیا تھا۔ ہوا کا رُخ بدل گیا تھا۔ عجب جادوگری تھی پھر اس کی مردانگی اسے متاثر کر رہی تھی اور کیسے نہ کرتی؟ اس مرد نے پھر ایک بار اسے ہلاک نہیں کیا تھا۔ اسے نیم پاگل بنا کر چھوڑ گیا تھا۔

جبکہ وہ قسم کھا کر آئی تھی کہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گی۔ اب دل پر ہاتھ رکھ کر سوچ رہی تھی۔ ''اس زمین پر اور کوئی ایسا مرد نہیں ہے جو مجھے زیر کر سکے۔ ایک وہی ہے جو مجھے بار بار موت کی دہلیز پر پہنچا کر زندہ چھوڑتا رہتا ہے۔''

اب اس نے قسم کھائی کہ اس کے سر کا سودا نہیں کرے گی۔ اسے انڈیا سے کہیں جانے بھی نہیں دے گی اسے کسی طرح گھیر کر اپنے ہی پاس چھپا کر رکھے گی۔

دوسری صبح ایئر پورٹ پر دوستوں اور دشمنوں کی بھیڑ لگ گئی۔ ریڈ الرٹ اور ڈینجرس ریکٹ کے جاسوسوں کو بھی بھنک مل گئی تھی کہ مراد ائر انڈیا کی فلائٹ سے لندن جا رہا ہے۔

جگنی بائی اپنی دو بیٹیوں ٹینا اور ڈولی کے ساتھ انہیں الوداع کہنے آئی تھی۔ ایک بیٹی ورشا نہیں تھی۔ وہ پچھلی رات کو ہی گھر سے چلی گئی تھی۔ فون پر ماں سے کہہ دیا تھا کہ اسے تلاش نہ کیا جائے وہ کل صبح انٹیلی جنس کے آدمیوں کے ساتھ آئے گی۔

مرینہ وہاں برقع میں چھپی ہوئی تھی۔ دو مسلح گارڈز اس سے کچھ فاصلے پر اس کی نگرانی کے لیے موجود تھے۔

ایسے وقت ورشا تیزی سے چلتی ہوئی آئی۔ اس کے ساتھ دو انٹیلی جنس والے سادے لباس میں تھے۔ اس نے عبداللہ کبڈی کے پاس آ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔ ''مراد کہاں ہے؟''

کبڈی نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا کر کہا۔ ''میں کسی مراد کو نہیں جانتا۔ اپنی ماں سے بات کرو۔''

ماں نے کہا۔ ''ورشا! یہ تم کن لوگوں کے ساتھ تماشا کرنے آئی ہو اور وہ مراد کون ہے، ہم نہیں جانتے۔ تم جانتی ہو تو بتاؤ، کیا تمہیں کہیں نظر آ رہا ہے؟''

وہ بولی۔ ''میں دور سے دیکھتی آ رہی ہوں۔ وہ جو نئے چہرے کے ساتھ خود کو ایمان علی کہتا ہے، نظر نہیں آ رہا ہے۔''

وہ ڈاکٹر اور کبڈی کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''وہ کہاں ہے؟ وہ بھی تو اسی فلائٹ سے جا رہا ہے۔''

ماں نے کہا۔ ''وہ تو پہلے ہی پرسوں دوپہر کی فلائٹ سے جا چکا ہے۔ آج تو صرف ڈاکٹر اور عبداللہ کبڈی جا رہے ہیں۔''

اس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ مرینہ برقع میں قریب ہی کھڑی سن رہی تھی۔ اسے بھی شاک پہنچا۔ ورشا پریشان ہو کر بولی۔ ''نہیں ماتاجی! تم جھوٹ بول رہی ہو۔''

''تو پھر اسے ڈھونڈ نکالو۔ میری بچی! میں نے تمہیں جنم دیا ہے تم نے مجھے پیدا نہیں کیا ہے۔ تمہیں آج کے دھوکے میں رکھ کر اسے پرسوں ہی یہاں سے روانہ کر دیا تھا۔'' وہ ہنستی ہوئی بولی۔ ''دیکھو میں نے کیسے کھیل ختم کیا ہے اب کھیلو، کس سے کھیلو گی؟''

مرینہ سوچ رہی تھی، مراد واقعی دو دن پہلے جا چکا ہے یا پھر کوئی چال چلی جا رہی ہے۔ وہ یونس مراد کہلانے والے کبڈی کو روک کر حقیقت معلوم کر سکتی تھی۔

اس مقصد کے لیے وہ کبڈی کی طرف بڑھی پھر لڑکھڑا کر فرش پر گر پڑی۔ ڈاکٹر کا انجکشن اثر دکھا رہا تھا۔ وہ پھر ہوش و حواس سے بیگانی ہو گئی تھی۔ اپنے آپ کو بھول گئی تھی۔

ڈاکٹر یمنی سن اور عبداللہ کبڈی سامان کی ٹرالی دھکیلتے ہوئے بورڈنگ کارڈ لینے اندر جا رہے تھے۔ ایک ہندوستانی ماں پاکستانی بیٹے کو چھومنتر کر چکی تھی۔

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردش ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

جب نووارد تاش کھیلنے والے کمرے میں داخل ہوا تو میں اور چارلی برج کھیل رہے تھے۔ ہم دونوں لندن سے اس بحری جہاز پر سوار ہوئے تھے اور ہماری منزل آسٹریلیا کی بندرگاہ سڈنی تھی۔ نووارد نیوزی لینڈ کی بندرگاہ آکلینڈ سے سوار ہوا تھا جہاں سے سہ پہر کے وقت ہمارا جہاز روانہ ہوا تھا۔ ہمیں لندن سے چلے ہوئے ایک مہینا ہو گیا تھا اور اب صرف پانچ دن کا سفر باقی تھا۔

نووارد کا لباس بے حد قیمتی اور رکھ رکھاؤ حاکمانہ تھا۔ وہ فربہ اندام تھا، چربی اس کے چہرے پر بھی چڑھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اندر کی جانب دھنس گئی تھیں۔ گردن پر گوشت کی زیادتی نے اسے تقریباً معدوم کر دیا تھا۔ وہ ٹہلتا ہوا اس میز کی طرف بڑھا جہاں کئی افراد شام ہی سے پوکر کھیل رہے تھے۔ ان میں ایک شخص اس کا واقف کار تھا جس نے اٹھ کر نووارد سے پہلے مصافحہ کیا اور پھر اپنے ساتھیوں سے اس کا تعارف کرانے لگا۔

میں نووارد کو فراموش کر کے دوبارہ کھیل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے چارلی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا کہ کیا وہ کچھ پینا پسند کرے گا۔ وہ نووارد کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنا سوال دہرایا لیکن اس مرتبہ بھی اس نے میری آواز نہیں سنی۔ چند لمحوں بعد جب چارلی میری طرف پلٹا تو مجھے اس کی آنکھوں سے نفرتوں کے سوتے پھوٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔ میں حیران رہ گیا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کے تاثرات یکایک بدل گئے، اب ایسا نظر آتا تھا جیسے وہ سوتے سوتے اچانک بیدار ہو گیا ہو۔

”معاف کرنا، میں نے سنا نہیں تم کیا کہہ رہے تھے؟“

چارلی سے میری واقفیت جہاز پر ہی ہوئی تھی۔ وہ ہنس مکھ اور خوش گفتار ہونے کے ساتھ ساتھ دوسرے کی بات بھی پوری توجہ سے سنتا تھا۔ ایسے لوگ سماجی حلقوں میں بے حد مقبول ہوتے ہیں اور بڑی آسانی سے دوسروں کو دوست بنا لیتے ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے وہ انجینئر تھا اور اس کی ابتدائی زندگی بہت سخت گزری تھی۔ کبھی کبھی مجھے اس پر اتنا رشک آتا کہ میں اس جیسا نظر آنے کی خواہش کرنے لگتا۔ جہاز کے عملے کے علاوہ دوسرے تمام مسافر بھی اسے پسند کرتے تھے۔

لندن سے جہاز روانہ ہوتے ہی ہم دوست بن گئے تھے۔ ہماری شامیں تاش کھیلنے میں گزرتی تھیں لیکن جب سے نووارد نے اس کمرے میں قدم رکھا تھا، چارلی پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ اطمینان اور سکون کی جگہ اضطراب نے لے لی تھی، کھیل کے دوران وہ بار بار نووارد کی طرف دیکھتا رہتا جس کا نام رالسن تھا۔ کھیل کے علاوہ بھی چارلی جہاز پر جہاں کہیں بھی ہوتا، اس کی نظریں رالسن کے جسم سے چپکی رہتی تھیں۔

کسی کی زندگی کے شب و روز میں اپنا عکس دیکھنے والے شخص کی ذہانت کا ثبوت

کہتے ہیں کہ ہوا کا رخ دیکھ کر موسم کا اندازہ لگانے والے، بامعنی لفظوں سے گفتگو کے متن کو سمجھ لینے اور آنکھوں سے دلوں کے اندر جھانکنے والے بہت ذہین اور تہ نشین ہوتے ہیں... اس کا شمار بھی انہی زیرک انسانوں میں ہوتا تھا مگر اس مقام پر تمام ذہانت دھری کی دھری رہ گئی۔

تہ نشین

ش م جمیل



رالسن کو پوکر کھیلنا پسند تھا، وہ جس پارٹی کے ساتھ رہتا تھا، میں اس کے تمام افراد سے واقف تھا۔ وہ سب تاجر یا صنعت کار تھے۔ ان کا تعلق کان کنی، دھات کی خرید وفروخت، جہاز سازی اور اسی قسم کی صنعتوں سے تھا۔ وہ سب بہت دولت مند تھے لیکن ان میں دو افراد کروڑپتی تھے۔ ان میں سے کوئی بھی اپنی امارت کی نمائش اس طرح نہیں کرتا تھا جس کا رالسن عادی تھا۔ وہ کھیل کے دوران نوٹوں کی گڈیاں اپنے سامنے رکھ کر کھیلتا تھا۔ اس کی انگلیوں میں کئی انگوٹھیاں تھیں اور ان سب میں بڑے بڑے ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ سگار رکھنے والا کیس مگرمچھ کی کھال سے بنا ہوا تھا۔ سگار جلانے کا لائٹر پورا کا پورا سونے کا تھا اور سگار کاٹنے کا کٹر بھی ٹھوس سونے کا بنا ہوا تھا۔ کھیل کے دوران وہ بہت شور کرتا تھا۔ ہر پانچ منٹ بعد چیخ کر اسٹیوارڈ کو آواز دیتا جو دوڑ دوڑ کر برانڈی اور وسکی کی بوتلیں لاتا رہتا تھا۔ جیتنے کے دوران زور زور سے اپنی مہارت اور ذہانت کا ذکر کرتا اور ہارتے ہوئے بدقسمتی کو کوستا۔ رالسن کی ان عادتوں کے پیش نظر کوئی بھی اسے پسند نہیں کرسکتا تھا لیکن مجھے یقین تھا چارلی کی ناپسندیدگی کی وجہ کچھ اور ہی تھی۔

جوں جوں ہمارا جہاز آسٹریلیا کے براعظم کے قریب ہوتا جارہا تھا، سمندر کی گہرائی میں کمی واقع ہورہی تھی۔ لہروں کی سرکشی بڑھتی جارہی تھی اور جہاز کبھی ہچکولے لینے لگتا تھا۔ وہ آخری رات تھی، دوسرے روز دوپہر کے وقت جہاز سڈنی کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہونے والا تھا۔ طویل سفر کے بعد تمام مسافر زمین پر قدم رکھنے کے لیے بے قرار نظر آرہے تھے۔ اس رات کوئی بھی تاش کھیلنے کے موڈ میں نظر نہیں آتا تھا۔ رالسن جن لوگوں کے ساتھ پوکر کھیلتا تھا انہوں نے بھی کھیلنا ترک کردیا تھا۔ اس وقت رالسن سب کی نظروں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس کی انگلیاں موٹی ضرور تھیں لیکن میں یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا کہ وہ تاش کے پتوں کا کوئی پیشہ ور ماہر نظر آرہا تھا۔ اس نے وہ سارے کرتب دکھائے جو شعبدے باز دکھاتے ہیں اور پھر ایک ایسا کمال دکھایا جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

رالسن نے تاش کی گڈی میں سے پان کا اکا نکال کر سب کو دکھایا اور پھر وہ پتا گڈی میں شامل کرکے انہیں پھینٹنا شروع کیا۔ اس نے چھ جگہ پتوں کو تقسیم کیا، تمام پتے الٹے رکھے تھے، پھر اس نے چھ میں سے ایک ڈھیر پر انگلی رکھ دی۔ ان پتوں کو دیکھا گیا تو ان میں پان کا اکا موجود تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر اس نے یہ شعبدہ کس طرح دکھایا۔ چارلی کرسی پر جھکا بہت غور سے یہ شعبدہ دیکھ رہا تھا۔

"میں نے یہ کرتب آخری بار سمٹ ڈگن میں دیکھا تھا۔" چارلی نے پہلی بار لب کشائی کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

کمرے میں موجود تمام افراد پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

کروڑپتی ڈینی سن نے کہا۔ "تم دونوں ہمارے ساتھ شامل کیوں نہیں ہوجاتے، آج ہماری آخری رات ہے۔ ہمیں سفر کے اختتام کی خوشی میں جشن منانا چاہیے۔"

ہم اس پارٹی میں شامل ہوگئے۔ ڈینی سن نے اسٹیوارڈ کو شمپین، برانڈی اور وسکی کی بوتلیں لانے کا حکم دیا۔

"تو دوست تم بھی سمٹ ڈگن میں قیمتی پتھر نکالتے ہو؟" میک نے پوچھا۔ وہ بھی کروڑپتی تھا۔

"اب تو نہیں لیکن بیس سال پہلے۔"

"وہ بڑا خطرناک علاقہ ہے، میں نے کچھ عرصے وہاں کان کنی کی ہے۔" میک نے سب پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ "وہ علاقہ ہر قسم کی آبادی سے سیکڑوں میل کے فاصلے پر ہے اور عظیم صحرا کے کنارے پر واقع ہے۔ گرمی تو۔۔۔۔ بہت شدید ہے اس علاقے میں کھدائی کرنے کے لیے انتہائی سخت جان ہونا لازم ہے، کیوں دوست، ٹھیک ہے نا؟"

چارلی نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تم نے بھی دولت جمع کی؟" ڈینی سن نے پوچھا۔

"ہاں اور نہیں۔" چارلی نے آہستگی سے کہا اور رالسن کی طرف لمحے بھر کے لیے دیکھا جو سر جھکائے تاش کے پتے پھینٹ رہا تھا۔ چارلی نے پائپ سلگایا اور ایک گہرا کش لے کر چاروں طرف دیکھا۔

"میں نے سمٹ ڈگن کے علاقے میں تقریباً ایک سال تک قسمت آزمائی کی تھی۔" چارلی نے کہانی بیان کرنے والے انداز میں کہا۔ "میرے ساتھ دو شریک کار تھے ایک کا نام ہورگن تھا، وہ ان معاملات میں خاصا تجربہ کار تھا اور دوسرا ایک کم عمر نوجوان تھا، اس کا نام ڈان تھا۔ وہ بالکل ناتجربہ کار تھا لیکن سخت جان اور محنتی تھا۔ ہم تینوں نے مل کر ایک سال کے عرصے میں بہت بڑے علاقے کی کھدائی کرڈالی تھی۔"

"وہاں زیادہ گہری زمین کھودنی نہیں پڑتی۔" میک نے کہا "صرف چھ فٹ۔"

"چھ فٹ؟ بس۔" ڈینی سن نے حیرت بھرے لہجے میں کہا اور تصدیق طلب نظروں سے چارلی کی طرف دیکھا۔

"درست ہے۔" چارلی نے جواب دیا۔ "اس

علاقے میں صرف چھ فٹ کھدائی کرنے پر آہنی پتھروں کی تہ نکل آتی ہے اور اس کے بعد اصل کام شروع ہوتا ہے۔ اس تہ کو توڑ کر مزید کئی فٹ کھدائی کرنی پڑتی ہے۔ تہ کے نیچے سرنگ بنا کر پشت کے بل لیٹ کر ایک ایک انچ کھسکنا پڑتا ہے اور موم بتی کی روشنی میں آہنی پتھروں کی تہ میں چھپے ہوئے قیمتی پتھر اوپل نکالنے پڑتے ہیں۔ اس میں بھی بڑی احتیاط کرنی پڑتی ہے کیونکہ ذرا سی بے احتیاطی سے اوپل میں بال آجاتا ہے جس کے بعد اس کی قیمت ایک چوتھائی بھی نہیں رہتی۔ یہ بڑا ہی صبر آزما اور اعصاب شکن کام ہوتا ہے لیکن ہم نے ہمت نہیں ہاری اور مسلسل ایک سال تک اوپل نکالتے رہے۔ اس طرح ہم نے بارہ سو اونس پتھر جمع کرلیا۔ اس وقت تو آپ کو یہ مقدار کچھ زیادہ نظر نہیں آئے گی لیکن بیس سال قبل بھی اول درجے کا اوپل اسّی ڈالر فی اونس کے حساب سے فروخت ہوتا تھا، اب اس کی قیمت ہزار ڈالر کے لگ بھگ بنتی ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کا حصہ پچیس ہزار ڈالر سے اوپر بنتا تھا اور بیس سال قبل یہ رقم بہت بڑی شمار ہوتی تھی۔"

میں نے اس سے پہلے چارلی کو کبھی اس طرح بے تکان بولتے ہوئے نہیں سنا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی خاص مقصد کے تحت اپنی کہانی بیان کر رہا ہے۔ میں نے رالسن کی طرف دیکھا، وہ بالکل پرسکون نظر آرہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چارلی پر جمی ہوئی تھیں۔

"میں زندگی بھر وہ آخری شب نہیں بھول سکتا جو میں نے سمٹ ڈگن میں...... گزاری تھی۔" چارلی نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ہم تینوں میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بغیر ٹانگوں کی میز تھی یا یوں کہیں کہ میز کا صرف اوپری حصہ تھا جو لکڑی کے تختے جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ اس علاقے میں ہم سے پہلے بھی بہت سے لوگوں نے قسمت آزمائی کی تھی اور چلتے وقت وہ لوگ انتہائی ضروری اشیا کے علاوہ سب کچھ وہاں چھوڑ جاتے تھے۔ ہم میز کے گرد موم بتیوں کے خالی ڈبوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے پتھروں کا وزن کرکے انہیں برابر کے حصوں میں تقسیم کرلیا تھا اور ہمارے حصے ہمارے سامنے رکھے تھے۔ موم بتیوں کی روشنی میں ان پتھروں سے نارنجی شعلوں کی لپٹیں اٹھتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ وہ ایسا منظر تھا جو لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ہم نے سونے سے پہلے کچھ دیر پوکر کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ ایک گھنٹے کے کھیل کے دوران میں برابر جیتتا رہا۔ کم عمر ڈان بہت کم پتھر ہارا لیکن ہورگن خاصی بڑی تعداد میں پتھر ہار چکا تھا۔ کچھ لوگ کھیل میں ہارنا برداشت نہیں کرسکتے۔ اس نے ہارے ہوئے پتھر واپس لینے کے چکر میں بلف کرنا شروع کردیا اور داؤ پر لگے ہوئے پتھروں کی تعداد تیزی سے بڑھنے لگی۔ آخرکار میں نے اسے پتے دکھانے کو کہا اور اس طرح ہورگن آخری بازی بھی ہار گیا۔ اس کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہوگیا اور وہ بری طرح اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ میں نے داؤ پر لگے ہوئے پتھروں کو اپنی طرف سمیٹنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا ہی تھا کہ ہورگن نے بڑی سرعت کے ساتھ چاقو نکال لیا۔ میری توجہ پتھروں کی طرف مرکوز تھی اس لیے میں وقت پر اس کی حرکت نہ دیکھ سکا۔ اس نے ہاتھ فضا میں بلند کیا اور پوری قوت سے میری ہتھیلی کی پشت پر وار کیا۔ ہورگن میں بلا کی قوت تھی، چاقو ہتھیلی سے آر پار نکلتا ہوا لکڑی کی میز میں دھنس گیا۔"

چارلی کا تنفس تیز ہوگیا تھا، اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے پھوٹ آئے تھے۔ اس نے اپنا سیدھا ہاتھ سب کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ اس کا ہاتھ بہت بڑا تھا جس پر گھنے سیاہ بال نظر آرہے تھے۔ ہتھیلی کی پشت پر ایک لمبے اور گہرے زخم کا نمایاں نشان نظر آرہا تھا جو کلائی تک پھیلا ہوا تھا۔ زخم بھر چکا تھا لیکن اس جگہ دوبارہ بال نہیں اگے تھے۔ زخم کا نشان درمیانی جگہ پر ایک چوتھائی انچ چوڑا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ چاقو کا پھل چوڑا ہونے کے ساتھ دودھاری تھا۔ کمرے پر گہرا سکوت طاری ہوگیا تھا۔

"پھر تم نے کیا کیا؟" کسی نے سکوت توڑتے ہوئے کہا۔

"چاقو میز کی سطح میں کافی گہرا دھنس گیا تھا اس لیے میں کچھ نہیں کرسکتا تھا۔" چارلی نے جواب دیا۔ "ہورگن نے چیخ کر کہا، دھوکے باز ذلیل، کمینے، پھر وہ جنگلی درندے کی طرح اچھل کر نشست سے کھڑا ہوگیا اور میرے قریب آیا، اس نے جھک کر زمین پر کچھ ٹٹولا اور جب وہ کھڑا ہوا تو اس کے ہاتھ میں دو تین معمولی سے پتے تھے۔ اس نے وہ پتے ڈان کے سامنے پھینک دیے اور چیخ چیخ کر اول فول بکنے لگا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ میں نے ایک اکا چھپایا ہوا تھا اور موقع دیکھ کر میں نے اپنے چھوٹے پتے نیچے پھینک دیے اور اکا اپنے پتوں میں شامل کرلیا۔ اس وقت درد کی شدت سے میرا ذہن مفلوج ہوچکا تھا، اس کے باوجود میں اس کا کھیل سمجھ گیا۔ میں نے کم عمر ڈان کو صحیح صورتِ حال بتانے کی کوشش کی لیکن اس نے مجھ پر یقین نہیں کیا۔ چلو اپنا سامان اٹھاؤ، ہورگن نے مشتعل انداز میں ڈان سے کہا۔ ہم ابھی اور اسی وقت یہاں سے جارہے ہیں۔ میں ایسے شخص کے ساتھ ایک منٹ بھی رہنا پسند نہیں کرتا جو اپنے دوستوں کو دھوکا دے سکتا ہو۔ اس پر ڈان نے اعتراض کیا کہ وہ مجھے

اس حالت میں کس طرح چھوڑ کر جا سکتے ہیں۔ اس پر ہورگن نے ڈان کا کاندھا پکڑ کے جھنجوڑا۔ جنگ میں جنگل کا قانون ہی چلتا ہے ڈان۔ اس نے سخت لہجے میں کہا۔ جو دوستوں کو دھوکا دے اسے عبرتناک سزا ملنی چاہیے۔ ہم اسے یہیں چھوڑ جائیں گے اور اس کا حصہ بھی آپس میں بانٹ لیں گے۔ یہ اس کی خوش قسمتی ہے کہ ہم اسے زندہ چھوڑ رہے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے ہورگن نے ڈان کو خیمے سے باہر نکال دیا۔"

چارلی خاموش ہو گیا اور اکھڑی ہوئی سانسوں کو اعتدال پر لانے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے سلسلہ جوڑتے ہوئے کہا۔ "جس وقت ان کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی، میں الٹے ہاتھ سے چاقو میز کی سطح سے باہر نکالنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔ ہر کوشش پر درد کی ایک لہر میرے وجود کو آگ کے شعلوں میں دھکیل دیتی تھی اور تازہ لہو زیادہ تیزی کے ساتھ ابلنے لگتا تھا۔ ڈان کو خیمے سے نکال کر ہورگن نے زمین پر پڑا ہوا ہتھوڑا اٹھایا۔ جیسے ہی میری نظر ہتھوڑے پر پڑی، میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ بے اختیار میرے حلق سے ایک بھیانک چیخ نکلی لیکن ہورگن کو وہ چیخ نہیں روک سکی۔ اس نے چاقو کے دستے پر ہتھوڑا مار کر چاقو کو میز کی سطح میں خوب اچھی طرح گھسا دیا۔ جس طرح لکڑی میں کیل ٹھونکی جاتی ہے فرق یہ تھا کہ اس نے کیل کا کام اس دو دھاری چاقو سے لیا تھا۔ درد کی شدت جب ناقابلِ برداشت ہو گئی تو میں بے ہوش ہو گیا اور جب مجھے ہوش آیا تو وہ دونوں مجھے اس ویرانے میں تنہا چھوڑ کر جا چکے تھے۔"

چارلی نے ہاتھ بڑھا کر اپنا گلاس اٹھایا اور بچی کچی شراب جلدی سے حلق میں انڈیل لی۔ کروڑپتی میک کا چہرہ خوف سے سپید پڑ گیا تھا۔ "میں ہورگن کو انسان تسلیم نہیں کر سکتا۔" اس نے جبڑے بھینچتے ہوئے کہا۔

ہماری نظریں چارلی پر جمی ہوئی تھیں اور ہم بے تابی سے اس کی کہانی کا بقیہ حصہ سننے کے منتظر تھے۔

"شاید آپ میں سے کسی کو بھی ایسی صورتِ حال کا سامنا کرنا نہیں پڑا ہوگا۔ مجھ پر اس کا ناقابلِ فہم ردِعمل ہوا۔ مجھ پر نیم غنودگی سی کیفیت طاری ہو گئی اور دوسرے دن میں تمام وقت اونگھتا رہا۔ میرے حواس مفلوج ہو گئے تھے اور ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ شام کو ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے مجھے اس کیفیت سے بیدار کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں غیر شعوری طور پر تمام دن خود کو ایک آخری کوشش کے لیے تیار کرتا رہا تھا۔ بے تحاشا خون بہہ جانے کی وجہ سے میں نقاہت محسوس کر رہا تھا میرا ہاتھ جو تمام دن درد کی آگ میں جلتا رہا تھا، شام کے وقت سن ہو گیا تھا جس کی وجہ سے تکلیف کے احساس میں کمی واقع ہو گئی تھی۔ میں نے پہلی بار جھک کر غور سے اپنے ہاتھ کا جائزہ لیا۔ چاقو کا دستہ میری ہتھیلی کی پشت تک دھنسا ہوا تھا اور تب مجھ پر انکشاف ہوا کہ میرے ہاتھ کی ہڈیاں چاقو کے پھل سے محفوظ تھیں، شاید ایک آدھ رگ کٹ گئی تھی، جس کی وجہ سے اس قدر خون بہا تھا۔ وہاں ایسے اوزار موجود نہیں تھے جن کی مدد سے چاقو میز کی سطح سے باہر نکال لیا جاتا۔ میرا خیمہ شاہراہ سے تین میل اندر تھا لیکن قریب ترین بستی سو میل سے زیادہ فاصلے پر تھی۔ اگر میں اسی طرح خیمے میں بیٹھا رہتا تو چند روز میں میری موت واقع ہو جاتی۔ اگر میں کسی نہ کسی طرح تین میل دور شاہراہ پر پہنچ جاتا تو میرے زندہ بچنے کے کافی امکانات تھے۔ وہ شاہراہ مجھ جیسے قسمت آزما اور سرکاری ملازمین ہی استعمال کرتے تھے۔ گو اس سڑک پر آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی لیکن میں اس امکان کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ اگر میں شاہراہ پر پہنچ جاؤں تو ممکن ہے اس سڑک پر سفر کرنے والا میرے مرنے سے پہلے اس طرف نکل آئے اور مجھے طبی امداد مل جائے۔"

چارلی نے خاموش ہو کر پائپ سلگایا اور دوبارہ کہانی شروع کرنے سے پہلے کئی کش لیے۔ "عام طور پر کوئی بھی تین میل کا فاصلہ ایک گھنٹے میں پیدل طے کر سکتا ہے لیکن مجھے وہی فاصلہ طے کرنے میں دو دن لگ گئے کیونکہ میز کا اوپری حصہ بہت وزنی تھا اور خون نکلنے کی وجہ سے میں بہت کمزور ہو گیا تھا۔ میں نے میز کو سر پر اٹھا رکھا تھا اور میرا ہاتھ بدستور اس کی سطح سے جڑا ہوا تھا۔ دو روز بعد جب میں نڈھال ہو کر زمین پر گر گیا اور مجھے احساس ہو گیا کہ اب میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا تو بے اختیار میرے منہ سے قہقہے بلند ہونے لگے کیونکہ میں سڑک کے کنارے پہنچ گیا تھا جس کا احساس مجھے زمین پر گرنے کے بعد ہوا۔ تکلیف کی ایک شدید لہر میرے اندر سے بلند ہوئی اور میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو سفید فام باشندوں کے درمیان پایا، ان کے ساتھ برِاعظم آسٹریلیا کا ایک مقامی باشندہ بھی تھا۔ وہ میری طرح قسمت آزما تھے۔ میں نے انہیں اپنی کہانی سنائی تو وہ فوراً ہورگن اور ڈان کا تعاقب کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ ان کے پاس گھوڑے تھے جو تیز رفتاری سے سفر کر سکتے تھے لیکن ہمارے درمیان ڈھائی دن کا وقفہ حائل تھا۔ مجھے احساس تھا

کہ ہم ہورگن کو نہیں پکڑ سکیں گے۔ اس کے ساتھ مجھے ڈان کی بھی فکر تھی۔ مقامی باشندے ماہر کھوجی ہوتے ہیں، ہم اس کی راہنمائی میں سفر کر رہے تھے۔ ایک جگہ وہ رک گیا۔ سڑک سے ہٹ کر چٹانوں کا سلسلہ تھا اور وہاں ایک تنگ درّے میں ہورگن اور ڈان نے ایک رات کے لیے قیام کیا تھا۔ ہمیں درّے میں ڈان کی لاش پڑی ہوئی نظر آئی۔"

چارلی خاموش ہو گیا۔ اس کی جذباتی کیفیت ایسی تھی کہ وہ اپنی کہانی جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس وقفے سے فائدہ اٹھا کر ہم لوگ بھی مشروبات اور تمباکو نوشی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ سب خاموش تھے، ہمارے ذہن اس ہولناک کہانی کے تانے بانے میں الجھے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد چارلی نے ایک بار پھر لب کشائی کی۔

"ڈان کی لاش دیکھ کر یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ ضرور چٹان پر چڑھا ہوگا اور پیر پھسلنے کی وجہ سے وہ سر کے بل نیچے درّے میں گر گیا۔ اس کا سر بری طرح کچلا ہوا تھا جس سے اس کی موت واقع ہوئی تھی لیکن مجھے ایک لمحے کے لیے ڈان کی حادثاتی موت پر یقین نہیں آیا۔ ہورگن نے سوتے کی حالت میں ڈان پر بہت بڑا پتھر پھینک کر اس کا سر کچل دیا تھا۔ ہم نے وہ پتھر تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ اس طرح ہورگن اونیل کی ساری مقدار کا مالک بن گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ میں صحرا میں زندہ نہیں بچوں گا اور ڈان کو اس نے قتل کر دیا تھا۔ ہم نے ڈان کو دفن کرنے کے لیے قبر کھودی اور جس وقت ہم اسے قبر میں لٹا رہے تھے، اس کے حلق سے کراہنے کی دھیمی سی آواز نکلی۔ اس آواز سے ہم خوفزدہ ہو گئے۔ اور دو افراد ڈان کی لاش چھوڑ کر بھاگ لیے لیکن بقیہ دو افراد مضبوط دل کے آدمی تھے، انہوں نے آہستگی سے ڈان کو زمین پر لٹا دیا۔ پھر کسی نے دل کے مقام پر کان لگا کر دھڑکن سننے کی کوشش کی تو ڈان زندہ تھا لیکن اس کا دل بہت آہستہ آہستہ دھڑک رہا تھا۔ اگر اس وقت ڈان کے حلق سے کراہنے کی آواز نہیں نکلتی تو ہم اسے مردہ تصور کرتے ہوئے زندہ ہی دفن کر دیتے۔

"ہم نے اسی جگہ خیمے لگا دیے اور ہر ممکن ڈان کی تیمارداری میں لگ گئے۔ جب اس کی حالت سفر کے قابل ہو گئی تو ہم نے ہورگن کا تعاقب کرنے کا خیال ملتوی کر دیا اور قریب ترین آبادی کی جانب چل دیے لیکن اس مرتبہ ہمارا سفر سست رفتاری سے طے ہو رہا تھا کیونکہ ڈان کی حالت گھوڑوں کی تیز رفتاری کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی خوش قسمتی سے ہم اسے زندہ حالت میں آبادی تک لے جانے میں کامیاب ہو گئے جہاں ایک اسپتال بھی تھا۔ ڈان مہینوں اسپتال میں زیرِ علاج رہا لیکن صحت یاب ہو گیا۔"

جب تک چارلی اپنی کہانی سناتا رہا، میں کچھ نہ کچھ ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے لیکن مجھے یقین تھا کہ کچھ ضرور ہوگا لیکن اگر یہی کہانی کا اختتام تھا تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کہانی کے بیان کرنے کا کیا مقصد تھا۔ میں نے رالسن کی طرف دیکھا، وہ مسحور زدہ انداز میں چارلی کو نظریں جمائے دیکھ رہا تھا۔

"تم ہورگن کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے؟" کروڑپتی میک نے دریافت کیا۔

"نہیں۔ اسے فرار ہونے کے لیے بہت وقت مل گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ آسٹریلیا سے فرار ہو گیا تھا۔ اس کے بعد کسی نے بھی ہورگن کو نہیں دیکھا۔"

کسی نے گہرا سانس لیا۔ "اور ڈان کا کیا ہوا؟"

"صحت یابی کے بعد وہ کافی عرصے بے کار رہا۔ وہ کام کرنے کے قابل نہیں تھا۔ آج کل وہ خوب صحت مند ہے، لندن میں رہتا ہے۔ ایک خوبصورت بیوی کا شوہر اور تین پیارے بچوں کا باپ ہے۔۔۔۔" اس واقعے کے بعد ہم دونوں جنگل کے قانون کے قائل ہو گئے ہیں۔ کیونکہ جنگل کا قانون انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ آپ لوگوں کو یہ سن کر شاید مسرت ہوگی کہ کل جب ہمارا جہاز سڈنی کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوگا تو ڈان وہاں میرے استقبال کے لیے موجود ہوگا۔ آپ لوگ اسے دیکھ کر یقین نہیں کریں گے کہ یہ وہی شخص ہے جسے ہم غلطی سے زندہ دفن کرنے جا رہے تھے۔"

اس سے پہلے کہ کوئی شخص اپنے خیال کا اظہار کرتا، رالسن اچانک نشست سے کھڑا ہو گیا۔ ٹھیک اسی وقت جہاز تیزی سے ایک طرف جھکا۔ ہم لوگوں نے جلدی سے اپنے اپنے گلاس پکڑ لیے۔ رالسن نے میز کا کنارا پکڑ کے خود کو گرنے سے بچایا۔ اس کا سرخ و سفید چہرہ نیلا پڑا ہوا تھا۔ "میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، میں اپنے کیبن میں جا رہا ہوں۔" وہ بڑبڑاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

ایک اسٹیوارڈ اسے سہارا دے کر لے جانے لگا، ہم خاموشی سے اسے جاتا ہوا دیکھتے رہے۔

پھر چارلی نشست پر کھڑا ہو گیا۔ "بہت دیر ہو گئی ہے، میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے بلند آواز میں اعلان کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ چارلی کے رخصت ہونے پر ہر شخص اپنے کیبن کی طرف روانہ ہو گیا۔ ہر شخص کسی

گہرے خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔

اس رات میں دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ پتا نہیں کب آنکھ لگ گئی۔ رات کے کسی حصے میں اچانک میں بستر سے اٹھ گیا۔ میں نے کیبن کی روشنی جلائی، اس وقت صبح کے پانچ بجے تھے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر کس وجہ سے میری آنکھ کھلی ہے، تب اچانک مجھے احساس ہوا کہ جہاز کا انجن بالکل خاموش ہے۔

میں نے جلدی سے لباس تبدیل کیا اور عرشے پر نکل آیا۔ باہر بہت سردی تھی اور سمندر پر کہر چھائی ہوئی تھی۔ آسمان پر سپیدۂ سحر نمودار ہو چکا تھا۔ کچھ لوگ عرشے پر ریلنگ پکڑے جھک کر سمندر میں کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پتا کرنے پر معلوم ہوا کہ رالسن عرشے پر ٹہلتا رہا تھا اور کچھ دیر قبل اس نے اچانک سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ جہاز کو واپس موڑا گیا، اس وقفے میں سورج نکل آیا تھا۔ کئی کشتیاں پانی میں اتاری گئیں لیکن گھنٹوں کی تلاش کے باوجود رالسن کا کوئی پتا نہیں چلا۔

مجھے یقین تھا کہ رالسن ہی چارلی کی کہانی والا ہورگن تھا، اس کے باوجود مجھے اس کی موت پر افسوس ہوا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ عرشے پر چارلی کے علاوہ سارے مسافر موجود ہیں، میں نے اسے ناشتے کے وقت بھی نہیں دیکھا۔ دوپہر کو وہ تاش کھیلنے والے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ہشاش بشاش اور مسرور نظر آرہا تھا۔ بہ ظاہر وہ خوب گہری نیند سویا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب قسم کے تاثرات تھے جنہیں لفظوں میں بیان کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ کچھ ایسے تاثرات جو کوئی بہت بڑا اور مشکل کام کامیابی کے ساتھ انجام دینے پر کسی کے چہرے پر نظر آتے ہیں۔

اس کی آمد سے قبل ہم لوگ رالسن کی خودکشی پر قیاس آرائی کر رہے تھے، اسے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ چارلی نے سب کے لیے مشروبات کا آرڈر دیا اور تاش کی گڈی نکال کر...... کھیل کے پتے جمانے لگا۔ اس کی بے نیازی دیکھ کر کروڑپتی میک سے برداشت نہیں ہو سکا۔ ”سنو چارلی۔“ اس نے میز پر آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ ”کل رات جو تم نے کہانی سنائی تھی...... اس میں جو شخص ہورگن تھا...... وہ رالسن ہی تھا نا؟“

چارلی نے ایک پتا پلٹا اور اسے صحیح جگہ پر لگانے لگا پھر اس نے آہستگی سے سر اٹھا کر میک کو دیکھا۔ اس نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا، بس اثبات میں سر ہلا دیا۔

”دیکھا میں نے کہا تھا۔“ میک نے فاتحانہ انداز میں دوسروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ڈیبی سن نے چارلی کی طرف دیکھا۔ ”اگر تمہیں یہ معلوم ہوتا کہ تمہاری کہانی سننے کے بعد رالسن خودکشی کرلے گا تو تم یقیناً اپنی کہانی نہیں سناتے، ٹھیک ہے نا؟“

”میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اس ردعمل کا یقین تھا۔“ چارلی نے ڈیبی سن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہونے کے لیے مچل رہی تھی، یا شاید میری نظریں دھوکا کھا گئی تھیں۔ ”لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اس کے خودکشی کرنے کی توقع تھی۔“

کمرے پر اچانک اعصاب شکن خاموشی چھا گئی۔

”سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟“ میک نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ ”تم نے بیس سال بعد بھی رالسن کو پہچان لیا تھا۔ شاید وہ بھی تمہیں پہچان گیا تھا لیکن اس توقع پر خاموش رہا کہ تم اسے شناخت نہیں کر سکو گے۔ تم گزشتہ شب اگر اپنی کہانی نہیں سناتے تو اس وقت رالسن زندہ ہوتا۔ بندرگاہ پر اترتے ہی تم اسے پولیس کے حوالے کر سکتے تھے، اس طرح تمہیں اور تمہارے دوست ڈان کو وہ حصہ بھی مل جاتا جسے ہورگن نے بیس سال قبل تم سے چھینا تھا۔ اس کے علاوہ عدالت تم دونوں کو جرمانہ بھی دلواتی اور اسے کم از کم دس سال کی سزا بھی ہو جاتی جس سے تمہارا انتقام بھی پورا ہو جاتا۔ اس کا زندہ رہنا ہر لحاظ سے بہتر تھا۔“

میک نے میرے خیالات کی ترجمانی کی تھی، شاید ہر شخص یہی سوچ رہا تھا۔ چارلی اس دوران بڑی توجہ سے تاش کے پتوں سے کھیلتا رہا۔ ہم خاموشی سے اس کے جواب کا انتظار کر رہے تھے۔ آخرکار چارلی نے سر اٹھا کر ہماری طرف دیکھا۔ ”عدالت تک یہ معاملہ لے جانے کے لیے گواہ کی ضرورت تھی۔ کسی گواہ کے بغیر میں اپنی کہانی سچ ثابت نہیں کر سکتا تھا۔“

میں اس کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ چارلی کی کہانی سچ ثابت کرنے کے لیے سب سے بڑا عینی شاہد اس کا دوست ڈان تھا اور وہ افراد تھے جنہوں نے اسے اور ڈان کو بچایا تھا۔

”بات یہ ہے۔“ چارلی نے نرم لہجے میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”کہ ڈان زندہ نہیں بچ سکا تھا۔ جب ہم اس دڑبے تک پہنچے تو وہ مر چکا تھا۔“

حکیم صاحب کی لڑکی بہت خوبصورت تھی۔

میں صرف ایک بار ہی اپنے بخار کا علاج کروانے حکیم صاحب کے مطب کی طرف گیا حالانکہ میں جب بھی بیمار پڑتا کسی ایلو پیتھ ہی کے یہاں جایا کرتا تھا لیکن اس دن نہ جانے کیوں حکیم شمشاد کے مطب میں گھس گیا۔

میں یہ مطب ایک عرصے سے دیکھتا آ رہا تھا۔ میرا راستہ بھی یہی تھا اسی لیے حکیم صاحب، کے بورڈ پر نظر پڑ جاتی تھی۔

شاید وہ کسی مشرقی علاج کے کالج کے فارغ التحصیل بھی تھے۔

میں نے اکثر وہاں مریضوں کو بھی دیکھا تھا یعنی حکیم صاحب کے ہاتھ میں شفا تھی۔ اس لیے مریضوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔

اس دن شاید میری قسمت مجھے حکیم صاحب کی طرف لے گئی تھی۔ خوش گوار قسم کے حادثات اسی انداز سے ہوا کرتے ہیں جب اچانک ہی کوئی نعمت آپ کے ہاتھ لگ

قطعہ کہانی

منظر امام

کبھی کبھی لفظوں کے الٹ پھیر سے جملہ ایک الگ ہی معنی پہن لیتا ہے جیسا کہ یہاں... گھر کسی اور کا، دستک کسی اور کی... بڑا گمبھیر مسئلہ درپیش تھا جبکہ مکین کے دل میں ایک الگ جہان آباد تھا... ایسے میں ملاپ بھلا کس طرح ممکن تھا۔

آنکھوں کے رستے دل میں گھر کرنے والوں کی گمشدگی کا ماجرا



جائے اچانک ہی کوئی تختہ مل جائے اور تختہ وہاں موجود تھا۔

ایک بہت نازک اور خوبصورت سی لڑکی جو مریضوں کو دوا بنا بنا کر دیے جا رہی تھی۔ وہ یقیناً کمپاؤنڈر قسم ہی کی تھی۔

اس نے میرا نام پوچھا۔ رجسٹر میں درج کیا اور ایک ٹوکن میری طرف بڑھا دیا یعنی حکیم صاحب کا کام ٹھیک ٹھاک ہی چل رہا تھا۔ میں بھی قطار کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

میں مریضوں کے درمیان بیٹھا تو تھا لیکن میری نگاہیں اس لڑکی کا طواف کر رہی تھیں۔ بلا کی جاذبیت تھی اس میں۔ وہاں بیٹھے بیٹھے مجھے اس کا نام بھی معلوم ہو گیا۔ اس کا نام جمیلہ تھا۔ حکیم صاحب بار بار اسے آوازیں دیتے تھے۔

"جمیلہ، ادھر آنا۔ جمیلہ فلاں کو بھیج دو۔ جمیلہ یہ اٹھا کر لے آؤ۔"

کچھ دیر انتظار کے بعد میری باری بھی آ گئی۔ جمیلہ نے میرا نام پکار کر مجھے اندر بھیج دیا۔ حکیم صاحب کا کمرا مختلف قسم کی دواؤں کی بو یا خوشبو سے رچا ہوا تھا۔

"تشریف رکھیں۔" حکیم صاحب نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔

"جی فرمائیں، کیا تکلیف ہے آپ کو؟"

"حکیم صاحب، تکلیف تو یہاں آنے کے بعد ہوئی ہے۔" میں نے دھیرے سے کہا۔

"کیا مطلب؟" حکیم صاحب نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"جناب، گھر سے چلا تو صرف بخار تھا۔ یہاں بیٹھنے کے بعد سینے میں جلن بھی شروع ہو گئی ہے۔"

"اوہ۔" حکیم صاحب نے میری نبض دیکھنی شروع کر دی۔ "میاں، کچھ تیزابیت معلوم ہوتی ہے اور معدے میں گڑبڑ ہے۔"

"ہو سکتا ہے جناب۔"

"ہو نہیں سکتا بلکہ ہے۔ اب تم ایسا کرو کہ اپنے قارورے کی جانچ کروا کے لے آؤ۔ اس کے بعد تمہارا مکمل علاج شروع کروں گا۔" اس وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ قارورہ کسے کہتے ہیں۔ اس لیے میں حکیم صاحب کے کمرے سے نکل کر اس لڑکی جمیلہ کے پاس آ گیا۔

"لائیں اپنا نسخہ دیں۔" اس نے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

"حکیم صاحب نے نسخہ تو دیا ہی نہیں۔" میں نے بتایا۔ "کہہ رہے تھے کہ قارورہ جانچ کروا کے آؤ۔ اب میں نہیں جانتا کہ یہ قارورہ کیا ہوتا ہے؟"

"کیا آپ قارورہ نہیں جانتے؟" وہ زیر لب مسکرا رہی تھی۔

"بالکل نہیں، اتنی مشکل چیز میرے پاس نہیں ہوتی۔" میں نے کہا۔

"یورین کو کہتے ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے بتایا اور دوسری طرف متوجہ ہو گئی۔

مجھے اس وقت سخت خفت ہوئی تھی۔ میں جلدی سے مطب سے باہر نکل آیا۔ میں ان چکروں میں نہیں پڑنا چاہتا تھا لیکن اب تو قارورہ جانچ کروانا ضروری تھا۔ ورنہ اس لڑکی سے دوبارہ ملاقات کیسے ہوتی۔

میں نے الٹا سیدھا کر کے قارورہ کی جانچ کروائی اور رپورٹ لے کر حکیم صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ یہ اتفاق تھا کہ اس وقت حکیم صاحب بھی نہیں آئے تھے اور کوئی مریض بھی نہیں تھا جبکہ وہ لڑکی بہت محنت سے دواؤں کو سجا سجا کر رکھ رہی تھی۔ مجھے پہچان کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

اس وقت اسے اتنی محنت کرتے دیکھ کر میرے ذہن میں ایک خیال آ گیا۔ پچھلے دنوں میرے دفتر میں ایک لڑکی کی جگہ خالی ہوئی تھی۔ تنخواہ بھی معقول ہی تھی جبکہ حکیم صاحب اس بے چاری کو کیا دیتے ہوں گے۔

"سنیں۔" میں نے اسے مخاطب کیا۔ "آپ سے ایک بات کہنی ہے۔ اگر آپ برا نہ مانیں؟"

"جی فرمائیں۔"

"آپ کو یہاں سے کتنے پیسے ملتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں؟" اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"آپ کو اس سے کیا مطلب؟"

"آپ بتائیں تو سہی پھر میں آپ کو بتاؤں گا۔"

"پندرہ سو روپے ملتے ہیں۔" اس نے بتایا۔

"اوہو...... صرف پندرہ سو۔ یہ تو آپ کے ساتھ بہت زیادتی ہے۔ ویسے اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو پانچ ہزار روپے دلوا سکتا ہوں۔"

"وہ کس طرح؟" وہ اب پوری طرح میری طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

"میرے دفتر میں ایک جگہ خالی ہے۔" میں نے بتایا۔ "میں اگر چاہوں تو ایک دن میں تمہیں وہ جاب مل سکتی ہے۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ لیکن میرے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ میں حکیم صاحب کو چھوڑ نہیں سکتی۔"

"کیوں؟ ایسی بھی کیا مجبوری ہے؟"

"مجبوری یہ ہے کہ حکیم صاحب میرے ابو ہیں اور میں ان کی بیٹی ہوں۔" اس نے بتایا۔ وہ شرارت بھرے

انداز میں مسکرا رہی تھی۔

میں ایک بار پھر اس کے سامنے شرمندہ ہو گیا۔ اس بار یہ شرمندگی اچھی خاصی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اور شرمندہ ہوتا حکیم صاحب یعنی اس کے ابو تشریف لے آئے اور میں ان کے ساتھ کمرے میں چلا گیا۔

میں نے اپنی رپورٹ ان کے سامنے رکھ دی۔ رپورٹ دیکھ کر انہوں نے ایک نسخہ لکھا اور میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ ''دوائیں بھی بنوالیں اور میری فیس بھی دے دیجیے گا۔''

میں نے باہر آ کر نسخہ لڑکی کے حوالے کر دیا۔ جب وہ نسخہ بنانے میں مصروف تھی تو میں نے اسے مخاطب کیا۔

''آپ کو میری بات بری لگی ہو تو معاف کر دیجیے گا۔''

''نہیں تو۔ اس میں برا ماننے والی کوئی بات نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''بہت سے لوگ لڑکیوں کو دیکھ کر اسی قسم کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔''

''اب زیادہ شرمندہ نہ کریں۔''

اس نے دوائی تیار کر کے میرے سامنے رکھ دی۔

''دیکھیں عالمِ بے خودی میں پیسے ادا کرنا مت بھول جایئے گا۔''

اوہ..... میں تو جیسے قربان ہی ہو کر رہ گیا۔ کیا بات تھی اس لڑکی میں، کیا زبان تھی اور کیا شائستگی تھی۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے دو سو روپے اس کے حوالے کیے اور مطب سے باہر آ گیا۔ اس دوران میں دوسرے مریض بھی آ چکے تھے۔ اس لیے رکنا مناسب نہیں تھا۔

میں نے حکیم صاحب کی دوائی استعمال بھی نہیں کی۔ عام سا نزلہ بخار تھا۔ اس لیے ٹھیک بھی ہو گیا تھا لیکن ایک ہفتے کے بعد پھر حکیم صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ اس دن اگرچہ مطب میں اور مریض بھی تھے اس کے باوجود اس لڑکی کو مجھ سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔

''میرا خیال ہے کہ اب آپ ابو کے مستقل مریض ہو گئے ہیں۔''

''وہ کیسے؟''

''آپ کا دوبارہ آنا یہی ظاہر کرتا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ورنہ مجھے یقین ہے کہ آپ کو کوئی مرض نہیں ہے اور اب آپ بالکل ٹھیک ہیں۔''

''پھر تو آپ مجھے اپنے ابو کا نہیں بلکہ اپنا مریض سمجھیں۔'' وہ زیرِ لب مسکرا دی۔ یعنی اس نے میری بات کا برا نہیں مانا تھا۔ بہرحال وہاں اس سے زیادہ بات نہیں ہو سکتی تھی پھر میرا نمبر بھی پکار لیا گیا تھا۔ اس لیے میں حکیم

کرشمہ

قرآن پاک کو آواز سے پڑھنے سے Thyroid Problem اور سانس کی بیماری نہیں ہوتی۔

قرآن پاک کو سننے سے Cancer نہیں ہوتا بلکہ Cancer کے جراثیم ہوں بھی تو وہ بھی مر جاتے ہیں۔ سبحان اللہ۔

والد کی عظمت

ماں کی خدمت سے جنت تو مل جاتی ہے مگر جنت کا دروازہ اس وقت کھلتا ہے جب باپ کی عزت کی جائے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

خوب صورت ہدایات

رات کے وقت جب کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دے تو اللہ پاک کی پناہ مانگو کیونکہ وہ ایسی مخلوق دیکھتے ہیں جو ہم نہیں دیکھ سکتے۔ جب رات کو ضروری کام نہ ہو تو باہر کم ہی نکلا کرو کیونکہ رات کے وقت اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے جسے چاہتا ہے پھیلا دیتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر دروازے بند کیا کریں کیونکہ شیطان وہ دروازہ نہیں کھول سکتا جسے بسم اللہ..... پڑھ کر بند کیا جائے۔

پانی کا برتن ڈھانپ کے رکھا کریں، خاص طور پر رات کے وقت کیونکہ رات کے وقت وبائیں آسمان سے اترتی ہیں۔

اچھی اور پرسکون نیند کے لیے درود پاک پڑھ کر سویا کریں۔

مرسلہ۔ محمد جاوید، تحصیل علی پور

پیاری بات

ایک آدمی نے ایک مرتبہ حضرت علیؓ سے پوچھا۔ ''جب ہماری قسمت پہلے سے لکھی ہوئی ہے تو ہمیں دعا مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟'' تو آپؓ نے جواب دیا۔

''ہو سکتا ہے تیری قسمت میں یہی لکھا ہو کہ جب تو مانگے تو تجھے ملے گا۔''

مرسلہ۔ عبدالجبار رومی انصاری۔ چوہنگ لاہور

صاحب کے کمرے میں چلا گیا۔

اس بار میں ان کے پاس بدہضمی کی شکایت لے کر گیا تھا۔ حکیم صاحب نے نسخہ لکھ کر دے دیا اور جمیلہ یعنی ان کی لڑکی نے اپنے خوبصورت ہاتھوں سے دوا بنا کر دے دی۔

اس کے بعد وہاں میرا مستقل آنا جانا شروع ہو گیا۔ کبھی سر درد، کبھی کمر کا درد، کبھی بدہضمی۔ شاید حکیم صاحب کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ میں یہ سب کیوں کر رہا ہوں۔ اس لیے انہوں نے ایک دن مجھ سے کہا۔ ”برخوردار! میرا خیال ہے کہ تم کسی شریف خاندان کے فرد ہو۔“

”جی حکیم صاحب، میرے والد صاحب پروفیسر ہوتے تھے۔ اب ریٹائر ہو گئے ہیں۔“

”تو میاں ایسی حرکتیں تمہیں زیب نہیں دیتیں۔“

”جی۔“ میں کچھ پریشان ہو گیا۔

”میں سب سمجھتا ہوں میاں۔ میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔“ حکیم صاحب نے فرمایا۔ ”میاں، اگر ایسا ہی ہے تو گفتگو کرنے کے لیے اپنے کسی بڑے کو بھیج دو۔“

”جناب۔“ میری آواز شدتِ جذبات سے لرزنے لگی۔

”ویسے کرتے کیا ہو؟“

میں نے بتا دیا کہ میری کتنی تعلیم ہے، جاب کیا ہے۔ حکیم صاحب بہت خوش ہوئے۔ خاص طور پر انہیں میرا خاندانی پس منظر بہت پسند آیا تھا۔

جمیلہ نے بھی شاید حکیم صاحب کی کچھ باتیں سن لی تھیں۔ اس لیے جب میں کمرے سے باہر نکلا تو وہ شرمائی شرمائی سی تھی۔ میں مسکراتا ہوا مطب سے باہر آ گیا۔

اس جیسی لڑکی سے شادی میرے لیے بہت اچھی بات ہوتی کیونکہ وہ تو پہلی ہی نگاہ میں بقول شاعر دل سے جگر تک اتر چکی تھی۔ اس جیسی مہذب اور پڑھی لکھی لڑکی سے شادی میرے لیے خوش نصیبی کی بات ہوگی۔

سوال یہ تھا کہ رشتے کی بات کرنے کے لیے کس کو بھیجا جائے۔ والد صاحب کے بارے میں یقین تھا کہ وہ کبھی نہیں جائیں گے کیونکہ ان کی یہ خواہش تھی کہ میں ان کے دوست کی بیٹی سے شادی کرلوں۔ جو مجھے بالکل پسند نہیں تھی پھر مجھے تایا کا خیال آ گیا۔ امجد حسین نام تھا میرے تایا کا۔ وہ بھی ایک عجیب کردار کے مالک تھے۔ انہوں نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی حالانکہ ان کے پاس بہت دولت بھی تھی۔ ان کی کم از کم دس دکانیں اور چار پانچ فلیٹ تھے اور ہر مہینے ہزاروں روپے کرائے کے طور پر آتے تھے۔ وہ مجھ سے محبت بھی بہت کرتے تھے۔

حکیم صاحب کے پاس جانے کے لیے ان سے بہتر اور کون ہو سکتا تھا۔ میں ان کے گھر پہنچ گیا۔

”تایا ابو، آپ سے ایک بہت ضروری کام ہے۔“ میں نے کہا۔

”بتاؤ بیٹے، کیا کام ہے؟“

”تایا ابو، آپ کو رشتے کی بات کے لیے جانا ہے۔“ میں نے انہیں تمام باتوں سے تفصیلاً آگاہ کیا۔

”اوہو، تو یہ سلسلہ ہے۔ حکیم مراد صاحب کی اکلوتی بیٹی ہے۔ کیا بہت اچھی ہے؟“

”جی ہاں تایا ابو! بہت اچھی ہے۔ آپ دیکھ کر خوش ہو جائیں گے لیکن ابو کو پتا نہ چلے۔“

”خیر۔ اس کی تو فکر ہی مت کرو۔ میں کل ہی چلا جاؤں گا۔“

میں اب مطمئن ہو گیا تھا کہ اب تو سارے معاملات تایا ابو سنبھال لیں گے۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ ایک ہفتے تک نہ تو میں تایا کی طرف گیا اور نہ ہی حکیم صاحب کی طرف۔ ایک ہفتے بعد تایا ابو آئے تو بہت خوش تھے۔ مجھے ایک طرف بلا کر کہنے لگے۔ ”بیٹے، تمہاری ہدایت کے مطابق میں نے اب تک کسی کو نہیں بتایا ہے حالانکہ شادی کو آج پانچواں دن ہے۔“

”شادی لیکن...... کس کی شادی تایا ابو؟“

”ارے بھئی میری شادی۔ تم ہی نے تو بھیجا تھا حکیم صاحب کی لڑکی سے شادی کرنے۔ تو میں نے شادی کرلی۔“

”کیا...... آپ نے جمیلہ سے شادی کرلی؟“

”ہاں بیٹے، تمہارے ہی کہنے پر کی ہے۔“

”تایا ابو، آپ پاگل تو نہیں ہو گئے۔ میں نے تو اپنے رشتے کے لیے آپ کو بھیجا تھا۔“

”کیا...... او خدا۔ یہ کیا گڑبڑ ہو گئی۔ میرے تو دھیان ہی سے نکل گیا کہ تم نے اپنے لیے بھیجا ہوگا۔ میں تو اس سے شادی بھی کر چکا ہوں۔ اب بتاؤ کیا ہو سکتا ہے؟“

”کچھ نہیں ہو سکتا تایا ابو...... اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ صرف ایک قطعہ ہو سکتا ہے۔“

”چلو بیٹا وہی سنا دو۔“

”سنیں۔

رشتے کی بات کرنے کو بھیجا تھا شوق سے
پر کیا کہوں کہ اپنی تو قسمت خراب ہے
خود ہی بیاہ لائے وہ میری جمیلہ کو
تایا کے بھول جانے کی عادت خراب ہے“

عارفِ حق

ضیا تسنیم بلگرامی

حق پر اڑنے اور لڑنے کے لیے انسان کو جن مصمم ارادوں اور مستقل مزاجی کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں۔۔۔ اور جنہیں یہ دولت مل جائے وہ اللہ کے برگزیدہ بندوں کی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔۔۔ آپ کا تعلق بھی انہی محبوب انسانوں میں سے تھا جنہیں عبادت وریاضت کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل ہو جاتا ہے۔

اللہ کے ایک نیک بندے کے سچے قول و فعل اور

کھری میزان کا قصہ



تھا۔ چنگیز خاں مرچکا تھا مگر اس کے بیٹے تولی خاں کا بیٹا ہلاکو خاں قتل وخون ریزی میں اس کی نیابت کررہا تھا۔ وہ تیان شان سے بلخ کی طرف بڑھا چلا آرہا تھا۔ راستے میں ہلاکو خاں کے خونخوار دستے آگ وخون کا کھیل کھیلتے سروں کے مینار کھڑے کرتے ہوئے فتح مندی کے نشے سے بدمست ہورہے تھے۔ بلخ کے صلح پسندوں نے ترک مکانی کیا تا مور فاروقی خاندان نے بھی سنت نبویؐ پر عمل کرتے ہوئے ہندوستان کا رخ کیا۔ برصغیر میں یہ عہد خلجی تھا۔ علاؤ الدین خلجی کا زمانہ، بادشاہ کو ان مہاجروں کی آمد کا حال معلوم ہوا تو اس نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور چند دن مہمان رکھ کر اودھ میں ردولی کی جاگیر عطا کردی۔

یہ خاندان ردولی میں بس گیا۔ فکر معاش سے آزادی اور منگولوں کی دستبرد سے دوری نے انہیں علمی میدانوں میں گامزن کردیا۔ زہد وتقویٰ میں بھی ان کا کوئی شریک نہ تھا۔ نالۂ نیم شبی اور گریۂ سحر گاہی کی تپش نے انہیں کندن کردیا تھا۔ اس خاندان کا ایک سات سالہ لڑکا احمد اس وقت اپنی ماں کی توجہ کا خاص مرکز بن گیا جب انہوں نے اس کو نصف شب کے بعد اپنے پیچھے تہجد کی نماز پڑھتے دیکھ لیا۔ احمد اپنے ماحول سے بے نیاز، دنیا سے غافل انتہائی انہماک سے تہجد کی نماز اس طرح ادا کرتا کہ اس طرح کوئی بڑا بھی نہ پڑھتا ہوگا۔ ماں اپنے بیٹے کو کئی ہفتے اس حال میں خاموشی سے دیکھتی رہی۔ احمد پوری رات مصروف عبادت رہتا اور صبح فجر کی نماز پڑھ کر تلاوت کلام پاک میں مشغول ہوجاتا۔ عبادت گزار ماں کا دل اپنے بیٹے کی عبادت گزاری سے، بہت خوش تھا مگر اس خوشی میں یہ تشویش بھی موجود تھی کہ اس نوعمری میں اس کو اتنی شدید ریاضت نہیں کرنا چاہیے۔ انہوں نے کئی بار یہ ارادہ کیا کہ اپنے بیٹے احمد کو سمجھائیں اور شب بیداری سے باز رکھنے کی کوشش کریں لیکن ان کی ہمت نہیں پڑی۔ اس کم ہمتی میں خدا کا خوف بھی شامل تھا اور اپنے بیٹے کی نظر میں شرمندہ ہوجانے کا تکلیف دہ احساس بھی۔

ایک دن بیٹے کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا جسم بخار سے تپ رہا تھا۔ ماں کا خیال تھا کہ ان کا بیٹا احمد آج کی رات آرام کرے گا لیکن بیٹے کے معمولات میں کوئی فرق نہ آیا۔ اس نے عشا کی نماز بھی پڑھی اور پھر تہجد کے لیے بھی کھڑا ہوگیا۔ ماں کو خود بھی تہجد پڑھنا تھی اس نے چند رکعتوں کے بعد اپنے بیٹے کے جسم کو ٹٹول کر بخار کی حدت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ پورا جسم بخار کی گرمی سے تپ رہا تھا۔ وہ بیٹے کے داہنی طرف بیٹھ کر سلام پھیرنے کا انتظار کرنے لگیں۔

کچھ دیر بعد احمد نے جیسے ہی سلام پھیرا۔ ماں نے کرب سے کہا۔ ”بیٹے احمد! تو تو بخار میں تپ رہا ہے۔“

احمد نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”ہاں ماں، آج شام ہی سے طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

ماں نے کہا۔ ”بیٹے! میں ڈرتی ہوں، کہیں تجھے چکر نہ آجائے۔“

بیٹے نے جواب دیا۔ ”نہیں ماں، اب اتنا تیز بخار بھی نہیں کہ مجھے چکر آجائے۔“

ماں نے اصرار کیا۔ ”بیٹے احمد! اگر تو میری بات مانے تو میں تجھے یہی مشورہ دوں گی کہ تو آج کی رات آرام کرلے۔“

لیکن احمد نے ناگواری سے پوچھا۔ ”ماں! اگر میں آرام کرلوں گا تو اس سے مجھ کو کیا فائدہ پہنچے گا؟“

ماں نے جواب دیا۔ ”اس سے یہ فائدہ پہنچے گا کہ صبح ہوتے ہوتے تیری طبیعت سنبھل جائے گی اور بخار اتر جائے گا۔“

احمد نے کہا۔ ”ماں! اس معاملے میں، میں آپ سے اتفاق نہیں کروں گا۔ آپ کو معلوم نہیں کہ مجھ کو شب بیداری میں کیا مزہ ملتا ہے۔ ماں! اس میں ایک نشہ ہے، سوز ہے، لذت ہے ناقابل بیان لذت۔ اگر میں اس لذت سے محروم کردیا جاؤں تو بیمار پڑ جاؤں گا۔ یہی وہ لذت ہے جو مجھے ہر شب بیدار رکھتی ہے۔ گر مجھ سے یہ لذت چھین لی جائے تو میں کچھ بھی نہیں رہوں گا۔ میں خالی اور محروم رہ جاؤں گا ماں۔“

ماں نے خفت زدہ لہجے میں کہا۔ ”بیٹے احمد! میں اس لذت اور سوز سے واقف ہوں جس کا تو ذکر کررہا ہے لیکن میرے لال ابھی تو سات سال کا ہے۔ ابھی تو تجھ پر نماز بھی فرض نہیں نہ کہ تہجد کی نماز۔ اتنی کم سنی میں اتنی شدید محنت، بخدا میرا دل کانپتا رہتا ہے، میں اندر ہی اندر لرزتی رہتی ہوں خدا کے لیے اپنے آپ پر اور مجھ پر رحم کر۔“

بیٹے نے جواب دیا۔ ”ماں میری بھی یہی دعا ہے کہ خدا آپ پر رحم فرمائے اور مجھ پر بھی۔ رہی یہ بات کہ ابھی میں سات سال کا ہوں اور ابھی مجھ پر نماز کی ادائیگی فرض نہیں ہے تو میری فکر مجھے کچھ اور ہی بتاتی ہے۔ میں اس پر یقین رکھتا ہوں ماں کہ انسان جب عدم سے وجود میں آتا ہے اور نیست سے ہست میں قدم رکھتا ہے تو اس پر اپنے رب کی بندگی فرض ہوجاتی ہے۔“

ماں اپنے سات سالہ بچے کی زبان سے حکمت ومعرفت کی باتیں سن کر دنگ رہ گئی۔ انہوں نے بے ساختہ کہا۔ ”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ بچے کو اپنے رب سے کیا ہوا وعدہ اچھی طرح یاد ہے، الست بربکم۔“

یہ کہتے کہتے وہ سجدے میں گر گئیں اور بڑی دیر تک رو رو کر اپنی نادانی اور سہو کی اپنے رب سے معافی مانگتی رہیں۔ وہ

گڑگڑا کر اپنے رب سے کہہ رہی تھیں: "خدایا! میں نادان ہوں، مجھ کو اپنے بیٹے کے مرتبے کا علم نہیں تھا، یہ میری کتنی بڑی چوک تھی کہ میں اس کو تیرے ذکر سے محروم کر دینا چاہتی تھی۔ میں اسے تیری بندگی سے روکنے کی غلطی کر رہی تھی۔ مجھے معاف کر دے اور میرے بیٹے کے دل سے اس کدورت کو دور کر دے جو اس وقت کی باتوں سے پیدا ہو گئی ہو گی۔"
بیٹا ماں کی گریہ وزاری سن رہا تھا۔ جب ماں نے سجدے سے اپنا سر اٹھایا تو اس نے عاجزی سے عرض کیا۔ "ماں! آپ اتنی غمزدہ کیوں ہیں، میں اور میرا خدا دونوں ہی آپ کے اس جذبے سے واقف ہیں جو ممتا کا جذبہ کہلاتا ہے آپ نے جو کچھ فرمایا اپنی ممتا کے زیر اثر فرمایا۔ اگر میرے اور آپ کے درمیان رب کی ذات نہ ہوتی تو میرے لیے آپ کا حکم ماننا ہی عبادت قرار پاتا۔"
ماں نے بیٹے کو سینے سے لگا لیا اور فرط جذبات سے رونے لگیں، احمد کا دل بھی بھر آیا۔ وہ بھی رونے لگا۔ روتے روتے دونوں ہی ہلکان ہو گئے ور دل کو دبانے والے بوجھ نے آنسوؤں کی شکل میں بہہ کر انہیں ہلکا کر دیا۔
☆☆☆
کچھ عرصے بعد پھر ایسی ہی صورت حال پیش آئی۔ ماں ایک بار پھر بیٹے کی صحت کی طرف سے فکر مند ہو گئیں۔ احمد کی عبادت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ رات کو تہجد، دن کو ذکر الٰہی، آرام کا کوئی وقت ہی نہ تھا۔ ماں کو ہر وقت یہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ اس محنت شاقہ کا ان کے بیٹے احمد کی صحت پر کیا اثر پڑے گا۔ ان دونوں میں اس موضوع پر کئی بار گفتگو بھی ہوئی، دونوں ہی دلیلوں اور نظیروں سے ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے اور تقریباً ہر بار بیٹے کی پُر اثر باتوں نے ماں کو لاجواب اور جذباتی کر دیا۔ انہیں اپنے بیٹے پر فخر تھا لیکن وہ کبھی بھی بیٹے کی دلیلوں سے اپنی وہ فکر دور نہیں کر سکیں جو انہیں اپنے بیٹے کی صحت کی طرف سے مستقلاً لاحق ہو چکی تھی۔
ماں نے اپنے شوہر کو بھی اس معاملے میں شریک کر لینا چاہا اور زور دے کر مجبور کیا کہ وہ احمد پر دباؤ ڈال کر شب بیداری سے باز رکھنے کی کوشش کریں۔
لیکن سلجھے ہوئے باپ نے ہر بار یہی کہا کہ "بیوی! میں بندے اور اس کے رب کے تعلقات میں کیونکر دخل دے سکتا ہوں۔ وہ جو کچھ کر رہا ہے اس کو کرنے دو۔ معلوم نہیں خدا کو کیا منظور ہے اور میرا تو خیال ہے کہ احمد مادر زاد ولی ہے اور وہ جو کچھ کر رہا ہے کوئی غیر معمولی طاقت اس سے یہ کرا رہی ہے۔"
بیوی نے کہا۔ "آپ میرے دل میں جھانک کر دیکھ لیں میں اپنے بیٹے کو شب و روز بیدار نہیں دیکھ سکتی۔ خدانخواستہ اس کو کچھ ہو گیا تو؟"
شوہر نے جواب دیا۔ "بیوی! اس کو کچھ نہیں ہوگا، خدا اس کا محافظ ہے۔ یاد رکھو، خدا کسی بھی شخص سے اس کی استطاعت اور صلاحیت سے زیادہ کام نہیں لیتا۔ احمد جو کچھ کر رہا ہے خدا نے اس میں اتنی صلاحیت اور استطاعت رکھ دی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ راتوں کو اپنے گرم گرم بستر میں دبکا آرام کر رہا ہوتا۔"
لیکن ماں کو قرار نہیں آیا اور وہ سیدھی بیٹے کے پاس پہنچ گئیں اور بولیں۔ "بیٹے احمد! افسوس کہ میں ایک بار پھر وہی فرسودہ موضوع لے کر آ گئی ہوں۔"
بیٹے نے لاتعلق نظروں سے ماں کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر کے یا اللہ یا اللہ کا ورد شروع کر دیا۔ ماں کچھ دیر خاموش کھڑی بیٹے کی کیفیت ملاحظہ کرتی رہی۔ آخر کچھ دیر بعد کہا۔ "بیٹے احمد! میں نے کیا کہا؟ میں کچھ کہہ رہی ہوں، کیا تو نے میری بات نہیں سنی؟ میں کیا کہہ رہی ہوں؟"
بیٹے نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "مجھے کچھ پتا نہیں کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔"
ماں نے جواب دیا۔ "میرے لال! میں یہ کہہ رہی ہوں کہ تو اس کم سنی میں اتنی زیادہ عبادت نہ کر، ورنہ تیری صحت جواب دے جائے گی عبادت کے لیے پوری عمر پڑی ہے۔"
بیٹے نے کہا۔ "خوب خوب! کیا فرمایا آپ نے عبادت کے لیے پوری عمر پڑی ہوئی ہے۔"
"ہاں میں نے یہی بات کہی ہے کہ عبادت کے لیے پوری عمر پڑی ہے۔"
بیٹے نے مسکرا کر عرض کیا۔ "ماں زندگی کا کوئی بھروسا نہیں پھر آپ کس طرح کہہ سکتی ہیں کہ عبادت کے لیے پوری عمر پڑی ہوئی ہے، اگر آپ کسی طرح مجھ کو لمبی عمر کا یقین دلا دیں اور یہ ثابت کر دیں کہ میں طویل عرصے تک زندہ رہوں گا تو میں شب بیداری ختم کیے دیتا ہوں۔"

ماں نے جواب دیا۔ ”یہ یقین تو کوئی ولی بھی نہیں دلا سکتا۔ پھر میں کس طرح دلاؤں۔“

”تب پھر آپ خاموش رہیے ماں! مجھ کو عبادت سے نہ روکیے اگر میں نے ایسا کیا تو میں یادِ حق سے بہت دور ہو جاؤں گا اور اگر ایسا ہو امار تو آپ یقین کیجیے کہ میں کبھی شاید یہ ہمت بھی نہ کر سکوں کہ اپنی شب بیداری سے باز آ جاؤں۔ کیا میں نے شب بیداری کی لذتوں سے آپ کو آگاہ نہیں کیا؟ کیا آپ میری وہ بات چیت بھلا چکی ہیں؟ شاید نہیں، اگر میں آپ کی سیدھی سچی بات مان بھی لوں تو اس سے آپ کے بقول صحت کے علاوہ اور کیا فائدہ پہنچے گا۔“

بیٹے نے لاجواب کر دیا تو ماں نے ایسا سکوت اختیار کیا کہ پھر زندگی بھر اس موضوع پر بات ہی نہیں کی۔

دہلی میں احمد کے بڑے بھائی شیخ تقی الدین مستقل رہ رہے تھے، ان کی علمی قابلیت کا بڑا شہرہ تھا گھر میں شیخ تقی الدین کا بڑا ذکر رہتا۔ ماں اکثر کہتی رہتیں کہ اگر میرا بیٹا تقی الدین کے گھر میں ہوتا تو احمد کو شاندار تعلیم دلواتی۔ شیخ احمد ان کی باتیں بغور سنتے اور اپنے بھائی سے ملاقات کے لیے سراپا شوق بن جاتے لیکن یہ شوق پرواز سے محروم ہی رہتا۔ چھوٹے سے دل و دماغ میں شوق اور ولولے کی لہریں اٹھتی بیٹھتی رہتی تھیں لیکن ان لہروں نے طوفان کی شکل ایک عرصے تک نہیں اختیار کی۔ ان کے دل و دماغ منتقہ طور پر ایسی تجاویز اور تدابیر پر غور کرتے رہتے اور کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ بھائی تقی الدین سے ملاقات کس طرح کی جائے۔

شب و روز کی عبادت میں سوز بھی باقی نہیں رہا تھا۔ شیخ احمد سوچتے رہتے کہ آخر میں اپنی عبادت اور ریاضت میں کس کی راہنمائی اختیار کروں۔ جب ماں کو اس الجھن کا پتا چلا تو وہ شیخ احمد کے پاس جا بیٹھیں اور پوچھا۔ ”بیٹے! کیا بات ہے آج کل تو پریشان کیوں رہتا ہے؟ کسی سے کوئی جھگڑا یا کوئی رنجش؟“

شیخ احمد نے جواب دیا۔ ”نہیں ماں ایسی کوئی بات نہیں؟“

ماں نے پوچھا۔ ”پھر تو فکر مند اور اداس اداس کیوں رہتا ہے؟“

شیخ احمد نے جواب دیا۔ ”ماں! بات یہ ہے کہ میں عبادت ریاضت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا اور ہمیشہ اس کوشش میں رہتا ہوں کہ طمانیت قلب حاصل کروں لیکن روح کی تشنگی دور ہی نہیں ہوتی، پیاس بجھتی ہی نہیں۔ میں ہمیشہ اپنی ذات میں کوئی کمی محسوس کرتا رہتا ہوں، آخر ایسا کیوں ہے؟“

ماں نے کہا۔ ”احمد! ابھی تیری عمر ہی کتنی ہے، کل بارہ سال۔ اس عمر میں تو نے جو کچھ بھی حاصل کر لیا ہے، بہت ہے رہا تشنگی کا مسئلہ تو یہ ہمیشہ باقی رہے گی۔“

لیکن بیٹے کو ماں کی باتیں مطمئن نہ کر سکیں، اضطراب اور اضطرار میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ انہوں نے ماں سے پوچھا۔

”ماں! دہلی میں بھائی تقی الدین کیا کر رہے ہیں؟“

ماں نے جواب دیا۔ ”بیٹے! تقی الدین ایک عالم فاضل انسان ہیں معلوم نہیں کہاں کہاں سے طالبانِ علم اس کے پاس پہنچ کر تحصیلِ علم کرتے ہیں۔ اس کی علمیت مسلمہ ہے، شک و شبے سے بالاتر۔“

شیخ احمد نے کہا۔ ”پھر تو ماں میں دہلی جاؤں گا اور ضرور جاؤں گا۔ بھائی تقی الدین میری تشنگی دور کر دیں گے۔“

ماں نے تشویش ظاہر کی۔ ”لیکن بیٹے ایک بارہ سالہ لڑکا اتنا لمبا سفر کیونکر کرے گا۔ میرا تو یہ سوچ کر ہی دل بیٹھا جاتا ہے کہ تو تنہا یہ سفر کس طرح کرے گا؟“

شیخ احمد نے عرض کیا۔ ”ماں! میں سفر کے لیے آپ کی اجازت کا طالب ہوں۔ تلاشِ فضل اور طلب علم میں اس فاصلے کی اہمیت ہی کیا ہے، مجھ سے پہلے تو ایک ملک سے دوسرے ملک تک کے سفر کیے گئے ہیں۔“

ماں خود کو بے بس محسوس کر رہی تھی آخر کچھ دیر بعد ہتھیار ڈال دیے اور دہلی جانے کی اجازت دے دی۔

شیخ احمد ایک قافلے میں شامل ہو گئے۔ یہ قافلہ مغربی حصوں میں جا رہا تھا۔ شب و روز کی صعوبتیں جھیلتے، مصیبتیں اٹھاتے آپ دہلی میں داخل ہو گئے۔ تلاش کرتے ہوئے اپنے بھائی شیخ تقی الدین کے پاس پہنچ گئے۔ شیخ احمد اس بات سے بہت متاثر ہوئے کہ ان کے بھائی کا دہلی میں بڑا شہرہ تھا اور ہر شخص ان کا نام عزت و احترام سے لیتا تھا۔ بڑے بھائی نے ایک بارہ سالہ اجنبی لڑکے کو اپنے سامنے کھڑے دیکھا تو یہ گمان گزرا کہ یہ بھی کوئی طالب علم ہے جو ان کے آگے زانوئے تلمذ تہ کرنے آیا ہے۔ شیخ احمد نے بھی اپنے بھائی کی یہ کیفیت محسوس کر لی کہ وہ انہیں پہچان نہیں سکے، انہوں نے سکوت اور تامل اختیار کیا۔

شیخ تقی الدین نے اپنے چھوٹے بھائی کو بغور دیکھ کر سوال کیا۔ ”صاحبزادے! آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں اور میرے پاس کیوں آئے ہیں؟“

شیخ احمد نے جواب دیا۔ ’’حضرت! میرے پاس آپ کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں کہ میں کہاں سے آیا ہوں۔ ہاں یہ ضرور جانتا ہوں کہ میں آپ کی خدمت میں کیوں آیا ہوں؟‘‘

تقی الدین نے اس عجیب و غریب لڑکے کو ایک بار پھر غور سے دیکھا۔ بولے۔ ’’آدمی تو اچھے لگتے ہو۔ اچھا اگر تم یہ نہیں بتانا چاہتے کہ کہاں سے آئے ہو تو کوئی حرج نہیں، میرے لیے یہی جان لینا کافی ہے کہ تم مجھ سے تعلیم حاصل کرنے آئے ہو۔‘‘

شیخ احمد نے عرض کیا۔ ’’جناب! میں پانچ چھ سال سے ایک اندرونی کرب میں مبتلا ہوں، اگر آپ اس کو دور فرما دیں تو میں آپ کا زندگی بھر ممنون رہوں گا۔‘‘

بڑے بھائی نے پوچھا۔ ’’تمہارا قیام کہاں ہے؟‘‘

آپ نے جواب دیا۔ ’’حضرت! یہاں میں ایک لاوارث ہوں، مجھ کو تو رہنے کے لیے ٹھکانا بھی درکار ہے، میں اس شہر میں بالکل اجنبی ہوں۔‘‘

تقی الدین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ’’یہ تو بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے تم کو اپنے رہنے کا انتظام خود ہی کرنا چاہیے۔ میرے پاس اتنی گنجائش کہاں کہ طلبہ کی اقامت کا انتظام بھی کروں۔‘‘

شیخ احمد نے معصومیت سے کہا۔ ’’نہ صرف یہ کہ آپ مجھے پڑھائیں گے اور اقامت کا انتظام بھی کریں گے بلکہ کھانے پینے کی ذمے داری بھی قبول کرنا ہوگی۔‘‘

تقی الدین نے ایسا عجیب طالب علم پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ذرا سختی سے کہا۔ ’’میاں صاحبزادے یہ تو بتاؤ تمہارے ماں باپ کیسے ہیں جو انہوں نے تم کو تنہا دہلی چلا آنے دیا۔ آخر تم کسی خوشحال گھرانے ہی سے تعلق رکھتے ہو گے ورنہ غریب انسان تو یہاں تک آنے کا خیال تک دل میں نہیں لاسکتا۔‘‘

شیخ احمد نے جواب دیا۔ ’’جنابِ والا! آپ مجھ سے بحث تو کیجیے نہیں بس یہ بتا دیجیے کہ آپ مجھ کو میری عائد کردہ شرطوں پر پڑھا سکتے ہیں یا نہیں؟‘‘

تقی الدین نے تھکے ہارے لہجے میں کہا۔ ’’میں انکار نہیں کرسکتا۔ اگر تو نادار ہے تو میں تیرے قیام و طعام کی ذمے داری بھی اپنے ہی سر لے لوں گا۔ تو میرے پاس ہی رہ جا۔‘‘

شیخ احمد نے خوش ہوکر عرض کیا۔ ’’بھائی صاحب! مجھ کو آپ سے یہی امید تھی۔ ماں نے آپ کو بہت بہت پوچھا ہے اور یہ معلوم کیا ہے کہ آپ ردولی کب تشریف لا رہے ہیں؟ وہ آپ کو یاد کر کے اداس ہو جاتی ہیں۔‘‘

تقی الدین نے شیخ احمد کے چہرے پر اپنے باپ کا عکس دیکھ لیا۔ بے اختیار اٹھے اور بھائی کو سینے سے لگا لیا۔ بولے۔ ’’احمد! تو نے کمال کر دیا کیا تجسس پیدا کیا۔ واہ واہ خوب!‘‘

شیخ احمد نے حرفِ مدعا گوش گزار کیا۔ ’’بھائی صاحب! میں ایک عرصے سے مضطرب اور پریشان ہوں کہ میں اپنی روح کی پیاس کس طرح بجھاؤں۔ اپنی تشنگی کس طرح دور کروں؟‘‘

بھائی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ’’میں اس وقت تیری رہائش کا بندوبست کرتا ہوں۔ اس کے بعد کچھ اور کروں گا۔‘‘ شیخ احمد وہیں بیٹھ گئے اور تقی الدین ان کے قیام اور طعام کا انتظام کرنے چلے گئے۔ رات ہوگئی تو شیخ احمد کو تشویش ہوئی کہ یہ بھائی کہاں چلے گئے؟ آخر وہ نصف شب کو واپس آئے تو بہت خوش خوش، بولے۔ ’’احمد! افسوس کہ میں اپنے مدرسے میں تجھ کو نہیں رکھ سکتا۔ ہاں ایک دوسری جگہ کا انتظام کر لیا ہے۔‘‘

شیخ احمد نے جواب دیا۔ ’’بھائی صاحب! آپ بھی کن چکروں میں پڑ گئے۔ میں کہیں کسی گوشے میں پڑا رہتا۔‘‘

بھائی نے کہا۔ ’’یہ کیا بات ہوئی۔ تو میرا بھائی ہے اور بھائی عزت و احترام سے رہے گا۔ تو خرچ اور مصارف کی تو بات ہی نہ کر اس کو مجھ پر چھوڑ دے۔‘‘

احمد نے پوچھا۔ ’’بھائی صاحب! پھر مجھے کون سا وقت مرحمت فرمائیں گے؟‘‘

بھائی نے جواب دیا۔ ’’ہر وقت، کسی بھی وقت تجھ کو تو میں اپنے بھائی کی حیثیت سے تعلیم دوں گا۔‘‘

احمد کو بڑے بھائی کے پاس قیام و طعام کی سہولتیں مل گئیں اور جب انہیں پہلے دن بڑے بھائی نے پڑھانا شروع کیا تو شیخ احمد نے ان سے سوالات کرنا شروع کر دیے۔

تقی الدین نے کہا۔ ’’احمد! تو مجھ سے پڑھنے آیا ہے یا سوالات کرنے؟‘‘

احمد نے جواب دیا۔ ”بھائی صاحب! علم وہی نہیں ہے جو کتابوں میں موجود ہوتا ہے بلکہ میں جو علم حاصل کرنا چاہتا ہوں شاید وہ اس درس گاہ سے نہیں ملے گا۔“

بڑے بھائی نے کہا۔ ”میاں صاحبزادے! مجھ کو یہ بات سخت ناپسند ہے کہ میری تدریس میں کوئی مخل ہو، مجھ کو اپنی مرضی کا نصاب پڑھانے سے روکا جائے۔“

شیخ احمد نے جواب دیا۔ ”اور بھائی صاحب! مجھ کو بھی یہ قطعاً ناپسند ہے کہ کوئی معلم میرے اندر کی بے چینی نہ دور کر سکے، روح کی تشنگی نہ بجھا سکے۔ میں یہاں علوم ظاہری کی تحصیل کے لیے نہیں آیا۔ میں اپنی روح کو تسکین اور آسودگی دینا چاہتا ہوں۔“

تقی الدین نے افسوس سے کہا۔ ”احمد! افسوس کہ میں ظاہری علوم تو پڑھا سکتا ہوں علوم باطنی میں، میں تقریباً کورا ہوں۔“

شیخ احمد نے جواب دیا۔ ”پھر مجھے بھی افسوس ہے کہ میں یہاں علومِ ظاہری حاصل کرنے نہیں آیا۔ میری بیماری علومِ باطنی سے دور ہوگی۔ میرے لیے آپ کا مدرسہ کارآمد نہیں۔“

تقی الدین نے پوچھا۔ ”پھر کیا ارادے ہیں؟“

چھوٹے بھائی نے جواب دیا۔ ”میں کسی مرشدِ کامل کی تلاش میں ہوں اور میں اس کی جستجو میں یہاں سے بھی چلا جاؤں گا۔ بھائی صاحب بس ایک رات۔ اس سے زیادہ نہیں۔ میں آپ کے سر مصیبت نہیں بننا چاہتا۔“

بھائی کی محبت انہیں روکنے پر مجبور کر رہی تھی۔ کہا۔ ”احمد! تم یہیں میرے پاس ہی رہو۔ اگر تمہیں کسی مرشدِ کامل کی تلاش ہے تو میں خود بھی تمہارا ساتھ دوں گا اور اس کو تلاش کر کے دم لوں گا۔“

”بھائی صاحب!“ چھوٹے بھائی نے کہا۔ ”صاف گوئی کی معافی چاہتا ہوں جو آگ میرے سینے میں روشن ہے آپ اس سے محروم ہیں اور جب آپ کے دل میں مرشدِ کامل کے لیے تڑپ ہی نہیں تو اس کو تلاش کہاں اور کس طرح کریں گے؟“

بھائی نے آہستہ سے کہا۔ ”پھر بھی تو رات بھر اس سلسلے میں غور کر۔ میرا خیال ہے تجھ کو میرے پاس سے جدا نہیں ہونا چاہیے۔ کسی ٹھکانے کو مرکزی حیثیت دینا ہی پڑے گی کیونکہ بے گھر و بے در انسان منزلِ مقصود نہیں پا سکتا۔“

چھوٹے بھائی نے جواب دیا۔ ”اپنی اپنی سوچ، اپنی اپنی فکر کی بات ہے کیونکہ مرشدِ کامل کی تلاش میں جب تک آدمی بے گھر اور بے در نہیں ہوگا اپنی منزل نہیں پا سکتا۔“

بڑے بھائی نے رعب سے کہا۔ ”میں کہتا ہوں سوچنے میں حرج ہی کیا ہے؟ بے سوچے سمجھے اتنا بڑا قدم اٹھانا کسی طور مناسب نہیں۔“

شیخ احمد خاموش ہو گئے جس کا بڑے بھائی نے یہ مطلب لیا کہ شاید ان کی بات مان لی گئی ہے۔

شیخ احمد بستر پر گئے تو ان کے ذہن میں مرشد کامل کے سوا کوئی بھی نہ تھا۔ وہ اس کے بارے میں سوچتے رہے معلوم نہیں کب تک جاگتے رہے۔ اس کیفیت میں انہیں نیند آ گئی۔ سوتے میں انہیں کسی کی آواز سنائی دی، کوئی کہہ رہا تھا۔ ”میاں صاحبزادے! آپ کی منزل زیادہ دور نہیں ہے۔ پانی پت جائیے اور قطب ربانی سے بیعت ہو جائیے۔“

شیخ احمد نے سراپا شوق بن کر سوال کیا۔ ”ان قطب ربانی کا نام؟ میں پانی پت میں انہیں کہاں تلاش کروں گا؟“

جواب ملا۔ ”آپ پانی پت جائیں تو سہی۔ اللہ نے چاہا تو ان تک پہنچ کر ہی قدم رکیں گے۔“

اس کے بعد آپ کی آنکھ کھل گئی اور دیر تک اس خواب پر غور کرتے رہے، کبھی فیصلہ کرتے کہ پانی پت فوراً ہی چلے جانا چاہیے اور کبھی تساہل سے سوچتے کہ کہیں یہ وسوسۂ شیطانی تو نہیں جو ہر جویائے حق کی راہ روکنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے لیکن صبح ہوتے ہوتے شیخ یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ انہیں بہرحال پانی پت پہنچنا ہے۔

وہ علی الصباح اپنی منزل کی طرف چل پڑے۔ بڑے بھائی کو یہ پتا نہ تھا کہ شیخ احمد کہاں چلے گئے۔

دوسری طرف قطب ربانی شیخ جلال الدین کبیر الاولیا کشفِ باطن سے اس مادر زاد ولی کی آمد سے باخبر ہو چکے تھے۔ انہیں شیخ احمد کا امتحان لینا مقصود تھا۔ اس لیے اپنے مریدوں کو حکم دیا۔ ”لوگو! ہمارے پاس ایک مہمانِ خاص آ رہا ہے۔ میری خواہش ہے کہ اس کا شاندار استقبال کیا جائے۔“

مریدوں نے جواب دیا۔ ”حضرت! ہم سب ہر طرح حاضر ہیں۔ آپ جو حکم دیں گے، بجا لائیں گے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”سامنے کھلی جگہ میں چولہے روشن کیے جائیں اور ان پر دیگیں چڑھا دی جائیں۔ لطیف و لذیذ کھانے پکوائے جائیں۔“

ایک مرید نے بصد ادب عرض کیا۔ ''حضرت! یہ سب ابھی ہوا جاتا ہے مزید اور کچھ؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''اور دوسرے مریدوں سے کہہ دو کہ خانقاہ کے در پر حسین اور خوبصورت گھوڑے ساز و سامان سے لیس کر کے کھڑے کر دیے جائیں۔''

ایک مرید نے کھڑے ہو کر عرض کیا۔ ''حضرت! یہ انتظام بھی ہو جائے گا بس حضور کے ارشاد کے مطابق میں پندرہ بیس ہاتھی کھڑے کر دوں گا۔ اسی تعداد میں گھوڑے بھی کھڑے کر دیے جائیں گے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''کھڑے کر دیے جائیں نہیں، جو کچھ ہونا ہے فوراً ہی ہونا ہے اس لیے ان پر فوراً عمل درآمد ہوگا۔''

مرید ادھر ادھر پھیل گئے۔ کسی نے چولہے جلائے۔ کسی نے دیگوں میں مال ڈالا اور کسی نے ہاتھی گھوڑے اپنے قبضے میں کیے اور انہیں خانقاہ کے دروازے پر سجا کر کھڑا کر دیا۔ جب قطب ربانی کو اس کا علم ہوا کہ ہاتھی اور گھوڑے در پر کھڑے کر دیے گئے ہیں تو آپ ان کے معائنے کو نکل کھڑے ہوئے اور خانقاہ کے در پر شاندار منظر دیکھ کر بے حد خوش ہوئے اور مریدوں سے فرمایا۔ ''لوگو! میرا ایک بارہ تیرہ سال کا مہمان آرہا ہے اس طرح میں اس کو مرعوب کرنا چاہتا ہوں، چنانچہ چند باتوں کا تمہیں بھی خیال رکھنا ہوگا۔''

مریدوں نے بیک آواز سوال کیا۔ ''کن باتوں کا حضرت، ارشاد!''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں آنے والے مہمان کی تلخ نوائی اور صاف گوئی کی قدر کرتا ہوں۔ اس لیے اگر میرا مرید کوئی ایسی ویسی حرکت کرے تو تم لوگ اس کا کوئی خیال نہ کرو گے۔''

مریدوں نے عرض کیا۔ ''حضرت، یہ آج آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ہم آپ کے مہمان کی شان میں کسی قسم کی گستاخی کریں گے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

آپ اندر جاتے ہوئے بولے۔ ''اچھا میں اندر جا رہا ہوں، میرا مہمان بس آیا ہی چاہتا ہے، تم لوگ اس کو سنبھالنا۔''

مرید خاموش ہو گئے اور آپ اندر تشریف لے گئے۔

کچھ ہی دیر بعد شیخ احمد خانقاہ کے در پر پہنچ گئے۔ وہاں بہت ساری دیگیں چڑھی ہوئی تھیں اور ان میں سے لذیذ کھانوں کی نکلنے والی خوشبو سے گرد و پیش کی فضا مہک رہی تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے سامنے ہاتھیوں اور گھوڑوں کی قطاریں دیکھیں، یہ دونوں مویشی نہایت شان سے کھڑے گویا کسی کے منتظر تھے۔ شیخ احمد کو ذرا سی دیر کے لیے یہ شبہ گزرا کہ یہ مکان قطب ربانی کا ہی ہے یا کسی امیر کبیر شخص کا۔ وہ ابھی وسوسوں میں مبتلا تھے کہ ایک مرید نے چند قدم چل کر کسی مرید سے پوچھا۔ ''بھائی! پیر و مرشد اندر تشریف رکھتے ہیں کیا؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''تو کیسا مہمل سوال کر رہا ہے۔''

دوسرے مرید نے کہا۔ ''مہمل سوال؟ کیا کہا تم نے؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''آج کل بھی اگر......''

آپ چند قدم آگے بڑھے اور دونوں سے سوال کیا۔ ''حضرات! میں ایک پردیسی انسان ہوں، یہاں کے ماحول اور لوگوں سے قطعاً ناواقف ہوں، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ کس امیر کا محل ہے؟''

ایک مرید نے ادھر ادھر دیکھ کر حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''میاں صاحبزادے، آپ کس محل کی بات کر رہے ہیں؟ کون سا محل؟ یہاں تو کوئی محل نہیں ہے۔''

شیخ احمد نے خانقاہ اور اس کے در پر موجود شان و شکوہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اس محل اور اس کے ساز و سامان کی بابت پوچھ رہا ہوں۔''

مرید نے جواب دیا۔ ''صاحبزادے! یہ محل نہیں ایک خانقاہ ہے حضرت جلال الدین کبیر الاولیا کی خانقاہ۔''

آپ نے طنزاً فرمایا۔ ''تو یہ خانقاہ ہے۔ خوب، میں تو اس کو محل سمجھ بیٹھا تھا۔ کیا خانقاہیں ایسی ہوتی ہیں؟ درویش کی خانقاہ لیکن ٹھاٹ باٹ شاہانہ محل جیسے فقیر کی کٹیا جس پر شاہی قصر کا گمان ہوتا ہے۔''

مرید نے کہا۔ ''صاحبزادے! یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔''

آپ نے جوش میں فرمایا۔ ''میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں درست کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ اندر میرا ضمیر اس محل کو کٹیا کہنے پر آمادہ ہی نہیں۔''

مرید نے انہیں ایک بار پھر سمجھایا۔ ”صاحبزادے! یہ قطب ربانی کی خانقاہ ہے، آپ یہاں سے واپس جا کر پچھتائیے گا۔“
شیخ احمد نے جواب دیا۔ ”میں سکونِ قلب کی تلاش میں ہوں، میں طمانیت کی جستجو میں ہوں اور جہاں یہ ساز و سامان موجود ہو، وہاں سکون اور طمانیت کا کیا کام؟“
مرید نے بے بسی سے عرض کیا۔ ”آپ کی مرضی، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ جو جی میں آئے کریں۔“
شیخ احمد نے اسی وقت اس در کو چھوڑ دیا اور پانی پت سے نکل جانے کے ارادے سے سارا دن پیدل ہی سفر کرتے رہے یہاں تک...... کہ وہ شام تک ایک دوسری آبادی میں داخل ہو گئے۔ ایک درخت کے نیچے ستانے کے لیے بیٹھ گئے۔ رات سر پر کھڑی تھی۔ پریشان تھے کہ شب بسری کہاں ہو گی۔ انہوں نے ایک راہ گیر سے پوچھا۔ ”بھائی ذرا سننا تو۔“
راہ گیر کھڑا ہو گیا، بولا۔ ”صاحبزادے! آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟“
انہوں نے جواب دیا۔ ”پانی پت سے۔“
راہ گیر مسکرایا۔ ”پانی پت سے، واللہ طبیعت تو ٹھیک ہے جناب کی؟“
آپ نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیوں اس میں طبیعت کی خرابی یا صحت یابی کو کیا دخل؟ میں پانی پت سے چلا آرہا ہوں۔“
راہ گیر نے جواب دیا۔ ”صاحبزادے! اس وقت آپ پانی پت ہی میں تشریف فرما ہیں پھر پانی پت سے آنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔“
شیخ احمد کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا لیکن پھر اس شبہے میں پڑ گئے کہ شاید وہ راستہ بھول کر پانی پت ہی میں چلتے پھرتے رہے ہیں راہ گیر نے جاتے جاتے کہا۔ ”صاحبزادے اب آپ گھر جائیں کیونکہ یہ پردیس نہیں آپ کا اپنا وطن پانی پت ہے۔“
شیخ احمد خاموش رہے اور پوری رات اس درخت کے نیچے گزار دی۔
صبح طلوعِ آفتاب کے فوراً بعد آپ دوبارہ چل کھڑے ہوئے اور نہایت ہوشیاری اور احتیاط سے دن بھر سفر کرتے رہے۔ شام سے پہلے ہی وہ پانی پت سے دور جا چکے تھے۔ نئی آبادی، نئے نئے اجنبی سے مکانات، غیر مانوس کھیت غرضیکہ ماحول کی ہر شے نئی اور اجنبی تھی۔ یہ ایک محل کے سائے میں جا کھڑے ہوئے اور سوچنے لگے کہ اگر کوئی نظر آجائے تو اس سے شب بسری کے لیے جگہ مانگی جائے۔ راستے میں ایک گھڑسوار آتا دکھائی دیا، یہ اپنی جگہ سے اٹھے اور گھڑسوار کی راہ میں کھڑے ہو گئے۔ اس نے گھوڑا روک دیا اور گھوڑے کی پشت ہی سے سوال کیا۔ ”کیوں صاحبزادے کیا بات ہے؟“
شیخ احمد نے جواب دیا۔ ”مجھے جانا تو بہت دور ہے لیکن سردست میں پانی پت سے بھاگ جانا چاہتا ہوں اور خدا کا شکر ہے میں اس میں کامیاب ہو گیا۔“
گھڑسوار ہنسا۔ ”خوب یعنی آپ پانی پت سے تشریف لائے ہیں اور پانی پت ہی میں کھڑے یہ سوال کر رہے ہیں۔ خوب۔“
شیخ احمد نے گھبرا کر گھڑسوار کا جواب دہرایا۔ ”یعنی اس وقت میں پانی پت میں ہوں؟ وہ پانی پت جس کو میں نہایت ہوشیاری اور احتیاط سے بہت پیچھے چھوڑ آیا ہوں؟ اس وقت بھی میں اسی پانی پت میں موجود ہوں؟ یہ معاملہ کیا ہے اور یہ مجھ سے کون مذاق کر رہا ہے؟“
گھڑسوار نے آپ کو حیرت و استعجاب سے دیکھا اور اپنی راہ لی۔
شیخ احمد کو ضد ہو گئی خود سے بولے۔ ”احمد! کچھ بھی ہو، میں پرکار کی طرح ساری عمر یوں ہی کوشش جاری رکھوں گا اور دیکھوں گا کہ کس طرح اس پرکار سے نکلنا نصیب نہیں ہوتا۔“
انہوں نے پوری رات محل کی دیوار کے سائے میں گزار دی اور علی الصبح ایک بار پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ دوپہر تک نہایت سرگرمی سے سفر کرتے رہے لیکن دھوپ کی تمازت نے انہیں آرام کرنے پر مجبور کر دیا۔ وہ ایک خشک درخت کے نیچے جا بیٹھے۔ تنے سے ٹیک لگا کر ماضی حال اور مستقبل کی سیر کرنے لگے۔ اتنے میں اچانک آواز سنائی دی۔ ”اے بھائی تمہیں کہاں جانا ہے؟“
آواز درخت کے اوپر سے آرہی تھی چنانچہ انہوں نے اوپر درخت کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک خوب صورت نوجوان اچھے لباس میں کلگی ٹوپی پہنے بیٹھا تھا۔ انہیں حیرت تھی کہ یہ نوجوان اس جگہ تھوڑی دیر پہلے تو نہیں تھا۔ اب یہ کہاں سے آگیا۔
نوجوان انہیں حیرت زدہ اور متفکر دیکھ کر مسکرایا اور طنزیہ کہا۔ ”لڑکے تو اتنا پریشان کیوں ہے۔ کیا ہوا؟“
شیخ احمد نے گھبرا کر سوال کیا۔ ”ارے بھائی یہ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“
نوجوان نے جواب دیا۔ ”میں یہاں کچھ بھی نہیں کر رہا۔ میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

شیخ احمد نے کہا۔ ”بھائی! میں منزل کی تلاش میں یہاں تک آ گیا ہوں، میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اب مجھے کدھر کو جانا ہے؟“

نوجوان ہنس دیا۔ مذاق اڑانے کے انداز میں کہا۔ ”معلوم نہیں میں تمہیں کیا کہوں، خوش قسمت یا بدقسمت۔ تم وہ شخص ہو جو منزل پر پہنچ کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے، تم نے تو اپنا راستہ جلال الدین کے در پر پہنچ کر ہی گم کر دیا۔“

شیخ احمد نے کہا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

نوجوان نے جواب دیا۔ ”بھائی! میں ہی نہیں ایک زمانہ بھی کہے گا۔“ پھر...... سامنے آتے ہوئے دو آدمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ان دونوں سے بات کرو۔ اللہ نے چاہا تو یہ بھی میری تائید کریں گے۔“

شیخ احمد دونوں کی طرف بڑھے۔ یہ دونوں نہایت ستھرے کپڑوں میں ملبوس انہی کی طرف بڑھے چلے آ رہے تھے۔ شیخ احمد ان کی طرف بڑھے اور قریب پہنچ کر سوال کیا۔ ”صاحبان! مجھے کدھر جانا چاہیے۔ میرا راستہ کدھر ہے؟“

ان دونوں نے بیک آواز جواب دیا۔ ”راستہ کھونے کے بعد راستہ پوچھ رہے ہو؟ کیا جلال الدین قطب ربانی کا در تیری منزل نہیں تھا؟ تو نے تو اپنا سارا راستہ خود ہی کھو دیا۔“

شیخ احمد شرمسار و شرمندہ درخت کی طرف مڑے اور درخت پر بیٹھے ہوئے نوجوان کا شکریہ ادا کرنا چاہا لیکن اب درخت پر کوئی بھی نہ تھا۔ ادھر سے مڑ کر دونوں اجنبیوں کی طرف بڑھے لیکن اب وہ بھی غائب ہو چکے تھے۔ یہ خجل و شرمندہ ہو کر درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ اور سوچنے لگے کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیے۔

آخر اٹھے اور پانی پت کی طرف چل پڑے لیکن راستے میں ندامت اور شرمندگی نے انہیں نڈھال کر دیا۔ وہ بے ہوش ہو کر گر گئے اور بڑی دیر تک یوں ہی پڑے رہے لیکن ہوش میں آتے ہی وہ پانی پت کی طرف چل نکلے۔

ابھی آستانہ دور ہی تھا کہ وسوسوں نے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ معلوم نہیں، انہیں کون ورغلا رہا تھا۔ دل بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ تجربے اور ثبوت کے بغیر میں انہیں کس طرح ولی کامل اور قطب ربانی مان لوں پھر کسی نے دل سے یہ مشورہ دیا کہ ”شیخ احمد! ذرا ان قطب ربانی کا امتحان تو لے لے۔“

اس آواز سے شیخ احمد نے سوال کیا۔ ”میں ان کا کیا امتحان لوں؟“

جواب ملا۔ ”جب تو ان کے سامنے پہنچے تو اپنے دل میں دو خواہشیں لیے ہو کہ حضرت قطب ربانی اپنے سر کی ٹوپی اپنے پیر کی قبر سے مس کر کے تیرے سر پر رکھ دیں اور اس کے بعد شیرینی عطا فرما دیں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو واقعی قطب ربانی ٹھہریں گے ورنہ کچھ بھی نہیں۔“

چنانچہ شیخ احمد اپنے دل میں دونوں خواہشیں لیے ہوئے قطب ربانی کی خدمت میں پہنچ گئے۔ خادم سے پوچھا۔ ”کیوں بھائی، قطب ربانی تشریف رکھتے ہیں، میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔“

خادم نے جواب دیا۔ ”قطب ربانی اس وقت اپنے پیر کے مزار پر کھڑے فاتحہ پڑھ رہے ہیں، اگر ان سے ملاقات کا اتنا ہی شوق ہے تو اندر مزار کے پاس چلے جاؤ اسی وقت ملاقات ہو جائے گی۔“

شیخ احمد اسی وقت مزار کے احاطے میں داخل ہو گئے۔ اس وقت قطب ربانی فاتحہ پڑھ کر واپسی کا ارادہ کر رہے تھے، اپنے سامنے شیخ احمد کو کھڑے دیکھا تو مسکرا دیے۔ پوچھا۔ ”تو تم ابھی تک پانی پت میں ہی موجود ہو؟“

شیخ احمد کے دل پر چوٹ لگی بولے۔ ”حضرت میں خطا کار ہوں۔“

حضرت قطب ربانی نے فرمایا۔ ”تم پرکار کی طرح عمر بھر چکر لگانے کا عہد کر چکے تھے؟“

شیخ احمد تڑپ کر بولے۔ ”مجھ سے غلطی ہوئی میں شرمندہ ہوں۔ مجھ کو اور زیادہ شرمندہ نہ کیجیے۔“

جواب میں قطب ربانی نے کلاہ سر سے اتار کر ہاتھ میں لے لی اور پھر اس کو مزار سے چھوا کر شیخ احمد کے سر پر رکھ دی۔ دوسرے ہاتھ میں روٹی اور حلوا تھا فرمایا۔ ”یہ کلاہ اپنے سر پر رہنے دے اور روٹی اور حلوا کھا لے۔“

شیخ احمد کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ ”حق حق حق۔“

اور بے اختیار قطب ربانی کے قدموں میں ڈھیر ہو گئے۔ قطب ربانی نے انہیں اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور بڑی دعائیں دیں۔

حضرت قطب ربانی انہیں اپنے ساتھ خانقاہ میں لے گئے اور اپنے ہاتھوں سے سر کے بال کاٹ دیے اور باقاعدہ اپنا مرید کر لیا۔ کچھ دیر بعد دسترخوان بچھا اور اس پر کئی قسم کے کھانے سجا دیے گئے۔

شیخ احمد نے ہر کھانے میں تامل سے کام لیا۔

قطب ربانی نے دریافت کیا۔ "کیا بات ہے شیخ احمد، کھاتے کیوں نہیں؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "حضرت میری کیا مجال جو کھانے سے گریز کروں لیکن اندر دل میں معلوم نہیں کون ہے جو مجھے وسوسوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ میں کھانا کھانا چاہتا ہوں لیکن دل سے آواز آ رہی ہے کہ خبردار، محتاط جو کچھ بھی کھانا سوچ سمجھ کر کھانا، کھانے کی طرف سے ہر طرح اطمینان کر کے۔"

اس کے بعد شیخ احمد نے کئی بار حق حق کا نعرہ بلند کیا۔

قطب ربانی نے جواب دیا۔ "میں تمہارے وسوسے کا علاج کرتا ہوں، تمہارے دل کو ہاں اور نہیں کے وسوسوں سے پاک کرتا ہوں۔"

شیخ احمد نے عجز و انکسار سے فرمایا۔ "خدا کے لیے جلدی کیجیے ورنہ میں بیمار پڑ جاؤں گا۔"

قطب ربانی نے تیز تیز نظروں سے شیخ احمد کو گھورا اور تحکمانہ فرمایا۔ "شیخ احمد! ان موجود کھانوں میں جو ناپسند ہوں، انہیں چھوڑ دو بقیہ کھالو۔"

شیخ احمد کو یوں محسوس ہوا گویا ان کا دل وسوسوں سے پاک ہو چکا ہے، انہوں نے بے ساختہ "حق حق" کا نعرہ بلند کیا۔

قطب ربانی نے فرمایا۔ "شیخ احمد، یہ تو حق حق کا نعرہ کیوں لگا رہا ہے؟"

شیخ احمد نے جواب دیا۔ "مجھ کو حق حق سے سکون ملتا ہے۔"

قطب ربانی نے ارشاد فرمایا۔ "اب آج سے تو شیخ احمد کے ساتھ ساتھ عبدالحق بھی ہے۔ یہ نام تیرے ساتھ اچھا رہے گا۔ اب تو عبدالحق ہے اور ہمیشہ عبدالحق ہی رہے گا۔"

اس کے بعد سے وہ واقعی عبدالحق ہی ہو گئے۔

کچھ عرصہ پیر و مرشد کے پاس رہ کر انہوں نے سیاحت اختیار کی۔ قطب ربانی نے بھی اس کی اجازت مرحمت فرما دی تھی۔ یہ پانی پت سے ردولی پہنچے، ماں اپنے بیٹے کی یاد میں سوگوار ہو رہی تھیں۔ اچانک بیٹے کو سامنے دیکھ کر بے چین ہو گئیں اور دیر تک سینے سے لگائے رکھا۔

بعد میں ماں نے پوچھا۔ "کیا تیرے بھائی تقی الدین نے تیری مدد کی؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ذرا بھی نہیں کیونکہ بھائی تقی الدین علوم ظاہری کا درس تو دے سکتے ہیں علوم باطنی کا انہیں کوئی تجربہ نہیں۔"

ماں نے شفقت سے پوچھا۔ "پھر تو نے کیا کیا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "پھر میں نے اپنے بھائی کی قیام گاہ چھوڑ دی اور مرشد کامل کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ مجھے پانی پت کا پتا بتایا گیا تھا چنانچہ جب میں پانی پت پہنچا اور وہاں قطب ربانی کے در پر ہاتھیوں اور گھوڑوں کا ہجوم دیکھا تو میرے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوا کہ آخر یہ کیسا پیر ہے جو اس کروفر اور شان و شوکت سے رہتا ہے۔ میں نے اس خانقاہ میں دوبارہ جانا بھی گوارا نہ کیا اور پانی پت کو چھوڑ دیا۔ سارا دن چلتا رہا اور بعد میں یہ معلوم ہوا کہ میں پانی پت ہی میں عمر بھر گردش کرتا رہوں گا کسی پرکار کی طرح۔"

ماں نے بے چینی سے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟"

شیخ احمد نے سب کچھ تفصیل سے بتا کر عرض کیا۔ "ماں اب میں بہت شرمندہ بھی ہوں اور مطمئن بھی۔"

ماں نے ایک بار پھر بیٹے کو اپنے سینے سے لگا لیا اور بڑی دعائیں دیں۔ اس کے بعد شیخ احمد سیاحت کے لیے نکل کھڑے ہوئے اور کئی سال تک سیاحت کرتے رہے۔ پانی پت میں پیر و مرشد کی طبیعت بہت نازک ہو گئی اور انہیں اپنی زندگی کی طرف سے مایوسی ہو گئی۔ اپنے بیٹے شیخ احمد عارف کو بلا کر فرمایا۔ "بیٹے عارف! اب میں عنقریب اپنے خالق کے پاس چلا جاؤں گا۔"

قطب ربانی کے صاحبزادے رونے لگے کہا۔ "باوا جان! خدا آپ کو ہزاروں سال زندہ و سلامت رکھے آپ ایسی بات نہ کیجیے۔"

شیخ عارف کی باتیں آپ نے بڑے انہماک سے سنیں اور فرمایا۔ "فرزند! میرے بعد شیخ احمد جو اب عبدالحق ہو چکا ہے تیرے پاس آئے گا تو میرے سارے تبرکات اس کے حوالے کر دے گا، کیونکہ وہی میرا خلیفہ اور سجادہ نشین ہوگا۔"

بیٹے کو رونا آئے جا رہا تھا۔ بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "باوا جان آپ ایسی باتیں نہ کیجیے میرا دل غم سے پھٹا جا رہا ہے۔"

باپ نے بیٹے کو ڈانٹ دیا۔ "بیٹے! تو آنسو نہیں بہائے گا کیونکہ رسول ﷺ نے اس سے منع کیا ہے۔" پھر پوچھا۔ "کیا میری ساری وصیتیں اور نصیحتیں تو نے سن لی ہیں؟"

بیٹے نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "میں نے آپ کی نصیحتیں اور وصیتیں اچھی طرح سن لی ہیں اور اللہ نے چاہا تو میں

ان پر پورا اتروں گا۔"

اس کے چند دن بعد حضرت قطب ربانی نے وصال فرمایا۔ کچھ عرصہ بعد شیخ احمد پانی پت واپس پہنچے۔ مرحوم قطب ربانی کے صاحبزادے شیخ عارف نے بصد ادب واحترام تبرکات ان کے حوالے کر دیے اور کہا۔ "حضرت! پدر مرحوم فرما گئے ہیں کہ ان کا سلسلہ آپ ہی سے جاری ہوگا۔ آپ ان کے جانشین ہیں۔ چنانچہ ان کے سارے تبرکات پیش خدمت ہیں قبول فرمائیے۔"

شیخ احمد نے تبرکات لے کر پیر ومرشد کے فرزند شیخ عارف پر توجہ دینا شروع کر دی اور تعلیم وتربیت دے کر انہیں مرتبہ کمال کو پہنچا دیا۔ ادھر سے فارغ ہو کر آپ نے ردولی کے لیے رخت سفر باندھا۔ شیخ عارف نے سوگوار ہو کر دریافت کیا۔ "حضرت! میرے لیے کیا ارشاد ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "مرشد زادے! تم میرے خلیفہ اور جانشین ہو۔ چاہو تو ردولی چلو، ورنہ یہیں رہ جاؤ۔"

مرشد زادے نے عرض کیا۔ "میں آپ کے ساتھ ردولی چلوں گا کیونکہ آپ کے بغیر میرا وجود ہی کیا۔"

آپ مرشد زادے کے ساتھ ردولی تشریف لے گئے گھر کی حالت ہی بدل چکی تھی۔ والدین میں سے کوئی بھی بقید حیات نہ تھا۔ ردولی چند مکانوں کی ایک بستی کا نام تھا ورنہ ہر طرف جنگل و بیابان تھا۔ آپ اپنے آبائی مکان میں رہنے لگے۔ آپ کے عقیدت مندوں نے آپ کی صحبت میں ردولی کا قیام اختیار کیا اور اس کی آبادی میں اضافہ ہونے لگا۔

آپ کے حجرے میں نہ تکیہ تھا نہ بستر۔ جسم پر ایک خرقہ تھا جس پر بے شمار پیوند لگے ہوئے تھے۔ شیخ عارف نے ایک عرصہ بعد آپ کو یاد دلایا۔ "حضرت! کامل تیس سال گزر چکے ہیں کہ آپ کا سر تکیے کی لذت سے ناآشنا ہے۔ اب ضعیفی میں تو سر کو آرام دے دیجیے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "تکیہ ایک ہی ذات کا کافی ہے، اس کے ہوتے ہوئے کسی اور تکیے کی کیا ضرورت۔ اور اس تکیے میں جو لذت ہے اس کا بیان کرنا ہی کیا۔"

شیخ عارف نے عرض کیا۔ "حضرت! آپ کا لباس بھی پیوندوں کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے اور ان کی کثرت سے یہ اندازہ لگانا دشوار ہے کہ لباس کا اصل کپڑا کون سا ہے۔"

آپ نے بے نیازی سے جواب دیا۔ "مجھے اپنے لباس کی نہیں اپنی شناخت منظور ہے، اگر یہ شناخت میں نہ حاصل کر سکوں تو پھر میرے پاس رہے گا کیا لیکن اب میری شناخت میں یہ لباس بھی شامل ہو چکا ہے۔"

اس کے بعد آپ پر محویت طاری ہو گئی اور دنیا فراموش ہونے کے ساتھ ساتھ خود فراموشی میں ایسے گم ہوئے کہ سب کچھ بھلا دیا۔ وہ ذات واحد میں گم ہو چکے تھے، جمعے کی نماز پڑھنے کے لیے باقاعدگی سے تشریف لے جاتے اور ردولی اتنی ترقی کر چکا تھا کہ وہاں کئی مسجدیں تعمیر ہو چکی تھیں اور ایک جامع مسجد بھی بن چکی تھی۔ آپ ہمیشہ جامع مسجد ہی میں نماز پڑھتے تھے لیکن خود ان کو یہ نہیں معلوم تھا کہ جامع مسجد کہاں ہے۔

مرید اور رشتے دار آپ کی خدمت میں حاضریاں دیتے لیکن آپ کو دنیا سے بے نیاز اور گم دیکھ کر واپس چلے جاتے۔ آپ کسی سے مخاطب ہوتے نہ کسی کا مخاطب کرنا پسند فرماتے۔ دنیا فراموشی کا یہ عالم تھا کہ رشتے دار ان کے سامنے کھڑے ہوتے مگر آپ انہیں پہچاننے سے قاصر رہتے۔

ایک دن تو بہ ظاہر فراموشی حد کمال کو پہنچ گئی۔ آپ کا ایک انتہائی قریبی رشتے کا نوجوان اس زعم میں آپ کے پاس پہنچا کہ آپ اس کو تو پہچان ہی لیں گے۔ آپ نے اپنے روبرو ایک سایہ سا محسوس کیا پوچھا۔ "بھائی! تم کون ہو؟"

اس نے جواب دیا۔ "حضرت! میں آپ کی بہن کا بیٹا ہوں۔"

آپ نے حیرت سے کہا۔ "میری بہن کا بیٹا، یہ کیا ہوتا ہے؟"

بھانجے نے جواب دیا۔ "بہن کا بیٹا بھانجا ہوتا ہے، آپ کی بہن کا بیٹا۔"

آپ نے بدستور کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "میری بہن کا بیٹا! میرا بھانجا، میں تیری بات نہیں سمجھا، میرا وقت کیوں ضائع کرتا ہے اپنی راہ لے اور میرے سامنے سے ہٹ جا۔"

بھانجے نے پھر عرض کیا۔ "میں خود کو پہچان کرائے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا، چاہے جو ہو جائے۔"

آپ نے فرمایا۔ "پھر جلدی پہچان کرا دو میں تجھے نہیں پہچان سکا۔"

بھانجے نے پوچھا۔ "کیا آپ اپنی بہن کو بھول گئے؟"

آپ نے ذہن پر زور دیا، فرمایا۔ ''بہن؟ یہ کوئی چیز ہوتی تو ضرور ہے۔ ذرا اس کا اتا پتا تو بتا۔ ممکن ہے اس طرح میں اسے پہچان لوں۔''

بھانجے نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ''حد ہے تو گویا آپ نے اپنی بہن ہی کو بھلا دیا۔ اس بہن کو جو آپ کی ماں اور باپ کی بیٹی تھی۔ آپ کے والدین کی بیٹی آپ کی بہن۔''

آپ نے ذرا سکوت اختیار کیا اور پھر فرمایا۔ ''میرے والدین کی بیٹی؟ ہاں ایک تھی تو ضرور لیکن آج کل وہ ہے کہاں؟ وہ کہاں چلی گئی۔ شاید بچپن میں اس کا میرا کچھ ساتھ بھی رہا ہے۔''

بھانجے نے خوش ہو کر جواب دیا۔ ''بے شک بے شک آپ نے درست فرمایا۔ اب آپ نے پہچان لیا، بالکل صحیح پہچانا۔''

آپ نے دریافت کیا۔ ''تو تو میری بہن کا بیٹا ہے لیکن وہ میری بہن ہے کہاں؟''

بھانجے نے جواب دیا۔ ''حضرت! وہ اللہ کو پیاری ہو چکیں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ہم سب کو وہیں جانا ہے بس اللہ ہی باقی رہے گا۔''

بھانجے نے عرض کیا۔ ''حضرت! ایسی خود فراموشی بھی کس کام کی کہ بہن اور بھانجے تک کو بھلا دیا۔''

آپ نے پوچھا۔ ''کوئی کام کی بات کرنا ہو تو کر، وقت ضائع نہ کر۔''

بھانجے نے جواب دیا۔ ''حضرت! میرے حق میں دعا کیجیے۔ میں بہت پریشان ہوں۔''

آپ بدستور حق حق فرماتے رہے، اس طرح گویا انہوں نے بھانجے کی آواز سنی ہی نہیں۔

بھانجے نے ایک بار پھر عرض کیا۔ ''حضرت! کچھ میری بھی سنیے، میں کچھ عرض کر رہا ہوں۔''

آپ نے بھانجے کو غور سے دیکھ کر سوال کیا۔ ''کیا کچھ مجھ سے کہہ رہے ہو؟''

بھانجے نے جواب دیا۔ ''ہاں آپ ہی سے کہہ رہا ہوں، میں بہت پریشان ہوں میرے حق میں دعا فرما دیجیے۔''

آپ نے پوچھا۔ ''لیکن تم ہو کون؟''

بھانجے نے جواب دیا۔ ''میں ہوں آپ کا بھانجا۔''

آپ نے ذہن پر زور دے کر پوچھا۔ ''بھانجا۔ یہ بھانجا کیا ہوتا ہے؟''

بھانجے نے زچ ہو کر عرض کیا۔ ''بھانجا بہن کا بیٹا ہوتا ہے۔''

آپ نے ذہن پر مزید زور دیا۔ ''بہن کا بیٹا؟ یہ بہن کیا ہوتی ہے؟''

بھانجے نے عاجز آ کر جواب دیا۔ ''حضرت! ابھی ابھی بہن کا مطلب سمجھا چکا ہوں اور آپ پھر پوچھ رہے ہیں کہ بہن کیا ہوتی ہے اب میں بار بار کیا بتاؤں کہ بہن کیا ہوتی ہے۔''

آپ نے ''حق حق'' کا نعرہ لگایا۔ بولے۔ ''ہاں بتا بتا یہ بہن کیا چیز ہوتی ہے؟''

بھانجے نے جواب دیا۔ ''حضرت! آپ کو اپنے والدین کا علم ہے: آپ کی ایک ماں تھی ایک باپ تھا؟''

آپ نے فرمایا۔ ''ہاں تھے تو سہی، پھر؟''

بھانجے نے کہا۔ ''ان کا ایک بیٹا تھا جو آپ ہیں اور ایک بیٹی تھی وہ بیٹی آپ کی بہن تھی میں اس کا بیٹا ہوں۔''

آپ نے متبسم ہو کر فرمایا۔ ''سمجھا سمجھا۔ بالکل سمجھ گیا۔''

بھانجے نے فوراً عرض کیا۔ ''میں آپ کی بہن کا بیٹا ہوں، میرے حق میں دعا کیجیے۔''

آپ پھر ''حق حق'' کہنے لگے فرمایا۔ ''دعا کروں گا ضرور کروں گا، تیرے لیے بھی۔ بہن کے لیے بھی، سب کے لیے دعا کروں گا۔''

اس کے بعد آپ جتنے دن بھی رہے خود فراموشی میں رہے۔ آخر سی حال میں 15 جمادی الثانی 837ھ کو آپ نے وصال فرمایا۔ آپ کا سنِ وفات، عارف حق احمد عبدالحق بحق، سے نکلتا ہے۔

آپ کے بعد آپ کے مرشد زادے عارف خلیفہ اور سجادہ نشین ہوئے ان کے بعد یہ خلافت محمد بن عارف کو منتقل ہوئی اور پھر یہ خلافت حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کو ملی اور ان سے یہ سلسلہ پورے برصغیر میں پھیلتا چلا گیا۔

"میں نے ایک افواہ سنی ہے۔" سمپسن نے کہا پھر گردن گھما کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ جب اسے کامل یقین ہوگیا کہ وہ اور دوا فروش اس چھوٹی سی پریسکرپشن فارمیسی میں تنہا ہیں تو پھر وہ دوبارہ دوا فروش کی جانب متوجہ ہوگیا۔ دوا فروش ایک پختہ عمر کا پستہ قد آدمی تھا لیکن اس کی عمر کا صحیح اندازہ لگانا مشکل تھا۔ اس کی عمر پچاس سے سو برس کے درمیان کچھ بھی ہوسکتی تھی۔

تنہائی کے باوجود سمپسن کا لہجہ دھیما تھا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ تمہارے پاس ایک ایسا زہر ہے جس کا کسی طور سراغ نہیں لگایا جاسکتا۔"

دوا فروش نے اثبات میں سر ہلا دیا پھر وہ کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل کر باہر آگیا اور دکان کے داخلی دروازے کا اندر سے تالا لگا دیا۔ پلٹنے کے بعد اس کا رخ کاؤنٹر کے پیچھے بنے ہوئے چھوٹے سے کیبن کے دروازے کی جانب تھا۔

"میں کافی کا وقفہ کرنے جارہا تھا۔" دوا فروش نے سمپسن سے کہا۔ "میرے ساتھ اندر آجاؤ اور کافی پی لو۔"

سمپسن کاؤنٹر کے پیچھے سے گھوم کر دروازے سے اندر کیبن میں چلا گیا۔ اس کیبن میں فرش سے چھت تک طاق بنے ہوئے تھے، جن میں چھوٹی چھوٹی بوتلیں سجی ہوئی تھیں۔ دوا فروش نے کافی تیار کرنے والی بجلی کی مشین کا پلگ آن کیا اور دو خالی کپ اٹھا کر اس چھوٹی سی میز پر رکھ دیے جس کی دونوں جانب دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے سمپسن کو سامنے کی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

"اب مجھے بتاؤ!" دوا فروش نے کہا۔ "تم کسے مار ڈالنا چاہتے ہو؟... اور کیوں؟"

"کیا یہ بتانا ضروری ہے؟" سمپسن نے پوچھا۔ "کیا یہ کافی نہیں کہ میں اس کا معاوضہ ادا کروں گا؟"

تب دوا فروش نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ "ہاں، یہ ضروری ہے۔ مجھے لازمی قائل کرنا ہوگا کہ جو میں تمہیں دے سکتا ہوں تم واقعی اس کے مستحق ہو۔

تمام اندیشوں سے بے نیاز ایک منصوبہ ساز کی چالاکی

کسی بھی منصوبے کو کامیاب یا ناکام بنانے کے لیے تدابیر اہم کردار ادا کرتی ہیں گویا... تدبیریں کرنے والا اپنی چٹکی بھر عقل کا اظہار کرتا ہے یہ اور بات کہ یہ اظہار اس کے اراسے ظاہر کرتا ہے یا معاملات پر پردے ڈال دیتا ہے۔ کچھ ایسی ہی صورت حال یہاں بھی تھی جس نے بڑی ہوشیاری سے منصوبہ بنایا مگر نتائج نکلنے پر نہ ہوش پاس رہا نہ یاری نے ساتھ دیا۔

باتدبیر

سلیم انور



ورنہ پھر......"

دوافروش نے شانے اچکادیے۔

"آل رائٹ۔" سمپسن نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "جسے میں ہلاک کرنا چاہتا ہوں وہ میری بیوی ہے۔"

"اور کیوں؟"

تب سمپسن نے ایک طویل کہانی بیان کرنا شروع کردی۔ اس سے قبل کہ وہ اپنی داستان مکمل کرتا، کافی تیار کرنے والی بجلی کی مشین نے کافی تیار ہونے کا سگنل دے دیا۔ دوافروش نے سمپسن کو رکنے کا اشارہ کیا اور اٹھ کر کافی لینے چلا گیا۔ جب وہ کافی لے کر پلٹا تو سمپسن اپنی کہانی دوبارہ بیان کرنے لگا۔

جب اس نے اپنی داستان مکمل کردی تو پستہ قد دوافروش نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہاں، میں کبھی کبھار وہ زہر تقسیم کردیتا ہوں جس کا سراغ نہیں لگایا جاسکتا۔ یہ کام میں مفت کیا کرتا تھا۔ اگر میں سمجھتا ہوں کہ کیس مستحسن ہے۔ میں نے کئی قاتلوں کی مدد کی ہے۔"

"فائن!" سمپسن نے کہا۔ "تب یہ مجھے بھی دے دو۔"

دوافروش اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ "میں پہلے ہی دے چکا ہوں۔ جس وقت کافی تیار ہورہی تھی تو میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ تم اس کے مستحق ہو...... جیسا کہ میں نے کہا تھا میں یہ زہر مفت دیا کرتا ہوں لیکن اس کے تریاق کی ایک قیمت ہے۔"

یہ سن کر سمپسن کے چہرے کا رنگ اڑ گیا لیکن اسے اس بات کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ اسے گمان تھا تو اس بات کا کہ اس کے ساتھ یا تو عہد شکنی ہوسکتی ہے یا پھر کسی طریقے سے بلیک میل کیا جاسکتا ہے۔ اس نے فوراً ہی اپنی جیب میں سے ایک پستول نکال لیا۔

پستہ قد دوافروش نے پستول پر نگاہ پڑتے ہی ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "تم اسے استعمال کرنے کی جرأت مت کرنا۔ کیا تم ان میں سے زہر کا تریاق تلاش کرسکتے ہو؟" اس نے اپنے عقب کے طاقوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہاں تو ہزاروں بوتلیں رکھی ہوئی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ تمہیں کوئی زیادہ تیز اثر زہر کی شیشی ہاتھ میں آجائے اور اگر تم سمجھ رہے ہو کہ میں تمہیں دھوکا دینے کے لیے جھوٹ بول رہا ہوں کہ میں نے تمہیں حقیقت میں زہر نہیں دیا ہے تو پھر دیر مت کرو اور مجھے شوٹ کردو۔ تمہیں اس کا جواب تین گھنٹے میں مل جائے گا جب زہر اپنا اثر دکھانا شروع کردے گا۔"

"تریاق کا معاوضہ کیا ہوگا؟" سمپسن نے جھلاہٹ بھرے لہجے میں پوچھا۔

"خاصا مناسب ہے۔ صرف پانچ ہزار ڈالرز۔ آخر کار ایک شخص کے لیے زندہ رہنا بھی ضروری ہے اور اس کی گزر بسر کے اخراجات بھی ہوتے ہیں۔ چاہے اس کا مشغلہ قتل کو روکنا ہی کیوں نہ ہو اور اس کا کوئی جواز نہیں کہ وہ اپنے اس مشغلے کو اپنی آمدنی کا ذریعہ نہ بنائے۔ ہے نا؟"

سمپسن نے غراتے ہوئے اپنا پستول نیچے کرکے اسے اپنی دسترس میں ہی رکھا اور جیب میں سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال لی۔ اس نے سوچا شاید تریاق حاصل کرنے کے بعد اسے اپنے پستول کو استعمال کرنے کی ضرورت پیش آجائے۔ پھر اس نے سو سو ڈالرز کے نوٹ گڈی میں سے نکال کر گننا شروع کیے اور...... پانچ ہزار ڈالر کی رقم دوافروش کے سامنے میز پر رکھ دی۔

دوافروش نے اس رقم کو اٹھانے کے لیے کسی قسم کی عجلت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ بولا۔ "تمہاری بیوی کے اور اپنے تحفظ کے لیے ایک اور بات۔ تمہیں اپنے ارادے...... بلکہ سابقہ ارادے کے اعتراف میں ایک تحریر دینا ہوگی کہ تم اپنی بیوی کو قتل کرنا چاہتے تھے جس کا مجھے یقین ہے۔ پھر تمہیں اس وقت تک انتظار کرنا ہوگا جب تک میں تمہاری وہ تحریر...... تمہارا اعتراف نامہ اپنے اس دوست کو نہ پہنچادوں جو پولیس کے اس شعبے سے وابستہ ہے جو قتل کی وارداتوں کی تفتیش کرتا ہے۔ وہ اس اعتراف نامے کو بہ طور ثبوت اپنے پاس رکھے گا اگر تم نے اپنی بیوی یا مجھے قتل کرنے کا فیصلہ کیا۔"

سمپسن خاموشی سے سب کچھ سن رہا تھا۔

دوافروش نے اپنی بات جاری رکھی۔ "جب یہ تحریر میرے دوست کے پاس حفاظت سے پہنچ جائے گی تو تب ہی میرا یہاں واپس آنا محفوظ ہوگا اور پھر میں تمہیں تریاق دے دوں گا۔ اب میں تمہیں کاغذ اور قلم دے رہا ہوں تاکہ تم لکھنا شروع کردو۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنی میز کی دراز کھولی۔

"ارے ہاں، ایک بات تو کہنا بھول گیا۔" دوافروش گویا ہوا۔ "گو میں اس پر قطعی اصرار نہیں کروں گا لیکن میرے سراغ نہ لگائے جانے والے زہر کی بات لوگوں میں ضرور پھیلا دینا۔ میری خاطر اتنا تو کرسکتے ہو نا؟ کسی کو کیا پتا کہ جو زندگی تم بچارہے ہو وہ تمہاری اپنی زندگی بھی ہوسکتی ہے...... اگر کوئی تمہارا بے دشمن ہوں تو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں مسٹر سمپسن؟"

سمپسن نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔



زندہ بھوت

تنویر ریاض

یہ حقیقت ہے کہ علم کی تو کوئی انتہا نہیں البتہ انسانی عقل کی ایک حد ضرور مقرر ہے... اس علم کو استعمال کرنے کا اختیار بھی اللہ نے مکمل طور پر انسان کے ہاتھ میں دیا ہے۔ وہ بھی ایک عجب فریب تھا... جس کا وجود نہیں تھا وہ ہی نظر آتا اور جو نظر آتا اس کا کوئی نشان تک نہ ملتا تھا۔

دل کے چور اور نظر کے دھوکوں پر مشتمل ایک حیرت انگیز کہانی

وہ بوڑھی عورت اپنی ایک آنکھ سے مسلسل گھورے جارہی تھی لہٰذا جولی نے مسکراتے ہوئے مٹی کا پیالہ اپنے ہونٹوں سے لگالیا۔ ڈون نے بھی اس کی تقلید کی۔ پہلا گھونٹ لیتے ہی جولی پُرسکون ہوگئی، ورنہ وہ سوچ رہی تھی کہ چائے کے نام پر جو شروب انہیں پیش کیا گیا ہے، اس کا ذائقہ نہ جانے کیسا ہو۔ مگر یہ گرما گرم سبز چائے اس کی توقع سے بڑھ کر خوش ذائقہ تھی جس میں یقیناً شہد، سرکہ اور شاید... دارچینی بھی ملائی گئی تھی لیکن جولی کو یہ سب جاننے کی ضرورت

نہیں تھی۔ وہ اطمینان سے ٹھنڈی چائے کے گھونٹ لیتی اور مسکراتی رہی۔

ڈون اس کے برابر میں گھاس پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس نے بھی ایک بھرپور مسکراہٹ کے ذریعے چائے کی تعریف کی تو بوڑھی عورت نے گھورنا بند کر دیا اور اپنی پوتی کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا اور اطمینان سے کشن سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ ٹین کی چھت والا لکڑی سے بنا کاٹیج جزیرے کے دور افتادہ حصے میں واقع تھا۔ اس میں بجلی تھی اور نہ ہی کوئی فرنیچر البتہ ہر کونے میں بڑی بڑی موم بتیاں روشن تھیں۔ ایک پردے کے ذریعے اس کمرے کو بقیہ کاٹیج سے علیحدہ کیا گیا تھا اور موم بتی کی روشنی میں سفید دیواروں پر سائے رقص کرتے نظر آرہے تھے۔ جائزہ لینے کے بعد جولی نے سوچا کہ یہ کسی ویسٹ انڈین ہارر فلم کے لیے مکمل سیٹ ہو سکتا ہے۔

ان کے یہاں آنے کا مقصد ڈون کو اپنی نئی کتاب کے بارے میں معلومات حاصل کرنا تھا کیونکہ وہ ہمیشہ اپنے ناولوں میں تفصیل سے بیان کرنے کا عادی تھا اور اس کے لیے وہ انتہائی حد تک جا سکتا تھا۔ وہ ایک سسپنس تحریر لکھنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا جس کا پس منظر جزائر غرب الہند تھے، لہٰذا وہ اس کے لیے ریسرچ کرنے کی غرض سے سینٹ تھامس میں آیا تھا اور اسی سلسلے میں وہ اوبی قبیلے سے تعلق رکھنے والی اس یک چشم عورت کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

''سب سے پہلے میں تمہیں ایک بات بتا دینا ضروری سمجھتی ہوں۔'' بوڑھی عورت نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''تم اپنی کتاب میں کوئی ایسی بات نہیں لکھو گے جس سے یہاں کے رہنے والوں کی دل آزاری ہو اور نہ ہی ان کے مذہبی عقائد اور رسم و رواج کا مضحکہ اڑاؤ گے یا اس پر نکتہ چینی کرو گے۔''

''میں ہر فرد کے عقیدے کا احترام کرتا ہوں۔'' ڈون نے اپنی میزبان کو یقین دلاتے ہوئے کہا۔ ''میں اس جزیرے کی تہذیب و ثقافت کو ممکنہ طور پر صحیح انداز میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یونیورسٹی آف دی ورجن آئی لینڈ کے پروفیسر لینگ کا کہنا ہے کہ تم اس موضوع پر مکمل دسترس رکھتی ہو۔''

بوڑھی عورت نے یہ سن کر قہقہہ لگایا۔ جولی نے اس کی جانب چونک کر دیکھا۔ کمرے کی مدھم روشنی میں اس کے سفید دانت چمک رہے تھے۔ اس کی ایک آنکھ بادامی جبکہ دوسری زرد تھی جس سے کم دکھائی دیتا تھا۔ اس عیب کے باوجود وہ خاصی خوب صورت نظر آرہی تھی۔ اس نے قدیم افریقی عورتوں کی طرح ایک لانبا چغہ پہن رکھا تھا جس پر نیلے اور بادامی رنگ کی دھاریاں پڑی ہوئی تھیں۔ سر کے بالوں کو اس نے ایک گول ٹوپی سے ڈھانپ رکھا تھا اور کانوں میں بڑی بڑی بالیاں جھول رہی تھیں۔

''مذاق میں کہہ دیا ہوگا۔'' عورت نے کہا۔ ''ممکن ہے کہ وہ ٹھیک ہی کہتا ہو۔ ویسے وہ وقتاً فوقتاً میرے پاس لوگوں کو بھیجتا رہتا ہے، جن میں ڈاکٹر، اسکالر اور مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے لوگ شامل ہیں۔ ایک دفعہ اس نے کسی ماہر نفسیات کو بھیج دیا۔ وہ بھی ایک کتاب لکھ رہا تھا۔ ایسے بور لوگوں کو میں منہ نہیں لگاتی۔ اسی لیے میں نے اسے چائے بھی نہیں پلائی لیکن تم مجھے اچھے آدمی لگے ہو اور تمہاری بیوی بھی بہت خوب صورت ہے۔ میں تم دونوں کو کس نام سے پکاروں۔''

''میرا نام ڈون ہے۔'' مرد نے کہا۔ ''اور یہ جولی بیکسٹر ہے..... اور یہ میری بیوی نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ابھی ہماری شادی نہیں ہوئی۔''

بوڑھی عورت کی بادامی آنکھ جولی کے چہرے پر جم گئی لیکن اس نے شرمانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ بوڑھی عورت نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کے سامنے ایک بتیس سالہ پُرکشش عورت بیٹھی ہوئی تھی جس نے بڑے سلیقے سے اپنے آپ کو سنوار رکھا تھا۔ اس نے ہلکا سوتی لباس پہن رکھا تھا جو اس نے گزشتہ روز ہی ٹورسٹ شاپ سے خریدا تھا۔ عورت کی نظر اس کے ہاتھوں پر گئی جس کی درمیانی انگلی میں سونے کی انگوٹھی نظر آرہی تھی۔

''میرا نام مرینہ ہے۔'' بوڑھی عورت نے کہا۔ ''ابھی تک تمہاری شادی نہیں ہوئی۔ کوئی بات نہیں، جلد ہو جائے گی۔'' اس کی نظریں ابھی تک انگوٹھی پر جمی ہوئی تھیں۔

جولی نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں بیوہ ہوں۔ میرے شوہر کا چند ماہ قبل ہی انتقال ہوا ہے۔ ڈون ہمارا پرانا دوست ہے اور اس کا اصرار تھا کہ میں بھی اس کے ساتھ سینٹ تھامس چلوں۔'' یہ کہہ کر اس نے ڈون کی طرف دیکھا جو اس کی بات سن کر مسکرا رہا تھا۔ ''جہاں تک ہماری شادی کا تعلق ہے۔ ہمارے درمیان اس موضوع پر گفتگو ہوئی ہے لیکن میں اتنی جلدی شادی نہیں کروں گی۔ ابھی.... شوہر کی جدائی کا غم تازہ ہے۔''

''میں جانتی ہوں۔'' بوڑھی عورت نے سادگی سے کہا۔ ''تمہیں اس پر قابو پانے میں کچھ وقت لگے گا۔ میرے شوہر کو مرے ہوئے عرصہ ہو گیا۔ اس وقت تم شاید پیدا بھی نہ ہوئی ہو گی لیکن میں کافی عرصے تک اس کے غم

سے نجات حاصل نہ کرسکی تھی۔ اسی طرح تمہیں بھی اس میں کچھ وقت لگے گا پھر تم اس کے بارے میں ضرور سوچنا۔"

اس نے انگوٹھے سے ڈون کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ خوش شکل ہے اور عمر میں تقریباً تمہارے ہی برابر ہے۔ کیا تمہارے بچے ہیں؟"

جولی شرما گئی۔ وہ یہاں کے لوگوں کی طرح صاف گو نہیں تھی۔ اس نے کہا۔ "میرا کوئی بچہ نہیں اور تمہارے؟"

"پانچ۔" مرینہ دانت نکالتے ہوئے بولی۔ "تین لڑکے اور دو لڑکیاں۔ ایک لڑکا مر چکا ہے۔ وہ منشیات فروشوں کے گروہ میں شامل ہو گیا تھا اور ایک جھگڑے کے دوران گولی لگنے سے ہلاک ہو گیا۔ میرے نو پوتے، پوتیاں اور نواسے، نواسیاں ہیں۔ یہ میری سب سے چھوٹی پوتی ہے جس نے تمہیں چائے دی تھی۔ اس کا نام سیلینا ہے۔"

"بہت خوب صورت لڑکی ہے۔" جولی نے کہا۔

"ہاں، میرے حصے کی ساری خوب صورتی اسے مل گئی ہے۔" یہ کہہ کر وہ زور زور سے قہقہے لگانے لگی جس سے اس کے کانوں میں پڑی بالیاں آگے پیچھے جھولنے لگیں پھر اچانک ہی اس کی ہنسی رک گئی اور وہ آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ "تمہارے شوہر کی کیا عمر ہوگی؟"

جولی نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ "وہ اکیاون سال کا تھا۔"

"گویا تمہاری عمر سے دوگنا۔ اس کی موت کیسے واقع ہوئی؟"

جولی نے ایک بار پھر پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ "وہ ہمارے پام بیچ والے گھر کی سیڑھیوں سے گر گیا تھا۔"

"پام بیچ، یہ تو فلوریڈا میں ہے۔ میرا خیال تھا کہ تم نیویارک کی رہنے والی ہو۔"

"ہاں، ہمارے گھر دونوں جگہوں پر ہیں۔ اس کے علاوہ لندن میں مکان اور دبئی میں ایک ولا بھی ہے۔ میرے شوہر کا ان سب جگہوں پر آنا جانا لگا رہتا تھا۔ وہ ایک بہت بڑی کمپنی کا سربراہ تھا۔ ورلڈ وائیڈ کمپیوٹرز...... شاید تم نے یہ نام سنا ہو۔"

"اوہ، تم تو خاصی امیر عورت ہو۔" مرینہ نے حیرت سے کہا۔ "جب تمہارا شوہر سیڑھیوں سے گرا تو تم اس کے پاس ہی تھیں؟"

اس سوال پر جولی کچھ بے چین سی ہو گئی۔ اس نے کہا۔ "نہیں، جب یہ حادثہ پیش آیا اس وقت میں نیویارک میں تھی۔"

"حادثہ۔" بوڑھی عورت نے سرگوشی میں کہا پھر اس کی نظریں ڈون کی جانب اٹھ گئیں اور بولی۔ "اور تم اس وقت کہاں تھے؟"

ڈون کا چہرہ سفید پڑ گیا، وہ بولا۔ "معاف کرنا، میں کچھ سمجھا نہیں۔"

اس گفتگو کے دوران مرینہ نے تیسری بار قہقہہ لگایا اور سر کو پیچھے لے جاتے ہوئے بولی۔ "میں تو وہ لینے والی جادوگرنی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی ہنسی پر قابو پایا اور ایک بار پھر آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ "یہ سوال میں نے تم سے اس لیے پوچھا کہ میں نے ایک سایہ دیکھا۔ جب میں نے دروازہ کھولا تو وہ مجھے تمہارے پیچھے نظر آیا تھا۔ میں حیران رہ گئی کہ وہ سایہ کس کا ہو سکتا ہے لیکن اتنا جانتی ہوں کہ وہ ایک مرد تھا۔ اس نے سرمئی رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا جس پر چوڑی دھاریاں تھیں۔ نیلی ٹائی پر چھوٹے چھوٹے ستارے بنے ہوئے تھے۔ چاندی جیسے بال اور زرد آنکھیں...... نہیں زرد نہیں اس کے لیے ایک اور لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔"

"بنفشی۔" جولی نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں، یہ صحیح لفظ ہے۔" بوڑھی عورت بولی۔ "وہ تمہارے ساتھ یہاں آیا تھا۔"

جولی سے برداشت نہ ہوسکا اور وہ چاروں طرف نگاہیں گھمانے لگی جیسے اس سائے کو دیکھنا چاہ رہی ہو۔ اس نے دیکھا کہ ڈون بھی ایسا ہی کر رہا تھا پھر انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور اپنی میزبان کی جانب متوجہ ہو گئے۔

"کیا وہ اب بھی یہیں ہے؟" جولی نے پوچھا۔

"میرے بچے، وہ ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گا لیکن تم اسے دیکھ نہیں سکو گے کیونکہ تمہارے پاس وہ آنکھ نہیں ہے لیکن میں اسے دیکھ سکتی ہوں بلکہ میں ہر شخص کو دیکھ سکتی ہوں چاہے وہ زندہ ہو یا مردہ۔ یہ طاقت صرف مجھے حاصل ہے۔" پھر اس نے آواز لگائی۔ "سیلینا!"

وہی خوب صورت لڑکی کچن سے برآمد ہوئی۔ اس نے ان کی پیالیوں میں اور چائے ڈال دی اور خاموشی سے چلی گئی۔

"چائے پیو۔" مرینہ نے حکم صادر کیا۔ "یہ جپسی چائے ہے اور صرف ان لوگوں کو پیش کی جاتی ہے جنہیں میں پسند کرتی ہوں۔ مجھے تم لوگ پسند آئے۔"

ڈون نے چائے کا گھونٹ لیا اور بولا۔ "جپسی چائے، جپسی کے معنی تو بھوت پریت کے ہیں۔ امریکا میں انہیں روسی کہا جاتا ہے۔"

مرینہ نے اپنا سر ہلایا اور اسے ایک آنکھ سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "نہیں، تم اس بارے میں غلطی پر ہو اور تمہیں

اپنی کتاب کے لیے زیادہ جاننے کی ضرورت ہے ..... بے شک یہ بھوت پریت یا پچھلے پیروں پر چلنے والی چڑیلیں ہیں لیکن تم انہیں دیکھ نہیں سکتے۔"

"میں سمجھ گیا۔" ڈون نے یہ کہہ کر گھاس پر پڑے ہوئے چھوٹے سے ٹیپ ریکارڈر کی طرف دیکھا تاکہ یقین کر سکے کہ ان کی گفتگو ریکارڈ ہو رہی ہے پھر بولا۔ "یہ کس قسم کی روحیں ہیں، اچھی یا بری؟"

"دونوں لیکن زیادہ تر بدروحیں ہوتی ہیں اور یہ نقصان پہنچا سکتی ہیں لیکن کبھی کبھی یہ بے ضرر بھی ہوتی ہیں اور کسی چیز کی تلاش میں دو دنیاؤں کے درمیان بھٹکتی رہتی ہیں۔" جولی نے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ محسوس کی۔

"انہیں کس چیز کی تلاش ہوتی ہے؟"

مرینہ نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور بولی۔ "وہ حقیقت جاننے کے لیے ادھر ادھر بھٹکتی رہتی ہیں۔" اس کا چہرہ جگمگا اٹھا اور وہ ایک بار پھر قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ "مرغی سڑک کیوں پار کرتی ہے؟"

ڈون مسکراتے ہوئے بولا۔ "تاکہ سڑک کے دوسری جانب جا سکے۔"

وہ عورت بولی۔ "وہ مرغی بدروح بھی ہو سکتی ہے۔"

"بہت خوب۔" ڈون نے کہا۔ "اور یہ چائے؟"

"یہ چائے تمہیں دوسری دنیا کو دیکھنے میں مدد دے گی۔ اس کو پینے کے بعد تم بھوتوں اور بدروحوں کو دیکھ سکو گے۔ اس کا اثر ایک دن تک رہتا ہے یعنی سورج غروب ہونے سے لے کر اگلے روز سورج غروب ہونے تک۔ اس کے بعد تمہیں دوبارہ یہ چائے پینا ہوگی۔" پھر وہ جولی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

"تم اس چائے سے لطف اٹھاؤ جب تک میں تمہارے ساتھی سے اس کی کتاب کے بارے میں کچھ باتیں کرلوں۔"

☆☆☆

"یہ سب بہت سنسنی خیز تھا۔" ڈون نے واپسی کے دوران کرائے کی کار چلاتے ہوئے کہا۔

"بہت زیادہ۔" جولی نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "اس نے رچرڈ کا حلیہ ہو بہو بیان کر دیا۔ یہ سب اسے کیسے معلوم ہوا؟"

ڈون قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "یاد کرو، اس نے کیا کہا تھا کہ وہ غیر معمولی قوت کی حامل ہے لیکن ڈارلنگ! تم اسے بھول جاؤ۔ وہ صرف دکھاوا کر رہی تھی، البتہ وہ کافی دلچسپ عورت ہے اور اس نے مجھے کتاب کے لیے اچھا خاصا مواد فراہم کیا ہے۔"

"پھر تو ہمیں کوئی نقصان نہیں ہوا۔" جولی اپنے خوف پر قابو پانے کے لیے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ "اور اس پراسرار چائے کے بارے میں کیا کہو گے؟"

"وہ سبز چائے تھی اور اس میں شاید کوئی نشہ آور شے ملائی گئی تھی۔ مجھے تو ہلکی ہلکی غنودگی محسوس ہو رہی ہے۔"

"میرا بھی یہی حال ہے۔" جولی نے کہا۔ "کیا تم نہیں سمجھتے کہ اس نے ہمیں نشہ دیا؟"

ڈون نے اس کی جانب دیکھا اور بولا۔ "وہ ایسا کیوں کرے گی ڈارلنگ اور تمہیں ایسی احمقانہ باتوں سے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔"

"احمقانہ۔" وہ تعجب سے بولی۔ "میں تو سمجھتی تھی کہ تم جادو ٹونے اور جن بھوتوں پر یقین رکھتے ہو اور دیگر مذاہب یا رسومات کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے بہت پرجوش ہو جاتے ہو۔"

جولی نے محسوس کیا کہ اس بار ڈون نے قہقہہ نہیں لگایا۔ اس نے اپنی نظریں سامنے سڑک پر جمائی ہوئی تھیں لیکن وہ دیکھ سکتی تھی کہ کار کا ائرکنڈیشنر چلنے کے باوجود ڈون کی پیشانی اور گردن سے پسینا بہہ رہا تھا اور اسٹیئرنگ پر رکھے ہاتھ لرز رہے تھے۔

اس وقت وہ جزیروں کے اس حصے میں تھے جو یووونی کہلاتا تھا۔ یہ جگہ ساحل پر بنے ہوئے ہوٹلوں سے بہت دور تھی۔ جولی نے ڈیش بورڈ پر لگی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا۔ ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ انہوں نے لنچ کے بعد سے اب تک کچھ نہیں کھایا تھا۔

"مجھے بھوک لگ رہی ہے، ہمیں کچھ کھا لینا چاہیے۔"

اس نے ایک ریسٹورنٹ کا انتخاب کیا جو لائبریری سے زیادہ دور نہیں تھا۔ جزیرے کا موسم گرم تھا جس کا اندازہ انہیں پارکنگ لاٹ سے ریسٹورنٹ تک آتے ہوئے ہو گیا تھا تاہم وہ یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی کہ ڈون بری طرح پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ چہرہ سرخ اور سانس پھول رہی تھی۔

صاف لگ رہا تھا کہ اس بوڑھی عورت مرینہ سے ملنے کے بعد وہ پریشان ہو گیا تھا۔

وہ داخلی دروازے سے کافی دور ایک الگ تھلگ کونے میں جا کر بیٹھ گئے۔ جولی نے نظریں گھما کر گاہکوں سے بھرے ہوئے ہال کا جائزہ لیا۔ دیواروں پر خوب صورت تصاویر آویزاں تھیں اور مہاگنی کی میزوں پر سیٹن

کے پوش پڑے ہوئے تھے۔ سب سے اچھی بات یہ کہ ہال کا ائرکنڈیشنر خوب ٹھنڈک دے رہا تھا۔ مستعد اور چاق و چوبند ویٹرس نے فوراً ہی ان کی میز پر مشروبات لاکر رکھ دیے۔ اب ڈون کی حالت قدرے بہتر نظر آرہی تھی لیکن جولی نے نوٹ کیا کہ ڈون نے اپنا گلاس فوراً ہی خالی کرلیا تھا۔ کھانے کے دوران وہ زیادہ تر خاموش رہے اور جولی کو بھی اچھا لگتا تھا۔ وہ اپنے گرد بیٹھے لوگوں کی باتیں سن رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اس گانے سے بھی لطف اندوز ہو رہی تھی جو ایک خوش شکل مقامی گلوکار کونے میں رکھے ہوئے پیانو پر گا رہا تھا۔

وہ یہ بات برسوں سے جانتی تھی کہ ڈون شراب پیتا ہے لیکن اس سے پہلے اس نے کبھی اس طرح پیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اور رچرڈ دونوں ایک ہی ہیلتھ کلب میں جایا کرتے تھے اور ہفتے میں دو بار ریکٹ بال بھی کھیلا کرتے تھے اور جب وہ درمیان میں آئی، اس وقت تک دونوں بہترین دوست بن چکے تھے۔ چھ سال پہلے جولی کی ملاقات رچرڈ ڈیکسٹر سے ہوئی جس کی پہلی بیوی مرچکی تھی۔ وہ پہلی نظر میں ہی ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے اور جب اس کی شادی رچرڈ سے ہوئی تو ڈون بھی اس کا دوست بن گیا۔

وہ جولی سے چار سال بڑا تھا۔ اس طرح اب اس کی عمر چھتیس برس ہو چکی تھی جبکہ گزشتہ چند ماہ سے بطور مصنف اس کا کیریئر زوال پذیر تھا۔ اس نے دس سال پہلے اپنا پہلا ناول لکھا جو پسند کیا گیا اور اس کی فروخت بہت اچھی رہی لیکن بعد میں لکھی جانے والی کتابوں کو پہلے کی طرح پذیرائی نہ مل سکی جس کی وجہ سے اسے ملنے والے معاوضے میں بھی کمی آگئی۔ یہ ایک طرح سے پبلشنگ کی صنعت کے زوال کی شروعات تھی اور اس صورت حال میں غیر معمولی ناول ہی کامیاب ہوسکتے تھے۔

اس دوران ڈون نے ان لوگوں سے اس حد تک مراسم بڑھالیے کہ وہ ایک طرح سے ان کے گھر کا فرد بن گیا۔ ہر اہم تقریب اور موقع پر اس کی موجودگی ناگزیر سمجھی جاتی تھی۔ وہ ہمیشہ برج اور ریکٹ بال میں رچرڈ کا پارٹنر بنتا اور اپنے ناولوں کو مقررہ وقت میں مکمل کرنے کی خاطر ان کے مختلف گیسٹ روم میں قیام کرتا۔ وہ ان کے ساتھ لندن، پیرس، روم، ہانگ کانگ کا سفر کرتا۔ ویسے تو رچرڈ اس کے ساتھ بڑی عزت و احترام سے پیش آتا لیکن مذاق ہی مذاق میں جولی کو اس کا نام لے کر چھیڑتا رہتا تھا۔ جولی اور اس کے مرحوم شوہر کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ڈون لارسن، جولی میں دلچسپی لے رہا ہے۔

رچرڈ اس دنیا سے جاچکا تھا اور اب ڈون اس کی غمزدہ بیوہ کو اپنے ساتھ ریسرچ کے لیے ورجن آئی لینڈ لے آیا تھا۔ اس نے جولی سے اصرار کیا کہ اس سفر پر جتنے بھی اخراجات ہوں گے، وہ ادا کرے گا۔ فی الوقت تو ہوائی جہاز کے ٹکٹ سے لے کر ہوٹل، کرائے کی کار اور یہاں تک کہ اس ڈنر کی ادائیگی بھی وہی کررہی تھی۔ اس نے جولی سے شادی کرنے کی خواہش کا بھی اظہار کیا تھا لیکن اس نے یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ وہ اس پر غور کرے گی اور ساتھ ہی یہ بھی واضح کردیا کہ اسے اس سلسلے میں کچھ وقت درکار ہے۔

اب وہ ڈنر کرتے ہوئے اس شخص کے بارے میں سوچ رہی تھی جو کبھی اس کے شوہر کا دوست تھا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ کبھی اس سے شادی کرسکے گی۔ اس کا زوال پذیر کیریئر اور بڑھتی ہوئی شراب نوشی نے اسے ایک ایسا غیر مطمئن اور موڈی شخص بنادیا تھا جس کا ساتھ کسی عورت کے لیے خوشگوار نہیں ہوسکتا اور یہی وہ شخص تھا جس نے آخری بار رچرڈ کو زندہ دیکھا تھا۔ اس روز وہ رچرڈ کے ساتھ اس کے پام بیچ والے گھر میں موجود تھا اور دونوں شراب نوشی کررہے تھے۔

اس نے بل کی ادائیگی کے لیے ویٹر کو اپنا کریڈٹ کارڈ دیا تھا اور اس کی واپسی کا انتظار کررہی تھی۔ اچانک اس کی نگاہ ڈون کے عقب میں کھڑے ایک شخص پر گئی جو ریسٹوران کے آخری سرے پر داخلی دروازے کے نزدیک نظر آرہا تھا۔ لمبا قد، چاندی جیسے بال، دھاریوں والا سوٹ اور نیلی ٹائی جس پر سفید ستارے چمک رہے تھے۔ وہ ہوبہو رچرڈ تھا اور اپنی بنفشی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ جولی نے اسے دیکھا اور ہانپنے لگی۔

''کیا ہوا؟'' ڈون نے اپنے پسندیدہ مشروب کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''کچھ گڑبڑ ہے؟''

''اوہ خدایا۔'' وہ سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔ ''وہ دیکھو رچرڈ۔''

ڈون نے پیچھے مڑکر دیکھا اور جولی نے محسوس کیا کہ اس شخص پر نظر پڑتے ہی ڈون کی کمر میں سختی آگئی۔ وہ کافی دیر تک اسے دیکھتا رہا اور جب جولی کی طرف مڑا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل چکی تھیں۔ اس کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ ''یہ کیا مصیبت ہے؟''

عین اسی وقت ویٹر، جولی کا کریڈٹ کارڈ اور ادائیگی کی رسید لے کر آگیا۔ وہ اس طرح کھڑا ہوا تھا کہ انہیں ہال کا بقیہ حصہ اور داخلی دروازہ نظر نہیں آرہا تھا اور جب ویٹر وہاں

سے ہٹا تو وہ شخص جا چکا تھا۔ جولی نے ڈون کی ہلکی سی چیخ سنی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا، ورمیزوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا داخلی دروازے کی جانب لپکا۔ جولی نے بھی جلدی سے اپنا پرس اٹھایا اور اس کے پیچھے چل دی۔ وہاں بیٹھے ہوئے لوگ حیرت سے انہیں دیکھنے لگے۔

جولی ریستوران کے خنک ماحول سے نکل کر گرم مرطوب گلی میں آئی اور اندھیرے میں دائیں بائیں جھانکنے لگی۔ ادھر ڈون اپنی کار کی مخالف سمت گلی میں دوڑ رہا تھا اور اس کا رخ مرکزی سڑک کی جانب تھا۔ رات کے سناٹے میں اس کے بھاری قدموں کی آواز پوری گلی میں گونج رہی تھی۔ وہ اس کے پیچھے بھاگی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اس نے اونچی ایڑی والے جوتے نہیں پہن رکھے تھے۔

"ڈون۔" اس نے عقب سے اسے پکارا لیکن اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ بالآخر وہ گلی اور مرکزی سڑک کے سنگم پر اس تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی۔ وہ فٹ پاتھ پر کھڑا سڑک کے دونوں جانب دیکھ رہا تھا۔ مرکزی سڑک پر بھی بہت زیادہ روشنی نہیں تھی اور تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ پوری سڑک تاریکی اور سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی پھر انہیں اپنے بائیں جانب کسی کے دور جاتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ ڈون نے اس کا تعاقب کیا اور جولی بھی اس کے پیچھے چل دی۔

انہوں نے اسے ایک بلاک کے فاصلے پر ایک اسٹریٹ لیمپ کے نیچے سے گزرتے دیکھا۔ وہ مارکیٹ اسکوائر کی جانب بڑھ رہا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا اوپن ائر پلازا تھا جسے وہ گزشتہ روز لائبریری جاتے ہوئے دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے تیزی سے سڑک پار کی اور مخالف سمت کی فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ مارکیٹ اسکوائر سے گزرنے کے بعد وہ ایک تاریک گلی میں داخل ہوگیا اور اس کے قدموں کی آواز آہستہ آہستہ معدوم ہوتی چلی گئی۔ یوں لگا جیسے وہ شخص چلتے چلتے غائب ہوگیا ہو۔ ڈون نے آگے کی جانب چھلانگ لگائی۔ جولی بھی اس کا ساتھ دینے کی کوشش کرتی رہی۔ وہ اس جگہ تک پہنچ گئے جہاں آخری بار وہ شخص انہیں نظر آیا تھا۔ وہ ایک بڑی عمارت کے سامنے رک گئے۔ جولی نے اس کے بند دروازوں اور کھڑکیوں اور صلیب کے نشان کی طرف دیکھا اور بولی۔

"سینٹ پیٹر اور پال۔" اس نے بہ آواز بلند عمارت کی پیشانی پر لکھی ہوئی عبارت پڑھی اور بولی۔ "ڈون! یہ ایک گرجا ہے کیتھولک چرچ۔ میرا خیال ہے کہ وہ اندر گیا ہے۔"

"مجھے تو یہ مقفل نظر آرہا ہے۔" ڈون نے اپنی سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"کیا گرجا میں بھی تالا لگایا جاتا ہے؟" جولی نے پوچھا۔ "میں سمجھتی ہوں کہ یہ ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ دو تین سیڑھیاں اوپر گئی اور بند دروازوں کو دیکھنے لگی۔

"اب ایسا نہیں ہوتا۔" ڈون بولا۔ "ویسے بھی یہ ہمیں کس طرح معلوم ہوگا کہ وہ اندر گیا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ وہ اس وقت گرجا میں کیوں جائے گا؟"

جولی اس کی طرف مڑی اور اسے گھورتے ہوئے بولی۔ "رچرڈ بھی کیتھولک تھا۔"

"وہ رچرڈ نہیں تھا۔" ڈون چلاتے ہوئے بولا۔ "وہ رچرڈ سے ملتا جلتا کوئی شخص ہے۔"

جولی مسکرائے بغیر نہ رہ سکی اور بولی۔ "پھر ہم اس کا تعاقب کیوں کر رہے ہیں؟"

ڈون نے اسے گھورا اور اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔ "اب ہمیں چلنا چاہیے۔ میں نہیں سمجھتا کہ شہر کا یہ حصہ رات میں بھوت پریت کے حوالے سے محفوظ ہے۔ ہمیں یہاں سے فوراً نکل جانا چاہیے۔"

"یہ کیا پاگل پن ہے؟" جولی چلاتے ہوئے بولی۔ "ڈون! تم احمقانہ باتیں کر رہے ہو۔ بھوتوں کا کوئی وجود نہیں۔ یہ سب کہانیاں ہیں۔"

ڈون نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "بہت سے لوگ ان چیزوں کے وجود پر یقین رکھتے ہیں۔"

جولی نے نہ ماننے والے انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ "سمجھدار لوگ ان پر یقین نہیں کرتے۔"

"اب میں پاگل ہو جاؤں گا جولی۔ تم نے اسے دیکھا ہے، خدا کے واسطے بتاؤ کہ کیا تم اپنے شوہر کو بھی نہیں پہچانتیں؟"

وہ دونوں گیسٹ ہاؤس کے دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ جولی نے کہا۔ "اپنی آواز نیچی رکھو ورنہ دوسرے لوگ جاگ جائیں گے۔"

"کیا ہم رٹز کارلٹن میں نہیں ٹھہر سکتے تھے؟" ڈون نے جھلاتے ہوئے کہا۔

جولی نے اس پر طنز کرتے ہوئے کہا۔ "تمہاری جیب میں پیسے نہیں لیکن شوق مہنگے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ مجھے ایسی جگہیں پسند نہیں جہاں سیاحوں کا جمگھٹا ہو۔ اس کے بجائے میں یہاں قیام کرنا پسند کروں گی۔"

اس گیسٹ ہاؤس کی مالکن میگی نیویارک میں جولی کی کلاس فیلو ہوا کرتی تھی اور اسے اپنے مہمانوں کا بہت خیال

رہتا تھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" ڈون نے بحالتِ مجبوری اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں ابھی تک یہ نہیں جان پایا کہ وہ شخص کون تھا؟"

"تم کچھ دیر پہلے خود ہی کہہ چکے ہو کہ وہ رچرڈ سے ملتا جلتا کوئی آدمی تھا۔ اس نے بی ریستوران میں کھانا کھایا جہاں ہم بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے بعد وہ وہاں سے چل دیا۔"

"اس کے کپڑوں کے بارے میں کیا کہو گی؟" ڈون نے اپنی بات پر اصرار کرتے ہوئے کہا۔

"سرمئی دھاری دار سوٹ اور اس کی پسندیدہ نیلی ٹائی جس پر سفید ستارے بنے ہوئے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہم نے رچرڈ کو انہی کپڑوں میں دفن کیا تھا۔"

جولی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس طرح کے سوٹ عام ہیں اور وہ ٹائی میں نے سیل میں خریدی تھی۔ اس طرح کی ہزاروں ٹائیاں بازار میں مل جائیں گی۔"

ڈون اب بھی قائل نہیں ہوا اور کہنے لگا۔ "تمہیں یاد ہے مرینہ نے کیا کہا تھا کہ اس کی چائے پینے کے بعد ہم... بدروحوں کو دیکھ سکیں گے۔ اس بارے میں کیا کہو گی؟"

"اوہ ڈون! تم جس طرح کی باتیں کررہے ہو انہیں سن کر تو لگتا ہے کہ کچھ دیر بعد تمہیں گلابی ہاتھی بھی نظر آنے لگیں گے۔"

"شکریہ جولی! شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔"

جولی کو اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔ وہ اس کے پاس آئی اور بازو تھپتھپاتے ہوئے بولی۔ "ناراض مت ہو ڈیئر اور دیر تک مت جاگنا۔ تمہیں کل صبح دوبارہ لائبریری جانا ہے۔ اس کے بعد ہم ساحل پر جائیں گے، شب بخیر۔"

جب وہ گیسٹ ہاؤس کے اندر جانے لگی تو اس نے ڈون کو بڑبڑاتے ہوئے سنا۔ "آئی لو یو۔"

وہ بستر پر لیٹی چھت پر لگے پنکھے کو دیکھ رہی تھی جب اس نے ڈون کے قدموں کی آواز سنی جو اپنے بیڈروم کی طرف جارہا تھا۔ جولی کو اس وقت اپنا شوہر بہت یاد آرہا تھا۔ روزانہ رات کو بستر پر لیٹتے وقت اس کی یہی کیفیت ہوتی تھی لیکن اس وقت وہ ڈون کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اسے اس بات کی حیرانی تھی کہ پام بیچ پر ہونے والے حادثے کے بعد ڈون کی عجیب وغریب کیفیت ہوگئی تھی۔ وہ پریشان رہنے لگا تھا اور اس کی شراب نوشی میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ اس لیے جب ڈون نے اسے اپنے نئے ناول کے بارے میں بتایا تو وہ اس کا ساتھ دینے پر تیار ہوگئی۔ اس نے اس سفر کا انتظام کیا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے اپنی پرانی دوست میگی کو فون کیا اور اس کے ساتھ ہی یونیورسٹی کے پروفیسر بل لینگ کو بھی ڈون کی آمد کے بارے میں بتادیا جو ہارورڈ میں رچرڈ کا روم میٹ تھا۔ جب اس نے ڈون کو بتایا کہ یہ ٹور اس کی جانب سے کرسمس کا تحفہ ہے تو وہ بہت خوش ہوا اور اس نے اصرار کیا کہ جولی بھی اس کے ساتھ چلے۔ وہ خود بھی چند دنوں کے لیے نیویارک سے باہر جانا چاہ رہی تھی تاکہ اپنے شوہر کی موت کا غم بھلا سکے لہٰذا اس نے رضامندی ظاہر کردی۔

ڈون کے بارے میں سوچنا شروع کیا تو اس کی شخصیت کا ایک اور پہلو سامنے آیا۔ وہ ہر وقت اپنے گلے میں صلیب لٹکائے رہتا تھا اور روزانہ اخبار میں قسمت کا حال پڑھتا تھا۔ وہ انتہائی وہمی ہونے کے ساتھ ساتھ جن بھوتوں، چڑیلوں اور بدروحوں کا بھی قائل تھا۔ شاید اسی لیے خوشبودار چائے کا پیالہ پینے اور رچرڈ سے ملتے جلتے شخص کی ایک جھلک دیکھ لینے کے بعد اس کی حالت غیر ہوگئی تھی اور وہ اسے بھی رچرڈ کا بھوت سمجھ بیٹھا تھا۔

اگلی سہ پہر وہ شخص ساحل پر دوبارہ نظر آیا لیکن جولی نے اس کے بارے میں ڈون کو نہیں بتایا کیونکہ اسے شک تھا کہ اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ خوشگوار موسم اور ساحل کے دلفریب نظارے بھی اس کا موڈ بحال نہ کرسکے لیکن اس نے جولی کے چہرے کے تاثرات بھانپ لیے اور پیچھے مڑ کر دیکھا اور اس کے تعاقب میں دوڑ لگادی۔ جولی بھی اس کے پیچھے تھی۔

وہ جب ساحل پر پہنچے تو آسمان پر چھائے گہرے بادلوں کو دیکھ کر جولی کو خیال آیا کہ کسی وقت بھی بارش ہوسکتی ہے۔ انہوں نے ریت پر کمبل بچھائے اور سمندر میں نہانے لگے۔ کچھ دیر بعد ڈون قریبی اسنیک بار سے کھانے کا سامان اور کوک کی بوتلیں لے کر آگیا۔ کھانے کے دوران جولی نے اس سے پوچھا۔ "تمہاری ریسرچ کیسی جارہی ہے؟ کیا تمہیں اپنے ناول کے لیے مطلوبہ مواد مل گیا؟"

اس نے کندھے اچکائے اور بولا۔ "ہاں، میں ایک ایسے شخص کے بارے میں معلومات حاصل کرچکا ہوں جو یہاں کے قدیم لوگوں کو جرائم پر اکساتا تھا اور انہیں اپنے دشمنوں کو قتل کرنے کے لیے استعمال کرتا تھا لیکن اب مجھے اس میں کوئی دلچسپی نظر نہیں آرہی۔"

"کیوں؟" جولی بولی۔ "یہ تو بہت زبردست آئیڈیا ہے۔"

"میں نہیں جانتا۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "اب

میں سوچ رہا ہوں کہ شاید یہاں کچھ حقیقی پراسرار واقعات بھی ہوتے ہیں مثلاً جن بھوت یا بدروحوں سے متعلق۔''

''یہ بھی اچھا آئیڈیا ہے۔'' وہ اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے بولی۔

ڈون نے ایک بار پھر کندھے اچکائے اور کمبل پر لیٹتے ہوئے بولا۔''سچ تو یہ ہے کہ میں اس کام سے اکتا گیا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ لکھنا چھوڑ دوں۔''

جولی نے مزید گفتگو کرنا مناسب نہ سمجھا اور ساحل پر ٹہلنے لگی۔ ایک گھنٹے بعد اس کی واپسی ہوئی اور وہ چلنے کی تیاری کرنے لگے کیونکہ بارش کسی وقت بھی شروع ہوسکتی تھی۔ انہوں نے لباس تبدیل کیے۔ ڈون کمبل لپیٹ رہا تھا جب جولی نے اس کے عقب میں اسی طویل قامت سرمئی سوٹ میں ملبوس شخص کو دیکھا جو جنگل کے کنارے کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔ ڈون نے جولی کی آنکھوں میں حیرت کی پرچھائیں دیکھیں تو فوراً پلٹا اور اس آدمی پر نظر پڑتے ہی اس کی جانب بھاگنے لگا لیکن اس کے وہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ شخص جنگل میں غائب ہوگیا۔ اب وہ ڈون کو نظر نہیں آرہا تھا۔ ڈون بھی اس کے تعاقب میں آگے بڑھتا رہا۔ عین اسی وقت بارش شروع ہوگئی۔ جولی نے جلدی جلدی سامان سمیٹا اور ڈون کو بلانے چل دی۔ جنگل تک پہنچتے پہنچتے وہ بری طرح بھیگ چکی تھی۔

''ڈون۔'' اس نے پوری قوت سے آواز لگائی لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ البتہ اسے ڈون کی آواز ضرور سنائی دی جو چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ ''کتیا کی اولاد۔ اپنا چہرہ دکھاؤ۔'' وہ اس آواز کی سمت میں پام کے درختوں کے درمیان چلتی رہی۔ کچھ فاصلے پر اسے ڈون نظر آگیا۔ وہ درختوں کے جھنڈ کے درمیان تنہا کھڑا زور زور سے سانس لے رہا تھا۔ جب وہ اس کے قریب پہنچی تو سر ہلاتے ہوئے بولا۔''وہ پھر بھاگ گیا۔''

جولی نے ادھر ادھر دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا کہ وہاں کوئی نہیں تھا۔ سب لوگ بارش شروع ہوتے ہی چلے گئے تھے ورنہ ان کا تماشا بن جاتا۔ اس نے ڈون کا بازو پکڑا اور بولی۔''چلو۔''

پارکنگ لاٹ کی طرف جاتے ہوئے ڈون نے جیب سے اپنا سیل فون نکالا اور جولی سے پوچھا۔ ''تمہارے پاس مرینہ کا نمبر ہے؟ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ ابھی اور اسی وقت۔''

''پروفیسر لینگ نے اس ملاقات کا اہتمام کیا تھا۔ میں نہیں سمجھتی کہ اس کے پاس فون ہے۔ وہاں تو بجلی بھی نہیں ہے۔''

ڈون نے اس کے ہاتھ سے کار کی چابی چھین لی اور بولا۔ ''پھر ایک ہی حل ہے، ہمیں اس کے پاس دوبارہ جانا ہوگا۔''

☆☆☆

مرینہ نے ایک بار پھر ان کی تواضع چائے سے کی لیکن اس مرتبہ جولی نے چائے نہیں پی البتہ ڈون نے اس بار بھی کوئی تکلف نہیں کیا اور مزے لے لے کر چائے پیتا رہا۔ جب اس کی پیالی ختم ہوگئی تو وہ بولا۔'' میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس وقت وہ کہاں ہے؟''

مرینہ بڑی دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے ان دونوں کے آنے پر کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ اس نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔'' میں جانتی تھی کہ تم واپس آرہے ہو۔'' اس کی پوتی ان کے لیے صاف سفید تولیے لے کر آئی تھی تاکہ وہ اپنا بدن اور چہرہ خشک کرسکیں۔

''وہ آج یہاں نہیں ہے۔'' مرینہ نے کہا۔'' میں نے حصار کھینچ دیا ہے۔ اس لیے وہ میرے گھر میں داخل نہیں ہوسکتا لیکن یہ بتاؤ کہ تم دونوں میں سے کس نے پہلے اسے دیکھا؟''

''میں نے۔'' جولی نے کہا۔''گزشتہ شب ریستوران میں اور آج بھی ساحل پر میں نے ہی اسے پہلے دیکھا۔ دونوں بار وہ مجھے ڈون کے عقب میں نظر آیا۔''

''گزشتہ شب وہ چرچ میں گیا تھا؟''

جولی اور ڈون ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔''ہمارا یہی خیال ہے۔'' ڈون نے کہا۔

''اور آج وہ درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوگیا؟''

''ہاں۔''

مرینہ نے ہاتھ اٹھا کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور آنکھیں بند کرکے منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگی۔ وہ دونوں خاموش بیٹھے انتظار کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور بولی۔

''چرچ ایک مقدس جگہ ہے اسی لیے وہاں جانے کے بعد وہ کسی کو نظر نہیں آیا۔ وہ صرف اس شخص کا پیچھا کررہا ہے جس کی اسے تلاش ہے۔ اسی لیے وہ اس کے پیچھے کھڑا ہوا نظر آتا ہے اور جیسے ہی وہ شخص پیچھے مڑ کر دیکھے تو وہ چل دیتا ہے اور وہ شخص یقیناً ڈون ہی ہے۔''

وہ دونوں حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ ڈون اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس چھوٹے سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔

جولی نے کہا۔''وہ ڈون کو بتاتا کیوں نہیں کہ کیا چاہتا ہے؟''

بوڑھی عورت ڈون کو کمرے میں ٹہلتے ہوئے دیکھ

رہی تھی۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''شاید اس کا خیال ہے کہ ڈون پہلے سے جانتا ہے۔''

''نہیں۔'' ڈون چلایا۔ ''میں کچھ نہیں جانتا۔''

''ڈون! بیٹھ جاؤ۔'' جولی نے کہا تو وہ بیٹھ گیا۔ سیلینا پردے کے پیچھے سے چائے کی کیتلی لیے ہوئے برآمد ہوئی اور اس نے ان کی پیالیاں دوبارہ بھر دیں۔ ڈون نے دوبارہ چائے پینی شروع کر دی لیکن جولی نے اس مرتبہ بھی اسے ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ اپنی میزبان سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''کیا کوئی ایسا طریقہ ہے کہ رچرڈ میرا مطلب ہے کہ وہ بھوت اپنی بات ڈون تک پہنچا سکے۔ اگر وہ اس سے براہ راست بات نہیں کر سکتا تو اسے پیغام ہی بھیج دے۔''

مرینہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''دو باتیں ہو سکتی ہیں یا تو وہ کوئی پیغام چھوڑ دے یا اپنی کوئی نشانی۔''

''نشانی؟'' ڈون نے پوچھا۔

''ہاں، کوئی ایسی چیز جس سے اس کے وجود کا پتا چل سکے۔''

جولی آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ ''تم نے نشانی دینے کی نہیں بلکہ چھوڑنے کی بات کی ہے۔ ایسی کون سی جگہ ہے جہاں وہ یہ نشانی چھوڑ سکتا ہے؟''

بوڑھی عورت نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ''وہ جگہ جہاں ڈون سوتا ہے۔''

ڈون اور جولی نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ڈون نے چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگائی اور ایک گھونٹ لینے کے بعد بولا۔ ''ٹھیک ہے، ہم بہت جلد نیویارک واپس جا رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہاں پہنچ کر مجھے پیغام مل جائے۔''

وہ آگے کی طرف جھکا اور اس نے مرینہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں سے لگایا پھر اس نے جولی کو کھڑا ہونے میں مدد دی اور وہ دونوں دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ ڈون نے گرم جوش مسکراہٹ کے ساتھ مرینہ کو دیکھا۔ جولی نے بھی اس کی تقلید کی۔ مرینہ اپنی جگہ پر بیٹھی رہی۔ اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''مجھے امید ہے کہ تمہاری تلاش جلد ختم ہو جائے گی۔''

واپسی کے سفر میں ڈون پاگلوں کی طرح گاڑی چلا رہا تھا۔ جولی نے کہا۔ ''گاڑی آہستہ چلاؤ ورنہ کوئی حادثہ ہو سکتا ہے۔'' اس نے ونڈ شیلڈ سے جھانکتے ہوئے کہا۔ باہر اب بھی بارش ہو رہی تھی۔ وہ مضطرب لہجے میں بولی۔ ''تمہیں اتنی جلدی کیوں ہے؟''

ڈون نے گاڑی کی رفتار آہستہ کر دی اور بولا۔ ''ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔ ہمیں آج رات ہی آخری پرواز سے نکل جانا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے۔'' جولی نے کہا۔ وہ اس سے بحث نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ ''شاید ہم نے یہاں آ کر غلطی کی۔''

وہ تلخ انداز میں ہنستے ہوئے بولا۔ ''ائر لائن کو فون کر کے سیٹیں بک کروا لو۔''

جولی نے سیل فون پر ائر لائن کا نمبر ملایا اور جب اس نے بات ختم کی تو ڈون کار پارک کر رہا تھا۔

جولی نے کہا۔ ''ہمیں نو بجے والی پرواز میں دو سیٹیں مل گئی ہیں لیکن تمہاری ریسرچ کا کیا ہوگا؟''

''مجھے اس کی پروا نہیں۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

وہ کار سے اتر کر بارش میں بھیگتے ہوئے پورچ تک آئے اور ایک چھوٹی سی لابی میں رک گئے۔ میگی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی اور نہ ہی کوئی دوسرا مہمان موجود تھا۔ گیسٹ ہاؤس کے ملازمین گھروں کو جا چکے تھے۔ وہاں بالکل خاموشی تھی۔

''سب لوگ کہاں ہیں؟'' ڈون نے کہا۔

''وہ باہر گئے ہوئے ہوں گے۔'' جولی نے اپنے بالوں سے پانی جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''میگی ان سب کو ڈنر پر لے گئی ہے۔ تمہیں یاد نہیں کہ اس نے ہمیں بھی دعوت دی تھی۔''

اس نے کندھے اچکائے اور بولا۔ ''تم اس کے لیے ایک خط چھوڑ دو کیونکہ ہم ان کے آنے سے بہت پہلے چلے جائیں گے۔'' یہ کہہ کر اس نے لاؤنج میں جا کر اسکاچ کی بوتل اٹھائی اور اپنے لیے گلاس بھرنے لگا۔ جولی نے ایک بار پھر اسے تنبیہ کی کہ زیادہ شراب نوشی اس کے لیے نقصان دہ ہے لیکن وہ شراب پیتا اور لاؤنج میں ٹہلتا رہا۔ دو گلاس ختم کرنے کے بعد وہ بولا۔

''اب ہمیں تیاری کر لینی چاہیے۔''

وہ دونوں سیڑھیاں چڑھ کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ جولی نے کمرے کی لائٹ جلائی اور اپنا پرس بستر پر پھینکا اور دیوار پر لگے ہوئے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے لگی۔ تبھی اسے ایک چیخ سنائی دی۔

''جولی!''

اس نے آنکھیں بند کر کے گہری سانس لی اور دوسرے کمرے کی طرف بھاگی۔ ڈون اپنے کمرے کے وسط میں کھڑا تھا اور اس کی نظریں چھت پر لگے ہوئے پنکھے پر تھیں جس کے ایک پر کے ساتھ نیلے رنگ کی ٹائی لٹکی ہوئی

تھی جس پر سفید ستارے بنے ہوئے تھے۔ ڈون کی پشت اس کی جانب تھی۔ ڈون آہستہ آہستہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ وہ گھوم کر اس کے سامنے آئی اور خود بھی جھک کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔

''ڈون! کیا ہوا، تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟''

اس نے پنکھے کی طرف اشارہ کیا۔ جولی کی نظریں اس جانب گئیں پھر وہ بولی۔ ''تم کیوں چلا رہے تھے اور کس چیز کی طرف اشارہ کر رہے ہو؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

ڈون نے پنکھے سے نظریں ہٹا کر جولی کو دیکھا اور بولا۔ ''تم نے کچھ نہیں دیکھا؟''

''کیا نہیں دیکھا؟ ڈون! تم مجھے ہوش میں نہیں لگ رہے۔''

''ٹائی۔'' اس نے دوبارہ پنکھے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''رچرڈ کی ٹائی۔''

''ڈون! میری طرف دیکھو۔'' جولی نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''تم اس وقت ایک بچے کے مانند لگ رہے ہو......''

اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی ڈون کی چیخ ابھری۔ اس نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا اور فرش پر بیٹھے بیٹھے ہی جولی کو دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں جولی کے عقب میں دیوار پر لگے ہوئے آئینے پر تھیں۔

''اوہ خدایا۔'' وہ ایک بار پھر چلایا۔ ''مجھے بہت افسوس ہے۔''

جولی نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ آئینے پر بڑے بڑے سرخ حروف میں لکھا ہوا تھا۔ ''اسے بتا دو۔''

جولی نے دوبارہ ڈون کے چہرے پر نظریں جما دیں اور تجسس بھرے لہجے میں بولی۔ ''تم کیا دیکھ رہے ہو؟''

''کیا تم نے کچھ نہیں دیکھا؟'' ڈون نے ایک لمبا سانس لیتے ہوئے کہا۔

''کیا؟''

ڈون نے ایک بار پھر ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ جولی بہ مشکل اس کے الفاظ سن سکی تھی۔

''تم نہیں دیکھ سکتیں کیونکہ تم نے آج وہ چائے نہیں پی۔ آئینے پر لکھا ہے سے بتا دو۔ وہ چاہتا ہے کہ میں تمہیں اصل بات بتا دوں۔ اسی لیے وہ میرا پیچھا کر رہا ہے اور جب تک میں تمہیں نہیں بتاؤں گا، وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔''

اب اس نے اپنے ہاتھ چہرے سے ہٹائے پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ جولی کے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ اسے ڈون کی حالت پر ترس آنے لگا۔ اچانک اس کی نظر دروازے پر گئی، وہاں وہی شخص کھڑا ہوا تھا۔ چاندی جیسے بال، بنفشی آنکھیں اور دھاریوں والا سرمئی سوٹ لیکن اس کے گلے میں ٹائی نہیں تھی پھر اس نے ڈون کو دیکھا جو اس کے قدموں کے پاس بیٹھا سسکیاں لے رہا تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل جھکی اور ایک بار پھر اس کے بازوؤں پر اپنے ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

''تم کیا بتانا چاہ رہے ہو؟''

''میں نے اسے مارا ہے۔'' وہ فریادی لہجے میں بولا۔ ''میں نے ہی اسے سیڑھیوں سے دھکا دیا تھا۔ پہلے اسے شراب پلائی تاکہ اس کا سیڑھیوں سے گرنا ایک حادثہ معلوم ہو۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اسی لیے رچرڈ کا وجود میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ اس کے پاس وہ سب کچھ تھا جو میں چاہتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس سے چھٹکارا حاصل کر کے تم سے شادی کر لوں۔ اس طرح اس کی تمام دولت مجھے مل جاتی۔ میں اس سے نفرت کرتا تھا اسی لیے مار دیا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور ہمیشہ کرتا رہوں گا۔''

بالآخر اس نے اعتراف کر ہی لیا۔ جولی نے اس کے بازوؤں سے اپنے ہاتھ ہٹائے اور کھڑی ہو کر اپنے آنسو پونچھنے لگی۔ اس نے اپنے دوست کو دیکھا جو اس کے شوہر کا بھی دوست تھا پھر اس نے دروازے میں کھڑے ہوئے شخص کو دیکھا اور سر ہلا دیا۔

پام بیچ پولیس ڈپارٹمنٹ کا سراغ رساں جان ریلے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے مرینہ کی خوب صورت پوتی ورجن آئی لینڈ کی سراغ رساں سیلینا ہیرس بھی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وردی میں ملبوس دو پولیس والے بھی اندر آگئے۔ سیلینا نے ڈون کو گرفتار کرنے کا حکم دیا اور پولیس والوں نے اسے ہتھکڑیاں پہنا دیں۔ ان کے ساتھ جاتے ہوئے بھی وہ سسکیاں لے رہا تھا۔ سیلینا بھی ان کے ہمراہ چلی گئی البتہ سراغ رساں ریلے وہیں رک گیا۔ وہ جولی کو اپنے ساتھ نیچے لاؤنج میں لے کر آیا اور اسے ایک کرسی پر بٹھا کر اس کے لیے برانڈی کا گلاس بھرنے لگا۔

جولی نے اس کی جانب دیکھا اور بولی۔ ''میں نے اپنی زندگی میں اس سے ہولناک کام کبھی نہیں کیا۔''

''لیکن یہ تمہارا ہی منصوبہ تھا۔''

''ہاں، صرف اس لیے کہ تم ہو بہو رچرڈ جیسے ہو۔'' جولی نے کہا۔ ''میں نے تمہیں رچرڈ کی موت کی تفتیش کے دوران دیکھا تھا اور تمہاری بنفشی آنکھوں کو دیکھ کر خیال آیا کہ اگر تمہارے سر پر چاندی جیسے بال ہوں تو تم بالکل

میرے مرحوم شوہر کی طرح نظر آؤ گے اور بعد میں جب ڈون نے اپنی ریسرچ کے سلسلے میں یہاں آنے کا پروگرام بنایا تب میں نے یہ منصوبہ بنایا۔ میں جانتی تھی کہ وہ پراسرار باتوں پر یقین رکھتا ہے۔ اس نے رچرڈ کے گرنے کے بارے میں جو کہانی سنائی، اس پر مجھے یقین نہیں آیا تھا۔ رچرڈ کو چکر آیا کرتے تھے اس لیے وہ زینہ استعمال نہیں کرتا تھا۔ ڈون کو یہ بات یاد نہ رہی۔ اسی طرح وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ کیتھولک تھا۔ اس نے رچرڈ کو شراب پلائی اور جب اس پر پوری طرح نشہ غالب آ گیا تو اسے سیڑھیوں کے پاس لا کر دھکا دے دیا۔''

سراغ رساں اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور اپنے سر پر موجود مصنوعی بالوں کی وگ اتار دی اور بولا۔ ''اب تمہیں یقین آ جانا چاہیے کہ ہمارا کام ختم ہو گیا۔''

جولی نے تائید میں سر ہلایا اور بولی۔ ''اب اس کے ساتھ کیا ہو گا؟''

''پہلے میں پولیس اسٹیشن جاؤں گا جہاں اسے باضابطہ میری تحویل میں دیا جائے گا پھر ایک تقریر کر کے مقامی پولیس کا شکریہ ادا کروں گا کیونکہ ان کے تعاون کے بغیر یہ کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ خصوصاً اس کیس میں سیلینا کے کردار کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ میں آج رات ہی ڈون کو لے کر پام بیچ روانہ ہو جاؤں گا اور یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کا انجام کیا ہو گا کیونکہ وہ خود ہی اپنی زبان سے اس قتل کا اعتراف کر چکا ہے۔''

جولی نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اب تمہیں چلے جانا چاہیے۔''

''کیا تم یہاں تنہا رہ سکو گی؟'' سراغ رساں نے پوچھا۔

''ہاں۔'' وہ اسے یقین دلاتے ہوئے بولی۔ ''میری دوست اب آنے ہی والی ہو گی۔''

''شب بخیر مسز ہیکسٹر۔'' وہ لابی کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے تعاون کا شکریہ۔''

''اپنی ٹائی تو لیتے جاؤ۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔

اس کے جانے کے بعد وہ وہیں بیٹھی برانڈی کے گھونٹ پیتی رہی۔ ایک گھنٹے بعد وہی بوڑھی عورت لاؤنج میں داخل ہوئی اور اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اب اس نے قبا کلی چغہ اور ٹوپی کے بجائے عمدہ تراش کا لباس زیب تن کر رکھا تھا اور آنکھوں سے کنٹیکٹ لینس ہٹا دیے تھے اور وہ مقامی لہجے میں بات کر رہی تھی۔

''کھیل ختم ہو گیا۔'' مرینہ بولی۔ ''اب تم اپنی زندگی گزارنے کے لیے آزاد ہو۔''

''ہاں۔'' جولی نے اپنی آنکھیں صاف کیں اور مسکرا دی۔

''اب تم کہاں جاؤ گی؟'' مرینہ نے پوچھا۔

جولی سوچتے ہوئے بولی۔ ''مجھے نیویارک واپس جانا ہو گا لیکن سوچ رہی ہوں کہ کچھ عرصہ یہاں قیام کروں۔ یہ بہت ہی خوب صورت جزیرہ ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے، کل تم اور تمہاری دوست میگی میرے گھر ڈنر پر آ رہی ہو۔''

''اس جنگل میں؟'' جولی نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

مرینہ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولی۔ ''مائی ڈیئر، وہ کاٹیج میری خادمہ کا ہے البتہ اس نے ہمارے لیے اسے نئے سرے سے ترتیب دیا تھا۔''

جولی مسکراتے ہوئے بولی۔ ''میری طرف سے اس کا شکریہ ادا کر دینا اور تمہارا بھی شکریہ۔ میں تمہیں اس کا معاوضہ دینا چاہتی ہوں۔''

''بے وقوف لڑکی۔'' مرینہ بولی۔ ''اس کیس کی وجہ سے سیلینا کی ترقی ہو جائے گی، یہی میرا معاوضہ ہے۔''

''پروفیسر لینگ نے مجھے بتایا ہے کہ تم اداکارہ تھیں۔''

''اوہ، یہ بہت پرانی بات ہے۔ اس وقت تو شاید تم پیدا بھی نہیں ہوئی ہو گی۔ شادی کے بعد میں نے اداکاری ترک کر دی تھی اور شادی کے بعد میرے یہاں پانچ بچے ہوئے۔''

''گویا بچوں والی بات سچ تھی؟''

''ہاں۔''

''کیا وہ واقعی جادوئی چائے تھی؟'' جولی نے پوچھا۔

''ہاں۔ وہ بھی چائے ہے اور یہ صرف میں ان لوگوں کو پیش کرتی ہوں جو مجھے پسند آتے ہیں۔'' مرینہ نے اس بوڑھی عورت کا لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''اور تم بھی مجھے پسند آ گئی ہو۔''

''میں نہیں مانتی۔'' جولی نے کہا۔ ''جس طرح تم نے اس عورت کا سوانگ بھرا تھا ویسے ہی اس چائے کی حقیقت بھی کچھ اور ہے۔ سچ بتاؤ وہ کون سی چائے تھی؟''

مرینہ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولی۔ ''لپٹن!''

جولی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ سوچنے لگی کہ جادو چائے میں نہیں بلکہ مرینہ کی زبان میں تھا جس نے ڈون کو چکرا کر رکھ دیا۔

برعکس

کاشف زبیر

کہتے ہیں کہ دور سے دنیا کے تمام مکروفریب بڑے رنگین لگتے ہیں لیکن ساتھ رہ کر ذات کی سنگینی اس طرح پرت پرت کھُلتی ہے کہ انسان کسی کو جان لینے کے گمان میں یقین کی ہر حد کو پار کرلیتا ہے مگر... اُس پار جاکر بھی جب یہی یقین گماں میں بدلتا ہے تو اپنی ذات سے بھی اعتبار ختم ہوجاتا ہے۔ وہ جو اس کی ذات کا عکس تھا، جسے اپنی کوکھ، اپنی گود کے ستھرے پن پر فخر تھا کہ اچانک فخر کا وہ کانچ محل کرچی کرچی ہوگیا... زندگی لہو لہو، دل زخمی اور وہ آبلہ پائی پر مجبور ہوگئی... یہ کیسا عجب سنگم تھا ستم ظریفی اور اعلیٰ ظرفی کا... وقت گزرتا رہا اور کُل کائنات لُٹ جانے کے باوجود ایک خواب سراب اس کے تعاقب میں جذبوں کو مہمیز کرتا رہا حتیٰ کہ اس دھندلے عکس میں دھیرے دھیرے رنگ بھرتے گئے اور عکس در عکس ان مٹتے ہوئے نقوش میں اسے اپنی گم شدہ کائنات کا اشارہ ملتا چلا گیا۔

سچے موتیوں کی جھوٹی وفاداری کا پُرفریب منظر......ایک

ممتا کی ماری کا دلخراش احوال

نرم اور گرم کمبل میں لپٹا بچہ اپنی کھلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ گلابی رنگت اور بہت نازک سے نقوش تھے۔ پہلے وہ سنجیدہ رہا تھا پھر اس کے ہونٹ کھلے اور وہ مسکرانے لگا۔ اس مسکراہٹ نے رعنا کو اندر تک سرشار کردیا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں کے لرزتے آنسوؤں میں بیک وقت دکھ بھی تھا اور خوشی بھی۔ اس نے بچے کو سینے سے لگالیا اور رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ”میرا بیٹا ......میرا کامی......“

☆☆☆



رعنا نے کامی کے کمرے کا دروازہ کھولا تو اندر سے اس کا دل ٹوٹنے لگا۔ آج پورے ایک مہینے بعد اس نے یہ دروازہ کھولا تھا۔ یہی دروازہ وہ دن میں درجنوں بار کھولتی تھی مگر اس بار ایک مہینا ہو گیا تھا۔ پہلے ہوش نہیں تھا اور پھر ہمت نہیں تھی۔ ویسے تو اس گھر کے چپے چپے پر کامی کی خوشبو اور اس کا احساس موجود تھا مگر یہ تو اس کا کمرا تھا۔ یہاں اس کی خوشبو اور احساس کہیں زیادہ شدید تھا۔ اتنا شدید کہ دروازہ کھلنے پر رعنا بے اختیار اسے آواز دینے والی تھی مگر پھر اس حقیقت کی تلخی نے اس کی زبان کو چھولیا کہ کامی اب دنیا میں نہیں رہا تھا۔ آج سے ٹھیک ایک مہینا پہلے وہ اس دنیا سے جاچکا تھا۔ آنسوؤں کی نمی نے رخساروں سے پہلے اس کا حلق نمکین کر دیا۔ کامی کا کمرا ویسا ہی صاف ستھرا اور قرینے سے تھا جیسا اس کی زندگی میں ہوتا تھا۔ درحقیقت وہ اپنا کمرا خود صاف کر کے گیا تھا۔ وہ اس کا عادی تھا۔ حالانکہ رعنا تھی اور ماسی زرینہ بھی آتی تھی۔

اسے رعنا نے ہی تو یہ سب سکھایا تھا۔ وہ بچپن سے ذہین اور فرمانبردار تھا، رعنا اسے جو سکھاتی وہ فوراً سیکھ جاتا اور پھر اس پر من وعن عمل کرتا تھا۔ جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا، اس کا طرزِ عمل اس معاملے میں شدید ہوتا چلا گیا۔۔۔ کبھی کبھی رعنا بھی جھنجلا جاتی کہ وہ ایسا کیوں ہو گیا تھا۔ رعنا اسے ڈھنگ سے زندگی گزارنے کے لیے ڈسپلن سکھانا چاہتی تھی مگر اس نے ڈسپلن کو اپنی پوری زندگی پر طاری کر لیا تھا۔ رعنا نے اسے جلدی سونے کی تربیت دی اور وہ اس پر اتنی سختی سے عمل کرنے لگا کہ ٹھیک نو بجتے ہی اپنے کمرے کا رخ کرتا۔ چاہے موقع کوئی بھی ہو اور گھر میں کوئی آیا ہوا ہی کیوں نہ ہو۔ وہ صرف کمرے میں ہی نہیں جاتا بلکہ پندرہ منٹ بعد منہ ہاتھ دھوکر اور دانت برش کر کے۔ بستر پر لیٹ چکا ہوتا تھا۔ رعنا اسے گڈ نائٹ کہنے اور پیار کرنے جاتی تھی۔ اس کے ہونٹ کامی کے ماتھے سے الگ بھی نہیں ہوتے تھے کہ اس کی آنکھیں بند ہو جاتیں اور بعض اوقات تو رعنا کو شبہ ہوتا کہ وہ سو چکا ہے۔

وقت پر سونا اٹھنا، کھانا پینا، کام کرنا اور زندگی کے دوسرے معمولات پر عمل کرنا وہ چھ سات سال کی عمر میں سیکھ چکا تھا۔ اس کے بعد رعنا کو کبھی ضرورت پیش نہیں آئی کہ اسے کسی بات کے لیے ٹوکتی۔ ہاں کبھی کبھی اسے کہنا پڑتا تھا کہ وہ معمولات کو ذرا ایک طرف بھی رکھ دیا کرے مگر وہ بڑی سنجیدگی سے کہتا۔ ”ماما...... آپ نے ہی مجھے یہ سب سکھایا ہے تو اب مجھے کیوں منع کرتی ہیں؟“

رعنا کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں ہوتا تھا۔

شاید وہی انتہا پسند ہو گئی تھی۔ شاید جاوید کی اچانک جدائی نے اسے سہما دیا تھا۔ وہ پریشان ہو گئی تھی کہ اکیلے کیسے کامی کی پرورش کرے گی؟ وہ صرف بیس سال کی ناتجربہ کار لڑکی تھی۔ رشتوں کے لحاظ سے بھی ناتجربہ کار تھی، ہوش سنبھالنے کے بعد ماں کے سوا کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ ان کا کوئی رشتے دار تھا یا نہیں، میمونہ نے کبھی نہیں بتایا۔ بڑے ہونے پر جب اس نے کئی بار ماں سے پوچھا تو ہر بار انہوں نے ایک ہی جواب دیا۔ ”رعنا! اس بارے میں نہ پوچھو تو بہتر ہوگا۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے، تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا صرف دکھ ہوگا۔“

میمونہ ورکنگ وومین تھیں۔ پتا نہیں وہ شروع سے جاب کرتی رہی تھیں یا پھر مجبوری میں ملازمت کی تھی۔ انہوں نے بی کام کے بعد چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بننے کی کوشش کی مگر دو سال بعد تعلیم ادھوری چھوڑ دی پھر بھی انہوں نے اتنا کچھ سیکھ لیا تھا کہ ایک نجی کمپنی میں اکاؤنٹنٹ بن گئی تھیں۔ اس وقت اس شعبے میں لڑکیاں بہت کم آتی تھیں۔ اس لیے اگر کسی کو پتا چلتا تو وہ تعجب کرتا۔ کسی قدر ہوش سنبھالنے پر رعنا کو پتا چلا کہ اس دنیا میں اس کا سوائے ماں کے اور کوئی نہیں ہے۔ باپ کا وجود اس نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ رعنا کی پیدائش سے پہلے اس دنیا سے گزر چکے تھے۔ راحت ریلوے لائن کراس کرتے ہوئے ٹرین کی زد میں آگئے تھے۔ میمونہ کے مطابق یہ حادثہ تھا لیکن بارہ تیرہ سال کی عمر میں رعنا نے وہ فائل دیکھ لی جس میں میمونہ نے اخبارات کے تراشے سنبھال کر رکھے تھے۔ ان تراشوں میں راحت کو پیش آنے والے واقعے کی کٹنگز تھیں۔ ان تراشوں کے مطابق یہ حادثہ نہیں بلکہ خودکشی کا واقعہ تھا عینی شاہدین نے بتایا کہ راحت جان بوجھ کر ٹرین کے سامنے آئے تھے مگر ان تراشوں میں خودکشی کی وجہ بیان نہیں کی گئی تھی۔ بہت عرصے بعد رعنا نے میمونہ سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے وہی جواب دیا۔

”نہ جاننا تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے۔“

کامی کی طرح رعنا بھی بہت فرمانبردار تھی مگر اس کی طرح روبوٹک عمل کرنے والی نہیں تھی۔ ان کا اپنا گھر تھا جو بعد میں رعنا کا گھر ہوا اور اسی گھر کا ایک کمرا کامی کے لیے مخصوص ہوا۔ یہ چھوٹا سا گھر میمونہ نے خود بنایا تھا یا راحت ان کے لیے چھوڑ کر گئے تھے۔ رعنا اس بارے میں بھی نہیں جانتی تھی لیکن اس کا اندازہ تھا کہ مکان ابو نے چھوڑا

ہوگا۔رعنا کی شادی سے چند سال پہلے انہوں نے اسے رینویٹ کیا تھا۔ان کے بعد رعنا نے اسے مزید بہتر کیا تھا۔اس نے اوپری منزل کی چار دیواری اونچی کرائی اور نیچے ایک طرف موجود گیلری میں گرل کرائی تھی کیونکہ حالات اچھے نہیں تھے۔

مکان ایک اچھے علاقے میں اور خوب صورت تھا مگر یہ عجیب مکان تھا۔اس سے شاید مردوں کا وجود برداشت نہیں ہوتا تھا یہاں کسی مرد کو زیادہ دیر رہنا نصیب نہیں ہوا تھا۔راحت تین سال رہے، پھر جاوید دو سال رہا اور سب سے زیادہ کامی انیس سال رہا مگر وہ سب سے جلدی چلا بھی گیا۔جبکہ رعنا کو اس گھر میں اڑتیس سال ہونے کو آئے تھے البتہ میمونہ کو بس بائیس سال رہنا نصیب ہوا تھا۔رعنا اٹھارہ سال کی تھی اور اس کی شادی کو صرف دوسرا مہینا ہوا تھا تب میمونہ کینسر کے موذی مرض کے ہاتھوں زندگی ہار گئیں۔

میٹرک کے بعد رعنا نے کالج میں داخلہ لیا تو میمونہ کی خواہش کے مطابق کامرس لی۔وہ چاہتی تھیں کہ رعنا ایم بی اے یا ایم کام کرے۔اسے خود بھی اکاؤنٹس سے دلچسپی تھی اس لیے اس نے شوق سے داخلہ لیا۔میٹرک میں اے ون گریڈ آیا تھا اور آئی کام میں بھی اس نے اے ون گریڈ لیا۔رعنا چاہتی تو یونیورسٹی میں آنرز میں داخلہ لے سکتی تھی۔اس کے نمبرز کافی تھے مگر اس نے بی کام کو ترجیح دی اور اسی کالج میں آگے تعلیم جاری رکھی جہاں سے آئی کام کیا تھا۔بی کام پارٹ ون کے پیپرز دیے تھے کہ میمونہ نے اچانک ہی اس کی شادی کا فیصلہ کر لیا۔رعنا دنگ رہ گئی تھی۔اب تک میمونہ نے اس کا جو بھی فیصلہ کیا تھا، اس میں رعنا کی رضا شامل رہی تھی لیکن یہ فیصلہ ایسا تھا کہ میمونہ نے بس اسے سنایا اور اس سے سو فیصد فرمانبرداری چاہی۔رعنا نے احتجاج نہیں کیا، ماں سے اس اچانک فیصلے کی وجہ جاننا چاہی تب میمونہ نے اسے جو وجہ بتائی اسے سن کر رعنا کے ہاتھ پیروں کی جان کے ساتھ دل و دماغ سے ذرہ برابر احتجاج کا ارادہ بھی نکل گیا۔

میمونہ کو برین کینسر تھا اور وہ نہ جانے کب سے اسے پال رہی تھیں۔شروع میں معمولی سی ٹیسیں اٹھتی رہیں، انہوں نے توجہ نہیں دی۔اپنی صحت کی طرف سے وہ کسی قدر بے پروا تھیں۔جب درد کا دورہ جلدی جلدی اور شدت سے پڑنے لگا تو انہوں نے خود ہی پین کلر لینا شروع کی اور اسی چکر میں وہ وقت نکل گیا جب کینسر کا عفریت قابو میں آسکتا تھا۔انہوں نے رعنا سے چھپایا تھا۔وہ دفتر سے واپسی پر ڈاکٹر کو دکھاتی تھیں۔ایک فزیشن نے علامات سن کر انہیں نیورو کے ماہر کے پاس بھیجا اور اس نے فوری طور پر میمونہ کا سی ٹی اسکین کرایا۔اس کا نتیجہ جو سامنے آیا وہ ہولناک تھا۔میمونہ کے دماغ میں تین رسولیاں پرورش پا کر میچور ہو چکی تھیں اور اب ان کو دواؤں یا آپریشن سے ختم کرنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔مزید چند ٹیسٹ کے بعد ڈاکٹرز نے انہیں جواب دیا اور انہیں بتا دیا کہ ان کے پاس مشکل سے تین مہینے ہیں۔شاید میمونہ نے اسی وجہ سے نہایت عجلت میں جاوید کا انتخاب کیا۔

جاوید میمونہ کے ڈیپارٹمنٹ میں نیا نیا جاب پر آیا تھا۔اس کی عمر بائیس سے زیادہ نہیں تھی، یعنی رعنا سے چار سال ہی بڑا تھا۔اتفاق سے اس کا بھی دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ایک مخیر شخص نے جاوید کی پرورش کر کے اسے تعلیم دلا کر اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل بنایا۔جاوید حیدرآباد میں رہتا تھا پھر جاب کے لیے کراچی آ گیا۔میمونہ کے ماتحت آنے کے بعد جب انہیں جاوید کے پس منظر کا علم ہوا تو انہیں جاوید سے ہمدردی ہو گئی اور وہ اس کا خاص خیال رکھنے لگیں۔میمونہ کی کوشش سے وہ ایک مہینے بعد جاب پر مستقل ہو گیا۔جاوید ذہین تھا۔میمونہ نے اسے مشورہ دیا کہ وہ کچھ عرصہ جاب کرنے کے بعد آگے تعلیم حاصل کرے۔کیونکہ ترقی کا واحد راستہ اعلیٰ تعلیم تھی۔جاوید بھی یہی چاہتا تھا مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔

کینسر کے انکشاف کے بعد میمونہ کو سب سے پہلے رعنا کا خیال آیا کہ ان کے بعد اس کا کیا ہوگا؟ اسے کون دیکھے گا اور اس کی شادی کون کرے گا؟ ان سوالوں کا ممکنہ جواب ایک ہی تھا کہ کوئی نہیں۔اس لیے میمونہ نے خود ہی سب کر کے جانے کا فیصلہ کیا۔پھر انہوں نے اپنے آس پاس دیکھا تو انہیں جاوید ہی سب سے مناسب نظر آیا۔وہ خوش شکل اور اچھے کردار کا لڑکا تھا۔اس لیے انہوں نے رعنا کو اپنا فیصلہ سنایا اور پھر پوچھنے پر اس کی وجہ بھی بتا دی۔ساتھ ہی انہوں نے واضح کیا کہ اس کے پاس کوئی چوائس نہیں ہے۔اسے بہر صورت میمونہ کی رضا کے آگے سر جھکانا تھا۔

رعنا مزاحمت کر ہی نہیں سکتی تھی، اس لیے میمونہ کے فیصلے کے ایک ہفتے بعد اس کا جاوید سے سادگی سے نکاح ہو گیا۔اس وقت جاوید ایک فلیٹ میں کچھ لڑکوں کے ساتھ شراکت میں رہ رہا تھا اور رعنا کو وہاں رکھنا ممکن نہیں تھا پھر اس کی تنخواہ اتنی نہیں تھی کہ وہ رعنا کو الگ سے کہیں رکھ سکتا اس لیے میمونہ نے اسے گھر داماد بنانے کا فیصلہ کیا۔رعنا کی

شادی کے ساتھ ساتھ میمونہ دوسرے تمام کام بھی بہت عجلت میں نمٹا رہی تھیں۔ انہوں نے مکان رعنا کے نام کیا اور مشروط کیا کہ وہ اسے پانچ سال سے پہلے فروخت نہیں کر سکتی تھی۔ میمونہ نے اپنے وکیل کو اس معاملے میں ضامن بنایا۔ مکان کے کاغذات اس کے پاس ہی تھے۔ اسی طرح اپنے واجبات اپنی زندگی میں وصول کر کے میمونہ نے انہیں ایک سیونگ اکاؤنٹ میں رکھ دیے جو رعنا کے نام پر تھا۔ یہ اسے بعد میں معلوم ہوا کہ مذکورہ رقم خاصی تھی۔ شاید جاوید پر اعتماد کے باوجود میمونہ کو خدشہ تھا کہ کہیں وہ غلط نہ نکلے اور ان کے بعد وہ رعنا سے مکان اور رقم ہتھیانے کی کوشش نہ کرے اس لیے وہ یہ سب کر کے جا رہی تھیں۔ رعنا کو تو ان کے انتقال کے بعد پتا چلا کہ انہوں نے کیا کیا ہے۔

جاوید نکاح کے بعد اپنا مختصر سامان لے کر ان کے گھر منتقل ہو گیا اور یہیں ان کی شادی کی پہلی رات آئی۔ اس اولین رات میں جاوید نے رعنا کو اپنی ساری محبت اور سارا اعتماد دے دیا۔ اس نے رعنا کو اپنی زندگی کی مکمل داستان سنائی۔ وہ ایک بہت غریب گھر سے تعلق رکھتا تھا اور پھر ہیضے کی وبا میں اس کا پورا گھر موت کے گھاٹ اتر گیا۔ وہ بچنے والا واحد فرد تھا اور پھر ایک مخیر شخص نے اس کی پرورش کی اور صرف اللہ واسطے کی۔ اس نے جاوید کو بہترین تعلیم و تربیت دلوائی اور جب وہ اس قابل ہو گیا کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے تو اسے اپنی زندگی آپ گزارنے کو کہا۔ جاوید نے اعتراف کیا کہ آج وہ جو بھی تھا، اسی شخص کی وجہ سے تھا۔ رعنا ماں کے بعد ڈر رہی تھی لیکن جاوید اتنا اچھا اور سلجھا ہوا انسان نکلا کہ جب میمونہ کے بعد ان کا وصیت نامہ اور مکان کی ملکیت کی بات سامنے آئی تب بھی اس نے اس بارے میں ایک لفظ نہیں کہا اور نہ ہی اسے اپنی توہین سمجھا۔ اس کے بجائے اس نے میمونہ کی تائید کی کہ انہوں نے بالکل درست فیصلہ کیا ہے۔

شادی کے فوراً بعد جاوید نے ایک مرد کی طرح گھر کی ساری ذمے داری سنبھال لی اور آخری دنوں میں میمونہ کی اتنی خدمت کی کہ وہ اسے دعائیں دے کر گئیں۔ وہ صرف پونے دو مہینے اور زندہ رہیں اور پھر ایک صبح ناشتے کی میز پر اچانک انہیں جھٹکا لگا اور وہ میز پر ہی اوندھی ہو گئیں۔ جب انہیں اٹھایا تو ان کا جسم روح سے خالی ہو چکا تھا۔ ٹیومر پھٹ گیا تھا اور وہ سیکنڈ سے بھی پہلے جان سے گزر گئیں۔ خلاف توقع رعنا نے یہ صدمہ برداشت کر لیا۔ شاید اس لیے بھی کہ اسے سنبھالنے کے لیے جاوید موجود تھا۔ اس نے ان دنوں رعنا کا بہت زیادہ خیال رکھا اور اس کی دل جوئی کی وجہ سے وہ بہت جلد سنبھل گئی۔ دھیان بٹانے کے لیے جاوید نے مشورہ دیا کہ وہ کالج جانا شروع کر دے۔ ویسے بھی بی کام کا آخری سال تھا اور چند مہینے بعد پیپرز تھے۔ رعنا کو مشورہ مناسب لگا اور اس نے کالج جانا شروع کر دیا۔ جاوید کی تنخواہ زیادہ نہیں تھی مگر ان کے گزارے کے لیے کافی تھی۔ جاوید نے رعنا کو بینک اکاؤنٹ چھیڑنے سے منع کیا۔

"اسے کسی وقت کے لیے رہنے دو، ابھی تو ہمارا گزارہ ہو رہا ہے۔"

جاوید بہت دیکھ بھال کر خرچ کرنے والا تھا اور فضول خرچ رعنا بھی نہیں تھی اس لیے وہ آرام سے گزارہ کرنے لگے۔ دونوں کم عمر تھے انہیں خیال نہیں آیا کہ شادی کے بعد کچھ مراحل اور بھی آتے ہیں۔ میمونہ کی وفات کے دو مہینے بعد رعنا کی طبیعت گڑبڑ ہوئی۔ چکر آئے اور متلی کی کیفیت ہوئی تو وہ کھٹکی اور ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے تصدیق کر دی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ رعنا اور جاوید خوش ہو گئے۔ اگرچہ ابھی وہ دونوں ہی جدوجہد سے گزر رہے تھے۔ رعنا تعلیم مکمل کر رہی تھی اور جاوید کوشش کر رہا تھا کہ اپنی آمدنی بڑھائے۔ اس لیے بچے کی آمد کسی قدر غیر متوقع تھی لیکن پھر بھی وہ خوش تھے۔

ماں کی وفات کے بعد رعنا کو جاوید کی رفاقت کے بعد صحیح معنوں میں کوئی خوشی ملی تھی تو وہ کامی کی آمد کی تھی۔ جلد وہ اور جاوید خواب دیکھنے لگے جو ہر آنے والے ننھے مہمان کے ماں باپ دیکھتے ہیں۔ وہ اس کے لیے شاپنگ کر رہے تھے اور اس کی باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے طے کیا کہ بیٹا ہوا تو اس کا نام کامران اور بیٹی ہوئی تو اس کا نام حنا رکھیں گے۔ جلد انہیں پتا چل گیا کہ لڑکا ہے اور گھر میں کامی کی آمد سے پہلے اس کا ذکر نام کے ساتھ ہونے لگا۔

☆☆☆

دروازے کے اندر سے کامی کی خوشبو محسوس ہو رہی تھی۔ یہ خوشبو رعنا کو جذباتی کر رہی تھی مگر اب وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ گزشتہ ایک مہینے میں اس نے اتنے آنسو بہائے تھے کہ اس کی آنکھیں ہی نہیں، جسم بھی خشک ہو گیا تھا۔ وہ اب مزید رونا نہیں چاہتی تھی۔ جانے کتنی دیر بعد ہمت کر کے رعنا اندر داخل ہوئی۔ فرش پر کامی کے پسندیدہ رنگ کا ہلکا سرمئی قالین بچھا ہوا تھا۔ چھوٹا سنگل بیڈ ایک کونے میں تھا اور دوسری طرف کامی کی اسٹڈی ٹیبل تھی اور ان دونوں کے درمیان میں اس کی کمپیوٹر ٹرالی تھی جس پر کامی کا ڈیسک

ٹاپ کمپیوٹر اور اس کے لوازمات رکھے تھے۔ بیڈ شیٹ ہموار تھی اور کمرا صاف ستھرا ہو رہا تھا۔ شاید ماسی زرینہ ہر دوسرے تیسرے دن یہاں کی صفائی کرتی تھی۔ بیڈ کی مخالف سمت دیوار کے کونے میں وڈ بٹ والی الماری تھی اور اس کے ساتھ چھوٹی سی ڈریسنگ ٹیبل تھی۔ جس پر کامی کے پرفیوم، باڈی اسپرے اور دوسری چیزیں سلیقے سے رکھی تھیں۔

اسٹڈی ٹیبل پر لیمپ کے ساتھ کتابیں رکھی تھیں کامی بی بی اے کے چوتھے سمسٹر میں تھا جب ایک غیر متوقع طور پر بجنے والی سیل فون کی بیل نے اس کی زندگی کی ڈور کاٹ دی۔ رعنا آفس میں تھی جب اسے اطلاع ملی تو اسے یقین نہیں آیا۔ بلکہ اب تک نہیں آیا تھا۔ ایک چھوٹی سی غلط فہمی نے کامی کی جان لے لی تھی۔ جس لڑکے شاہد نے اسے شوٹ کیا، اس نے گرفتاری کے بعد پولیس کو بیان دیا کہ اس نے غصے میں آکر یہ فعل کیا تھا کیونکہ کامی اس کی گرل فرینڈ اسما کے چکر میں تھا وہ اسے کال کرتا تھا اور اسما کو اس کے خلاف بہکاتا تھا۔ اتفاق سے جب اسے پتا چلا کہ اسما اس کے رقیب سے ملنے آرہی ہے، وہ بھی اسی ریستوران پہنچ گیا جہاں یہ ملاقات ہونی تھی مگر اسما نہیں آئی اور وہ اس لڑکے سے ہرگز واقف نہیں تھا۔ شاہد گھر سے مسلح ہو کر آیا تھا اور اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اس لڑکے کو قتل کر دے گا۔ جب اسما نہیں آئی تو اس نے لڑکے کو تلاش کرنے کے لیے اس کے نمبر پر بیل دی، اتفاق سے اسی وقت رعنا نے کامی کو کال کی اور اس کے موبائل نے بیل دی۔ ٹائمنگ پرفیکٹ تھی اور لڑکے نے بیل کی آواز پر کامی کی جانب دیکھا اور نزدیک جا کر اسے عقب سے گولی ماردی۔ وہ کال بھی ریسیو نہیں کرسکا تھا۔

آج کل ایسے واقعات عام ہیں۔ نوجوان لڑکے ذرا سی بات پر کسی کو قتل کر دیتے ہیں۔ کامی اس کا غلط شکار تھا، وہ تو لڑکیوں سے دوستی کا قائل ہی نہیں تھا۔ جب وہ سولہ سترہ سال کا ہوا اور رعنا اسے چھیڑنے کے لیے کہتی کہ وہ خود کوئی لڑکی پسند کرلے تاکہ میں جوتیاں گھسنے سے بچ جاؤں تو وہ سنجیدہ ہو جاتا اور کہتا۔ ”ماما پلیز، میں اس کا قائل نہیں ہوں۔ مجھے لو میرج کی ذرا بھی خواہش نہیں ہے۔“

رعنا ہنس کر کہتی۔ ”تب مجھے ہی جوتیاں گھسنی پڑیں گی۔“

”بالکل آپ کو ہی کرنا ہوگا مگر ماما ابھی اس میں بھی بہت وقت ہے۔ ابھی مجھے پڑھنا ہے اور بہت سارا پڑھنا ہے پھر اپنا کیریئر بنانا ہے... تب شادی کی بات کیجیے گا۔“

رعنا سوچ رہی تھی کہ کامی کو تو پتا ہی نہیں چلا کہ اسے کس نے اور کیوں مارا ہے۔ اس کا شاہد اور اس کی گرل فرینڈ اسما سے کوئی تعلق نہیں تھا اور جب یہ بات شاہد کو پتا چلی تو وہ بھی شاکڈ رہ گیا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اس نے غلط فہمی کا شکار ہو کر ایک ایسے لڑکے کو قتل کر دیا تھا جس کا اس سارے معاملے سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا لیکن اس سے اس کے جرم کی سنگینی کم نہیں ہوئی تھی۔ پولیس نے چالان بنا کر اسے عدالت میں پیش کر دیا تھا۔ وہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا، آلۂ قتل سمیت متعدد گواہ اس کے خلاف تھے، جنہوں نے اپنی آنکھوں سے اسے کامی پر گولی چلاتے دیکھا تھا۔ امکان یہی تھا کہ اسے بہت جلد سیشن کورٹ سے سزا ہو جائے گی اور سزائے موت کا بھی پورا امکان تھا۔ اگرچہ وہ اس کے بعد ہائی کورٹ اور پھر سپریم کورٹ تک جاتا۔ اس کا تعلق ایک کھاتے پیتے خاندان سے تھا اور وہ اتنی آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالتا۔ اس کے باوجود کیس بہت مضبوط تھا۔ اس کی رہائی کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔

رعنا نے ٹی وی پر اس خوب صورت سی لڑکی کو دیکھا تھا جو اس سارے فساد کی جڑ تھی اور اس نے صاف انکار کر دیا تھا کہ اس کا قاتل سے کوئی تعلق تھا۔ اسما کا کہنا تھا کہ وہ خود اس کے پیچھے پڑا رہتا تھا مگر وہ اسے لفٹ نہیں کراتی تھی۔ اس نے یہ بھی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ کسی اور لڑکے کو پسند کرتی تھی۔ مگر رعنا کو یقین تھا اس نے بہت سارے جھوٹ بولے تھے۔ وہ قاتل سے تعلق رکھتی تھی اور وہ اس لڑکے کو بھی پسند کرتی تھی جس کے دھوکے میں قاتل نے کامی کو قتل کیا تھا۔ گویا اسما اچھے کردار کی لڑکی نہیں تھی جو بیک وقت دو لڑکوں سے تعلق رکھے ہوئے تھی۔ اس کی وجہ سے نوبت یہاں تک پہنچی کہ شاہد نے پاگل ہو کر کامی کو قتل کر دیا اور اب خود اسے سزائے موت کا سامنا تھا۔ اس سانحے نے رعنا کو دنیا سے بیگانہ کر دیا تھا۔ کامی کی تدفین تک تو اسے ہوش ہی نہیں رہا تھا سب کچھ محلے والوں اور اس کے دفتر کے کولیگز نے دیکھا تھا۔ جب اس کے حواس بحال ہوئے تو اس کی سوچوں پر جو سوال سب سے زیادہ حاوی تھا وہ یہی تھا کہ کامی کا کیا قصور تھا؟ اسے یوں اچانک موت کیوں ملی؟ اور وہ بھی کسی اور کے حصے کی موت۔

رعنا جتنا سوچتی، اتنا ہی الجھتی اور اس کا دماغ اتنا ہی منتشر ہو جاتا۔ رفتہ رفتہ یہ سوچیں اس پر اتنی حاوی ہو گئیں کہ اسے رات کو نیند نہیں آتی تھی اور اسے لگتا کہ وہ پاگل ہو جائے گی۔ تنگ آکر سوچوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے وہ نیند کی دوا لینے لگی۔ محلے والے اور کولیگز چند دن تک آتے جاتے رہے پھر سب اپنی اپنی مصروفیات میں مگن ہو

گئے۔ اکیلے میں سوچوں کے سوا اور کیا تھا اور وہ سوچ سوچ کر پاگل ہونے لگی۔ کامی کے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا؟ وہ تو لڑکیوں کے معاملے میں آج کے لڑکوں سے بالکل مختلف سوچ رکھتا تھا۔ ان سے بہت محدود تعلق کا قائل تھا۔ کبھی کبھی زرینہ کی طبیعت خراب ہو جاتی اور وہ اپنی جگہ اپنی بیٹی کو بھیج دیتی۔ شازیہ سولہ سترہ برس کی اور بڑی پیاری سی لڑکی تھی۔ اگر رعنا گھر میں نہ ہوتی اور صرف کامی ہوتا تو وہ اسے واپس بھیج دیتا تھا کہ امی نہیں ہیں وہ بعد میں آئے۔

ایسی سوچ والے لڑکے کو یوں بے دردی سے ایک غلط ترین الزام لگا کر قتل کر دیا گیا۔ رعنا کو قاتل سے شکوہ نہیں تھا۔ اس نے جو کیا ایک شدید غلط فہمی کے تحت کیا، اسے تو تقدیر سے شکوہ تھا جو کامی کو اس سے زیادہ بہتر جانتی تھی، اس کے باوجود...... کامی کی موت اس طرح ہوئی۔ یہ سب سوچتے ہوئے رعنا کے پاؤں کانپنے لگے۔ وہ کامی کے بستر پر بیٹھ گئی اور اس کی آنکھوں سے وہ آنسو پھر پھوٹ نکلے، جن کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ خشک ہو چکے ہیں۔ روتے ہوئے وہ کامی کو پکار رہی تھی مگر وہ تمام پکاروں سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ پھر رعنا نے اس ہستی کو پکارا جو سب کی سنتا ہے اس سے شکوے کیے، پرانی باتیں نکال کر بیٹھ گئی کہ اس نے اس کے نصیب میں ہمیشہ تنہائی کیوں لکھی؟ پہلے باپ، پھر شوہر اور اب بیٹا واپس لے لیا۔ اس کے پاس رہا ہی کیا تھا؟

رونے اور شکوے کرنے سے رعنا کا دل ذرا ہلکا ہوا تو وہ اٹھ کر کامی کی اسٹڈی ٹیبل کے پاس آ گئی۔ اس کی کتابیں، پین، رجسٹر اور دوسری چیزیں اسی طرح رکھی تھیں جیسے وہ رکھ کر گیا تھا۔ ان میں پارکر پین کا وہ سیٹ بھی تھا جو رعنا نے اسے کالج کے پہلے دن تحفے میں دیا تھا۔ کامی کو یہ پین بہت پسند آئے تھے اور وہ اب تک ان سے کام لے رہا تھا۔ انٹر کے بعد اسے کمپیوٹر کی ضرورت پیش آئی تھی۔ اس سے پہلے گھر میں ایک معمولی سا کمپیوٹر تھا۔ رعنا نے اب تک کامی کو اس کے کمرے میں کمپیوٹر نہیں دیا تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ آج کی نئی نسل، بلکہ اچھے خاصے میچور آدمی بھی اس آلے کی وجہ سے بے راہ روی کا شکار ہو رہے تھے۔ کمپیوٹر نے جہاں ایک طرف معلومات تک رسائی کو بہت آسان بنا دیا تھا وہیں اس نے کچے ذہنوں کی تباہی کا راستہ بھی کھول کر رکھ دیا تھا۔

مگر اب کامی کو ضرورت تھی اور رعنا کو اس پر اعتماد بھی تھا۔ اس نے اپنے کردار اور عمل سے ثابت کیا تھا کہ وہ بھٹکنے والے نوجوانوں میں سے نہیں ہے۔ اس نے رعنا سے مطالبہ نہیں کیا تھا کہ اسے کمپیوٹر اس کے کمرے میں مہیا کیا جائے لیکن اس نے خود یہ فیصلہ کیا اور کمپیوٹر مع ٹرالی کے اس کے کمرے میں سیٹ کر دیا۔ یہ جدید ترین کمپیوٹر تھا جس کے ساتھ اسکینر اور پرنٹر بھی تھے۔ ویڈیو چیٹ کے لیے مانیٹر پر کیمرا نصب تھا۔ رعنا نے ہر ہر چیز بہترین لی تھی تاکہ کامی کو کوئی مسئلہ نہ ہو۔ لوڈ شیڈنگ سے بچنے کے لیے گھر میں یو پی ایس تھا لیکن کمپیوٹر کے لیے الگ سے یو پی ایس لیا تاکہ اچانک کمپیوٹر بند ہونے سے کامی کے کسی کام کا نقصان نہ ہو۔ یو پی ایس اور دوسری چیزیں سب ٹرالی میں ہی فٹ تھیں۔ کامی کو میوزک کا شوق تھا مگر اسے موسیقی میں وہ غزلیں اور پرانے گیت پسند تھے جو کبھی رعنا نے بھی نہیں سنے تھے جب اس کا موڈ ہوتا تو کمپیوٹر پر ہی سنتا تھا۔

یہاں سب کچھ تھا بس کامی نہیں تھا۔ رعنا نے کی بورڈ پر ہاتھ پھیرا اور پھر غیر ارادی طور پر ہاتھ بڑھا کر کمپیوٹر آن کر دیا۔ جب سے اس نے کامی کو کمپیوٹر دلوایا تھا، ایک بار بھی اسے آن کر کے نہیں دیکھا تھا۔ وجہ وہی تھی کہ اسے کامی پر مکمل اعتماد تھا۔ اگر کامی زندہ ہوتا اور یہاں آتا تو ماں کو اپنا کمپیوٹر آن کرتے دیکھ کر حیران ضرور ہوتا۔ دو سالوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ رعنا اس کا کمپیوٹر آن کر کے دیکھ رہی تھی۔ ونڈو اسٹارٹ ہوئی اور پھر ڈیسک ٹاپ آن ہوا تو سامنے ہی رعنا اور جاوید کی شادی کی تصویر تھی۔ وہ دلہن بنی ہوئی تھی اور جاوید اس کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ حیران ہوئی کیونکہ کامی نے کبھی اسے نہیں بتایا تھا کہ اس نے ان کی شادی کی تصویر اسکین کر کے کمپیوٹر پر وال پیپر کے طور پر لگائی ہوئی تھی۔ وہ رعنا سے بہت محبت کرتا تھا مگر اس کی محبت کا اظہار ایسا ہی ہوتا تھا۔ اچانک کوئی بات، کوئی چیز سامنے آتی اور رعنا حیران رہ جاتی۔ وہ ماں باپ سے متعلق ہر موقع یاد رکھتا تھا پھر اس موقع کو اس کی مناسبت سے مناتا تھا۔ رعنا سب یاد کر رہی تھی اور اس کا دل جیسے کٹ رہا تھا۔ آنکھیں پھر برسنے لگی تھیں۔

☆☆☆

کامی کی آمد کی اطلاع ان دونوں کے لیے بیک وقت خوشی اور کسی قدر فکر کا باعث تھی۔ فکر یہ تھی کہ رعنا پیپرز کیسے دے گی اور تیاری کیسے کرے گی۔ اس کی طبیعت خراب تھی اور وہ کالج سے زیادہ چھٹیاں کرتی تو اسے پیپرز میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اس نے سوچا کہ وہ اس سال پیپرز نہیں دے گی، اگلے سال دے گی مگر جاوید نے رعنا کی حوصلہ افزائی کی۔ اس نے کہا۔ ”یہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔

اسی ملک میں لاکھوں عورتیں اس حالت میں جاب بھی کرتی ہیں اور پڑھتی بھی ہیں۔ تم بھی پڑھ سکتی ہو۔"

"مجھے شرم آئے گی۔"

جاوید نے نرمی سے کہا۔ "یہ فطری چیز ہے اور اس میں شرم کیسی؟"

"لیکن میری اتنی جو چھٹیاں ہو رہی ہیں؟"

"تم کالج میں بات کرلو اور اپنی مجبوری بتا دو۔ مجھے یقین ہے کالج انتظامیہ تم سے کوآپریٹ کرے گی۔ ویسے بھی امتحان تک تمہاری جسمانی حالت بہت چینج نہیں ہوگی۔ اس لیے کسی کو پتا نہیں چلے گا۔"

اصل میں رعنا کو اس حالت میں کالج جاتے ہوئے شرم آرہی تھی۔ وہاں بہت سی فرینڈز تھیں اور وہ سب اس کا ریکارڈ لگاتیں۔ دوستوں کی حد تک ٹھیک تھا لیکن ان سے یہ بات سب میں پھیل جاتی اور کالج میں بہت سے مرد لیکچرار اور پروفیسر بھی تھے۔ اس لیے وہ چاہتی تھی کہ یہ بات زیادہ نہ پھیلے۔ اس نے اچھی خاصی تیاری کرلی تھی اور اسے یقین تھا کہ وہ اپنے مارکس برقرار رکھے گی۔ جاوید کے مشورے پر رعنا نے کالج پرنسپل سے بات کی اور انہیں اپنی مجبوری بتائی تو وہ مان گئیں۔ انہوں نے کہا۔ "رعنا! آپ فکر نہ کریں...... حاضری کا مسئلہ نہیں ہوگا ویسے بھی آپ سیونٹی فائیو پرسنٹ اٹینڈنس سے زیادہ دور نہیں ہیں لیکن آپ کی تیاری مکمل ہونی چاہیے۔ یہ کالج کی ریپوٹیشن کا معاملہ ہے۔"

"میڈم! میں نے پریویس میں سیونٹی تھری پرسنٹیج حاصل کی تھی، اس بار مجھے امید ہے میں زیادہ حاصل کر سکوں گی۔"

"وش یو گڈ لک اینڈ وش یو اے ہیلدی بے بی۔" انہوں نے کہا تو وہ شرما گئی۔

"تھینک یو میڈم۔"

"میری کسی مدد کی ضرورت ہو تو بلا جھجک کہنا مجھے تمہارے کام آکر خوشی ہوگی۔ تم دہری ذمے داریاں نبھا رہی ہو۔"

رعنا ایک بار پھر میڈم کا شکریہ ادا کر کے باہر آگئی۔ وہ خوش تھی کہ اب پیپرز دینے میں مشکل نہیں ہوگی۔ اگر حاضری کا مسئلہ ہوا تو وہ بھی میڈم دیکھ لیں گی۔ اس وقت اس نے سوچا نہیں تھا کہ جلد یہ دہری ذمے داریاں تہری ہونے والی تھیں۔ اس کے لیے پہلا موقع تھا اور ابتدائی دن تھے اس لیے طبیعت رہ رہ کر خراب ہوتی تھی۔ ڈاکٹر نے جو دوائیں دی تھیں وہ باقاعدگی سے لے رہی تھی۔ کالج جانا تقریباً بند تھا لیکن تیسرے مہینے تک اس کی حالت کسی قدر سنبھل گئی شاید یہ دواؤں کا اثر تھا۔ خوراک بہتر لینے لگی تھی اس لیے رعنا پیپرز کی تیاری کرنے لگی۔ ہفتے میں دو تین بار وہ کالج بھی چلی جاتی اور وہاں اپنی فرینڈز سے تازہ نوٹس لے آتی۔

گھر کی تمام ذمے داریاں جاوید نے اپنے ذمے لے لی تھیں۔ وہ صبح ناشتا بنا کر اور رعنا کے ساتھ کر کے دفتر جاتا تھا۔ میمونہ کے پاس ایک چھوٹی سی کار تھی مگر رعنا اور جاوید دونوں میں سے کسی کو ڈرائیونگ نہیں آتی تھی اس لیے انہوں نے کار فروخت کر دی۔ وہ بس یا رکشے سے آتے جاتے تھے۔ واحد کام رعنا یہ کرتی تھی کہ وہ دوپہر میں کالج سے آکر سالن بنا لیتی۔ شام کو جاوید دفتر سے آتے ہوئے روٹی اور اگلے دن ناشتے کا سامان لے آتا۔ میمونہ نے اپنے آخری دنوں میں کوشش کی تھی کہ جاوید کو ترقی مل جائے اور اس کی تنخواہ بڑھ جائے مگر اس کی نئی نئی جاب کی وجہ سے ایسا ہو نہیں سکا تھا۔ سال مکمل ہونے پر جاوید کو پہلا انکریمنٹ ملا اور اس نے رعنا کو یہ خوش خبری سنائی۔ "اب ہم اپنے آنے والے بے بی کے لیے کچھ کر سکیں گے۔"

"جاوید! ہمارے پاس کمی تو نہیں ہے۔ اللہ نے چاہا تو ہمارے بے بی کے لیے سب آئے گا۔"

"ہاں کمی نہیں ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ اپنے بچے کے لیے سب خود کروں۔ میں نے جو محرومی دیکھی ہے، وہ میرے بچے کو نہ دیکھنی پڑے۔"

جاوید افسردہ ہو گیا اور رعنا کو اس کی افسردگی برداشت نہیں تھی اس لیے فوراً مان گئی۔ "کیوں نہیں جناب! ہمارے بے بی کا سب اس کے پاپا کریں گے۔"

جاوید کا چہرہ چمک اٹھا۔ "یہی تو میں بھی چاہتا ہوں۔"

میمونہ نے جاوید کو آگے پڑھنے کا مشورہ دیا تھا اور اس کا ارادہ ایم کام کرنے کا تھا مگر پہلے شادی اور اب بچے کی آمد کی وجہ سے اسے مہلت نہیں ملی۔ شاید اس نے اس بارے میں سوچنا بھی چھوڑ دیا تھا مگر رعنا نے سوچ رکھا تھا کہ اس کا بی کام مکمل ہوگا اور جب کاکی کسی قدر بڑا ہو جائے گا تو وہ جاب کرلے گی اور تب جاوید ایم کام کر سکے گا۔ مگر اس نے جاوید سے کہا نہیں، شاید وہ ابھی نہ مانتا۔ اس لیے رعنا نے اس معاملے کو آنے والے وقت پر چھوڑ دیا۔ پیپرز میں ایک مہینا رہ گیا تھا، اس لیے رعنا کا بیشتر وقت پڑھنے میں گزرتا یا پھر وہ آرام کرتی تھی۔ صفائی اور دوسرے کاموں کے لیے زرینہ آتی تھی اور وہ برتن اور کچن بھی نمٹا دیتی تھی۔ درحقیقت ان دنوں زرینہ نے رعنا کا بہت ساتھ دیا تھا۔ رعنا

کو اچھا نہیں لگتا تھا کہ وہ یوں بنا معاوضہ اتنا کام کرے۔ وہ غریب عورت اپنا گھر چلانے کے لیے صبح سے شام تک کام کرتی تھی۔ اس لیے رعنا نے یہ کیا کہ اپنے اکاؤنٹ سے چپکے سے رقم نکال کر اسے دیتی رہتی تھی۔

اپنی پوزیشن برقرار رکھنے اور اچھے مارکس لانے کے لیے رعنا نے بہت زیادہ محنت کی تھی۔ شاید اسی وجہ سے امتحان کے دنوں میں ہی طبیعت خراب ہو گئی تھی مگر وہ برداشت کرتے ہوئے کسی نہ کسی طرح پیپر دیتی رہی، جس دن آخری پیپر دے کر آئی ایسی بے سدھ پڑی کہ دو تین دن تک تو اسے ہوش ہی نہیں رہا۔ جاوید اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا اور ڈاکٹر نے بھی بتایا کہ زیادہ محنت اور صحت پر توجہ نہ دینے سے کیس ذرا مشکل ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے رعنا کو مکمل بیڈ ریسٹ اور خوراک پر توجہ دینے کی تاکید کی۔ ساتھ میں ڈھیروں طاقت کی دوائیاں بھی لکھ دی تھیں۔ ان دنوں جاوید اس کا بہت خیال رکھ رہا تھا، شام کو تھکا ماندا ڈیوٹی سے آنے کے بعد وہ اس کے ساتھ لگا رہتا۔ شاید اسی لیے اس کی طبیعت خراب ہو گئی۔ ایک دن وہ دفتر سے آیا تو اس کی آنکھیں سرخ اور چہرہ مرجھایا ہوا لگ رہا تھا۔ رعنا پریشان ہو گئی۔ ''کیا ہوا ہے آپ کو! طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''پتا نہیں دو تین دن سے طبیعت متلا رہی ہے اور کھانے کو دل نہیں چاہتا۔''

جاوید کو بخار بھی ہو رہا تھا۔ رعنا نے کہا۔ ''آپ ڈاکٹر کے پاس جائیں۔''

''ارے، نہیں کوئی خاص بات نہیں ہے تین دن پہلے آفس میں دعوت ہوئی تھی سب مرغن تھا اس لیے پیٹ ذرا گڑبڑ ہوا ہے ٹھیک ہو جائے گا، تم فکر مت کرو۔''

رعنا نے بہت اصرار کیا مگر جاوید کا انکار برقرار رہا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اس کے علاج اور دواؤں پر بہت خرچ ہو رہا تھا اور جاوید کا ہاتھ تنگ تھا اس لیے وہ ڈاکٹر کے پاس جانے سے گریز کر رہا تھا کہ اس میں بھی خرچہ ہوتا۔ اگلے دن اس کی طبیعت کسی قدر بہتر تھی مگر متلی والی کیفیت برقرار تھی۔ اس کے لیے وہ چورن اور ہاضمے کی دوا لے رہا تھا۔ اس کی رنگت عجیب پیلی سی ہو رہی تھی اور آنکھوں کے گرد حلقے نمایاں ہونے لگے تھے حالانکہ اس سے پہلے جاوید کی صحت بہت اچھی تھی۔ شادی کے بعد رعنا نے شاذ ہی اسے بیمار پڑتے دیکھا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس کی طبیعت خراب ہو رہی تھی۔ اگلے دن رعنا نے پھر ڈاکٹر کے پاس جانے کو کہا اور اس نے پھر انکار کر دیا۔ مہینے کی آخری تاریخ تھی اور تنخواہ ملنے میں کئی دن باقی تھے۔ جب رعنا نے زیادہ اصرار کیا تو جاوید نے چڑ کر کہا۔ ''میرے پاس صرف چار سو روپے ہیں ڈاکٹر کی فیس دے دوں گا تو دفتر کیسے جاؤں گا۔''

''جاوید ہمارے پاس رقم ہے اور رقم ہوتی ہی اس لیے ہے کہ کام آئے پلیز آپ......''

''اس کی بات مت کرو۔'' وہ بات کاٹ کر بولا۔ ''شاید کبھی ایسا وقت آئے کہ تمہیں اس کی ضرورت کہیں زیادہ ہو۔''

''اللہ نہ کرے۔'' رعنا دہل گئی تھی۔ ''پلیز جاوید! ایسی بات نہ کریں، میرا دل رکنے لگتا ہے۔''

''تب تم بھی مجھ سے اس رقم کا مت کہا کرو۔''

''اچھا جیسے ہی تنخواہ ملے گی آپ فوراً ڈاکٹر کے پاس جائیں گے۔''

''اچھا جاؤں گا بابا۔''

''ایسے نہیں، مجھ سے وعدہ کریں۔''

''وعدہ پکا وعدہ۔''

جاوید کو تنخواہ چار دن بعد ملی اور ان چار دنوں میں اس کی حالت ایسی ہو گئی کہ خود وہ بھی پریشان ہو گیا۔ اس کی رنگت اب پیلی سے سیاہی مائل ہو رہی تھی جسم جیسے گھلنے لگا تھا۔ ہاتھ پیروں میں جان نہیں رہی تھی جو کھاتا، کچھ دیر بعد الٹی کی صورت میں نکل جاتا حد یہ کہ جوس اور پانی بھی پیتا تو الٹی ہو جاتی تھی۔ جب وہ ڈاکٹر کے پاس گیا تو عملاً دو دن کے فاقے سے تھا۔ ڈاکٹر بھی پرتشویش ہو گیا اور اس نے فوری طور پر جاوید کو جگر کے ٹیسٹ لکھ کر دیے اور بولا۔ ''یہ فوری کرالیں اور ایمرجنسی میں کرائیں، ممکن ہے چند گھنٹے کی تاخیر بھی خطرناک ہو۔''

''ڈاکٹر صاحب، مسئلہ کیا ہوا ہے؟'' جاوید نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ''شاید ہیپاٹائٹس ہے لیکن ٹھیک سے ٹیسٹ کے بعد پتا چلے گا۔''

جاوید پریشان ہو گیا۔ اس نے فوری طور پر ٹیسٹ کرایا تو اس میں ہیپاٹائٹس بی نکلا اور مرض جگر پر حاوی ہو گیا تھا...... علاج کے ساتھ مزید ٹیسٹ کیے گئے تھے۔ جن سے پتا چلا کہ مرض بگڑ چکا ہے اور ڈاکٹروں کا رویہ بتا رہا تھا کہ وہ مایوس تھے۔ رعنا کو پتا چلا تو اس کا برا حال ہو گیا۔ ماں کے انتقال کے بعد اس کے لیے یہ ایک اور مشکل وقت تھا۔ شاید وہ زیادہ پریشان تھی کیونکہ اب وہ اکیلی نہیں تھی بلکہ اس کے وجود میں ایک ننھی جان بھی تھی اور جاوید ان دونوں کے لیے ناگزیر تھا مگر تقدیر یہ نہیں دیکھتی کہ کون ناگزیر ہے

اور کون نہیں، اس کا اپنا حساب کتاب ہوتا ہے۔ کاتب تقدیر نے جس کی جتنی زندگی لکھی ہوتی ہے وہ اس سے ایک سانس زیادہ نہیں لے سکتا۔ جاوید کا وقت آ گیا تھا۔ دو دن اسپتال میں رہ کر اس نے آخری سانس لینے سے پہلے بہت حسرت سے رعنا کو دیکھا اور آہستہ سے بولا ... ''پتا نہیں اللہ نے میرے لیے کیا لکھا ہے لیکن یہ اس کا احسان ہے کہ اس نے تمہیں دیا اور پھر مجھے اولاد دی شاید میں اسے دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہوں لیکن میرا کوئی نام لیوا تو ہوگا۔''

''ایسا نہ کہیں۔'' رعنا تڑپ کر رو دی تھی مگر اس کا رونا تڑپنا کام نہیں آیا۔ کچھ دیر بعد جاوید اسے چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلا گیا۔

☆☆☆

رعنا نے ڈیسک ٹاپ کی تصویر دیکھی تو اسے جاوید یاد آ گیا۔ اسے دنیا سے گزرے برسوں گزر گئے لیکن رعنا کے دل میں اس کی یاد ہمیشہ تازہ رہی۔ رعنا نے جو وقت اس کے ساتھ گزارا وہی اس کا اصل سرمایہ تھا۔ اس نے کبھی دوسری شادی کا نہیں سوچا تھا۔ اگرچہ وہ انیس سال کی ہونے سے پہلے بیوہ ہو چکی تھی۔ اس نے آنکھیں صاف کر کے تصویر دیکھی۔ وہ بہت سادہ تیار ہوئی تھی، جاوید نے بھی سادہ شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا لیکن دونوں بہت اچھے لگ رہے تھے۔

جب جاوید رعنا کی زندگی میں آیا تو وہ ماں سے محروم ہونے والی تھی پھر جاوید بھی سال سے پہلے چلے گیا اور اب کامی بھی نہیں رہا تھا۔ وہ خالی ہاتھ رہ گئی تھی۔ کامی کا خیال آیا تو ایک بار پھر اس کے پاؤں کانپنے لگے تھے اور وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ رعنا کا ہاتھ کی بورڈ پر تھا اور اسے پتا نہیں چلا کہ کب کون سا بٹن دب گیا جب اس نے اسکرین کی طرف دیکھا تو ایک فولڈر سامنے تھا۔ اس کا نام تھا ''مائی اسٹف!''

ویسے تو یہ کمپیوٹر کامی کا تھا لیکن یہ فولڈر شاید اس نے خاص طور پر اپنے لیے بنایا ہوا تھا۔ رعنا نے اسے کھولا تو اس کے اندر کئی سب فولڈر بنے ہوئے تھے۔ ایک پر پکس (تصاویر) لکھا ہوا تھا۔ اسے کھولا تو سامنے ہی رعنا اور کامی کی بے شمار تصویریں تھیں۔ میٹرک میں پوزیشن حاصل کرنے پر رعنا نے اسے جو گفٹس دیے تھے ان میں ایک جدید ڈیجیٹل کیمرا بھی تھا۔ وہ گاہے بگاہے رعنا کی تصویریں لیتا رہتا تھا۔ کامی نے تصویروں کے نیچے نام دیے تھے۔ رعنا کی تصویروں کے ساتھ اس نے مائی لولی ماما اور مائی سوئٹ ماما کے نام دیے ہوئے تھے۔ ان میں ایک تصویر اس وقت کی تھی جب رعنا نے شاید پہلی بار ہوش و حواس میں کامی کو گود میں لیا تھا۔ اس کا چہرہ بیک وقت آنسوؤں اور خوشی سے تر تھا اور والہانہ انداز میں کامی کو دیکھ رہی تھی۔ یہ تصویر کامی کی پیدائش کے آدھے گھنٹے بعد کی تھی اور رعنا کی ایک کلاس فیلو نازیہ نے لی تھی۔

☆☆☆

جاوید کی اچانک اور ناگہانی موت نے رعنا کے حواس گم کر دیے تھے۔ کئی دن تو اسے اپنے وجود میں موجود کامی کا خیال بھی نہیں رہا، وہ اپنے آپ سے بیگانہ ہو گئی تھی۔ ابتدائی دکھ ایسا تھا کہ لگا جیسے وہ مر جائے گی۔ شاید وہ مر جانا چاہتی بھی تھی مگر یہ اس کے اختیار میں نہیں تھا اس لیے زندہ رہی اور زندگی کی طرف بھی آنا پڑا۔ اپنے لیے بھی اور کامی کے لیے بھی۔ نازیہ نے ان دنوں رعنا کا بہت ساتھ دیا تھا۔ وہ کالج میں اس کی سب سے اچھی دوست تھی اور صرف اسے ہی علم تھا کہ رعنا امید سے ہے۔ نازیہ کا تعلق ایک اوپری متوسط گھرانے سے تھا اور اس کے گھر میں لڑکیوں کو مناسب آزادی حاصل تھی۔ جاوید کے انتقال پر وہ مستقل رعنا کے ساتھ رہی اور اس کے ساتھ ساتھ گھر بھی سنبھالتی رہی۔ اسے جینے پر اکساتی رہی۔

بالآخر وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہی، بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اس نے رعنا کو زندگی کی طرف کھینچ لیا۔ اس نے اس کا اتنا خیال رکھا کہ ہوش میں آنے کے بعد رعنا نے خود کو تقریباً ٹھیک پایا۔ وہ نازیہ کی شکر گزار ہوئی جس نے صرف دوستی کے ناتے اس کا اتنا ساتھ دیا۔ رعنا کو پتا چلا کہ جاوید کا کفن دفن محلے والوں اور اس کے آفس کولیگز نے مل کر کیا تھا۔ بعد کے معاملات بھی وہی دیکھتے رہے تھے۔ ان کا کوئی رشتے دار نہیں تھا ایسے میں ان ہی لوگوں نے ساتھ دیا تھا۔ جاوید کی تدفین کے پانچویں دن اس نے نازیہ سے کہا۔ ''میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں اتار سکوں گی۔''

''یہ احسان نہیں ایک دوست کی طرف سے دوست کے لیے کوشش ہے۔''

''نہیں یہ احسان ہے۔'' رعنا نے اصرار کیا۔ ''تم چھ دن سے مستقل میرے ساتھ ہو۔ تمہارے گھر والوں کا بھی احسان ہے کہ انہوں نے تمہیں یہاں رکنے کی اجازت دی۔''

''یہ بھی ایسی بات نہیں ہے۔ میں تو ویسے بھی فرینڈز کے گھر رک جاتی ہوں، میرے گھر والے اعتراض نہیں کرتے اور اس موقع پر تو اعتراض کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ جانتے ہیں کہ تمہیں میری کتنی ضرورت ہے۔''

''لیکن اب میں ٹھیک ہوں۔''

نازیہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں اس وقت تک تمہارے ساتھ رہوں گی جب تک مجھے خود اطمینان نہیں ہو جاتا۔“

رعنا نے اسے یقین دلایا کہ وہ اب ٹھیک ہے اور اپنی دیکھ بھال کر سکتی ہے اس کے باوجود نازیہ بہ مشکل دسویں دن گئی۔ اس کے جانے کے بعد رعنا کو ایسا سناٹا محسوس ہوا کہ اس کا دل چاہا سب چھوڑ کر یوں سڑکوں پر نکل جائے، جہاں لوگ ہوں اور وہ خود کو اتنا اکیلا محسوس نہ کرے۔ اس رات اس نے جانا کہ اکیلا پن کیا ہوتا ہے۔

☆☆☆

اور اب کامی ایک بار پھر اسے تنہا کر گیا تھا۔ صرف اس کی چیزیں، تصویریں اور یادیں رہ گئی تھیں۔ تصویریں بہت سی تھیں رعنا نے پیج اسکرول کیا تو نیچے موجود تصویریں سامنے آگئیں۔ تب رعنا نے پہلی بار اس لڑکی کی تصویریں دیکھیں اور جب اس نے نام پڑھنا چاہا تو اسے جھٹکا لگا۔ کامی نے پہلی تصویر کے نیچے نام کی جگہ لکھا ہوا تھا مائی بیوٹی فل جی ایف۔ یعنی میری خوب صورت گرل فرینڈ۔ لڑکی خوب صورت تھی۔ عمر میں وہ کامی سے بڑی لگ رہی تھی شاید بیس یا اکیس برس کی تھی مگر اس کے چہرے پر معصومیت تھی۔ وہ تصویریں بنواتے ہوئے کیمرے کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں شرم اور جھجک کا تاثر تھا۔ اگلی تصویروں کے نیچے نام کی جگہ مزید سنسنی خیز الفاظ تھے۔

رعنا کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اُسے بالکل یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کامی نے لکھا ہے۔ فولڈر میں لڑکی کی کوئی درجن بھر تصویریں تھیں اور سب میں وہ کہیں باہر تھے۔ چھ تصویریں ساحلِ سمندر اور باغ کی تھیں۔ دو کسی ریستوران یا ہوٹل کی اور باقی بھی پس منظر میں گھر سے باہر کی لگ رہی تھیں۔ کامی نے کسی تصویر میں لڑکی کا نام نہیں لکھا تھا۔ تصویریں دیکھتے ہوئے رعنا کو خیال آیا کہ ممکن ہے یہ تصویریں کامی نے نہ لی ہوں۔ شاید کسی اور نے اسے دی ہوں۔ یعنی ان تصویروں سے کامی کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ رعنا نے خود کو تسلی دی۔ ”ہاں یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ کامی اس نیچر کا لڑکا تھا ہی نہیں، یہ تصویریں اس نے یقیناً کسی اور سے لی ہیں۔ دوست اپنی گرل فرینڈز کے بارے میں ایک دوسرے کو بتاتے رہتے ہیں۔“

رعنا نے کمپیوٹر بند کر دیا اور وہاں سے اٹھ آئی۔ اگرچہ اس نے خود کو تسلی دی تھی مگر اس کے اندر بے چینی موجود تھی۔ اس کا دل مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ کامی کے انتقال کے بعد وہ دو ہفتے تک دفتر نہیں گئی تھی۔ اگرچہ آفس کی طرف

کترنیں

☆ اس دنیا میں کروڑوں لوگ ہیں، پھر آپ کے پیدا ہونے کی وجہ؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سے وہ چیز توقع کر رہا ہے جو کروڑوں لوگوں سے ممکن نہیں ہے۔

☆ ایک انسان اپنی سوچوں اور اپنی حرکات سے جانا پہچانا جاتا ہے اپنی دولت اور ڈگریوں سے نہیں۔ اصلی تعلیم آپ کا دوسروں سے حسن سلوک اور رجحان ہے۔

☆ پانی کے ایک قطرے کی جھیل یا تالاب میں کوئی قدر و قیمت نہیں، کوئی پہچان نہیں مگر یہی قطرہ اگر کسی سیپ پر گرتا ہے تو ایک ہیرے کی طرح چمکتا ہے چنانچہ کسی ایسی درست جگہ کا انتخاب کریں جہاں آپ ہیرے کی طرح چمک سکیں۔

☆ کچھ رشتے ”ٹام اینڈ جیری“ کی طرح ہوتے ہیں، وہ ایک دوسرے کو اذیت دیتے اور لڑتے جھگڑتے ہیں۔ ایک دوسرے کو مارتے ہیں مگر ایک دوسرے کے بغیر رہ نہیں سکتے۔

☆ یقین کی پختگی اور اخلاق کا حسن جس بندے میں ہوگا۔ وہ ایک ہی وقت میں خالق اور مخلوق دونوں کا محبوب بن جائے گا۔

مرسلہ۔ سیدہ شاہدہ شاہ، جہلم

سیاسیات

دو مختلف پارٹیوں کے سیاستدان آپس میں بحث و تکرار کر رہے تھے۔ دونوں پہلے تو ایک دوسرے کو قائل کرنے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔ پھر الزامات پر اتر آئے۔ ایک سیاستدان نے کہا۔

”مجھے معلوم ہے، تم کس کے اشارے پر ناچتے ہو؟“

دوسرے سیاستدان نے مشتعل ہو کر کہا۔

احمق آدمی۔ ”سیاسی بحث میں بیوی کو کیوں گھسیٹتے ہو۔“

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

سے اسے چھٹی میں کوئی مسئلہ نہیں تھا مگر اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ آفس جائے گی۔ گھر کا اکیلا پن اور کامی کا خیال اسے کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ کامی کی پیدائش کے ایک سال بعد اس نے جاب کرلی تھی کیونکہ بیٹھ کر کھانے سے تو خزانہ بھی خالی ہو جاتا ہے۔ کامی کی دیکھ بھال کے لیے اس نے ماسی زرینہ کو مستقل رکھ لیا تھا۔ وہ گھر کا کام کاج بھی کرتی تھی اور کامی کی دیکھ بھال بھی کرتی تھی۔ وہ اوپر کی فیڈ لیتا تھا اس لیے اس کا بھی مسئلہ نہیں تھا۔ رعنا کو ایک فرم میں جاب ملی وہ دو سال وہاں رہی۔ بی کام کے بعد وہ باقاعدہ تو نہیں پڑھ سکی تھی مگر اس دوران میں اس نے اکاؤنٹس کے کچھ کورسز کرلیے تھے۔ خاص طور سے کمپیوٹر پر اکاؤنٹس کا کورس کرنے سے اسے ایک ملٹی نیشنل فرم میں اچھی جاب مل گئی اور وہ اب تک یہیں کام کررہی تھی۔

شروع کے چند سال بہت مشکل گزرے تھے۔ کامی چھوٹا تھا اور اس کی جدائی محسوس کرتا تھا۔ جب وہ دفتر سے آتی تو اسے دیکھتے ہی یوں چمٹتا کہ پھر جان نہیں چھوڑتا تھا۔ زرینہ اسے بڑی مشکل سے بہلاتی تھی۔ تین سال کی عمر میں وہ کسی قدر سنبھل گیا اور جب رعنا نے اسے اسکول میں داخل کرایا تو اس نے رونا دھونا ترک کردیا تھا۔ اسکول وہ بہت خوشی سے گیا تھا۔ رعنا صبح اسے خود چھوڑتی ہوئی دفتر جاتی اور دوپہر میں زرینہ اسے لے آتی۔ ہفتہ اتوار چھٹی ہوتی اور یہ دو دن ماں بیٹے کے ہوا کرتے تھے۔ دو دن زرینہ کی چھٹی ہوتی اور رعنا سب دیکھتی تھی۔

رعنا اسے پڑھاتی بھی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ بچہ جو بات ماں سے سیکھ سکتا ہے وہ اسے دنیا کا کوئی فرد اتنی آسانی سے نہیں سکھا سکتا۔ اس لیے وہ کامی کی تربیت پر خاص توجہ دیتی تھی۔ اسے اس کا ایک ایک کام خاص طور سے سکھاتی تھی جیسے برش کیسے کرتے ہیں۔ منہ ہاتھ کیسے دھوتے ہیں، صفائی کا خیال کیسے رکھتے ہیں۔ کامی ذہین تھا۔ رعنا اسے جو بتاتی وہ عام طور سے ایک بار میں سمجھ لیتا تھا اس کے باوجود رعنا اس کا بار بار امتحان لیتی۔ شاید اسی وجہ سے بہت چھوٹی عمر میں وہ اپنے سارے کام خود کرنے لگا تھا۔ جب وہ دس سال کا ہوا تو اس نے رعنا سے کہا۔ ”ماما اب زرینہ بی کو بس کام کے لیے رکھ لیں۔“

”کیوں بیٹا؟“

”ماما میں اپنی دیکھ بھال کرسکتا ہوں۔“ کامی نے اعتماد سے کہا۔ ”آپ نے مجھے سب سکھا دیا ہے، میں اکیلا بھی رہ سکتا ہوں۔“

تب رعنا مان گئی اور اس نے زرینہ کو پھر سے صرف کام کے لیے رکھ لیا تھا۔ اب کامی خود اسکول جاتا تھا۔ ایک سال بعد رعنا نے کار لے لی تو اسے اسکول چھوڑتی ہوئی دفتر چلی جاتی۔ اسکول گھر سے ایک بلاک کی دوری پر تھا۔ چابی کامی کے پاس ہوتی تھی وہ خود گھر آجاتا۔ جب وہ بارہ سال کا ہوا تو رعنا نے اسے موبائل فون دلایا کہ کسی مشکل میں وہ اسے کال کرسکے۔ مگر کال کا موقع بھی نہیں آیا تھا چھوٹی موٹی بات ہوتی تو کامی اسے کال کرکے بتادیتا تھا مگر اس نے رعنا سے مدد طلب نہیں کی اور نہ ہی اس کی وجہ سے رعنا کو کبھی قبل از وقت دفتر سے نکل کر آنا پڑا۔

وہ شام کو گھر آتی تو گھر صاف ستھرا ہوتا اور تمام کام نمٹے ہوتے تھے۔ کامی کو بچپن میں بھی چیزیں پھیلانے کی عادت نہیں تھی اور ذرا بڑے ہونے پر تو اس نے پھیلی چیزیں سمیٹنا شروع کردی تھیں۔ اس سے ذرا بھی بے ترتیبی برداشت نہیں ہوتی تھی۔ رات کے کھانے میں رعنا کافی اہتمام کرتی تھی اور عام طور سے کامی کی پسند کی چیز بنتی تھی۔ اسے چاول کی ڈشز پسند تھیں اس لیے رعنا زیادہ تر وہی بناتی تھی۔ کبھی کبھی وہ کھانے کے لیے باہر بھی چلے جاتے تھے۔

جیسے جیسے کامی بڑا ہورہا تھا۔ رعنا پر ذمے داریاں کم ہوتی جارہی تھیں۔ کامی نے میٹرک کرنے کے بعد ایک ڈرائیونگ انسٹی ٹیوٹ سے ڈرائیونگ سیکھی اور اس کا لرننگ لائسنس بھی بن گیا۔ اس کے بعد وہ کہیں مل کر جاتے تو کامی ہی ڈرائیو کرتا تھا۔ اب ہر کام کے لیے رعنا کو نہیں جانا پڑتا تھا۔ گھر کی چیزیں اور سودا سلف کامی لانے لگا تھا۔ رات کو کھانا بناتے ہوئے وہ رعنا کا ہاتھ بھی بٹاتا تھا۔

کامی کے دوستوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں تھی۔ وہ کھیلنے کے لیے شام کے وقت جاتا اور عام طور سے مغرب سے پہلے گھر آجاتا تھا۔ پھر صرف ضرورت کے وقت ہی باہر جاتا۔ اس نے اپنے دوستوں کو بھی منع کیا ہوا تھا کہ وہ شام کے بعد اس کے گھر نہ آئیں۔ اسے رعنا کے ساتھ گھر میں رہنا پسند تھا۔ وہ اس کی مدد کرتا تھوڑا بہت ٹی وی دیکھ لیتا اور رات کا کھانا کھا کر نو بجتے ہی بیڈ روم کا رخ کرتا تھا۔ اس کے سونے کے بعد رعنا کچھ دیر ٹی وی دیکھتی یا پھر پڑھتی تھی لیکن وہ بھی عام طور سے ساڑھے دس بجے تک سونے کے لیے لیٹ جاتی تھی۔

رعنا سوچ رہی تھی کہ کامی کے پاس اتنی ڈھیر ساری مصروفیات میں وقت ہی کہاں ہوتا تھا جو وہ باہر کسی لڑکی سے ملتا۔ اس کے معمولات گھڑی کے بندھے تھے مگر وہ اس دن بھی تو

اس ریستوران میں تھا۔ لوگوں اور ویٹرز کا بیان ہے کہ وہ اکیلا تھا مگر اس نے اپنے لیے کچھ منگوایا نہیں تھا پھر وہ وہاں کیوں موجود تھا؟ کیا اسے کسی سے ملنا تھا اور وہ اس کا انتظار کررہا تھا؟ ریستوران شہر کے ایک بہت پوش علاقے میں تھا اور وہ جگہ ان کے گھر اور کامی کی یونیورسٹی سے خاصی دور پڑتی تھی تب وہ وہاں کیوں گیا تھا؟ ایک دن پہلے اس نے ڈنرٹیبل پر رعنا کو تفصیل سے بتایا تھا کہ گزشتہ روز اس کے معمولات کیا تھے اور اسے اگلے دن کئی اہم لیکچرز نوٹ کرنے تھے اور اس کے بعد وہ لائبریری جاتا۔ یونیورسٹی سے وہ دو بجے نکل جاتا تھا اور اس کے بعد وہ کم سے کم دو گھنٹے لائبریری میں بیٹھتا تو وہ سہ پہر ساڑھے تین بجے اس ریستوران میں کیوں موجود تھا؟

رعنا کچن میں کام کررہی تھی، سوالات کی بھرمار نے اسے ایسا حواس باختہ کیا کہ اس کے سامنے ہانڈی لگ گئی اور اسے پتا نہیں چلا۔ جب تیز بو کے ساتھ دھواں بھی اٹھنے لگا تب وہ چونکی اور اس نے گہری سانس لی اور خود سے کہا۔ ''میں کیوں فضول باتیں سوچ رہی ہوں۔ جب کہ میں اپنے بیٹے کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ کوئی غلط کام نہیں کرسکتا۔''

اس کا اب کھانا کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے چائے بنائی اور اپنے کمرے میں آگئی۔ دفتر جانے سے یہ ہوا کہ صبح سے شام تک کا وقت آسانی سے گزرنے لگا تھا مگر اس کے بعد کا وقت کاٹنا بہت دشوار ہوجاتا تھا۔ گھر میں ہر جگہ، ہر قدم پر اور ہر عمل میں کامی کی یاد آتی اور اس کے لیے خود پر قابو رکھنا دشوار ہوجاتا۔ اب یہ نیا مسئلہ سامنے آگیا تھا۔ اس نے انکار کیا مگر اس سے سوالات کا سلسلہ رکا نہیں۔ آنے والے کئی دنوں تک وہ ان سوالات کو بہ ظاہر نظرانداز کرتی رہی مگر درحقیقت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شدت میں اضافہ ہورہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ ایسا کچھ ہے جس سے وہ بے خبر تھی۔ اگر وہ لڑکی کامی سے ہی تعلق رکھتی تھی تو بہت کچھ تھا جس کا اسے علم نہیں تھا۔ اسے خیال آیا کہ وہ کامی کے دوستوں سے پوچھے لیکن پھر اس نے یہ خیال مسترد کردیا۔ اسے اچھا نہیں لگا کہ وہ اپنے مرحوم بیٹے کے ماضی کے بارے میں اس کے دوستوں سے پوچھے۔ ہوسکتا ہے وہ لاعلم ہوں اور اس کے بعد وہ کامی کے بارے میں سوچیں۔ تب وہ حقیقت تک کیسے پہنچ سکے گی؟

اگلے دن وہ آفس میں تھی۔ دوپہر میں ڈائریکٹر فنانس اشرف صاحب نے میٹنگ بلالی۔ وہ اپنے شعبے میں نائب تھی اس لیے اس کی شرکت بھی لازمی تھی۔ میٹنگ کے دوران اس کا دماغ الجھا رہا اور جب اشرف صاحب نے اسے دوسری بار مخاطب کیا تو وہ چونکی۔ اشرف صاحب پوچھ رہے تھے۔ ''مسز رعنا آر یو او کے؟''

''یس سر...... سوری سر۔'' اس نے معذرت کی۔ ''میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔''

''تو آپ چھٹی کرلیتیں۔'' وہ ہمدردی سے بولے۔ انہیں علم تھا کہ رعنا کس سانحے سے گزری ہے۔ ''بلکہ ایسا کریں چند دن کی چھٹی لے لیں۔''

رعنا چھٹی نہیں کرنا چاہتی تھی، اشرف صاحب کی بات پر اس نے سر ہلایا۔ ''تھینک یو سر ناؤ آئی ایم بیٹر۔''

رعنا واپس اپنے کمرے میں آئی تو کام کرنے کے بجائے وہ کسی سوچ میں گم تھی۔ چار بجے وہ اشرف صاحب کے کمرے میں آئی۔ اس نے کہا۔ ''سر! میں نے آپ کی بات پر غور کیا ہے، مجھے واقعی چند دن آرام کی ضرورت ہے۔''

''آپ نے درست فیصلہ کیا ہے۔ ایسا کریں منڈے سے چھٹی کی درخواست دے دیں، آج فرائی ڈے ہے آپ پانچ دن کی چھٹی لیں تو آپ کو نو دن کی چھٹی مل جائے گی۔ نیکسٹ منڈے تک۔''

رعنا نے ان کا شکریہ ادا کیا اور درخواست دے دی جو اشرف صاحب نے اسی وقت منظور کرلی۔ رعنا چھٹی کے وقت دفتر سے نکلی اور اس نے نازیہ کو کال کی۔ دفتر کے ساتھیوں سے ہٹ کر اگر اس کی کسی سے ملاقات ہوتی تو وہ نازیہ ہی تھی جو اس کے بہت قریب تھی۔ جاوید کی طرح کامی کی جدائی پر بھی اس نے رعنا کا پورا ساتھ دیا تھا۔ نازیہ کی شادی ہوگئی تھی اور اس کے چار بچے تھے۔ نازیہ کا شوہر اقبال ایک غیر ملکی بینک میں منیجر تھا۔ ان کی رہائش رعنا کے علاقے میں تھی۔ اس لیے نازیہ جلدی جلدی چکر لگاتی رہتی تھی۔ درمیان میں ملنا ذرا کم ہوگیا تھا مگر کامی کی وفات کے بعد وہ رعنا کا خاص خیال رکھ رہی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی اور بولی۔ ''میں ابھی تمہارا ہی سوچ رہی تھی کیا خیال ہے آج ڈنر ہمارے ساتھ کرو؟''

''میں نے اسی لیے کال کی ہے۔ میں دفتر سے نکلی ہوں لیکن گھر سے ہوکر آؤں گی۔''

''ٹھیک ہے لیکن جلدی آنا۔''

''ہاں جلدی آؤں گی، مجھے تم سے کچھ بات بھی کرنی ہے۔'' رعنا نے جواب دیا۔

دو گھنٹے بعد وہ نازیہ کے گھر میں اس کے ڈرائنگ روم میں موجود تھی۔ لاؤنج میں بچے ٹی وی دیکھ رہے تھے اور

اقبال بینک کی طرف سے ان دنوں آسٹریلیا گیا ہوا تھا اس لیے ان کی گفتگو میں مداخلت کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ رعنا نے اسے کامی کے کمپیوٹر میں موجود لڑکی کی تصاویر اور اس کے بعد اپنے ذہن میں آنے والے خیالات اور احساسات کے بارے میں کھل کر بتایا۔ نازیہ ایسی ہستی تھی جس سے وہ سب شیئر کرسکتی تھی۔ نازیہ خاموشی سے سنتی رہی۔ جب رعنا نے بات مکمل کی تو اس نے کہا۔ ”میں تم سے متفق ہوں، تمہاری جگہ میں ہوتی تو میرے ذہن میں بھی یہی سوالات آتے۔“

”میں کیا کروں، میں ان سوالوں سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہوں لیکن چھڑا نہیں پا رہی۔“

”ممکن ہے ان سوالوں میں ہی تمہارے ان سوالوں کا جواب بھی ہو جو کامی کی وفات پر تمہارے ذہن میں آئے تھے۔“ نازیہ نے کہا تو رعنا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اسے لگا جیسے نازیہ کی بات نے اس کے ذہن میں کوئی کھڑکی سی کھول دی ہو۔ اس کے بعد ان کے درمیان اس موضوع پر مزید بات نہیں ہوئی۔ وہ ہلکی پھلکی گفتگو کرتی رہیں۔ نازیہ کو پتا چلا کہ اس نے دفتر سے چھٹی لی ہے تو وہ بولی۔ ”ایسا کرو میرے پاس آجاؤ، کل اور پرسوں بچوں کی اسکول کی چھٹی ہے۔ تفریح کے کچھ پروگرام ہیں تمہارا دل بھی بہل جائے گا۔“

”میں سوچوں گی۔“ رعنا نے کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ کہا۔ نازیہ ڈنر کی تیاری کے لیے اٹھی تو رعنا بھی اس کے ساتھ آگئی۔ انہوں نے مل کر سارا کام کیا۔ ڈنر کے بعد وہ نازیہ کے اصرار کے باوجود جانے لگی۔ نازیہ نے اس شرط پر اجازت دی کہ وہ کل لازمی آئے گی۔ رعنا مان گئی۔ گھر میں داخل ہو کر وہ اپنے بیڈ روم کی طرف جا رہی تھی کہ کامی کے بیڈ روم کے سامنے رک گئی۔ پھر وہ دروازہ کھول کر اندر آئی، اس نے کمپیوٹر آن کیا۔ کامی کا مخصوص فولڈر اس کی مائی ڈاکیومنٹس میں تھا۔ رعنا نے پہلے کمپیوٹر میں کامی کی دوسری چیزیں دیکھیں مگر اسے اور کچھ خاص نہیں ملا۔ پھر اس نے فولڈر کھول کر لڑکی کی تصویر اوپن کی اور پھر ایک ایک کرکے اس کی ساری تصاویر دیکھ لیں اور آخر میں اس نے دو تصاویر منتخب کرکے انہیں پرنٹر سے نکالا۔ دونوں تصاویر اے فور سائز کے ایک ہی صفحے پر تھیں۔ اپنے کمرے میں لاکر رعنا نے انہیں قینچی سے کاٹ کر الگ کیا۔ اس رات سونے سے پہلے وہ سوچتی رہی کہ یہ لڑکی کون ہے اور کہاں ہے؟ صبح ناشتے کے بعد اس نے گھر صاف کیا۔ زرینہ دوپہر تک آتی تھی۔ مگر رعنا نے اسے کال کرکے منع کردیا۔

”آج میں گھر پر نہیں ہوں گی، تم اب پیر والے دن آنا۔“

زرینہ کے پاس گھر کی چابی تھی، وہ دوپہر میں آکر کام کرکے چلی جاتی تھی۔ رعنا کو اس پر پورا اعتماد تھا اسی لیے اس نے چابی اس کے حوالے کردی تھی۔ گھر سے نکلنے سے پہلے اس نے شاور لیا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا اور آنکھوں کے نیچے حلقے تھے۔ اگرچہ اب وہ خاصی بہتر ہو گئی تھی لیکن اس سانحے کے اثرات پوری طرح گئے نہیں تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ دیکھنے والوں کو بہتر نظر آئے اور کوئی خاص طور سے اس کی طرف متوجہ نہ ہو۔ سن گلاسز لگا کر وہ باہر آئی تو کسی قدر گرمی تھی، اس نے کار کا اے سی آن کرلیا اور روانہ ہو گئی۔ ابھی وہ ڈرائیو کر رہی تھی کہ نازیہ کی کال آگئی۔ ٹریفک کا شور سن کر اس نے پوچھا۔ ”تم راستے میں ہو؟“

”ہاں۔“

”کب تک پہنچ جاؤ گی؟“

”نازیہ اصل میں، میں تمہاری طرف نہیں آرہی ہوں۔“ وہ کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ بولی۔

”لیکن کیوں؟“ نازیہ چلا اٹھی۔ ”پھر کہاں جا رہی ہو؟“

رعنا نے کار روک دی۔ ”اسی ریستوران جہاں کامی کا ......مرڈر ہوا تھا۔“

نازیہ کچھ دیر کے لیے چپ ہو گئی۔ ”لیکن کیوں رعنا؟“

”میں نہیں جانتی۔“ رعنا نے آہستہ سے کہا۔ ”اوکے میں تمہیں بعد میں کال کروں گی۔“

”رعنا! میری بات تو سنو......“ نازیہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ کال کاٹ کر نیچے اتر آئی۔ وہ اس ریستوران کی پارکنگ میں تھی۔ جس وقت وہ کار سے اتر رہی تھی تو اچانک ہی ایک بڑی سلور رنگ کی کار آئی اور اس کی کار کے برابر میں رکی۔ اس کی رفتار کسی قدر تیز تھی۔ کار اس سے ذرا دور رکی تھی۔ رعنا ساکت رہ گئی۔ دوسری طرف سے ایک مرد اترا۔ کنپٹی سے سفید ہوتے بالوں سے اس کی عمر کا پتا چل رہا تھا، اس کے باوجود وہ دیکھنے میں چالیس بیالیس سے زیادہ کا نہیں لگ رہا تھا۔ قد متوسط سے ذرا زیادہ اور جسم درمیانہ تھا۔ اس نے تھری پیس سوٹ پہنا ہوا تھا اور خاصا خوش شکل مرد تھا۔ وہ اترتے ہی رعنا کی طرف دیکھ کر معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ”سوری مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ کار سے اتر رہی ہوں گی میری رفتار بھی تیز تھی۔ آپ ٹھیک ہیں نا؟“

رعنا ایک لمحے کو خوفزدہ ہو گئی تھی کیونکہ اگر وہ ایک قدم بھی آگے ہوتی تو کار کی زد میں آجاتی۔ اس نے سر ہلایا۔ ”اٹس او کے آئی ایم فائن۔“

''پھر بھی میری طرف سے ایک بار پھر معذرت۔''

وہ آگے تھا۔ رعنا اندر جانے لگی تو اس نے رعنا کے لیے دروازہ کھولا۔ صبح کے ساڑھے دس بج رہے تھے، ناشتے کا وقت ختم ہو گیا تھا اور لنچ کا وقت ابھی دور تھا اس لیے وہاں صرف چند ایک افراد ہی تھے۔ جو کسی وجہ سے وقت گزاری کر رہے تھے یا کسی سے ملاقات کے لیے وہاں آئے تھے۔ ریستوران زیادہ بڑا نہیں تھا مگر اعلیٰ درجے کا اور بہترین فرنیچر سے آراستہ تھا۔ جگہ جگہ بڑے سائز کے آرائشی گملے رکھے تھے جن میں خوب صورت پودے لگے تھے۔ ایک طرف کرسیوں اور میز والی سٹنگ تھی اور دوسری طرف گدیلی سٹنگ تھی۔ تین طرف لگے نیلگوں شیشوں سے باہر کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ذرا دور سمندر تھا۔ رعنا ایک کونے والی میز تک آئی، یہ جگہ باقی ہال سے کسی قدر الگ تھلگ تھی۔ اس کے بیٹھتے ہی ایک ویٹر آ گیا۔ اس نے مؤدبانہ انداز میں پوچھا۔ ''یس میڈم؟''

''اورنج جوس لے آؤ۔'' رعنا نے کہا۔

''اور کچھ میڈم؟''

''فی الحال یہی لاؤ۔''

ویٹر چلا گیا، وہ تقریباً پچیس برس کا خوش شکل نوجوان تھا۔ لہجہ مہذب تھا مگر زبان سے معمولی پڑھا لکھا لگ رہا تھا۔ دس منٹ بعد وہ اس کے لیے اورنج جوس لے آیا۔ اس وقت رعنا میز پر کامی کی کچھ تصویریں رکھ کر ان کا معائنہ کر رہی تھی اور ویٹر تصویریں دیکھ کر واضح طور پر چونکا تھا۔ یقیناً اس نے کامی کو شناخت کر لیا تھا۔ اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ ''میڈم یہ......''

''میرا بیٹا ہے، کامران۔'' رعنا نے کہا۔ ''تم نے پہچان لیا ہے؟''

''مجھے افسوس ہے میڈم۔'' ویٹر نے آہستہ سے کہا۔ ''میں نے انہیں کئی بار سرو کیا تھا لیکن جب یہ حادثہ ہوا تو میں ڈیوٹی پر نہیں تھا۔''

چونکہ ویٹر کئی بار کامی کو سرو کر چکا تھا اسی لیے اس نے فوراً اس کی تصویریں شناخت کر لیں۔ اس کا مطلب تھا کہ کامی کئی بار یہاں آ چکا تھا مگر اس نے کبھی رعنا کو نہیں بتایا کہ وہ اس ریستوران میں آتا تھا۔ جب وہ یونیورسٹی میں آیا تو رعنا نے اسے بائیک دلائی تھی تاکہ اسے پبلک ٹرانسپورٹ میں دھکے نہ کھانے پڑیں۔ ویسے بھی وہ بڑا ہو گیا تھا اور اس کا حلقۂ احباب بھی محلے سے بڑھ کر دوسرے علاقوں تک پھیل گیا تھا اور اسے کئی جگہوں پر جانا ہوتا تھا اس لیے بائیک لازمی تھی۔ ویٹر نے خود سے بات چھیڑی تھی اس لیے رعنا کو اب اس سے بات کرنے میں آسانی ہو گئی تھی اس نے کہا۔

''کامی...... کامران اکیلا آتا تھا؟''

ویٹر ہچکچایا۔ ''نہیں جی ان کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہوتی تھی۔''

رعنا نے پرس سے لڑکی کی پرنٹ شدہ تصویریں نکال کر میز پر رکھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اور اسے ویٹر سے کسی کے بارے میں بات کرتے دیکھے۔ اس نے کامی کی تصاویر بھی میز پر رکھی تھیں۔ ویٹر نے ذرا جھک کر دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔ ''یہی لڑکی ہوتی تھی۔''

رعنا نے تمام تصویریں واپس پرس میں رکھ لیں اور ویٹر سے کہا۔ ''تمہارا شکریہ۔ جاؤ اور دس منٹ بعد میرے لیے چائے لے آنا۔''

ویٹر چلا گیا اور رعنا اورنج جوس کے گھونٹ لینے لگی مگر اس کا ذہن پہلے سے زیادہ الجھ گیا تھا۔ اس نے لڑکی کے متعلق جو مفروضہ قائم کیا تھا وہ غلط ثابت ہوا۔ لڑکی کامی کی گرل فرینڈ ہی تھی اور کامی نے ہی اس کی تصاویر پر نام دیے تھے۔ رعنا سوچ رہی تھی کہ کامی کے بارے میں اس کا اندازہ غلط ثابت ہوا تھا لڑکیوں کے معاملے میں وہ عام سا نوجوان ہی ثابت ہوا تھا۔ بے شک وہ پڑھنے میں بہت تیز تھا اس طرح آج کل کے نوجوانوں کی طرح اس میں بے پروائی بھی نہیں تھی مگر وہ صنفِ نازک سے جتنی بے رغبتی اور بے اعتنائی کا اظہار کرتا تھا وہ آج غلط نکلی تھی۔ رعنا کے دل میں ٹیس سی اٹھی، اس نے زیرِ لب کہا۔ ''میرے بچے تم نے یہ کام کیا تھا تو اپنی ماں پر تو اعتماد کر لیتے۔ اگر تم اس لڑکی میں دلچسپی رکھتے تھے تو میں خود تمہارا رشتہ لے کر جاتی۔''

یہ کہتے ہوئے رعنا کو خیال آیا کہ کیا کامی اس لڑکی سے مخلص تھا یا صرف وقت گزاری کر رہا تھا؟ شاید اس نے اسی وجہ سے اس لڑکی سے بے خبر رکھا۔ کاش کہ وہ کسی طرح اس لڑکی کے بارے میں جان سکے۔ وہ سوچوں میں گم تھی کہ ویٹر چائے لے آیا اس نے گول ٹرے میز پر رکھی جس پر چائے کے تمام لوازمات الگ سے موجود تھے۔ رعنا نے اپنی چائے میں دودھ اور شکر ملائی۔ ویٹر وہیں موجود تھا۔ رعنا نے محسوس کیا کہ جب اس نے تصویریں شناخت کرانے کے بعد اس سے مزید کچھ نہیں پوچھا اور چائے لانے کو کہا تو وہ کسی قدر مایوس ہو کر گیا تھا۔ رعنا نے کہا۔ ''میں ایک بار پھر تمہاری شکر گزار ہوں لیکن کیا تم میری ایک مدد اور کر سکتے ہو؟''

"کیسی مدد میڈم؟" ویٹر محتاط ہو گیا۔

"میں اس لڑکی کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔"

ویٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ "سوری میڈم میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

ویٹر نے جتنی عجلت میں انکار کیا رعنا کھٹک گئی کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور جانتا ہے۔ اس نے اپنے پرس سے پیسے نکالے اور ایک سو کا نوٹ میز پر رکھا۔ "یہ تمہاری سپیشل ٹپ ہے۔ اس کا بل کی ٹپ سے تعلق نہیں ہے۔"

ویٹر ہچکچایا مگر اس نے نوٹ اٹھا لیا اور اسے سلام کر کے چلا گیا۔ رعنا نے اس کے سامنے چارہ ڈالا تھا۔ اب وہ انتظار کر رہی تھی کہ مچھلی چارے پر منہ مارتی ہے یا نہیں۔ ممکن تھا وہ اپنے انکار پر قائم رہتا اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ لڑکی کے بارے میں مفت میں بتانے پر ہچکچا رہا ہو۔ رعنا کے خیال میں دوسری بات زیادہ بہتر تھی۔ اسی صورت میں بات آگے بڑھتی۔ چائے ختم کر کے اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا، ویٹر فوراً آن موجود ہوا تھا۔ رعنا نے اس سے بل لانے کو کہا۔ وہ برتن اٹھا کر لے گیا اور بل لے آیا۔ رعنا نے پانچ سو کا نوٹ رکھا اور پھر ویٹر کو الگ سے سو کا ایک نوٹ دیا۔ اس نے سلام کر کے نوٹ جیب میں غائب کیا اور آہستہ سے بولا۔ "ایک بلاک آگے شائن بوتیک ہے۔ میں دو بجے وہاں آؤں گا۔ آپ انتظار کیجیے گا۔"

رعنا کا دل دھڑک اٹھا۔ "میں انتظار کروں گی۔"

دو بجنے میں بہت وقت تھا۔ رعنا نے شائن بوتیک دیکھا اور پھر سڑکوں پر بلا مقصد کار گھمانے لگی۔ وہ وقت گزاری کر رہی تھی اور وقت تھا کہ گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ ایک گھنٹے بعد جب کار میں گیس ختم ہونے لگی تو وہ ایک پارک کے پاس رک گئی۔ چھٹی کا دن تھا اور دن کے ابتدائی حصے میں وہاں بچے اور عورتیں آئی ہوئی تھیں اس لیے رعنا بھی اتر کر اندر آ گئی۔ عورتیں آپس میں بات کر رہی تھیں اور بچے شور مچا رہے تھے۔ ایک بجے پارک خالی ہونے لگا اور ڈیڑھ بجے تک وہاں سناٹا چھا گیا۔ رعنا اکیلی بیٹھی رہ گئی تو اسے عجیب سا لگنے لگا اس لیے وہ بھی اٹھ گئی۔ کچھ وقت کار میں گزار کر وہ دو بجے سے ذرا پہلے شائن بوتیک کے سامنے پہنچ گئی۔ کئی بڑی دکانوں پر مشتمل اس بوتیک کی تمام بیرونی دیواریں شیشے کی تھیں۔ اس نے کار پارکنگ میں روک دی اور انتظار کرنے لگی۔ ویٹر ذرا تاخیر سے سوا دو بجے نمودار ہوا اور جب وہ نزدیک آیا تو رعنا نے اسے پہچانا کیونکہ وہ سادہ لباس میں تھا۔ اس نے کھڑکی کا شیشہ بجایا۔ رعنا نے شیشہ نیچے کیا۔

"میڈم۔" ویٹر نے سرگوشی میں کہا حالانکہ وہاں کوئی نہیں تھا۔ "میرے پاس اس لڑکی کے آئی ڈی کارڈ کی کاپی ہے۔"

"کہاں ہے؟" رعنا نے بے تابی سے کہا۔ جواب میں ویٹر نے اسے ایک فوٹو کاپی اس طرح دکھائی کہ صرف لڑکی کی تصویر والا حصہ آ رہا تھا۔ یہ اچھی قسم کی فوٹو کاپی تھی مگر اس کے باوجود تصویر نمایاں نہیں تھی بس رعنا کو لگا کہ یہ وہی لڑکی ہے۔ اس نے مطالبہ کیا۔ "مجھے دو۔"

مگر ویٹر نے ہاتھ پیچھے کر لیا وہ خاموش رہا تھا۔ رعنا نے گہری سانس لی اور پرس کھول کر ایک پانچ سو کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا مگر اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ اگلی بار رعنا نے ہزار کا نوٹ دیا اور اس بار بھی وہ ساکت کھڑا رہا تو رعنا جھنجلا گئی۔ "تم کیا چاہتے ہو؟"

"دس ہزار روپے۔" ویٹر نے جواب دیا۔

"تمہارا دماغ درست ہے؟ دس ہزار کس چیز کے؟" رعنا کو غصہ آ گیا۔

"ٹھیک ہے آپ کو اس کی ضرورت نہیں ہے شاید۔" ویٹر نے اکھڑے لہجے میں کہا اور جانے کے لیے مڑا۔

"ایک منٹ۔" رعنا نیچے اتر آئی۔ "تم اس طرح نہیں جا سکتے، مجھے یہ کاپی چاہیے۔"

"میں نے قیمت بتا دی ہے۔" وہ بدتمیزی سے بولا۔ اس کا رویہ بالکل بدل گیا تھا۔ "یہ چاہیے تو دو ورنہ مرضی تمہاری۔"

پرس میں رعنا کے پاس کل چار ہزار کی رقم تھی۔

"میرے پاس چار ہزار روپے ہیں اس وقت۔"

"کوئی بات نہیں، باقی کے چھ ہزار لے آؤ میں کل اسی جگہ ملوں گا۔"

رعنا کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ "سنو میرے ساتھ کسی اے ٹی ایم تک چلو میں ابھی تمہیں رقم نکال دوں گی۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ تم جا کر لے آؤ میں یہیں موجود ہوں۔"

ویٹر بہت ہوشیار ثابت ہو رہا تھا شاید اسے خوف تھا کہ کہیں رعنا اسے پھنسا نہ دے۔ وہ غریب تھا معاملہ پولیس تک جاتا تو رعنا کی بات سنی جاتی۔ مجبوراً رعنا روانہ ہوئی۔ اسے اس جگہ کا پتا نہیں تھا مگر خوش قسمتی سے ایک اے ٹی ایم پاس ہی مل گیا اور وہ رقم نکلوا کر لے آئی۔ ویٹر بوتیک کے سامنے نہیں تھا مگر جیسے ہی رعنا نے کار روکی وہ نمودار ہوا اور تیر کی طرح اس کے پاس آیا۔ "تم رقم لے آئی ہو؟"

اس بار رعنا کو اس کے لہجے پر غصہ آ گیا۔ "یہ تم بات

کس طرح کر رہے ہو؟ تمیز سے بات کرو۔"

"میں اسی طرح بات کرتا ہوں' رقم دو۔" ویٹر بھی تیز لہجے میں بولا۔ رعنا کا اندازہ ٹھیک نکلا، وہ معمولی پڑھا لکھا تھا۔

"نہیں' پہلے مجھے کاپی دو میں اپنی تسلی کر کے رقم دوں گی۔"

"رقم لیے بغیر میں اسے دیکھنے بھی نہیں دوں گا تم نے پتا یا نمبر دیکھ لیا تو پھر مجھے رقم کہاں دو گی۔"

"ایکسکیوز می۔" قریب سے آواز آئی۔ رعنا نے مڑ کر دیکھا تو سلور کار والا آدمی نزدیک ہی کھڑا تھا۔ وہ شاید بوتیک کے اندر سے نکلا تھا کیونکہ اس کے ہاتھ میں ایک شاپر تھا۔ وہ رعنا سے مخاطب تھا۔ "اینی پرابلم؟"

آدمی کو دیکھتے ہی ویٹر کا رنگ اڑ گیا اور وہ پھر سے شریف نظر آنے کی کوشش کرنے لگا۔ رعنا نے اسے دیکھا اور بولی۔ "تھینک گاڈ تھینکس۔"

آدمی اپنی کار کی طرف بڑھا اور رعنا نے ویٹر کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس بار اس نے شرافت سے کاپی اسے تھمادی۔ رعنا نے اپنی تسلی کر کے اسے رقم دے دی۔ وہ رقم لیتے ہی وہاں سے روانہ ہو گیا تھا۔ فوٹو کاپی والی تصویر لڑکی کی تصویر سے مل رہی تھی مگر رعنا کو سو فیصد یقین نہیں تھا۔ کاپی پر لڑکی کا نام ندا سہیل اور پتا رعنا کے گھر سے کچھ دور ایک پوش سوسائٹی کا تھا۔ لڑکی غیر شادی شدہ تھی کیونکہ اس کے ساتھ باپ کا نام تھا۔ شناختی کارڈ دو سال پرانا تھا اور رعنا کا اندازہ درست ثابت ہوا تھا، وہ کامی سے دو سال بڑی تھی۔ اس کی تاریخ پیدائش کے مطابق اس کی عمر اکیس سال سے ذرا زیادہ بن رہی تھی۔ مگر یہ ابھی مفروضہ تھا جب تک وہ خود اس لڑکی سے نہیں مل لیتی وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ یہ وہی لڑکی ہے۔ وہ ویٹر سے جاننا چاہتی تھی کہ اس کے پاس لڑکی کے آئی ڈی کارڈ کی کاپی کیسے آئی مگر وہ رکا ہی نہیں۔ رقم لیتے ہی تو دو گیارہ ہو گیا۔

رعنا اس چکر میں کافی تھک گئی تھی مگر اس نے بڑی کامیابی حاصل کی تھی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ اسے اتنی معلومات مل جائیں گی۔ دس ہزار روپے خرچ ہوئے تھے لیکن وہ جان گئی تھی کہ کامی کا اس لڑکی سے تعلق تھا اور اب اس کے پاس لڑکی کے آئی ڈی کارڈ کی کاپی بھی تھی۔ وہ گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ اسے خیال آیا کہ وہ اپنے مرجانے والے بیٹے کی جاسوسی کر رہی ہے کیا یہ اچھی بات ہے؟ اس کے اندر سے کوئی کہنے لگا کہ وہ اس سلسلے کو یہیں روک دے۔ شاید اسے کوئی بہت دکھ دینے والی خبر ملے۔ مگر اب اس کے لیے رکنا مشکل تھا۔ وہ اتنا جان چکی تھی کہ اب سب جانے بغیر رہنا ممکن نہیں تھا۔ گھر آ کر وہ نڈھال سی بستر پر گر گئی جیسے کوئی بہت مشقت والا کام کر کے آ رہی ہو۔ جسم سے زیادہ اس کے اعصاب تھکے ہوئے تھے۔ کھانے کے بجائے چائے کی طلب تھی مگر اتنی ہمت نہیں تھی کہ اٹھ کر چائے بنالیتی۔

پھر اسے اونگھ آ گئی اور جب پانچ بجے اس کی آنکھ کھلی تو وہ خود کو بہتر محسوس کر رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر منہ دھویا اور کچن میں آئی' چائے بناتے ہوئے وہ آج ہونے والی پیش رفت پر سوچ رہی تھی۔ عجیب بات تھی اسے ویٹر سے زیادہ اس شخص کا خیال آ رہا تھا جو دو بار اس سے ٹکرایا تھا' دوسری بار اس نے رعنا کی مدد کی تھی۔ اسی کی وجہ سے بدتمیز ویٹر نے شرافت کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ چائے بنا کر لاؤنج میں آئی اور ابھی چائے پی کر فارغ ہی ہوئی تھی کہ کال بیل بجی۔ دروازے پر نازیہ تھی۔ وہ بچوں کو ایک تفریحی پارک سے گھما کر لائی تھی اور انہیں گھر پر اتار کر سیدھی اس کے پاس چلی آئی تھی۔ اسے تجسس تھا۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔ "کیا چکر ہے تم اس ریستوران میں کیوں گئی تھیں؟"

رعنا نے اسے بتایا کہ اسے کیا کچھ معلوم ہوا تھا۔ وہ بھی حیران رہ گئی۔ "میں کامی کو ایسا نہیں سمجھتی ہوں۔"

رعنا نے ٹھنڈی سانس لی۔ "سمجھتی تو میں بھی ایسا نہیں تھی لیکن بہت کچھ انسان کی توقع کے مطابق نہیں ہوتا۔"

"یہ لڑکی ندا سہیل کہاں رہتی ہے؟"

"پتا نزدیک کا ہے۔" رعنا نے آئی ڈی کارڈ کی کاپی نکالی۔

نازیہ نے پتا نوٹ کر لیا۔ "کل اقبال آ جائیں گے میں ان سے کہتی ہوں اس کا پتا چلائیں۔"

رعنا نے اعتراض نہیں کیا' اس نے نازیہ کو کامی کے کمپیوٹر میں موجود ندا کی تصاویر دکھائیں۔ اس نے غور سے دیکھا۔ "لڑکی تو پیاری ہے اور آج کل کی لڑکیوں کی طرح دیدہ ہوائی بھی نہیں لگ رہی ہے۔"

"لیکن ہے تو لڑکی...... جو محبت کے ہاتھوں ہمیشہ مجبور ہو جاتی ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو، میں اقبال سے کہتی ہوں وہ معلوم کر لیں گے لیکن تم اس کے بعد کیا کرو گی؟"

رعنا ہچکچائی۔ "میں نے کچھ سوچا نہیں ہے، ممکن ہے کچھ نہ کروں اور ہو سکتا ہے اس سے مل بھی لوں۔"

نازیہ نے پرخیال نظروں سے اسے دیکھا۔ "بعض اوقات نہ جاننا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔"

''ہاں۔'' رعنا نے گہری سانس لی۔ ''لیکن میں اپنے اندر کی کھٹک کا کیا کروں؟''

نازیہ کچھ دیر بعد چلی گئی گھر میں اس کے بچے تھے۔ رعنا اس کی بات پر سوچتی رہی کہ بعض اوقات نہ جاننا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ اس کو بھی یہی خیال تھا مگر اس معاملے میں نہیں۔ وہ اسے آخر تک لے جانا چاہتی تھی۔ جب وہ نازیہ سے کہہ رہی تھی تب بھی اس کے اندر یہ احساس تھا کہ وہ پیچھے نہیں ہٹے گی۔ اگلے دن اتوار تھا، اس نے کال کر کے زرینہ کو آنے کا کہہ دیا تاکہ صفائی ٹھیک سے ہوسکے۔ دوپہر تک زرینہ سب نمٹا کر چلی بھی گئی۔ رعنا ٹی وی دیکھ رہی تھی کہ نازیہ کی کال آگئی۔ اس نے بتایا کہ اقبال مزید دو دن کی تاخیر سے واپس آئے گا۔ رعنا ذرا مایوس ہوئی کیونکہ وہ جلد از جلد ندا کے بارے میں جان لینا چاہتی تھی۔ نازیہ سے بات کر کے اس نے سوچا کہ اسے خود کچھ کرنا ہوگا۔

چار بجے اس نے کپڑے بدلے اور کار لے کر نکل آئی۔ اس کا رخ اسی سوسائٹی کی طرف تھا جس کا پتا ندا کے آئی ڈی کارڈ پر موجود تھا۔ سوسائٹی جدید قسم کی تھی اور وہاں یقیناً تعلیم یافتہ اور مہذب لوگ رہتے تھے مگر بہت کم نے اپنے دروازوں پر نمبر پلیٹ کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ اس لیے رعنا کو کئی بار پتا پوچھنا پڑا۔ بالآخر وہ اس چھوٹے سے خوب صورت مکان کے سامنے پہنچ گئی اس پر نمبر پلیٹ تھی لیکن اس پر نام کسی احمر الدین کا لکھا ہوا تھا۔ رعنا نے کال بیل کا بٹن دبایا تو اندر سے دس بارہ سال کا ایک بچہ نکلا۔

''جی آنٹی؟''

''بیٹا سہیل احمد کا گھر یہی ہے؟''

''نہیں آنٹی یہ تو ہمارا گھر ہے۔'' بچے نے جواب دیا۔

''آپ کی امی گھر پر ہیں؟''

بچہ اندر گیا اور ایک منٹ بعد اپنی ماں کو بلا لایا۔ عورت کی عمر چالیس کے آس پاس تھی اور وہ غالباً کام کرتے ہوئے آئی تھی کیونکہ اس کے کپڑوں اور ہاتھوں پر آٹے کے آثار تھے۔ اس نے سوالیہ نظروں سے رعنا کی طرف دیکھا تو اس نے وہی سوال کیا۔ عورت نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میرے شوہر نے سہیل صاحب سے یہ مکان خرید لیا ہے۔ ایک سال سے ہم یہاں رہ رہے ہیں۔''

رعنا مایوس ہوئی تھی۔ ''آپ کو پتا ہے کہ وہ کہاں گئے یہاں سے؟''

''شاید میرے شوہر کو پتا ہو لیکن وہ لاہور گئے ہوئے ہیں۔ ایک ہفتے بعد آئیں گے۔''

رعنا کی مایوسی بڑھ گئی۔ اس نے سر ہلایا۔ ''پلیز آپ ان سے فون پر پوچھ لیں اور میرا نمبر لے لیں یا اپنا نمبر مجھے دے دیں... میں بعد میں آپ سے معلوم کرلوں گی۔''

عورت نے سوچا اور بولی۔ ''اپنا نمبر مجھے دے دیں میں اپنے شوہر سے پوچھ کر بتاتی ہوں۔''

رعنا جانے کے لیے مڑی تھی کہ اچانک اسے خیال آیا۔ ''سہیل صاحب کی ایک بیٹی ہے ندا......''

''جی آنٹی۔'' عورت سے پہلے لڑکا بولا۔ ''وہ سامنے والی سمیرا باجی کے پاس آتی ہیں ان کی فرینڈ ہیں۔''

عورت نے بیٹے کو گھورا اور بولی۔ ''ندا کی شادی ہو گئی تھی ہمارے ہاں بھی کارڈ آیا تھا مگر ہم گئے نہیں تھے۔''

رعنا چونکی۔ ''شادی ہو گئی تھی یہ کب کی بات ہے؟''

''شاید سات مہینے پہلے کی، ہاں یاد آیا سات فروری کو تھی اس کی شادی۔''

''میں آپ کی شکر گزار ہوں۔'' رعنا نے کہا اور اسے اپنا نمبر دے دیا۔

''آپ کس سلسلے میں سہیل صاحب سے ملنا چاہتی ہیں؟'' عورت کو اب تجسس ہو رہا تھا۔

''مجھے اصل میں ندا سے ملنا تھا۔''

''ندا سے؟''

''وہ میری بیٹی کی کلاس فیلو تھی۔'' رعنا نے ہچکچا کر کہا اور اپنی کار کی طرف بڑھ گئی۔ عورت بچے سمیت اندر چلی گئی تھی۔ اس کے جاتے ہی رعنا نے رخ بدلا اور اس مکان کی طرف بڑھی جس کے بارے میں بچے نے کہا تھا کہ وہاں رہنے والی سمیرا سے ندا کی دوستی تھی۔ رعنا نے کال بیل بجائی۔ ایک نوجوان لڑکا باہر آیا۔

''جی فرمایئے؟''

''مجھے سمیرا سے ملنا ہے۔'' رعنا بولی۔

نوجوان نے غور سے اسے دیکھا۔ ''سمیرا میری بہن ہے، آپ اس سے کیوں ملنا چاہتی ہیں؟''

''مجھے ان سے ایک ضروری کام ہے۔''

''ایک منٹ......'' نوجوان کہہ کر اندر چلا گیا۔ اس کی واپسی پانچ منٹ بعد ہوئی تھی۔ رعنا نے کئی بار پلٹ کر سہیل احمد کے سابقہ مکان کی طرف دیکھا۔ اسے خدشہ تھا کہ عورت یا لڑکا نہ نکل آئیں۔ اگرچہ اس سے فرق نہیں پڑتا لیکن اس کا امکان تھا کہ وہ تجسس میں پڑ جائیں گے اور رعنا چاہتی تھی کہ اس بات کی اہمیت واضح نہ ہو۔ لڑکا واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک بیس بائیس سال کی مناسب سی لڑکی تھی۔ اس نے

مہذب انداز میں کہا۔

''آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہیں؟''

رعنا نے پیچھے کھڑے اس کے بھائی کو دیکھا اور بولی۔''کیا میں آپ سے اکیلے میں مل سکتی ہوں؟ دراصل مجھے ندا کے بارے میں بات کرنی ہے۔''

سمیرا ہچکچائی، اس نے پلٹ کر بھائی سے سرگوشی میں کچھ کہا اور اس نے کچھ جواب دیا۔ چند لمحے ان میں سرگوشیوں میں ہی تبادلۂ خیال ہوتا رہا پھر سمیرا پلٹ کر آئی۔''آیئے اندر آجائیں۔''

وہ اسے نشست گاہ میں لے آئی۔ رعنا نے اپنا تعارف کرایا۔ سمیرا بولی۔''آپ کیا پئیں گی؟''

''تکلف کی ضرورت نہیں ہے بس ایک گلاس سادہ پانی چاہیے۔''

سمیرا اندر گئی اور کولڈ ڈرنک لے آئی۔ وہ کسی قدر نروس تھی۔''آپ ندا کے بارے میں کیا بات کرنا چاہتی ہیں؟''

''آپ کی ندا سے پرانی دوستی ہے؟''

''بچپن سے۔'' سمیرا نے سر ہلایا۔''ہم ساتھ پڑھے اور ساتھ کھیلے ہیں۔ پڑوسی بھی تھے۔''

''پھر ندا اور اس کے گھر والے یہاں سے چلے گئے؟''

''ہاں وہ ایک سال پہلے یہاں سے چلے گئے تھے۔''

''شادی سے پہلے ندا پڑھ رہی تھی؟''

''ہاں کالج تک ہم نے ساتھ پڑھا تھا پھر ندا نے آنرز میں...... یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا۔'' سمیرا نے یونیورسٹی کا نام بتایا تو رعنا چونک گئی۔ یہ کامی کی یونیورسٹی تھی۔ اگر ندا نے آنرز میں داخلہ لیا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ اس کا آنرز مکمل نہیں ہوا تھا، رعنا نے اندازے کا تیر چلایا۔

''پھر آنرز مکمل ہونے سے پہلے اس کی شادی ہوگئی؟''

اس سوال پر سمیرا کسی قدر نروس نظر آنے لگی۔

''آں...... ہاں اس کا آنرز کمپلیٹ نہیں ہوا تھا۔'' اس نے ہچکچا کر کہا اور پوچھا۔''آپ اس سے واقف ہیں؟''

''میں ملی نہیں ہوں لیکن ملنا چاہتی ہوں۔'' رعنا نے سوچ کر جواب دیا اور یہاں بھی وہی جھوٹ بولا۔''میری بیٹی اس کے ساتھ پڑھتی تھی۔''

''تو آپ اپنی بیٹی سے اس کے بارے میں پوچھیں۔''

''نہیں پوچھ سکتی، اس کا انتقال ہوگیا ہے۔''

سمیرا جیسے شاک میں رہ گئی تھی۔ اس نے بہ مشکل کہا۔''مجھے افسوس ہے۔''

''اس کے انتقال کے بعد مجھے پتا چلا کہ اس کی ندا نامی لڑکی سے واقفیت تھی لیکن اس نے کبھی مجھ سے ذکر نہیں کیا۔'' رعنا نے دل ہی دل میں اپنے جھوٹ پر نادم ہوتے ہوئے کہا۔ اس بار سمیرا نے جیسے اطمینان کا سانس لیا۔ رعنا سوچ رہی تھی کہ کیا کوئی ایسی بات ہے جو اس لڑکی کو پریشان کر رہی ہے اور وہ رعنا سے اسی حوالے سے ڈر رہی ہو۔ مگر جیسے ہی رعنا نے بیٹی کا جھوٹ بولا وہ مطمئن نظر آنے لگی۔ سمیرا نے کہا۔

''آنٹی آپ مجھے اپنا نمبر دے دیں میں ندا کو دے دوں گی وہ آپ سے کونٹیکٹ کر لے گی۔''

''اگر تم مجھے اس کا نمبر دے دو تو میں خود اس سے رابطہ کر لوں گی۔'' رعنا نے ملتجی لہجے میں کہا۔''میں اس سے جلد بات کرنا چاہتی ہوں یا اگر نمبر نہیں دے سکتیں تو پتا دے دو۔''

سمیرا سوچ میں پڑ گئی۔ شاید وہ سوچ رہی تھی کہ اس پر اعتبار کرے یا نہ کرے۔ رعنا نے اپنے پرس سے اپنا آئی ڈی کارڈ، ڈرائیونگ لائسنس اور آفس کارڈ نکال کر اس کے سامنے رکھا۔''بیٹا یہ دیکھ لو، میں ورکنگ وومن ہوں اور ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتی ہوں۔ مجھ سے کوئی خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔ نہ تمہیں نہ ندا کو۔''

سمیرا نے تینوں چیزیں دیکھیں اور گہری سانس لے کر بولی۔''آنٹی میں آپ کو اس کا سیل نمبر دے سکتی ہوں لیکن ایک شرط کے ساتھ......''

رعنا نے جلدی سے کہا۔''میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ تمہارا نام نہیں لوں گی اور یقین کرو اس میں ایسی کوئی بات بھی نہیں ہے۔''

رعنا کے کہنے کے باوجود سمیرا کو اطمینان نہیں ہوا تھا اور اس نے بہ مشکل کئی بار یاد دہانی کے ساتھ اسے نمبر دیا تھا۔ رعنا اس کی بہت شکر گزار ہوئی تھی۔ وہ نکلتے نکلتے بھی اسے یقین دلاتی رہی کہ اس کا نام نہیں لے گی مگر گھر جاتے ہوئے اسے خیال آیا کہ سمیرا معمول سے زیادہ پریشان لگ رہی تھی، ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی بات سے واقف تھی۔ دوسرے اس نے محسوس کیا تھا کہ نشست گاہ کے آس پاس کوئی تھا شاید سمیرا کے گھر والے یا اس کا بھائی متجسس تھا کہ وہ اس کی بہن سے کیا بات کرنے آئی تھی؟ ویسے یہ فطری بات تھی۔ گھر والوں کو تجسس ہوتا ہے کہ ان کی بیٹی یا بہن سے کوئی ملنے کیوں آیا ہے؟ رعنا کے اندر یہ احساس بڑھنے لگا کہ کوئی ایسی بات سامنے آنے والی ہے جو اسے شاک کر دے گی۔

رعنا نے جان بوجھ کر سمیرا سے اس کی شادی پر بات نہیں کی۔ اسے خطرہ تھا کہ وہ کھٹک جائے گی اور پھر شاید

اسے ندا کا پتا یا فون نمبر نہیں ملے گا۔ پہلے اس نے سوچا کہ گھر جاتے ہی کال کرے گی مگر پھر اسے خیال آیا کہ ممکن ہے اس کا شوہر گھر میں ہو اور وہ اس کے سامنے کھل کر بات نہ کر سکے، ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ اس کے بارے میں جانتے ہی وہ کال کاٹ دے اور شاید نمبر بھی بند کر دے۔ یوں اس سے رابطہ ممکن نہ رہے۔ خاصے غور و خوض کے بعد رعنا نے فیصلہ کیا کہ وہ اسے اپنے بارے میں نہیں بتائے گی بلکہ کسی اور بہانے سے پتا حاصل کرنے کی کوشش کرے گی۔ وہ اس سے آمنے سامنے ملے گی، تب ہی بات ہو سکے گی مگر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ ایسا کیا کرے کہ ندا خوشی خوشی اسے اپنا پتا دے دے۔ رات کے کھانے کے بعد اس نے نازیہ کو کال کی اور اپنی کارگزاری سنائی۔ وہ ہنسی۔

''تم تو پوری جاسوس بنتی جا رہی ہو۔''

''مجبوری میں انسان سب کرتا ہے۔'' رعنا نے کہا۔ ''لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس کا پتا کیسے حاصل کروں۔ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''میں کوشش کرتی ہوں۔'' نازیہ بولی۔ ''مجھے اس کا سیل نمبر دو۔''

رعنا نے اسے ندا کا نمبر دیا۔ ''مگر احتیاط سے اسے کسی صورت پتا نہ چلے کہ اس کا نمبر کہاں سے ملا ہے۔''

''فکر مت کرو، میں نے سوچ لیا ہے کہ کیا کرنا ہے۔ میں کچھ دیر بعد کال کرتی ہوں۔'' نازیہ نے کال کاٹ دی۔ اس نے دس منٹ بعد کال کی تو ہنس رہی تھی۔ ''لو تمہارا کام بہت آسانی سے ہو گیا، پتا نوٹ کرلو۔''

رعنا نے پتا نوٹ کیا۔ پتا اس علاقے کا تھا جہاں ریستوران تھا۔ یہ بہت سپر لگژری اپارٹمنٹس تھے جو ریستوران سے کچھ ہی فاصلے پر تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ندا کا شوہر یا سسرال بہت دولت مند تھا۔ ''تم نے پتا کیسے لیا؟''

''بہت آسانی سے، میں نے اس سے کہا کہ سیل فون کمپنی کی طرف سے اس کے نمبر پر لکی ڈرا میں ایک اسمارٹ فون نکلا ہے۔ وہ پتا موجودہ پتا بتا دے تو اسے کوریئر سے اس کا گفٹ بھیج دیا جائے گا۔ اس نے فوراً بتا دیا۔ رعنا یہ لڑکی بہت سادہ ہے ورنہ ذرا بھی چالاک ہوتی تو اتنی آسانی سے بیوقوف نہ بنتی، میرا تو سیل نمبر بھی دوسری کمپنی کا ہے۔ ندا کا نمبر دوسری کمپنی کا ہے۔ یہ سامنے کی بات ہے کہ کسی موبائل کمپنی کا نمائندہ دوسری کمپنی کا نمبر تو استعمال نہیں کرے گا۔''

''ہو سکتا ہے۔'' رعنا نے سنجیدگی سے کہا۔ ''صورت سے بھی وہ سادہ ہی نظر آتی ہے۔''

''اب تم کیا کرو گی؟''

''میں اس سے ملوں گی اور معلوم کروں گی کہ اس کا کامی سے تعلق کس حد تک تھا۔''

☆☆☆

رعنا نے دھڑکتے دل کے ساتھ اپارٹمنٹ کی کال بیل بجائی۔ یہ جگہ اس کے اندازے سے بھی زیادہ پوش تھی، نہایت صاف ستھری بلڈنگ اور کار پارکنگ، شیشے کی طرح چمکتی راہداریاں، جدید ترین لفٹس اور سیکیورٹی کا مکمل سسٹم تھا۔ گیٹ پر اسے روک لیا گیا اور اس نے اپارٹمنٹ نمبر بتایا تو گارڈ نے ویڈیو کال کی۔ رعنا نے اپنا نام نہیں بتایا تھا لیکن اس نے گارڈ سے کہا کہ ندا لائن پر آئے تو اس کی بات کرا دے۔ گارڈ نے اسے کیمرے کے سامنے آنے کو کہا اور اسے فون ریسیور تھما دیا۔ گارڈ خود ذرا دور چلا گیا تھا۔ ندا نے اسے دیکھا اور کسی قدر کنفیوژ انداز میں بولی۔ ''آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہیں؟''

''یہ میں ملنے پر بتا سکتی ہوں۔''

اس نے انکار کر دیا۔ ''سوری اس وقت میں اکیلی ہوتی ہوں اور کسی سے نہیں مل سکتی۔''

''اکیلے میں ملنا تمہارے لیے بہتر ہوگا، میں کامی کی ماں ہوں۔''

اس بار ندا ساکت رہ گئی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے اور کانپتی آواز میں کہا۔ ''میں...... میں...... کسی کامی کو ...... نہیں...... جانتی۔''

''دیکھو بیٹا میں صرف تم سے ملنا چاہتی ہوں، میں نہ تمہیں پریشان کروں گی اور نہ ہی تمہیں مجھ سے کوئی خطرہ ہو گا۔ میں صرف چند سوالوں کے جواب چاہتی ہوں۔ مجھے ان سوالوں کے جواب مل جائیں تو تم اس کے بعد مجھے دوبارہ نہیں دیکھو گی۔''

''دیکھیں یہ بہت مشکل ہے۔''

''میں بھی مشکل میں ہوں۔'' رعنا کا لہجہ تیز ہو گیا۔ ''اپنی مشکل آسان کرنے آئی ہوں۔ تم سے صرف یہ چاہتی ہوں۔ اسی میں ہم دونوں کا مفاد ہے کہ ہم اکیلے میں مل لیں میری بات سمجھ رہی ہو نا؟''

ندا کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے رعنا سے کہا۔ ''فون گارڈ کو دیں۔''

رعنا نے فون گارڈ کو دے دیا اور وہ دوسری طرف سے ملنے والی ہدایات سنتا رہا اور پھر رعنا کے پاس

آیا۔ ”میڈم اپنا آئی ڈی کارڈ یہاں جمع کرادیں، واپسی پر آپ کو مل جائے گا۔“

رعنا نے اس کا مطالبہ پورا کر دیا اور اسے اندر جانے کی اجازت مل گئی۔ کال بیل کے جواب میں ایک ملازمہ نے دروازہ کھولا، گویا ندا نے غلط کہا تھا کہ وہ اکیلی ہے۔ ملازمہ اسے ایک بہت خوب صورت جدید فرنیچر سے آراستہ ڈرائنگ روم میں لائی۔ یہاں ایک طرف شیشے کی بڑی سی کھڑکی کے پار دور سمندر کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ اپارٹمنٹ ساتویں فلور پر تھا، اس لیے منظر وسیع تھا۔

کچھ دیر بعد ندا کمرے میں داخل ہوئی تو رعنا اسے دیکھ کر بے اختیار کھڑی ہو گئی۔ وہ تصویر کے مقابلے میں کمزور ہو گئی تھی، گلابی رنگت ماند پڑ گئی تھی اور چہرہ دبلا ہو گیا تھا، آنکھوں کے گرد حلقے تھے، مگر اس کا پیٹ نمایاں ہو رہا تھا، وہ یقیناً چھ مہینے سے زیادہ کے حمل سے تھی۔ سی سی ٹی وی کیمرے میں صرف چہرہ آرہا تھا اور وہ بھی نمایاں نہیں تھا، اس لیے رعنا اندازہ نہیں کر سکی تھی کہ وہ اس قدر کمزور ہو گئی ہو گی۔ اس نے نشست گاہ کا دروازہ بند کر دیا۔ وہ اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئی اور اپنے دونوں ہاتھ آپس میں جوڑ کر پیٹ پر رکھ لیے۔ رعنا نے اسے غور سے دیکھا۔ ”تم امید سے ہو؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”ہاں۔“

”بے بی ہے یا بابا؟“

”آپ...... آپ کیوں آئی ہیں؟“ ندا کا لہجہ کسی قدر ہیجانی ہو گیا۔ ”پہلے کامی نے مجھے برباد کیا اب آپ کرنے آئی ہیں۔“

اس کے ابتدائی پرسکون رویے کے بعد رعنا کو اس سے اس قدر جذباتی ردعمل کی توقع نہیں تھی۔ وہ جیسے پھٹ پڑی اور رعنا ششدر رہ گئی تھی۔ وہ مسلسل بول رہی تھی۔ ”میں اب جا کر سنبھلی ہوں...... ماضی کو بھولنا شروع کیا ہے...... تو آپ آ گئیں...... کیا چاہتی ہیں آپ...... جو کسر کامی نے چھوڑ دی تھی...... وہ پوری کرنے آئی ہیں۔“

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رعنا کا دل پگھلنے لگا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آ گئی اور برابر میں بیٹھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”مجھے غلط مت سمجھو...... مجھے نہیں معلوم کامی نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“ وہ تڑپ کر بولی۔ ”آپ اس کی ماں ہیں آپ کو کیسے علم نہیں ہو سکتا کہ آپ کا اکلوتا بیٹا کیا کر رہا ہے؟“

”اللہ گواہ ہے مجھے کچھ نہیں معلوم اور تمہارے بارے میں تو مجھے اس کے کمپیوٹر سے پتا چلا جس میں تمہاری تصاویر ہیں۔“

ندا کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ”میری تصاویر...... کیسی تصاویر ہیں؟“

رعنا چونکی اس نے جواب دیا۔ ”عام سی تصاویر ہیں جو اس نے کہیں باہر لی تھیں پس منظر سے تو ایسا ہی لگ رہا ہے۔“

”آپ سچ کہہ رہی ہیں نا بس یہی تصویریں تھیں؟“ اس نے تصدیق چاہی۔ وہ پہلے بھی آہستہ آواز میں بول رہی تھی اور روتے ہوئے بھی خیال رکھا تھا کہ اس کی آواز بلند نہ ہو لیکن تصویروں کے بارے میں تو وہ اتنی دھیمی آواز میں پوچھ رہی تھی کہ رعنا نے مشکل سے سنا۔

”تو کیا کامی نے تمہاری اور تصاویر بھی لی تھیں؟“

ندا خاموش رہی، وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں رگڑ رہی تھی اور اس کے وجود سے شدید بے چینی چھلک رہی تھی۔ رعنا نے اسے آواز دی لیکن اس نے سنی نہیں وہ جیسے کہیں اور تھی، آخر رعنا نے اسے ہلایا تو وہ چونکی اور پھر بولی۔ ”پلیز اس کے کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک فارمیٹ کر دیں۔“

”ندا ایسی کیا بات ہے تم کھل کر مجھ سے بات کر سکتی ہو۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں کر سکتی...... میں برباد ہو جاؤں گی...... عامر مجھے چھوڑ دیں گے۔“

”پلیز ندا میں وعدہ کرتی ہوں کسی کو نہیں پتا چلے گا۔“

”میں نہیں بتا سکتی۔“ ندا چیخ اٹھی اور کھڑی ہو گئی۔ ”آپ...... آپ جائیں یہاں سے۔“

”میں جانے کے لیے نہیں جاننے کے لیے آئی ہوں۔“ رعنا بولی۔ ”تم کیا سمجھتی ہو کہ یہ سب جان کر مجھے سکون مل جائے گا۔ نہیں میں بھی اسی آگ میں جلوں گی جس میں تم جل رہی ہو۔ تم مجھ سے کبھی نہیں ملیں۔ اگر کچھ پتا بھی ہے تو کامی کے توسط سے ہے۔ اس نے شاید تمہیں بہت کچھ نہیں بتایا ہوگا۔ میں نے اسے بہت محنت سے پالا تھا۔ میں اکیلی تھی اور صرف انیس سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھی۔ کامی میرے شوہر کے مرنے کے بعد پیدا ہوا تھا، مجھے اسے پالنا بھی تھا اور اس کی تربیت بھی کرنی تھی۔ تم سمجھ سکتی ہو مجھ پر دہری ذمے داریاں تھیں۔ تم خوش قسمت ہو کہ تمہارے ساتھ تمہارا شوہر ہے اس بچے کو اس کا باپ ملے گا۔ کامی کو اس کا باپ نہیں ملا۔ اسے میں نے بنایا اور مجھے لگا وہ وہی بنا جو میں چاہتی تھی۔“

ندا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ ویسا نہیں بنا۔“

”میں بھی تو جاننا چاہتی ہوں کہ وہ کیا بنا...... اس نے

مجھے اتنا بڑا دھوکا کیوں دیا۔ اس نے خود پر اداکاری کا ایک خول چڑھا لیا تھا۔ وہ گھر میں کچھ تھا اور باہر کچھ اور۔ میں اس کا باہر والا روپ جاننا چاہتی ہوں۔"

"مجھے دیکھ کر آپ کو اندازہ نہیں ہوا کہ کامی کا دوسرا روپ کیسا تھا۔" ندا کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔

"تم اس سے یونیورسٹی میں ملی تھیں؟"

"ہاں کاش میں اس یونیورسٹی میں نہ جاتی کالج میں پڑھتی مگر پاپا نے مجبور کر دیا' وہ چاہتے تھے میں ایم بی اے کروں۔"

"تم شاید تین سال پہلے یونیورسٹی گئی ہو گی؟"

"ساڑھے تین سال پہلے۔" اس نے صحیح کی۔ "میرے پانچ سمسٹر مکمل ہو گئے تھے اور پھر مجھے تعلیم چھوڑنا پڑی۔"

"کامی کی وجہ سے؟"

"ہاں اس نے مجھے محبت کے دھوکے میں رکھ کر برباد کر دیا۔"

ندا جس طرح لفظ برباد استعمال کر رہی تھی' رعنا کو احساس ہوا کہ معاملہ اس کے اندازے سے زیادہ آگے جا چکا تھا۔ اس کے لیے یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ اس کا صرف انیس برس کا بیٹا جو بہ ظاہر لڑکیوں سے بھاگتا تھا' کسی لڑکی کو محبت کا دھوکا دے کر اس کا جسمانی استحصال بھی کر سکتا تھا۔ رعنا نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "کیا اس نے تم سے جسمانی تعلق....."

"یہ اسی کا نتیجہ ہے۔" ندا نے اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ اس بار رعنا بے حد ششدر رہ گئی تھی۔ ندا نہ جانے کیسے اس راز کو کھول گئی جس سے صرف وہ اور اس کا شوہر واقف تھے۔ وہ لفظ چبا چبا کر بولی۔ "آپ نے غلط کہا جس طرح کامی کو اس کا باپ نہیں ملا اسی طرح اس بچے کو بھی اس کا باپ نہیں ملے گا۔"

"میرے خدا۔" رعنا نے سر تھام لیا۔ "میں نے کامی کو کیا بنانا چاہا اور وہ کیا نکلا؟"

"اس نے مجھے کھلا دھوکا دیا۔ جیسے ہی اس کا مطلب نکلا وہ پھر پلٹ کر نہیں آیا۔ میں رو دھو کر چپ ہو گئی لیکن پھر مجھے پتا چلا کہ میں امید سے ہوں تو میری دنیا ہی اندھیر ہو گئی تھی۔ اگر عامر نہ ہوتے تو میرے پاس خودکشی کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔ میرے پاپا کو پتا چلتا تو وہ غیرت سے مر جاتے۔ عامر نے ہم دونوں کو بچا لیا اس نے اس بچے کو بھی بچا لیا۔ یہ شادی اسی کی کوشش سے ہوئی اس نے پاپا سے کہا کہ وہ ہائر اسٹڈی کے لیے باہر جانا چاہتا ہے اور شادی کر کے مجھے بھی لے جانا چاہتا ہے۔ پاپا راضی نہیں تھے مگر میں نے اپنی مرضی شامل کر کے انہیں منا لیا۔ پاپا خفا تھے کہ میں نے تعلیم ادھوری کیوں چھوڑ دی۔ ان کو پتا ہی نہیں کہ ان کی بیٹی پر کیا گزر گئی ہے۔ ہم نے دنیا دکھاوے کو شادی کر لی کیونکہ میں اور عامر دونوں اللہ کو دھوکا نہیں دے سکتے تھے۔ ہمارے درمیان آج بھی اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا شادی سے پہلے تھا۔ عامر نے مجھ سے کہا کہ جب بچہ ہو جائے گا تو وہ مجھ سے شریعت کے مطابق اصل نکاح کریں گے اور پھر ہم سچ میں میاں بیوی ہوں گے۔"

ندا بول رہی تھی اور اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ دل کی بھڑاس نکال رہی ہے۔ اس کی سانس تیز تھی لیکن آواز مدھم ہی تھی۔ اچانک کال بیل کی آواز آئی تو وہ چونکی اور اس نے جلدی سے اپنے آنسو صاف کیے۔ چند لمحے بعد ملازمہ نمودار ہوئی۔ "بی بی جی بڑے صاحب آئے ہیں۔"

"پاپا۔" ندا نے کہا اور رعنا کی طرف دیکھا۔ "پلیز۔"

رعنا سمجھ گئی تھی اس نے سر ہلایا۔ "میں بعد میں آؤں گی۔"

ملازمہ چلی گئی تھی اس لیے اس نے دبی زبان میں کہا۔ "نہیں اب میں آپ سے نہیں ملوں گی۔ آپ نے جو معلوم کرنا تھا وہ کر لیا۔ پلیز دوبارہ یہاں مت آیئے گا۔"

رعنا نے اسے دیکھا۔ "شاید ایک بار اور ملنا ہو۔"

"میں نے آپ کو جو بتانا تھا بتا دیا۔ اب آپ کا مجھ سے اور میری زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"نہیں تعلق تو ہے۔" رعنا نے ایک نظر اس کے بڑھتے ہوئے پیٹ پر ڈالی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ وہ دروازے کے پاس پہنچی تھی کہ سامنے سے وہی ادھیڑ عمر شخص نمودار ہوا جو رعنا کو پہلے ریستوران کے باہر اور پھر بوتیک کے سامنے ملا تھا۔ اس نے وہی شاپر اٹھا رکھا تھا جو لے کر بوتیک سے نکلا تھا۔ رعنا تو حیران تھی ہی' وہ بھی رعنا کو دیکھ کر حیران ہوا تھا۔

"آپ.....؟"

ندا جو رعنا کے پیچھے تھی' وہ بھی حیران ہوئی۔ رعنا سہیل احمد کو نظر انداز کر کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ اس نے عقب میں ندا کو کہتے سنا۔ "پاپا! آپ انہیں جانتے ہیں؟"

سہیل احمد نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "ہاں لیکن صرف چہرے کی حد تک۔ میرا کل ان خاتون سے دوبارہ اتفاقیہ سامنا ہوا تھا۔" سہیل احمد نے کہتے ہوئے ندا کے ماتھے پر پیار کیا۔ "تم کتنی کمزور ہو رہی ہو' اپنا

خیال نہیں رکھتیں؟"

"رکھتی ہوں پاپا۔" ندا نے کسی قدر بے چینی سے کہا۔ "آپ اچانک کیسے آئے؟"

"مَیں کل میں نکلا تھا تو تمہارے لیے یہ لے لیا۔" سہیل احمد نے اسے شاپر تھمایا۔ "تمہیں اچھا لگا۔"

ندا نے شاپر سے سوٹ نکال کر دیکھا اور بے دلی سے بولی۔ "اچھا ہے پاپا تھینک یو۔"

سہیل احمد نے اسے غور سے دیکھا۔ "ایوری تھنگ از او کے؟"

"ہاں پاپا سب ٹھیک ہے۔" ندا زبردستی مسکرائی۔

"یہ خاتون یہاں کیسے آگئیں، تمہاری جاننے والی ہیں؟"

"جی پاپا۔" ندا نے جھوٹ بولا۔ "ان کی بیٹی میرے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔"

"تھی؟"

"اس کی ڈیتھ ہوگئی۔"

"اوہ افسوس ہوا۔" سہیل احمد نے کہا۔ "تو یہ تم سے ملنے آئی تھیں؟"

"جی پاپا۔" ندا نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔ اسے علم نہیں تھا کہ اس نے اتفاق سے وہی جھوٹ بولا تھا جو رعنا نے اس کا پتا حاصل کرنے کے لیے میرا سے بولا تھا۔

☆☆☆

رعنا سہیل احمد کا جواب نہیں سن سکی تھی، وہ حیران تھی کہ یہ کیسا اتفاق تھا وہ جس شخص کی بیٹی کی تلاش میں تھی وہی اسے دو بار ملا اور اسے پتا نہیں چلا کہ یہ وہی سہیل احمد ہے۔ لفٹ تک وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی لیکن لفٹ میں اس کا ضبط جواب دے گیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی وہ رونے لگی تھی۔ آج کامی نے اس کا مان توڑ دیا تھا۔ وہ اس کے بارے میں کیا سوچتی رہی تھی اور وہ کیا نکلا تھا؟ وہ اس کی خاطر اللہ سے شکوہ کرتی رہی کہ کامی کو ایسی موت کیوں ملی؟ وہ اس انجام کا مستحق نہیں تھا مگر اب اسے معلوم ہوگیا تھا کہ اللہ کسی کے ساتھ بے انصافی نہیں کرتا ہے۔

شاید اسی سے غلطی ہوئی تھی۔ اس نے صرف سکھانے کو کافی سمجھا اور کامی پر نظر نہیں رکھی۔ دوسری طرف اس نے بھی جو کیا بہت ہوشیاری سے کیا۔ اس نے رعنا کو ذرا بھی احساس ہونے نہیں دیا کہ اس کی بیرونی سرگرمیاں کس نوعیت کی ہیں۔ اس نے اپنے معمولات میں بہ ظاہر فرق نہیں آنے دیا تھا۔ اپنے کمپیوٹر کے فولڈر میں تصاویر بھی شاید اس نے غلطی سے چھوڑ دی تھیں۔ تصویروں پر اسے خیال آیا کہ ندا تصویروں کے نام پر اتنی سفید کیوں پڑ گئی تھی اور اس نے یوں کہا تھا کہ وہ کامی کے کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک فارمیٹ کردے: کیا کامی نے اس کی غیر اخلاقی تصاویر بھی لی تھیں؟ جو شخص ایک لڑکی کو دھوکا دے کر اس کا جسمانی استحصال کرسکتا تھا، اس سے کسی بھی بات کی توقع کی جاسکتی تھی۔ وہ ندا کی اخلاق سے گری تصاویر بھی لے سکتا تھا۔ اس پر رعنا کو یہ خیال بھی آیا کہ اگر کامی نے ایسا کوئی کام کیا بھی تھا تو کیا اس میں ندا کی مرضی شامل تھی یا نہیں؟

رعنا کا دل دکھ رہا تھا مگر گھر آتے آتے اس نے خود کو سنبھال لیا۔ اس نے آتے ہی سب سے پہلے کامی کے کمپیوٹر کا سی پی یو کھولا اور اس میں لگی ہارڈ ڈسک باہر نکالی۔ اسے پورچ میں لاکر اس نے ہتھوڑے سے مار مار کر اسے پچکا دیا۔ اسے یقین تھا کہ اب اس میں موجود سارا ڈیٹا ضائع ہوگیا ہوگا۔ اگر اس میں ندا کی ایسی کوئی تصویر تھی بھی تو وہ ضائع ہوگئی تھی۔ اس نے ہارڈ ڈسک کچرے میں ڈال دی۔ پھر اس نے کامی کا ڈیجیٹل کیمرا چیک کیا مگر اس کا میموری کارڈ خالی تھا۔ احتیاطاً اس نے کامی کے سامان کی تلاشی لی۔ اس کی یو ایس بی اور سیل فون کے میموری کارڈ کو بھی چیک کیا مگر ان میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ رعنا کا اندازہ درست ثابت ہو رہا تھا۔ کامی کے فولڈر والی تصاویر بھی اتفاقاً رہ گئی تھیں موت نے اسے مہلت نہیں دی کہ وہ انہیں بھی ضائع کردیتا۔ اس رات اس نے عشا کی نماز کے بعد کامی کے لیے خصوصی دعا کی۔

"اے اللہ میرے بچے پر رحم فرما، اس نے مجھے دھوکا دیا لیکن میں نے اسے معاف کیا تو بھی اسے معاف کردے اور اس پر آخرت کی منزل آسان فرمادے۔"

مگر جب وہ سونے کے لیے لیٹی تو اسے خیال آیا کہ اصل میں تو کامی ندا کا مجرم تھا، جب تک وہ اسے معاف نہیں کرے گی اللہ بھی اسے معاف نہیں کرے گا۔ یہ تو طے ہے کہ اللہ اپنے حقوق معاف کرسکتا ہے لیکن بندوں کے نہیں جب تک کہ وہ خود نہ معاف کردیں۔ یہ خیال آتے ہی رعنا بے چین ہوگئی تھی۔ اس نے سوچا کہ ابھی ندا سے رابطہ کرے لیکن دل پر جبر کرکے وہ رک گئی کہ اس وقت گھر میں اس کا شوہر ہوگا۔ اگرچہ ندا کا کہنا تھا کہ عامر سب جانتا تھا مگر شاید وہ اس کے ماضی کا سامنا کرنا پسند نہ کرے۔ اس لیے ندا اس حوالے سے بھی خوفزدہ تھی۔ عامر نے پہلے ہی ناقابل یقین حد تک فراخ دلی کا ثبوت دیا تھا۔ وہ یقیناً ندا سے محبت کرتا تھا تبھی اس نے اسے اس بچے سمیت قبول کرلیا اور یہ اس کا

ظرف تھا کہ وہ اسے اپنا نام دیتا۔ رعنا رونے لگی۔ "کامی یہ تو نے کیا کیا، اپنی ماں کو اپنی نظروں میں ہی سر اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔"

رات دیر تک رونے، سوچتے اور پھر صبح کسی وقت سونے کی وجہ سے اس کی آنکھ کھلی تو سر میں شدید درد تھا اور طبیعت بوجھل تھی۔ اس نے نیم گرم پانی کا شاور لیا تو اس کی طبیعت کسی قدر بہتر ہوئی۔ نیم سیاہ چائے کے ساتھ درد کش گولیاں لے کر وہ خود کو مزید بہتر محسوس کرنے لگی تھی پھر اس نے ندا کا نمبر ملایا مگر وہ کال ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ رعنا نے دوسری بار کال کی کوشش کی تو اس کا نمبر بند ملا۔ واضح طور پر وہ اس سے بات کرنا نہیں چاہ رہی تھی۔ اس نے سیل ہی آف کر دیا تھا۔ رعنا نے اسے ایس ایم ایس کیا۔ "سوری ندا میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی بس ایک بات کہنا چاہتی ہوں اگر تم سن لو تو تمہاری بہت مہربانی ہوگی۔"

اس نے ایس ایم ایس کیا تھا کہ نازیہ کی کال آگئی۔ وہ جاننے کے لیے بے تاب تھی کہ اب کیا ہوا ہے۔ رعنا نے اسے بتایا کہ کس طرح اس نے ندا کا پتا ڈھونڈا اور وہ اس سے ملنے گئی تھی۔ نازیہ بولی۔ "اس نے کامی کے بارے میں کیا بتایا؟"

"یہی کہ کامی نے اس سے اچھا سلوک نہیں کیا، اسے محبت کے نام پر دھوکا دیا۔ جب وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہوگئی تو وہ پیچھے ہٹ گیا۔"

نازیہ بھی سن رہ گئی تھی پھر اس نے دکھ سے کہا۔ "اوہ مجھے کامی سے یہ امید ہرگز نہیں تھی۔"

"تم سوچ سکتی ہو یہ جان کر میرا کیا حال ہوا ہوگا۔"

"رعنا مجھے سچ مچ افسوس ہے تم نے کامی کو اچھا انسان بنانے کی پوری کوشش کی اور شاید وہ اچھا انسان بنا بھی۔ مگر انسان کتنا ہی اچھا کیوں نہ بن جائے وہ فرشتہ نہیں بن سکتا۔ کامی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا، ندا کے معاملے میں اس کے قدم بہک گئے۔"

"شاید، لیکن اس کی ایک ہی حرکت نے مجھے اپنی نظروں میں ہمیشہ کے لیے شرمندہ کر دیا۔"

"ایسا مت سوچو۔" نازیہ نے اسے تسلی دی۔ "بے شک وہ انیس برس کا تھا لیکن عاقل اور بالغ تھا، اس نے جو کیا اس کا ذمے دار وہ خود تھا۔ تم نے اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں کی اس لیے تم ذمے دار کیسے ہو سکتی ہو؟"

"میں اس کی ماں جو ہوں۔" رعنا کی آواز بھیگ گئی۔ "ذمے دار تو میں ہی سمجھی جاؤں گی۔"

"دنیا کی نظر میں، لیکن اوپر والا تو ہر بندے کو انفرادی طور پر دیکھتا ہے۔ وہ کسی کا بار دوسرے پر نہیں ڈالتا۔"

رعنا کو حوصلہ ہوا مگر پھر اسے کامی کا خیال آیا۔ "اسے تو سزا ملے گی نا۔"

"یہ تو ہے ہر انسان کو اپنے اعمال کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔" نازیہ صاف گوئی سے بولی۔

"اگر ندا اسے معاف کر دے تو شاید اللہ بھی اسے معاف کر دے گا۔"

"کیا تم نے ندا سے بات کی؟"

"ابھی میں کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر ایک بار اس نے کال ریسیو نہیں کی اور پھر سیل فون آف کر دیا۔ میں نے اسے میسج کر دیا ہے۔ شاید اس کے دل میں رحم آجائے اور وہ مجھ سے بات کر لے۔ تب میں اس سے کہوں گی کہ وہ کامی کو معاف کر دے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے جس لڑکی کو محبت میں دھوکا دیا گیا ہو وہ دھوکا دینے والے کو معاف کر سکتی ہے؟"

نازیہ کے اس سوال پر رعنا چپ ہوگئی۔ پھر اس نے کہا۔ "شاید وہ ایسا نہ کرے لیکن میں کوشش تو کر سکتی ہوں۔ کامی کے لیے یہ ایک کام ہے جو میں کر سکتی ہوں۔ اس کی مغفرت کی دعا کے علاوہ۔"

"ہاں اللہ اس کی آخرت کی مشکلیں آسان کر دے تو یہی سب سے بڑی بات ہوگی۔"

رعنا سارا دن وقفے وقفے سے ندا کا نمبر ملاتی رہی مگر وہ بدستور بند جا رہا تھا، ایسا لگ رہا تھا کہ یہ نمبر اس نے مستقل بند کر دیا ہے اور شاید اسے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی، اس کے پاس یقیناً دوسرا نمبر تھا جسے وہ استعمال کر سکتی تھی۔ شام تک رعنا سوچ رہی تھی کہ وہ پھر اس کے اپارٹمنٹ جائے۔ وہ ایک بار ندا کا جواب ضرور سننا چاہتی تھی۔ اگلے دن تک اس کا فیصلہ کئی بار ڈانواں ڈول ہوا مگر وہ نکل گئی۔ وہ ایک بار آچکی تھی اس لیے اس بار گارڈ نے اسے بنا پوچھے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ رعنا نے اطمینان کا سانس لیا، ورنہ اسے خدشہ تھا کہ شاید ندا گیٹ پر ہی انکار کر دے گی اور وہ ایسا ہی کرتی کیونکہ اتفاق سے کال بیل کے جواب میں دروازہ اسی نے کھولا اور اس کے چہرے پر جو تاثرات آئے تھے وہ ہرگز اچھے نہیں تھے۔ اس نے تلخی آواز میں کہا۔

"آپ کیوں میرے پیچھے پڑ گئی ہیں؟ میں آپ سے ملنا اور بات کرنا نہیں چاہتی۔"

"پلیز میں صرف دو منٹ کے لیے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"میں نہیں کرنا چاہتی۔" ندا نے کہتے ہوئے دروازہ بند کرنا چاہا تو رعنا نے دونوں ہاتھ آگے کر دیے۔ اس کے جڑے ہاتھ اور آنکھوں میں لرزتے آنسو التجا کر رہے تھے۔ ندا رک گئی اسی لمحے اندر سے کسی نے پوچھا۔

"ندا باہر کون ہے؟"

"عامر گھر پر ہیں۔" ندا آہستہ سے بولی۔ "آپ مجھے شام کو کال کیجیے گا مگر پلیز ابھی چلی جائیں۔"

"ٹھیک ہے۔" رعنا نے آنسو صاف کیے۔ "میں شام کو کال کروں گی مگر تمہارا اسیل......"

"آن ہوگا۔" ندا نے کہا اور دروازہ بند کر دیا پھر اس کی آواز آئی۔ "مسز شہباز تھیں۔"

مسز شہباز شاید اس کی پڑوسی تھیں۔ رعنا نے باہر جاتے ہوئے سوچا۔ وہ لفٹ سے نکل کر پارکنگ میں آئی اور اس نے نوٹ نہیں کیا کہ اسی لمحے سہیل احمد کی سلور کار وہاں آ کر رکی تھی، اس نے رعنا کو دیکھ لیا تھا۔ جب وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر باہر جانے لگی تو سہیل احمد کی کار اس کے پیچھے آئی تھی۔ وہ ذرا آگے نکلی ہوگی کہ سہیل احمد نے کار پاس لا کر ہارن دیا تو رعنا چونکی اور اس نے سہیل احمد کو دیکھ کر رفتار کم کر لی۔ سہیل احمد نے رکنے کا اشارہ کیا تو اس نے کار سڑک کے کنارے روک لی مگر وہ اندر بیٹھی رہی۔ چند لمحے کو اس کے ذہن میں خدشات آئے کہ سہیل احمد نے اسے کیوں روکا ہے؟ کیا وہ اس کے خلاف کچھ کرنا یا کہنا چاہتا ہے؟ یہ تو طے تھا کہ اس فیملی کے جذبات اس کے لیے دوستانہ نہیں ہو سکتے تھے۔ ندا کا کہنا تھا کہ اس کا باپ ناواقف ہے لیکن یہ اس کی خوش فہمی بھی ہو سکتی تھی۔ شاید سہیل احمد واقف تھا اور اب یہ بھی جان گیا تھا کہ وہ کامی کی ماں ہے۔ خدشات کے باوجود اس نے گاڑی روک دی۔ سڑک پر ٹریفک کم تھا۔

سہیل احمد اتر کر اس کی گاڑی کے پاس آیا۔ اس کا انداز نارمل تھا۔ "کیسی ہیں آپ؟" سہیل احمد نے مہذب لہجے میں پوچھا۔

رعنا جبراً مسکرائی۔ "میں ٹھیک ہوں لیکن آپ نے مجھے......"

"میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا بات کرنا چاہتے ہیں؟"

سہیل احمد ہچکچایا۔ "دیکھیے آپ غلط مت سمجھیے گا لیکن یوں سڑک پر گفتگو مناسب نہیں ہے۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو نزدیک ایک ریستوران ہے وہاں سکون سے بات کی جا سکتی ہے۔"

رعنا اس کے رویے سے مطمئن ہو گئی تھی اور اب اسے تجسس تھا کہ وہ اس سے کیا بات کرنا چاہتا ہے؟ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے سر ہلایا تو سہیل احمد خوش ہو گیا۔ "آپ میرے پیچھے آیئے زیادہ دور نہیں ہے۔"

ریستوران چھوٹا اور پرسکون تھا۔ اس وقت وہاں چند ہی افراد تھے۔ سہیل احمد نے اس کے منع کرنے کے باوجود چائے کا کہہ دیا اور اپنا تعارف کرایا۔ "نام سے آپ واقف ہیں۔ میں ندا کا باپ ہوں بلکہ اس کی ماں بھی ہوں کیونکہ وہ صرف چھ مہینے کی تھی جب اس کی ماں ہم دونوں کو چھوڑ گئی تھی۔"

رعنا نے افسوس سے کہا۔ "یعنی ندا آپ کی اکلوتی بیٹی ہے؟"

اس نے سر ہلایا۔ "میں چھوٹا سا بزنس مین ہوں اور میں بتا نہیں سکتا کہ بزنس کے ساتھ ساتھ ندا کی دیکھ بھال میں مجھے کتنی دشواری پیش آئی۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے بیٹی کی ذمے داری میں سرخرو کیا، اب وہ اپنے گھر میں خوش ہے۔ کچھ عرصے بعد ماں بن جائے گی۔"

لگتا تھا کہ سہیل احمد کو بھی اس کی طرح خوش فہمی تھی جیسے وہ کامی کو معصوم اور باکردار سمجھتی تھی ایسا ہی سہیل احمد بھی ندا کو سمجھتا تھا اور اسے علم ہی نہیں تھا کہ ندا بن بیاہی ماں بننے والی تھی۔ رعنا نے اپنے تاثرات پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

سہیل احمد نے اسے دیکھا۔ "ندا میری اکلوتی بیٹی ہے اس نے مجھ سے آج تک کچھ نہیں چھپایا۔ میں اس کی ساری فرینڈز کو اور ان کے گھر والوں کو جانتا ہوں کیونکہ انہیں جاننا میری ذمے داری تھی۔ مجھے نہیں یاد کہ آپ کی بیٹی کب میری بیٹی کی فرینڈ بنی، کیونکہ میں اس سے قطعی ناآشنا ہوں اور نہ میں نے کبھی آپ کو دیکھا ہے۔ نہ ہی میرے علم میں آپ کی بیٹی کی ڈیتھ ہے۔"

رعنا حیران رہ گئی۔ نادانستگی میں ندا نے اپنے باپ سے وہی کہا جو اس نے ندا کا پتا حاصل کرنے کے لیے سمیرا سے کہا تھا۔ کچھ دیر کے لیے وہ دنگ رہ گئی۔ پھر اس نے سنبھل کر کہا۔ "میری بیٹی اور ندا کی دوستی بس چند دن رہی اور پھر اس کی ڈیتھ ہو گئی۔"

"ندا نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟"

"یہ تو آپ اس سے پوچھیں، ویسے ان دونوں کی دوستی بہت گہری نہیں تھی۔"

"ندا بہت حساس ہے۔ وہ تو اخبار یا ٹی وی پر کسی کی موت کی خبر سنتی پڑھتی ہے تو اس کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔" سہیل احمد نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ ممکن ہی نہیں ہے

کہ وہ اپنی کسی عام سی دوست کی موت پر خاموش رہ جاتی۔"

"تب میں کیا کہہ سکتی ہوں۔" رعنا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "ممکن ہے اس نے آپ کی عدم موجودگی میں رو کر دل ہلکا کرلیا ہو۔"

ویٹر چائے لے آیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد سہیل احمد نے کہا۔ "آپ واقعی کچھ نہیں کہہ سکتی ہیں؟"

"میں کہہ چکی ہوں۔" رعنا کا لہجہ کسی قدر تیز ہو گیا۔ "اب آپ جو کہنا چاہتے ہیں وہ کہہ دیں۔"

سہیل احمد سنجیدہ ہو گیا۔ "ہاں میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ جب میں نے پہلی بار آپ کو دیکھا تو مجھے آپ جانی پہچانی لگی تھیں مگر مجھے یاد نہیں آیا کہ آپ کو کہاں دیکھا ہے؟"

رعنا کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ "پھر آپ کو یاد آ گیا؟"

سہیل احمد نے سر ہلایا۔ "میں نے انٹرنیٹ پہ پرانے اخبارات نکال کر دیکھے اور مجھے پتا چل گیا کہ آپ کیوں جانی پہچانی لگ رہی تھیں۔"

رعنا نروس ہو گئی۔ "تو آپ جان گئے ہیں......؟"

"آپ کی بیٹی کا نہیں بلکہ بیٹے کا انتقال ہوا ہے۔" سہیل احمد نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "مجھے افسوس ہے لیکن میں پوچھنا چاہوں گا کہ آپ اور ندا نے ایک ہی جھوٹ کیوں بولا؟"

رعنا گہری سانس لے کر رہ گئی۔ "میں نہیں بتا سکتی، آپ ندا سے کیوں نہیں پوچھ لیتے؟"

اس بار سہیل احمد نے گہری سانس لی۔ "اگر اس سے پوچھ سکتا تو آپ سے کیوں کہتا۔ آپ کو اندازہ ہوگا کہ باپ بیٹی کا رشتہ کتنا حساس ہوتا ہے۔ ماں بیٹی آپس میں ہر بات کر سکتی ہیں لیکن باپ بیٹی آپس میں ہر بات نہیں کر سکتے۔ میں اس کا باپ ہوں، میں جانتا ہوں جب سے اس کی شادی ہوئی ہے وہ کسی خوف کے زیر اثر جی رہی ہے لیکن یہ خوف عامر یا اس سے متعلق نہیں ہے۔ عامر میرا بھتیجا ہے اور میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ کئی بار میں نے ندا سے پوچھا کہ وہ کیوں پریشان ہے، وہ کیوں کمزور ہو رہی ہے لیکن وہ مجھے ہمیشہ ٹال جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے عامر بھی پریشان ہے۔"

"آپ کا خیال ہے ندا کی پریشانی کا تعلق مجھ سے ہے؟"

"نہیں میرا خیال ہے اس کی پریشانی کا تعلق آپ کے مرحوم بیٹے کامران سے ہے۔ میں نے مزید ریسرچ کی تو مجھے پتا چلا کہ وہ بھی اسی یونیورسٹی میں پڑھتا تھا جہاں ندا پڑھتی تھی۔"

"یہ درست ہے۔"

سہیل احمد ہچکچایا۔ "کیا کامران اور ندا میں کوئی تعلق تھا؟"

"شاید۔" رعنا نے کچھ دیر بعد کہا۔ "میں ندا کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی لیکن جب چند دن پہلے میں نے کامی کا کمپیوٹر پہلی بار دیکھا تو اس میں ندا کی تصویریں تھیں۔ کامی بالکل بھی ایسا لڑکا نہیں تھا جو لڑکیوں کے چکر میں رہتا ہو اس لیے مجھے تجسس ہوا۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ کامی اس ریستوران میں اکثر جاتا تھا جہاں اسے شوٹ کیا گیا تھا۔"

"تو آپ اس لیے وہاں گئی تھیں۔" سہیل احمد نے سر ہلایا۔ "ندا کے بارے میں وہیں سے پتا چلا؟"

''ہاں اس ویٹر نے مجھے ندا کے آئی ڈی کارڈ کی کاپی دی تھی' اس بوتیک کے سامنے جہاں آپ آئے تھے۔''

''اس کے پاس ندا کے آئی ڈی کارڈ کی کاپی کہاں سے آئی؟''

''مجھے نہیں معلوم، میں نے اسے ندا کی تصویر دکھائی تھی تو اس نے مجھے باہر ملنے کو کہا اور دس ہزار روپے لے کر یہ کاپی دی تھی۔'' رعنا نے پرس سے آئی ڈی کارڈ کی کاپی اور ندا کی پرنٹ تصاویر نکالیں اور سہیل احمد کے سامنے رکھ دیں۔ ''ایسی ایک درجن تصاویر تھیں جو میں ڈیلیٹ کر چکی ہوں۔''

سہیل احمد کا چہرہ ستا گیا تھا۔ وہ کچھ دیر ساکت نظروں سے ان تصویروں کو دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔ ''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ندا کسی کو پسند کر بیٹھے گی لیکن اس نے مجھ سے کیوں نہیں کہا' میں اس کا باپ ہوں۔ اس کی خوشی مجھ سے زیادہ کون چاہے گا۔''

صورت حال رعنا کے لیے غیر متوقع تھی۔ جب سہیل احمد نے حقیقت اس کے سامنے رکھی تو وہ بوکھلا گئی تھی مگر وہ ایک ورکنگ وومین تھی اور اسے مسائل کا حل نکالنا آتا تھا۔ اتنی دیر میں اس نے سوچ لیا تھا کہ اسے کیا کہنا ہے۔ کامی دنیا سے جا چکا تھا اور اب اسے ساری عمر اکیلے رہنا تھا۔ یہ اس کا مقدر تھا لیکن سہیل احمد اور ندا کے سامنے ایک بڑی زندگی تھی' اس میں مزید رنگ بھرنے تھے۔ وہ اس کے حقدار نہیں تھے کہ ان کی باقی زندگی جلتے کڑھتے اور پچھتاووں کے ساتھ گزرتی۔ انہیں کامی کے کیے کی سزا نہیں ملنی چاہیے تھی۔ اس نے کہا۔ ''سہیل صاحب، ایک ماں کی حیثیت سے بہت مشکل ہے کہ میں اعتراف کروں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں سارا قصور میرے بیٹے کا ہے اور کسی حد تک میرا بھی ہے۔ وہی ندا کی طرف بڑھا، اسے اپنی محبت کا یقین دلایا۔ لڑکیاں بہت آسانی سے محبت کا دعویٰ تسلیم کر لیتی ہیں۔ ندا نے بھی کر لیا مگر جلد کامی نے محسوس کیا کہ وہ اس محبت کو نبھا نہیں سکے گا۔ وہ ابھی پڑھ رہا تھا اور اسے اپنا کیریئر بنانا تھا۔ میں کسی صورت اس کی اتنی جلدی شادی نہیں کر سکتی تھی' یہ بات میں نے اس پر واضح بھی کی تھی کہ پہلے وہ خود کو سیٹ کرے گا تب میں اس کی شادی کروں گی۔''

''حالانکہ وہ آپ کا اکلوتا بیٹا تھا اور ایسے میں ماں کی خواہش ہوتی ہے کہ بیٹے کی جلد از جلد شادی کر دے تاکہ اس کے گھر میں رونق ہو۔''

''میں جذباتی عورت نہیں ہوں، میرے خیال میں مرد کی شادی اسی وقت کی جانی چاہیے جب وہ ذہنی لحاظ سے میچور اور ہر طرح کی ذمے داری اٹھانے کا اہل ہو جائے۔''

''تو آپ کے خیال میں کامران نے پیچھے ہٹ کر ندا کو دھوکا دیا؟''

''میرا یہی خیال ہے اور ندا نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔ وہ بہت اپ سیٹ ہو گئی تھی اور اس نے صرف عامر سے یہ بات شیئر کی تھی۔ اسے نروس بریک ڈاؤن سے بچانے کے لیے عامر نے اسے پرپوز کیا اور ان کی عجلت میں شادی کی وجہ بھی یہی تھی۔''

''رئیلی؟'' سہیل احمد نے بے یقینی سے کہا۔ ''انہوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔''

''کیونکہ ندا سمجھتی تھی کہ اگر آپ کو پتا چل گیا تو وہ ہمیشہ کے لیے آپ کی نظروں سے گر جائے گی اور وہ یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ حالانکہ اس نے محبت میں دھوکا برداشت کر لیا تھا۔''

''تب وہ ابھی تک کیوں پریشان ہے؟''

''شاید اسے خطرہ ہو کہ یہ بات کھل نہ جائے۔''

سہیل احمد سوچ میں پڑ گیا۔ شاید یہ بات اس سے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ ندا اس کی بیٹی تھی اور اسے معلوم تھا کہ وہ کس صورت حال میں کس طرح کا ردعمل دے سکتی ہے۔ اس کی فکرمندی اور حد سے زیادہ ٹینشن سمجھ سے باہر تھی۔ رعنا اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''وہ بہرحال ایک لڑکی ہے اور ماں سے محروم رہی ہے شاید اسی چیز نے اسے اتنا حساس بنا دیا ہے۔''

سہیل احمد نے گہری سانس لی۔ ''شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔''

رعنا نے سکون کا سانس لیا۔ ''یہاں جو گفتگو ہوئی ہے وہ میرے اور آپ کے درمیان رہے تو بہتر ہوگا۔ ندا نے مجھ پر اعتماد کیا...''

''میں سمجھتا ہوں۔'' سہیل احمد نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''یہاں ہونے والی گفتگو آپ کے اور میرے درمیان رہے گی۔ لیکن میں کچھ پوچھنا چاہوں گا؟''

''مزید کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟'' رعنا مطمئن ہوتے ہوتے ایک بار پھر مضطرب ہو گئی۔

''آپ اس دن پہلی بار ندا سے ملی تھیں؟''

''ہاں۔''

''اور آپ نے مجھے جو کچھ بتایا ہے' یہ سب باتیں اسی دن ہو گئی تھیں؟''

"ہاں۔"

"تب آپ آج کیوں گئی تھیں؟"

رعنا کا سر جھک گیا۔ اس نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کامی غلط سہی لیکن ہے تو میرا بیٹا، مجھے خیال آیا کہ اس نے ندا کا دل دکھایا ہے اور اللہ بھی اپنے بندوں کے حقوق معاف نہیں کرتا ہے جب تک کہ وہ خود معاف نہ کر دیں۔ میں ندا سے کہنا چاہتی تھی کہ وہ کامی کو معاف کر دے تاکہ اس پر آخرت کی منزلیں آسان ہو جائیں۔"

"ندا نے کیا جواب دیا؟"

"میں اس سے کہہ ہی نہیں سکی، وہ میری کال ریسیو نہیں کر رہی تھی تو میں خود آگئی مگر عامر گھر پر تھا۔ ندا نے کہا کہ میں بعد میں آؤں۔"

"میں نے آپ کو لفٹ سے نکلتے دیکھا تھا۔ میں خود آپ سے ملنا چاہتا تھا اس لیے میں آپ کے پیچھے چلا آیا۔ امید ہے آپ نے اس کا برا نہیں مانا ہوگا۔"

"بالکل بھی نہیں، اس کے برعکس میں آپ کی اور ندا کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے کامی کی ماں ہونے کے باوجود میرے ساتھ برا سلوک نہیں کیا۔"

سہیل احمد ہچکچایا۔ "اب آپ اکیلی ہیں؟"

"میں شروع سے اکیلی ہوں، مجھے رشتوں کی رفاقت بہت کم ملی۔" رعنا نے کہا اور کھڑی ہو گئی۔ "یہی میرا مقدر ہے۔"

"کیا ہم پھر مل سکتے ہیں؟"

"نہیں۔" رعنا نے بے ساختہ کہا۔ "یہ ممکن اور مناسب نہیں ہے۔ اسے آخری بار سمجھیں۔"

رعنا باہر کی طرف بڑھی اور سہیل احمد اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

☆☆☆

رعنا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی جس دن وہ سہیل احمد سے ریستوران میں ملی تھی اسی رات اسے شدت کا بخار ہوا تھا۔ دو دن وہ بخار میں پڑی رہی۔ زرینہ اگلے دن آئی تو اس کی حالت دیکھ کر ڈاکٹر بلائی اور اس نے رعنا کو دوا کے ساتھ مکمل آرام کا مشورہ دیا۔ زرینہ اس کے پاس رک گئی، اگلے دن بھی وہ صبح سے آگئی اور اس کی دیکھ بھال اور خوراک و دوا کا خیال رکھنے سے رعنا دوسرے دن شام تک خاصی بہتر ہو گئی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر اسے ذرا سکون ملا۔ زرینہ نے اس کے بال کنگھی کر کے باندھے اور رشک سے بولی۔ "بی بی جی آپ کے بال ماشاءاللہ کتنے گھنے اور بالکل سیاہ ہیں بس ایک دو تار ہی سفید ہیں۔"

پہلا سچ

ایک یورپین اپنے دوستوں کو اپنی مہموں کی روداد سنا رہا تھا۔

وہ کہہ رہا تھا۔ مجھے اور میری بیوی کو آدم خور قبائلیوں نے گھیر رکھا تھا۔ جب قبائلیوں کے سردار نے مجھے دیکھا تو کہنے لگا کہ وہ چالیس برس سے زیادہ کی عمر کے آدمیوں کو نہیں کھاتا اور زندگی میں وہ پہلا موقع تھا۔ جب میری بیوی نے اپنی عمر کے متعلق سچ بولا۔

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

"یہ قدرتی بات ہے۔"

"نہیں بی بی جی آپ کی جلد بھی بالکل ٹھیک ہے کہیں ذرا بھی جھری نہیں پڑی ہے آپ کو دیکھ کر کوئی مان ہی نہیں سکتا کہ آپ اڑتیس برس کی ہو۔"

رعنا مسکرائی۔ "لیکن یہ حقیقت ہے میں اڑتیس برس کی ہوں۔"

"بی بی اگر برا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟"

"کہو۔"

"آپ شادی......"

"نہیں زرینہ۔" اس نے انکار کیا اور پھر اس نے موضوع بدل دیا۔ "اب تم گھر جاؤ کب سے میرے ساتھ لگی ہو۔ میں اب ٹھیک ہوں۔ تم کل آنا۔"

"ٹھیک ہے میں دوپہر میں آؤں گی۔" زرینہ نے کہا پھر ہچکچا کر بولی۔ "بی بی، اب آپ اکیلی ہو اور عورت کو سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔"

زرینہ ٹھیک کہہ رہی تھی عورت کو سہارے کی ضرورت ہوتی ہے اب تک وہ کامی کے سہارے پر تھی اور کامی رہا نہیں تھا۔ مگر اسے کون سہارا دے گا؟ اسے بے اختیار سہیل احمد کا خیال آیا۔ وہ جس طرح اس سے ملا اور جس طرح اس کی طرف متوجہ ہوا تھا اسے کوئی عورت محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ آخر میں اس نے پھر ملنے کو کہا تھا اور رعنا نے انکار کر دیا تھا۔ اس نے سوچا کہ کیا سچ مچ یہ ممکن اور مناسب ہو گا۔ اس کے اندر سے کسی نے کہا۔ "بالکل نہیں ذرا سوچو اسے پتا چل گیا کہ کامی نے اس کی بیٹی کے ساتھ کیا کیا تو کیا وہ پھر بھی اسی طرح متوجہ ہوگا، ہرگز نہیں وہ اسے نفرت سے دیکھے گا اور شاید اسے دیکھنا بھی پسند نہ کرے۔" عجیب بات تھی وہ سہیل احمد کی نفرت کا سوچ کر لرز گئی تھی۔ "نہیں کبھی نہیں۔" اس نے خود سے کہا۔ "نہ ملنا ہی ہمارے لیے بہتر ہے۔"

اس نے ندا سے رابطے کی پھر کوشش نہیں کی تھی۔ وہ بخار میں تھی مگر چاہتی تو اسے کال کرسکتی تھی۔ اس نے جان کر نہیں کی' اس کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا' ان دو دنوں میں عجیب سی بے حسی اور سن کر دینے والی کیفیت اس پر طاری رہی تھی۔ مگر اب وہ اس کیفیت سے نکل آئی تھی اور سوچ رہی تھی کہ ندا کو کال کرلے۔ وہ زرینہ کے جانے کی منتظر تھی' اس کے سامنے کال نہیں کرسکتی تھی۔ زرینہ کچن میں تھی اور اس کے لیے پرہیزی کھانا تیار کر رہی تھی۔ رعنا کے موبائل کی بیل بجی تو اس نے اٹھا کر دیکھا۔ خلافِ توقع ندا کا نمبر آرہا تھا۔ وہ پہلے بیڈ روم میں آئی اور دروازہ بند کرکے اس نے کال ریسیو کی۔ ندا نے بنا تمہید یا سلام دعا کے پوچھا۔

''آپ کیا کہنے آئی تھیں؟''

''ندا کیسی ہو تم؟''

''میں ٹھیک ہوں۔'' اس کے لہجے کی رکھائی کم ہوئی تھی۔ ''آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔''

''میں تم سے ایک درخواست کرنے آئی تھی۔ بیٹی میری التجا ہے تم کامی کو معاف کردو۔ تم نے معاف نہ کیا تو اللہ بھی اسے معاف نہیں کرے گا۔''

''باوجود اس کے جو اس نے میرے ساتھ کیا ہے؟'' ندا کا لہجہ تلخ ہوگیا۔

''اسے ایک ماں کی التجا سمجھ لو، میں مانتی ہوں کامی نے تمہارے ساتھ بہت برا کیا مگر بیٹا اللہ معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے' یہی سوچ کر کامی کو معاف کردو۔''

''آپ نے میری حالت دیکھی ہے؟'' ندا جذباتی ہونے لگی۔ ''مجھے اس حال تک آپ کے بیٹے نے پہنچایا ہے اور آپ کہہ رہی ہیں کہ میں اسے معاف کردوں۔ آپ سن لیں میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی اور میری خواہش ہے کہ اس نے جو کیا ہے' اس کی سزا وہ ضرور بھگتے۔ اب مجھے فون مت کیجیے گا اور نہ ہی میرے گھر آیئے گا۔''

رعنا نے آہستہ سے کہا۔ ''ٹھیک ہے تم کامی کو معاف نہیں کرنا چاہتیں مت کرو لیکن ایک بار سوچنا ضرور کہ جو کچھ ہوا کیا اس میں صرف کامی کا قصور تھا؟ کیا تمہارے قدم نہیں بہکے تھے؟''

''چپ کر جائیں۔'' ندا نے تیز لہجے میں کہا اور کہتے ہی کال کاٹ دی۔ رعنا نے تڑپ کر اس کا نمبر ڈائل کیا مگر دوسری طرف سے نمبر بند ہونے کی اطلاع سنائی دی۔ ندا کو اندازہ تھا کہ وہ کال کرے گی۔ اس لیے اس نے کال کاٹتے ہی موبائل بند کردیا۔ رعنا نے موبائل ایک طرف ڈال دیا اور سر پکڑ کر بستر پر بیٹھ گئی۔ وہ رو رہی تھی اور اسے لگا جیسے اس کا سر چکرا رہا ہو۔ اسی لمحے اس کے موبائل کی بیل بجی اور اس نے اٹھنا چاہا تو لڑکھڑا کر گر پڑی۔ پھر اسے ہوش نہیں رہا تھا۔ ایک منٹ بعد زرینہ نے دروازے پر دستک دی اور جب رعنا کی طرف سے جواب نہیں ملا تو وہ دروازہ کھول کر اندر آئی اور رعنا کو قالین پر پڑے دیکھ کر بدحواس ہوگئی۔ موبائل کی بیل مسلسل بج رہی تھی اس نے پہلے رعنا کو جھنجوڑا مگر جب اس نے حرکت نہیں کی تو زرینہ نے موبائل اٹھا کر کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے کسی مرد نے کہا۔

''ہیلو رعنا.....؟''

''بی بی جی بے ہوش ہوگئی ہیں۔'' زرینہ نے رونے والے لہجے میں کہا۔ ''ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''کیا ہوا انہیں؟'' مرد پریشان ہوگیا۔

''کل سے بخار تھا۔ ابھی ٹھیک تھیں پر میں کمرے میں آئی تو یہ بے ہوش پڑی ہیں۔ آپ کون ہیں؟''

''میں..... میں ان کے ساتھ آفس میں کام کرتا ہوں۔'' مرد نے کہا۔ ''تم کون ہو؟''

''میں زرینہ ہوں جی، رعنا بی بی کی ملازمہ۔''

''کسی ڈاکٹر کا نمبر ہے تو اسے بلاؤ۔''

''نہیں جی کل بلا کر لائی تھی پر وہ دور ہوتا ہے اور اس وقت اس کا کلینک بھی بند ہوگا۔''

''مجھے پتا بتاؤ میں آرہا ہوں۔''

زرینہ نے اسے پتا بتایا۔ بیس منٹ بعد کال بیل بج رہی تھی۔

☆☆☆

رعنا کو ہوش آیا تو وہ اسپتال میں تھی اور اس کے بازو سے ڈرپ منسلک تھی۔ ڈرپ کا کسی قدر پیلا رنگ بتا رہا تھا کہ اس میں کوئی دوا بھی ڈالی گئی ہے۔ اس نے اٹھنا چاہا مگر اس سے اٹھا نہیں گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے جسم سے ساری طاقت نچڑ گئی ہو۔ اسے خیال آیا کہ یہاں کیسے آئی۔ اسے یاد آیا کہ وہ کمرے میں بے ہوش ہوگئی تھی تو زرینہ اسے اسپتال لائی ہوگی۔ ورنہ گھر میں اور کون تھا۔ اسی لمحے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک نرس اندر آئی۔ اسے ہوش میں دیکھ کر مسکرائی۔ ''اب کیسی ہیں آپ؟''

''میں ٹھیک ہوں، مجھے کیا ہوا تھا؟''

''بخار اور کمزوری، اس وجہ سے آپ بے ہوش ہوگئی تھیں۔'' نرس نے اس کا درجۂ حرارت اور بلڈ پریشر چیک کرنا شروع کیا۔ ''اب آپ تقریباً ٹھیک ہیں۔''

"مجھے یہاں کون لایا؟"

"ایک منٹ میں ان کو بھیجتی ہوں۔"

نرس چلی گئی اور کچھ دیر بعد دروازے سے سہیل احمد اندر آیا تو رعنا حیران ہو گئی۔ "آپ مجھے یہاں لائے ہیں لیکن آپ کو......؟"

"آپ کی ملازمہ نے بتایا میں کال کر رہا تھا، اس نے فون پر مجھے آپ کی حالت کے بارے میں بتایا تو مجھ سے رہا نہیں گیا۔ امید ہے آپ نے برا محسوس نہیں کیا ہوگا۔ میں زرینہ کی مدد سے آپ کو یہاں لایا ہوں۔ ابھی اسے اس کے گھر چھوڑ کر آیا ہوں۔"

"میں آپ کی شکر گزار ہوں اور اس صورت میں آپ کا احسان مزید بڑھ جاتا ہے کہ میں پہلے ہی آپ کی مقروض ہوں۔"

"بالکل نہیں کامی نے جو کیا ہے اس کا بوجھ آپ خود پر نہ لیں۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا ہے کہ کوئی کسی کے کیے کا ذمے دار نہیں ہے۔"

"آپ نے ٹھیک کہا۔" رعنا بولی۔ "لیکن آپ مجھے کیوں کال کر رہے تھے؟"

"اتفاق سے جب آپ نے ندا کو کال کی تو اس کے کچھ دیر بعد ہی میں اس کے پاس پہنچا تھا اور میں نے اس کے سیل میں آپ کا نمبر دیکھ لیا۔"

"اتفاق سے؟" رعنا کا لہجہ سوالیہ تھا۔

سہیل احمد شرمندہ ہو گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "نہیں میں نے آپ کا نمبر لینے کے لیے اس کا سیل دیکھا تھا۔"

"آپ نے اس کے سامنے مجھے کال کی تھی؟"

"نہیں باہر آ کر کی تھی۔" سہیل احمد نے جواب دیا۔ "میں اس کے سامنے نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

"کیوں؟"

"میں جاننا چاہتا تھا کہ آپ نے ندا سے بات کی اور اس نے کیا جواب دیا؟"

"میں نے بات کی اور اس نے صاف انکار کر دیا۔ وہ کسی صورت کامی کو معاف کرنے کو تیار نہیں ہے۔" رعنا نے اسے بتا دیا۔

سہیل احمد نے گہری سانس لی۔ "مجھے اس سے ایسی ہی توقع تھی۔"

رعنا نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "بہ ظاہر تو ندا نرم مزاج لگتی ہے۔"

"وہ ضدی بھی ہے، جس سے ایک بار اس کے دل میں گرہ آ جائے، اسے آسانی سے معاف نہیں کرتی ہے۔ پھر وہ اپنی غلطی نہیں مانتی ہے دوسرے کو الزام دیتی ہے۔"

"شاید کامی کے مقدر میں یہی تھا۔" رعنا نے کہا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "ڈاکٹر کیا کہہ رہا ہے؟ کیا میں گھر جا سکتی ہوں؟"

"معمولی بخار ہے۔ کمزوری کی وجہ سے آپ بے ہوش ہو گئی تھیں۔ شاید آج رات یہاں رکنا پڑے، اس اسپتال کا مالک میرا دوست ہے آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

رعنا کسمسائی۔ "مجھے یہ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔"

"بات اچھے برے کی نہیں ہے، آپ کو اس وقت علاج اور آرام کی ضرورت ہے۔" سہیل احمد نے کہا۔ "اب آپ آرام کیجیے میں کل صبح آؤں گا۔"

"ایک بار پھر شکریہ۔"

"ویلکم۔" سہیل احمد بولا۔ "ہاں میں ایک اور وجہ سے بھی آپ کو کال کر رہا تھا۔ آپ سے ملاقات کے بعد میں اس ریستوران گیا اور اس ویٹر کو پکڑا اس نے اعتراف کیا کہ اس نے آپ کو ندا کے آئی ڈی کارڈ کی کاپی دی تھی۔ یہ پرانی بات ہے ایک دن کامی اور ندا ریستوران میں ملنے کے لیے آئے تھے تو اتفاق سے دونوں کے پاس کیش نہیں تھا۔ کامی کے پاس اس کا آئی ڈی کارڈ بھی نہیں تھا۔ تو ندا نے اپنے آئی ڈی کارڈ کی کاپی دے دی۔ بعد میں بل ادا کر دیا تھا مگر وہ کاپی واپس لینا بھول گئی۔"

"اور اس کی اسی بھول کی وجہ سے مجھے اس کا سراغ ملا۔"

سہیل احمد کے جانے کے بعد رعنا اس کے بارے میں سوچتی رہی، حتیٰ کہ نرس نے آ کر اس کی ڈرپ میں نیند کا انجکشن شامل کر دیا اور وہ سو گئی۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو ذہن اور جسم ہلکا ہو رہا تھا اور کمزوری کا احساس تقریباً مٹ گیا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے چیک کیا۔ "ناؤ یو آر فائن۔"

"تو میں گھر جا سکتی ہوں؟"

"بالکل جا سکتی ہیں۔" ڈاکٹر نے اجازت دے دی۔ "لیکن دو دن احتیاط کرنی ہے ہلکی لیکن پوری غذا لینی ہے اور آرام کرنا ہے۔ دوا کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک طاقت کا سیرپ لکھ رہا ہوں وہ استعمال کریں۔"

زرینہ اس کا پرس اور گھر کی چابیاں لے آئی تھی۔ رعنا نے کاؤنٹر پر بل کا پوچھا تو اسے بتایا گیا کہ بل ادا کیا جا چکا ہے۔ وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔ اسے اندازہ تھا کہ بل سہیل احمد نے ادا کیا ہوگا۔ اسے اچھا نہیں لگا مگر وہ کیا کر سکتی تھی۔ سہیل احمد نے اس سے پوچھ کر یہ سب نہیں کیا تھا۔ وہ

اسپتال سے باہر نکلے تھے کہ سہیل احمد وہاں پہنچ گیا۔ اس نے گاڑی ان کے پاس روکی اور نیچے اتر آیا۔ ''میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں آپ کو صبح ڈراپ کردوں گا۔''

''کوئی بات نہیں' میں خود بھی جاسکتی ہوں۔'' رعنا نے کہا۔ ''اب میں ٹھیک ہوں پھر زرینہ بھی آگئی تھی۔''

''آیئے میرے ساتھ۔'' سہیل احمد نے گاڑی کا دروازہ کھولا تو رعنا کو اس کے ساتھ بیٹھنا پڑا۔ زرینہ پیچھے آگئی تھی۔

''ندا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی' میں اسے دیکھنے گیا تھا۔ اس لیے ذرا دیر ہوگئی ورنہ میں پہلے آجاتا۔''

''کوئی بات نہیں' آپ نے پہلے ہی اتنی زحمت کی۔''

''یہ زحمت نہیں ہے۔'' سہیل احمد نے یوں کہا کہ رعنا محجوب سی ہوگئی۔ گھر کے سامنے کار سے اترتے ہوئے رعنا نے اخلاقاً کہا۔

''اندر چلیں، میں آپ کے لیے چائے بنواتی ہوں۔''

''اس شرط پر کہ چائے آپ بنائیں گی۔'' سہیل احمد نے کہا تو رعنا نے زرینہ کی طرف دیکھا جو تالا کھول رہی تھی۔ اس نے نہیں سنا تھا۔ رعنا نے سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے میں بناؤں گی۔''

سہیل احمد اندر آیا، رعنا نے زرینہ کو دوسرے کام دیکھنے کو کہا اور خود کچن میں آگئی۔ وہ چائے بنا کر لائی تو سہیل احمد موبائل پر کسی سے بات کررہا تھا۔ ''تم اسے باقاعدگی سے چیک کراتے رہو۔ مجھے بہت فکر ہے۔ وہ کمزور ہورہی ہے، میں شام کو آؤں گا۔''

سہیل احمد نے موبائل رکھا تو رعنا نے پوچھا۔ ''ندا کو کیا ہوا؟''

''کیس مسئلہ کررہا ہے۔'' سہیل احمد نے کہا۔ ''ممکن ہے آپریٹ کرنا پڑے۔''

رعنا جھینپ گئی تھی۔ اس نے جلدی سے چائے بنا کر کپ اس کی طرف بڑھایا۔ ''آپ نے سچ میں بہت زحمت کی۔''

''میں نے کہا نا بالکل بھی نہیں۔'' اس نے کپ لے کر گھونٹ لیا۔ ''میرا اندازہ درست نکلا' آپ چائے بہت اچھی بناتی ہیں۔ آپ کھانا بھی اچھا بناتی ہوں گی۔''

''ہاں کامی بھی میرے ہاتھ کا پسند کرتا تھا۔''

''عام طور سے ورکنگ وومین کھانا بنانا پسند نہیں کرتی ہیں یا اچھا نہیں بناتی ہیں۔''

''میرے ساتھ ایسا نہیں ہے' مجھے کھانا بنانا پسند ہے اور میں اچھا بھی بناتی ہوں۔''

سہیل احمد نے کپ میز پر رکھا۔ ''رعنا اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں؟''

''جی پوچھیں۔''

''آپ ہر لحاظ سے ایک مکمل عورت ہیں۔ مالی لحاظ سے بھی مضبوط ہیں اور لگتا ہی نہیں کہ ایک جوان بیٹے کی ماں بھی ہیں، تب آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟''

رعنا کو اسی سوال کی توقع تھی۔ اس نے گہری سانس لی۔ ''سہیل صاحب! اس کی بہت سی وجوہات ہیں، اول جب میں بیوہ ہوئی تو میرے سر پر ایسا کوئی بڑا نہیں تھا جو میری دوبارہ شادی کی کوشش کرتا، دوسرے جاوید کے بعد میرے لیے کسی اور مرد کا تصور مشکل تھا۔ انہوں نے مختصر عرصے میں مجھے اتنی محبت دی، پھر کامی تھا میں اسے سوتیلے باپ کے حوالے نہیں کرسکتی تھی۔''

''آپ کی طرف کوئی بڑھا بھی نہیں؟''

''کچھ لوگ آگے آئے تھے مگر ان میں اخلاص سے زیادہ وقتی دلچسپی تھی۔ اس لیے میں نے جواب نہیں دیا۔''

''اور کوئی خلوص سے آتا تب؟''

''تب شاید میں سوچتی۔''

سہیل احمد چند لمحے کے لیے خاموش ہوکر چائے پیتا رہا پھر اس نے کہا۔ ''رعنا! اگر اب کوئی خلوص سے آپ کی طرف بڑھے تو......؟''

''اب بہت دیر ہوگئی ہے۔'' رعنا اس کی بات کاٹ کر بولی

''دیر نہیں ہوئی ہے۔'' سہیل احمد نے اصرار کیا۔

''دیر ہوگئی ہے۔'' رعنا کی آواز نم ہوگئی۔ ''پلیز میری درخواست ہے اب اس موضوع پر مزید بات نہ کریں۔''

سہیل احمد کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے طویل سانس لے کر سر ہلایا۔ ''جیسے آپ کہیں اور رعنا...... مجھے آپ کی مرضی بہت عزیز ہے۔'' وہ کھڑا ہوگیا۔ ''اب میں چلوں گا۔ میرا نمبر آپ کے موبائل میں آگیا ہے۔ اسے سیو کرلیجیے گا اور کوئی بھی بات یا مسئلہ ہو تو بلا جھجک مجھے کال کریجیے گا۔ میں آپ سے رابطے میں رہوں گا اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو۔''

''سہیل صاحب! مجھے اعتراض تو نہیں ہے لیکن میرا خیال ہے اس سلسلے کو اب یہیں ختم کردیا جائے تو بہتر ہوگا۔ بعد میں آنے والی پیچیدگیوں سے یہ بہتر رہے گا۔''

سہیل احمد نے آہستہ سے کہا۔ ''جیسے آپ کی مرضی، میں نے کہا نا مجھے آپ کی مرضی عزیز ہے۔''

رعنا اسے گیٹ تک چھوڑنے آئی تھی۔ سہیل احمد نے کار میں بیٹھ کر اس کی طرف دیکھا اور ہاتھ ہلا کر کار آگے بڑھا دی۔ رعنا گیٹ بند کر کے اندر آئی تو کچن کی صفائی کرتی زرینہ نے کہا۔ "بی بی جی! صاحب بہت اچھے آدمی ہیں۔ اگر کل یہ نہ آتے تو میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں۔ انہوں نے آکر سب سنبھال لیا۔"

"انہوں نے آکر کیا کیا؟" رعنا نے پوچھا۔

"بی بی آپ بالکل بے ہوش تھیں، میں نے ٹھنڈا پانی چھڑکا تب بھی ہوش میں نہیں آئی تھیں پھر صاحب آئے اور انہوں نے آپ کو دیکھا تو اپنی کار اندر لائے اور آپ کو اٹھا کر اس میں ڈالا۔ میں ساتھ بیٹھی اور وہ آپ کو اسپتال لے آئے۔ وہاں ڈاکٹر نے آپ کو دیکھا اور جب آپ کی طرف سے اطمینان ہوا تو وہ مجھے میرے گھر تک چھوڑ گئے۔"

رعنا کو شرم محسوس ہوئی اور ساتھ ہی اچھا بھی لگا کہ سہیل احمد نے اس کا اس حد تک خیال رکھا کہ کار اندر لا کر اسے اٹھا کر اس میں ڈالا۔ گلی میں تو تماشا بن جاتا اور دیکھنے والے نہ جانے کیا سوچتے؟ اس نے زرینہ سے پوچھا۔ "کسی نے دیکھا اور پوچھا تھا؟"

زرینہ نے سر ہلایا۔ "جی بی بی، سامنے والی شبانہ آنٹی نے پوچھا تھا، جب صاحب کار باہر نکال رہے تھے۔ میں نے بتایا کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور صاحب آپ کے دفتر میں کام کرتے ہیں۔"

رعنا نے اطمینان کا سانس لیا۔ "یہ تم نے ٹھیک بتایا۔"

زرینہ نے کسی قدر تعجب سے دیکھا۔ "تو صاحب آپ کے دفتر میں کام نہیں کرتے، انہوں نے بھی تو کہا تھا تب ہی میں نے گھر کا پتا بتایا تھا۔"

رعنا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ "میرا مطلب ہے تم نے ٹھیک کہا اور سہیل واقعی میرے آفس میں کام کرتے ہیں۔"

"صاحب بہت اچھے آدمی ہیں۔" زرینہ نے کہا اور اپنے کام میں لگ گئی۔ رعنا گہری سانس لے کر رہ گئی۔ سہیل احمد بہت اچھے آدمی ہیں۔ اس نے سوچا لیکن وہ جو چاہ رہے ہیں وہ ممکن نہیں ہے۔ پہلے بھی رعنا نے اس کی دلچسپی محسوس کی تھی مگر آج اس نے کھل کر بات کی اور بہت مہذب پیرائے میں اپنا مدعا بیان کیا۔ رعنا کے جواب کو اس نے اتنے ہی مہذب انداز میں قبول کیا اور جذباتی ہوئے بغیر چلا گیا۔ اسے انکار کرتے ہوئے رعنا کے اندر کچھ ٹوٹ سا گیا تھا مگر وہ اس کا پروپوزل قبول نہیں کر سکتی تھی۔ سہیل احمد کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ یہ تعلق کس قدر دشوار ہو سکتا ہے اور بعض باتیں اس کے علم میں آجاتیں تو اس تعلق کی نوعیت ہی بدل کر رہ جاتی۔ ندا کے بارے میں سہیل احمد نے جو کہا تھا، اب رعنا کو لگ رہا تھا کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو کسی بھی بات کو آسانی سے نہیں بھولتے بلکہ اسے روگ بنا لیتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ اس کے ساتھ اچھا نہیں ہوا تھا مگر ایک اچھے شخص سے شادی اور طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود اس نے اس بات کو اپنی زندگی پر طاری کیا ہوا تھا۔ اس کی حالت گواہی دے رہی تھی کہ وہ مسلسل کشیدہ اعصاب کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے۔ اس نے جس طرح رعنا کو انکار کیا تھا اس سے لگ رہا تھا کہ اس کے اندر سب کچھ روزِ اول کی طرح تازہ تھا۔

رعنا کو خیال آیا کہ ندا کی شادی کو سات مہینے ہو چکے تھے مگر بچے کا پتا یقیناً اس سے پہلے ہی چلا ہوگا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ آخری دنوں سے تھی۔ اگرچہ ایسا لگ نہیں رہا تھا۔ وہ کمزور تھی اور بچہ بھی کمزور تھا۔ شاید اسی وجہ سے کیس میں مشکل ہو رہی تھی۔ اس نے دل سے دعا کی کہ اللہ ندا کی مشکل آسان کرے، اس کی اور ہونے والے بچے کی حفاظت کرے۔ زرینہ شام تک اس کے ساتھ رہی پھر چھٹی کر کے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد گھر میں عجیب سا سناٹا چھا گیا۔ رعنا ایسی گھبرائی کہ چھت پر آگئی جہاں آس پاس رونق تھی۔ رعنا کا دل بہلا مگر جب مغرب کے بعد نیچے آئی تو پھر گھبراہٹ ہونے لگی۔ اس کا کوئی علاج نہیں تھا۔ اسے اب ساری عمر اسی تنہائی کے ساتھ رہنا تھا۔ رات بستر پر سونے کی کوشش میں کروٹیں بدلتے ہوئے اسے خیال آیا کہ کاش سہیل ندا کا باپ نہ ہوتا یا پھر ندا کا کامی سے تعلق نہ ہوتا تب وہ شاید اکیلی نہ رہتی۔

دو دن آرام کے بعد وہ خود کو بالکل ٹھیک محسوس کرنے لگی تھی۔ تنہائی کی وحشت بھی کم ہونے لگی تھی اور اس نے سوچا کہ اب وہ سوائے اشد ضرورت کے چھٹی نہیں کرے گی۔ کامی تھا تو چھٹی کے دن بھی بہت اچھے گزرتے تھے مگر اب کامی بھی نہیں رہا تھا۔ نازیہ نے اسے رات کے وقت کال کی اور رعنا نے اسے نہیں بتایا کہ وہ ایک دن اسپتال میں رہ کر آئی ہے۔ اس کے بجائے اس نے نازیہ سے کہا کہ وہ آنے والا ہفتہ اور اتوار کا دن اس کے ساتھ گزارے گی۔ وہ باہر چلیں گے اور انجوائے کریں گے۔ نازیہ سن کر خوش ہو گئی تھی۔ خاص طور سے اس بات پر کہ رعنا ہفتے کی رات اس کے گھر میں رکے گی۔ وہ ہفتے کی صبح اس کے گھر پہنچ گئی۔ بچے

بھی خوش تھے کہ انہیں گھومنے پھرنے کا موقع ملے گا۔

ساحل پر اقبال کے بینک کا ہٹ تھا۔ اس نے اس میں ایک کمرا بک کرا دیا تھا۔ کیونکہ اس کی چھٹی نہیں تھی اس لیے نازیہ خود بچوں اور رعنا کو لے کر چلی گئی۔ کھانے کا سامان ایک بیکری سے لیا تھا۔ ساتھ میں کولڈ ڈرنک تھی۔ ہٹ میں انہیں ایک کمرا ملا تھا۔ وہاں کچھ دوسری فیملیز بھی آئی ہوئی تھیں مگر وہ الگ کمروں میں تھیں۔ سامنے صاف ستھرا ریت والا ساحل تھا، وہ سارا دن وہیں رہے۔ پانی میں کھیلتے رہے اور جب بھوک لگتی تو کمرے میں آ کر کھا پی کر تازہ دم ہو جاتے تھے۔ شام کو واپسی پر سب تھکے ہوئے تھے۔ بچے تو نہا دھو کر جلد سونے چلے گئے۔ رعنا اور نازیہ نے نہا کر کھانا بنایا۔ رعنا گیسٹ روم میں تھی۔ نازیہ کا ارادہ گپ شپ کا تھا اس لیے وہ رعنا کے کمرے میں آ گئی۔ تب رعنا نے اسے وہ سب بتایا جو اب تک نہیں بتایا تھا۔ اس کی طبیعت خرابی کا سن کر وہ بے چین اور خفا ہو گئی۔

"مجھے نہیں بتا سکتی تھیں؟"

"اس وقت کیسے بتاتی اور بعد میں سوچا کہ ملاقات پر بتاؤں گی۔" رعنا نے اسے ٹھنڈا کیا۔ پھر اس نے سہیل احمد کے پروپوزل کے بارے میں بتایا تو نازیہ اپنی خفگی بھول گئی۔ وہ اچھل پڑی تھی۔

"اب میں تجھے قتل کر دوں گی۔ اتنی بڑی خبر اتنی دیر سے دی۔"

"یہ بھی سامنے دینا چاہتی تھی۔" رعنا نے اس کی کیفیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

"پھر تم نے کیا جواب دیا؟"

"وہی جو مجھے دینا چاہیے تھا۔" رعنا نے اسے بتایا کہ اس نے سہیل احمد سے کیا کہا۔ نازیہ سن کر پُرتاسف ہو گئی۔

"تم نے اچھا نہیں کیا، آج کے دور میں اچھا آدمی مشکل سے ملتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن تم نے یہ سوچا کہ اگر کبھی ندا نے اسے اصل بات بتا دی تو اس کا ردِعمل کیا ہو گا ... وہ اس عورت سے تعلق رکھنا تو بڑی بات ہے بات کرنا بھی پسند کرے گا جس کے بیٹے نے اس کی بیٹی کو برباد کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی ہو؟"

"دیکھو رعنا، تم اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی احساسِ گناہ کا شکار ہو رہی ہو حالانکہ یہ تمہارا گناہ نہیں ہے۔ لیکن تم نے سوچا کہ اگر کامی قصوروار ہے تو کسی نہ کسی حد تک ندا بھی قصوروار ہو گی۔ اگر کامی اس کی طرف بڑھا تو یہ اس کی چھوٹ تھی جو بات یہاں تک پہنچی۔" ندا نے بھی وہی بات کی جو رعنا نے نہ چاہتے ہوئے بھی ندا سے کہہ دی تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ کامی کا قصور تھا مگر ندا بھی اس حد تک قصوروار ضرور تھی کہ اس نے صحیح غلط کی پروا کیے بغیر خود کو کامی کے حوالے کر دیا۔ رعنا نے سرد آہ بھری۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن وہ یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہے۔ اس کے خیال میں صرف کامی قصوروار ہے اور وہ کسی معافی کا مستحق نہیں ہے۔"

"تب وہ خود غلط ہے۔" نازیہ نے یقین سے کہا۔ "اس کے معاف کرنے یا نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس نے نہ صرف اللہ کے بنائے قانون کو توڑا ہے بلکہ اپنے باپ کے اعتماد کو بھی دھوکا دیا ہے۔ وہ کیسے خود کو بری الذمہ سمجھ سکتی ہے۔"

"میں نے اس کا اور کامی کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا۔" رعنا نے آہستہ سے کہا۔ "دیکھا جائے تو میں اور سہیل بھی قصوروار ہیں، ہم نے اپنی اکلوتی اولاد پر نظر نہیں رکھی کہ وہ باہر کیا کر رہی ہے۔ اللہ ہم سب کو معاف کرے۔"

"ہاں وہی معاف کرنے والا ہے۔" نازیہ بولی۔

"کاش یہ سب نہ ہوا ہوتا یا سہیل کا ندا سے تعلق نہ ہوتا۔"

"مجھے بھی یہی خیال آیا تھا مگر یہ سب تقدیر کا کھیل ہے۔"

اگلے دن نازیہ نے باہر چلنے کی تجویز دی تھی لیکن رعنا نے منع کر دیا۔ اس کا موڈ نہیں ہو رہا تھا، اس نے کہا۔ "تم لوگ چلے جاؤ، میں گھر جانے کا سوچ رہی ہوں۔"

"ہرگز نہیں! تم ڈنر کر کے جاؤ گی۔" نازیہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ اس نے بچوں کو باپ کے سر مارا کہ وہ انہیں باہر گھما کر لائے اور خود رعنا کے ساتھ گھر میں رک گئی۔ وہ گھر کے کام کرتی اور گپ شپ کرتی رہیں۔ جب ڈنر کے بعد نازیہ اور اقبال اسے گھر چھوڑ کر گئے تو وہ خود کو بہت بہتر محسوس کر رہی تھی۔ اس رات اسے لیٹنے کے چند منٹ بعد ہی نیند آ گئی تھی اور وہ بہت گہری نیند میں تھی جب موبائل کی مسلسل بجنے والی بیل نے اسے بیدار کیا۔ ندا کا نمبر دیکھ کر اس کی نیند اڑ گئی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔

"ندا؟"

"آنٹی۔" ندا نے کہا تو اس کی آواز میں تکلیف تھی۔

"تم ٹھیک ہو نا؟" رعنا بے چین ہو گئی۔

"نہیں مجھے بہت درد ہو رہا ہے۔ آنٹی میں نے سوری کے لیے کال کی ہے۔ اس دن میں نے آپ سے بہت بدتمیزی کی تھی۔"

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' رعنا نے نرمی سے کہا۔ ''اگر تمہیں زیادہ تکلیف ہو رہی ہے تو تم عامر سے کہو وہ تم کو اسپتال لے کر جائے۔''

''مجھے لگ رہا ہے میں بچوں گی نہیں۔'' ندا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''آنٹی! اس دن میں نے آپ سے غلط کہا تھا کہ صرف کامی قصور وار ہے، اصل میں ہم دونوں قصور وار تھے، وہ آپ کا مجرم ہے اور میں پاپا کی، ہم دونوں نے آپ کے اعتماد کو دھوکا دیا۔ میں یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھی مگر آپ نے مجھے آئینہ دکھایا آنٹی، پتا نہیں مجھے پھر آپ سے بات کرنے کا موقع ملے یا نہ ملے میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی ہوں۔''

☆☆☆

ندا کالج سے یونیورسٹی آئی تو کچھ نروس تھی۔ اب تک اس نے ساری تعلیم لڑکیوں کے ساتھ حاصل کی تھی اور کو ایجوکیشن میں یہ پہلا موقع تھا۔ اگر سہیل احمد کی حوصلہ افزائی شامل نہ ہوتی تو شاید وہ پہلے سمسٹر سے یونیورسٹی چھوڑ دیتی۔ مگر سہیل احمد کے اصرار پر اس نے تعلیم جاری رکھی۔ ندا بچپن سے تنہائی پسند اور کسی قدر زود رنج تھی۔ وہ آسانی سے خفا ہو جاتی اور بہت مشکل سے مانتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی دوستی بہت کم لڑکیوں سے تھی۔ سب سے قریبی دوست سمیرا تھی۔ اسکول کی حد تک تو اس کی دوستیاں بھی نہ ہونے کے برابر تھیں۔ سہیل احمد سمجھتا تھا کہ ماں سے محرومی نے ندا کو ایک خاص نفسیاتی کیفیت کا شکار کر دیا ہے اور وہ اسے اس نفسیاتی کیفیت سے نکالنا چاہتا تھا اس لیے اس کی حوصلہ افزائی کرتا کہ وہ سوشل ایکٹی وٹیز میں حصہ لے، لوگوں سے گھلے ملے۔

یونیورسٹی میں اس کا گروپ صرف لڑکیوں پر مشتمل تھا اور اس نے دو گروپ اسی لیے بدلے تھے کہ ان میں لڑکے بھی شامل ہو گئے تھے۔ پیٹھ پیچھے اسے مس پراؤڈی بھی کہا جاتا تھا۔ ندا کو علم تھا مگر اس نے کبھی پروا نہیں کی۔ اگر کسی دوست نے اس کے گریز پر بات کرنا چاہی تو ٹال کر بات ختم کر دیتی۔ اس لیے جب وہ کامران کی طرف بڑھی اور چند ملاقاتوں کے بعد اس کی طرف کھنچنے لگی تو کسی اور سے زیادہ خود اسے اپنی کیفیت پر تعجب ہوا تھا۔ کامران عمر اور کلاس میں اس سے کم تھا اور وہ بھی لڑکیوں سے دور رہنے کی وجہ سے مشہور تھا۔ شاید اسی وجہ سے وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوئے۔ ابتدائی چند ملاقاتیں اتفاقیہ تھیں اور اس کے بعد وہ خود ایک دوسرے

سے ملنے لگے مگر جب ان کی ملاقاتوں کی خبریں یونیورسٹی میں پھیلنے لگیں تو انہوں نے باہر ملنا شروع کر دیا۔ انہوں نے اس ریستوران کا انتخاب کیا کیونکہ یہ ان دونوں کے گھروں اور حلقۂ احباب سے دور تھا اور یہاں کسی جان پہچان والے کے ملنے کا امکان بھی کم تھا۔ مگر یہاں سے معاملات بالآخر اس طرف مڑے جس کا انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ برائی آدمی کو یونہی کھینچتی ہے اور مرد و عورت کے درمیان تیسرا شیطان ہوتا ہے، اس کا اندازہ انہیں اس وقت ہوا جب کامی ایک بار اسے گھر لے آیا۔ پہلی بار تنہائی ملی تو وہ بہک گئے اور بہت دور نکل گئے۔ ندا نے حواس کھوئے تھے مگر اسے اتنا احساس تھا کہ کامی نے اس کی کچھ تصاویر بھی لی تھیں، وہ پہلے بھی اس کی تصویریں لیتا رہا تھا مگر یہ عام نہیں تھیں۔ ندا کو ہوش آیا تو اس نے کامی سے کہا کہ وہ ان تصویروں کو ڈیلیٹ کر دے اور اس نے یقین دلایا کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔ جذبات کا بھوت سر سے اترا تو دونوں ہی احساسِ گناہ سے ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے۔ بنیادی طور پر دونوں کی تربیت اچھے ماحول میں ہوئی تھی اس لیے بہک جانے کے باوجود انہوں نے اسے ٹھیک نہیں سمجھا تھا۔

اس واقعے کے بعد وہ ایک دوسرے سے گریز کرنے لگے تھے۔ صرف کامی پیچھے نہیں ہٹا تھا، ندا بھی اس سے ملنے سے ہچکچا رہی تھی۔ اس کے بعد وہ باہر بھی نہیں ملے تھے۔ پھر ایک دن کامی نے اسے کال کی۔ اس نے ندا سے کہا۔ ''میں تم سے ملنا چاہتا ہوں اسی ریستوران میں۔''

''کیوں؟'' ندا نے کسی قدر تلخی سے کہا۔ ''تم نے اپنا مطلب تو نکال لیا ہے۔''

کامی نے آہستہ سے کہا۔ ''ندا میرا قصور زیادہ ہے اور تم سے معافی چاہتا ہوں۔ بس ایک بار مل لو بے شک اس کے بعد میری کال بھی ریسیو مت کرنا۔''

ندا میں احساسِ ندامت زیادہ تھا مگر وہ کامی کو قصوروار .... سمجھ رہی تھی کہ وہ اسے اسی مقصد کے تحت گھر لے گیا تھا۔ اس لیے اس نے صاف انکار کر دیا۔ اس نے کامی سے کہا۔ ''میں تمہاری صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔ آج کے بعد مجھے کال مت کرنا۔''

کامی کو بھی غصہ آ گیا تھا۔ ''ٹھیک ہے اگر تم مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتیں تو میں بھی تم سے بات نہیں کروں گا۔''

اس کے چند دن بعد ندا کی طبیعت خراب ہوئی اور وہ یونیورسٹی سے واپسی پر ایک ڈاکٹر کے پاس چلی گئی۔ علامات سن کر ڈاکٹر نے اسے پریگننسی ٹیسٹ کرانے کو کہا تو ندا کے ہوش اڑ گئے۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ اس نے خدشات کے ساتھ ٹیسٹ کرایا تو وہ مثبت نکلا۔ کامی کے بارے میں اسے یقین تھا کہ اس نے اسے دھوکا دیا ہے۔ ایسے میں اسے جو واحد فرد نظر آیا اور جو اسے اس دلدل سے نکال سکتا تھا وہ عامر تھا۔ عامر اس کی مدد کو آیا۔ وہ اس سے بہت پہلے سے محبت کرتا تھا اور ندا اس محبت سے واقف بھی تھی مگر اس نے اس سے پہلے بھی عامر کو اہمیت نہیں دی تھی مگر وہی اس صورتِ حال میں اس کا نجات دہندہ بن کر آیا تھا۔

☆☆☆

''آنٹی آپ مجھے معاف کر دیں۔''

''بیٹا کامی میری اولاد ہے اس نے میرے اعتماد کو دھوکا دیا لیکن میں نے اسے معاف کر دیا۔ تم سے بھی کہا تھا......''

''میں کون ہوتی ہوں معاف کرنے والی، میں تو خود گناہ گار ہوں۔'' وہ پھر رونے لگی۔ ''پاپا سے معافی بھی نہیں مانگ سکتی، کامی نے آپ کے اعتماد کو دھوکا دیا تو میں نے بھی پاپا کی عزت نہیں رکھی۔''

''تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ تم عامر سے کہو وہ تمہیں اسپتال لے جائے۔''

ندا گہری سانسیں لے رہی تھی۔ ''آنٹی، مجھے آپ کو کچھ اور بھی بتانا ہے۔ اس دن کامی ریستوران میں میرا ہی انتظار کر رہا تھا۔ اس نے مجھ سے التجا کی تھی کہ میں ایک بار اس سے مل لوں اور اس کے روبرو اسے معاف کر دوں مگر میرا دل نہیں مانا تھا اور میں آنے کا کہہ کر بھی نہیں گئی۔ پھر وہ حادثہ ہو گیا۔ پتا نہیں اس روز میں اتنی سنگ دل کیوں ہو گئی تھی۔''

اب رعنا کو پتا چلا کہ کامی اس ریستوران میں کیا کر رہا تھا۔ ''وہ...... اپنے کیے پر شرمندہ تھا؟''

''ہاں، مگر شاید میں شرمندہ نہیں ہوئی بس اسے ہی قصوروار سمجھتی رہی۔'' ندا رونے لگی۔ ''میں بھی تو گناہ گار تھی۔''

''ندامت رو، تمہاری طبیعت اور خراب ہو جائے گی۔''

''میرا...... میرا سانس رک رہا ہے۔'' وہ ہانپنے لگی۔ ''اللہ حافظ آنٹی میرے لیے دعا کیجیے گا کہ اللہ مجھے معاف کر دے۔''

ندا نے کہتے ہی کال کاٹ دی اور رعنا اسے کال بیک

کرنے جارہی تھی کہ اسے خیال آیا اور اس نے سہیل احمد کا نمبر ملایا۔ اس نے تیسری بیل پر کال ریسیو کی اور بولا۔ ''رعنا آپ......؟''

''سہیل! میری ابھی ندا سے بات ہوئی ہے۔'' رعنا نے بلاتمہید کہا۔ ''اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، شی نیڈز ٹریٹ منٹ۔''

اس کی بات سن کر سہیل فوراً تہ تک پہنچ گیا۔ ''او کے میں دیکھتا ہوں۔'' اس نے کہتے ہی کال کاٹ دی۔ رعنا نے موبائل سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور جگ سے پانی نکال کر پیا، اس کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد سہیل نے اسے کال کی۔ ''عامر اسے اسپتال لے جا رہا ہے میں بھی راستے میں ہوں۔''

''اللہ کرے سب خیر خیریت سے ہو جائے۔''

''آپ دعا کریں۔'' سہیل احمد نے کہا۔ ''ندا نے آپ کو کیوں کال کی تھی؟''

''اس کی طبیعت خراب ہو رہی تھی اور وہ نادم ہو رہی تھی کہ اس نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ وہ سوری کر رہی تھی۔ پھر مجھے لگا کہ اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے تو میں نے آپ کو کال کی۔ میں نے ٹھیک کیا نا؟''

''آپ نے بروقت کال کی کیونکہ میں نے ہی عامر کو کال کر کے جگایا، ورنہ ندا نے اسے نہیں بتایا تھا وہ لاؤنج میں تھی۔''

''پلیز مجھے باخبر رکھیے گا۔''

''میں آپ کو اپ ڈیٹ کرتا رہوں گا۔'' سہیل احمد نے اسے یقین دلایا۔ اس سے بات کر کے رعنا نے وضو کیا اور دو رکعت نماز پڑھ کر ندا اور اس کے ہونے والے بچے کے لیے دعا کی۔ دعا کر کے اسے سکون ملا تھا مگر اندر ایک ہلکی سی کھٹک ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ صبح تک جاگتی رہی۔ فجر کی اذان پر اس نے تازہ وضو کیا اور نماز پڑھ کر سلام پھیرا تھا کہ موبائل کی بیل بجی، اس نے لپک کر موبائل اٹھایا۔ سہیل احمد کی کال تھی اور رعنا نے کال ریسیو کی تو سہیل احمد کے رونے کی آواز سن کر اس کا دل بیٹھ گیا۔

''سہیل کیا ہوا...... ندا اور بچہ ٹھیک ہے نا؟''

''بچہ ٹھیک ہے۔'' سہیل نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا ہے۔''

''اور ندا؟'' رعنا نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

''شی از ڈیڈ۔'' سہیل احمد پھر رونے لگا تھا۔ ''اس کی حالت بہت خراب تھی۔ ڈاکٹروں نے اسے بچانے کی کوشش کی مگر...... رعنا اس کے لیے دعا کرنا۔ میری بچی نے زندگی میں بہت دکھ دیکھے ہیں۔''

''میں دعا کروں گی...... ضرور کروں گی۔'' وہ بھی رونے لگی تھی۔ ''اس کی زندگی اور صحت کے لیے بھی کی تھی پر اللہ کو منظور نہیں تھا۔''

''میں پھر کال کروں گا، ابھی ندا کو دیکھنا ہے۔'' سہیل احمد نے کہا اور کال کاٹ دی۔ رعنا پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ اسے لگا جیسے اس کا کوئی عزیز مر گیا ہو۔ جیسے کامی کا انتقال ہوا تھا، تب اس نے ایسا ہی دکھ محسوس کیا تھا۔ بہت دیر رونے کے بعد اس کا دل ہلکا ہوا تو اس نے ندا کے لیے دعا کی۔ اللہ سے اس کی اور کامی کی مغفرت کے لیے دعا مانگی۔ اسے رہ رہ کر اس بچے کا خیال آ رہا تھا جو باپ سے تو پیدائش سے پہلے ہی محروم ہو گیا تھا اور جب دنیا میں آیا تو ماں بھی ساتھ چھوڑ گئی۔ اس کا کیا ہوگا؟ اسے کون دیکھے گا؟ رعنا جانتی تھی کہ انسان کا بچہ پل ہی جاتا ہے، چاہے اس کا دنیا میں ایک بھی خون کا رشتہ نہ ہو اس کے باوجود اس کا دل کٹ رہا تھا۔ اس سارا دن وہ سوچتی رہی۔ سہیل سے بچے کا پوچھے مگر اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ جانتی تھی سہیل کے لیے یہ سب سے بڑا دکھ تھا۔ اسے سنبھلنے میں کچھ وقت لگتا۔

رعنا نے آج کی بھی چھٹی کر لی تھی۔ اس نے آفس فون کر کے اطلاع دے دی تھی لیکن اگلے دن وہ دفتر گئی اور اس نے اپنی ذمے داری نبھانا شروع کر دی۔ وہ ایک حد سے زیادہ چھٹی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کسی کے جانے سے دنیا کے کام نہیں رکتے۔ اسے بھی کام کرنا ہی تھا اور وہ کام نہ کرتی تو کمپنی اس کی جگہ کسی اور کو رکھ لیتی۔ کام چلتا رہتا۔ اس کے ساتھیوں نے اسے ویلکم بیک کیا تھا۔ وہ خود پر جبر کر کے خوش مزاجی بھی دکھاتی رہی۔ وہ ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ وہ سوگ کی کیفیت سے نکل آئی ہے۔ ندا کا دکھ وہ کس حیثیت سے مناتی اور دوسروں کو اس بارے میں کیا بتاتی، اس لیے وہ اس دکھ کو اندر ہی اندر سہتی رہی۔ دوسرے دن بھی اس نے سہیل احمد کو کال نہیں کی۔ ندا کی تدفین ہو چکی تھی مگر وہ ابھی سہیل احمد کو مزید وقت دینا چاہتی تھی تب ہی وہ اس سے رابطہ کرتی۔

☆☆☆

نرم اور گرم بلینکٹ میں لپٹا بچہ اپنی کھلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ گلابی رنگت اور بہت نازک سے نقوش تھے۔ پہلے وہ سنجیدہ رہا تھا پھر اس کے ہونٹ کھلے اور وہ مسکرانے لگا۔ اس مسکراہٹ نے رعنا کو اندر تک سرشار کر دیا

تھا۔ مگر اس کی آنکھوں کے لرزتے آنسوؤں میں بیک وقت دکھ بھی تھا اور خوشی بھی۔ اس نے بچے کو سینے سے لگا لیا اور رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ''میرا بیٹا...... میرا کامی......''

ندا کے انتقال کے تیسرے دن وہ آفس سے گھر آئی اور ابھی لاؤنج میں چادر اتار ہی رہی تھی کہ گیٹ کی کال بیل بجی۔ وہ دوپٹا ٹھیک کرتی ہوئی باہر آئی تو دروازے پر سہیل احمد کھڑا تھا۔ اس نے ایک بے بی کارٹ اٹھا رکھا تھا جس میں بلینکٹ میں لپٹا بچہ تھا۔ رعنا کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا، اس نے بہ مشکل خود کو روکا۔ ورنہ وہ سہیل احمد سے جھپٹ کر کارٹ لینے والی تھی۔ اسے بروقت خیال آیا کہ بہ ظاہر اس بچے سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس نے آہستگی سے اسے ہاتھوں میں لے لیا۔ وہ سو رہا تھا اور ایک نظر میں وہ اسے ہوبہو کامی لگا جب اس نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ پھر اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ اس نے اسے سینے سے لگا کر زیرِ لب کامی کہا تھا اور پھر سہیل سے بولی۔

''یہ ندا کا......''

''بیٹا ہے۔'' سہیل احمد دھیمے لہجے میں بولا۔ ''کیا میں اندر آسکتا ہوں؟''

رعنا نے اسے پیچھے ہٹ کر راستہ دیا اور اسے اندر لاؤنج میں لے آئی۔ سہیل احمد نے خالی بے بی کارٹ میز پر رکھ دیا۔ رعنا نے بچے کے گالوں کو چوما اور بولی۔ ''آپ اسے دکھانے لائے ہیں؟''

''پرسوں یہ اپنی ماں سے محروم ہوا تھا۔'' سہیل احمد نے کہا۔ ''آج یہ باپ سے بھی محروم ہو گیا ہے۔''

رعنا چونکی۔ ''کیا مطلب؟''

''عامر ہمیشہ کے لیے ملک سے باہر جا رہا ہے۔ اسے آسٹریلیا کا اسٹوڈنٹ ویزا مل گیا ہے اور اس کا کہنا ہے اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔ اس نے اپنا بیٹا میرے حوالے کر دیا ہے۔''

رعنا اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ عامر نے اپنا نہیں، ندا کا بیٹا اس کے باپ کے حوالے کیا تھا۔ وہ اس بچے کی اصلیت اچھی طرح جانتا تھا اور پھر ندا نہیں رہی جس کی خاطر اس نے اس بچے کو قبول کیا تھا تو اس بچے کو ساتھ رکھنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ رعنا نے محبت سے اسے دیکھا۔ وہ اس کا پوتا تھا۔ سہیل احمد تھکا ہوا لگ رہا تھا اس نے کہا۔ ''میں کل سے اس کی دیکھ بھال کر رہا ہوں لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ یہ مجھ اکیلے کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس لیے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔'' وہ کہتے ہوئے رکا پھر اس نے کہا۔ ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم دونوں مل کر اس کی پرورش کریں؟''

رعنا کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ سہیل احمد ایک بار پھر اسے پروپوز کر رہا تھا اور اس بار اس کے پاس انکار کا جواز بہت کم تھا۔ ندا نہیں رہی تھی اور عامر بھی یہاں سے جانے والا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ بچہ اصل میں کس کا تھا۔ صرف وہی جانتی تھی اور وہی سب سے زیادہ اس کی حق دار تھی مگر اس کا حق اَن لکھا تھا۔ عام حالات میں اسے کسی صورت یہ بچہ نہیں مل سکتا تھا لیکن اگر وہ سہیل احمد سے شادی کر لیتی تو اسے اس کا حق مل جاتا۔ وہ بچے کو سینے سے لگائے سوچ رہی تھی اور سہیل احمد متوقع نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا پھر وہ آنسوؤں کے درمیان مسکرائی تو سہیل احمد بھی مسکرانے لگا۔ وہ اٹھ کر رعنا کے پاس آیا اور اس نے بچے کے چہرے پر ہاتھ رکھا۔

''اسے ہم دونوں مل کر پالیں گے۔''

''ہاں یہ ہمارا بچہ ہے۔'' رعنا کا لہجہ رندھ گیا تھا۔ ''اسے ہم پالیں گے۔''

☆☆☆

شاہد مرجھائے چہرے اور بڑھی شیو کے ساتھ عدالت کے کٹہرے میں کھڑا اپنی قسمت کا فیصلہ سن رہا تھا۔ گواہوں اور ثبوتوں کی روشنی میں اسے قتل کا مرتکب قرار دیا گیا تھا اور جج نے اس کی طرف سے رضاکارانہ اعتراف کی وجہ سے اسے عمر قید کی سزا سنائی تھی۔ یہ سزا سن کر اس کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ اس کے ماں باپ، رشتے دار اور دوسرے لوگوں کے ساتھ میڈیا بھی وہاں موجود تھا۔ جیسے ہی جج نے سزا سنا کر اپنے فیصلے پر مہر ثبت کی عقبی نشستوں سے رعنا اور اس کے ساتھ سہیل بھی کھڑے ہو گئے۔ رعنا نے بلند آواز سے کہا۔ ''میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔''

تمام لوگ ان کی طرف گھوم گئے۔ رعنا نے بات جاری رکھی۔ ''شاہد نے میرے اکلوتے بیٹے کامران کو قتل کیا۔ اگرچہ یہ قتل غلط فہمی کی وجہ سے ہوا مگر شاہد نے سوچ سمجھ کر یہ کام کیا ہوگا۔ اس کے باوجود میں صرف اللہ واسطے اسے معاف کرتی ہوں۔ میری طرف سے باقی کارروائی میرا وکیل کرے گا اور اسے میرا حتمی بیان سمجھا جائے۔''

یہ کہہ کر رعنا سہیل احمد کے ساتھ پلٹ کر باہر چلی گئی جس کی گود میں ننھا عدنان تھا۔ میڈیا والے ان کے پیچھے لپکے تھے اور شاہد کے اہلِ خانہ اس سے لپٹ گئے تھے۔